بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش رس

انسانی زندگی کا مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرنا ہے۔ اور یہ عبادت تمام مذاہب میں پرستش کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مذہب کی کوئی جامع تعریف نہیں ہوسکتی۔ یہ ہر انسان کا اپنا داخلی احساس ہوتا ہے، یہ ہر انسان کا ایک Subjective معاملہ ہوتا ہے۔ یہ چند رسومات اور پرستش کے چند طور طریقوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ خارج میں اس کا کوئی وجود یا احساس نہیں ہوتا، اس پر عمل کرنے کا اجر مرنے کے بعد آخرت میں ملتا ہے۔ اس دنیا میں مذہب کی تصدیق و تکذیب کا کوئی معیار موجود نہیں۔ کسی معاشرہ کو درست کرنا مذہب کا Function نہیں ہے۔ یہ بات مذہب کی حدود سے باہر ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم نے اسلام کو بطور ایک دین کے پیش کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام ہے، اور اس نظام کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ دین میں پرستش کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہوتی ہے، اور اس کی ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ دین پر عمل کرنے سے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ جو اس کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو وعدے کیے ہیں وہ اس دین کے ذریعے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی ان دعاوی کی صداقت کا عملی ثبوت ہمارا اولین دور فراہم کرتا ہے

جب کہ صدر اول میں مسلمانوں نے ایسا معاشرہ قائم کیا تھا جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما ہو کر ہر فرد کا تزکیہ نفس ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عملی حیثیت سے دین کا دور، خلافت راشدہ پر ختم ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد ملوکیت غالب آ گئی، لیکن دین کے اثرات کی وجہ سے کافی عرصہ تک مسلمانوں کو غلبہ حاصل رہا۔ لیکن جب ملوکیت کی وجہ سے مذہب کا پورا پورا غلبہ ہو گیا تو مسلمانوں کو زوال آنا شروع ہوا اور جس قدر مذہب کا غلبہ بڑھتا چلا گیا، اسی قدر مسلمان مغلوب ہوتے چلے گئے۔ ہم مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں بے شمار مذہبی تحریکیں اور بے شمار مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے نہایت خلوص و ایثار اور دل سوزی سے اس قعرِ مذلت سے نکلنے کی کوششیں کیں، لیکن ان تحاریک اور مصلحین کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ کیونکہ کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ہی مذہب تھا۔ اور ان میں سے کوئی تحریک یا کوئی مصلح مذہب کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس تمام طویل عرصے میں تحریک ''طلوع اسلام'' پہلی تحریک ہے جس نے دین و مذہب میں امتیاز کیا، اور مسلمانوں کے زوال کا سبب مذہب کو گردانا، اور ان کے اقتدار اور عروج کا واحد حل دین کے قیام سے وابستہ قرار دیا۔

تحریک طلوع اسلام کی چار بنیادی خصوصیات ہیں۔

(1) اس تحریک کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین کا تصور ابھار کر پیش کیا۔ اور آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے اس کے قیام کو لازمی قرار دیا۔

(2) اس تحریک کی دوسری اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے روایات کے وحی ہونے سے انکار کیا۔ ہماری پیشوائیت نے اس تحریک کے خلاف یہ الزام لگایا کہ یہ تحریک خدانخواستہ حدیث کی منکر ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ تحریک حدیث کی تو قائل ہے، لیکن حدیث کو وحی تسلیم نہیں کرتی۔

(3) اس تحریک کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفسیر بالروایات کو درست قرار دیتی نہیں دیتی۔ بلکہ یہ قرآن کریم کی تفسیر تصریف آیات کے ذریعے کرتی ہے۔

(4) یہ تحریک بنو عباس کے دور کی وضع کردہ قوانین کی پابندی ضروری نہیں سمجھتی۔ اس کا خیال ہے کہ ہر اسلامی حکومت کے قوانین اس مملکت کی فقہ و شریعت ہوتے ہیں، چونکہ ہماری پیشوائیت کی اساس ہی ان دو ستون، یعنی احادیث و فقہ پر ہے، اور یہ تحریک ان دونوں کو نہیں مانتی، اس لئے ہماری پیشوائیت اس تحریک کی سخت مخالفت کرتی ہے۔

اس تحریک کے بانی جناب محترم پرویز صاحب نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کی ہیں ہزاروں کی تعداد میں مضامین تحریر فرمائے۔ تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک رسالہ طلوع اسلام جاری رکھا۔ اپنے ہفتہ واری درسوں میں دو مرتبہ قرآن کریم کی تفسیر پیش کی، ان کے وہ درس اب بھی قرآن کریم کو سمجھنے کی کلید قرار دیئے جاتے ہیں، اور وہ ساری دنیا میں اب بھی CD/DVD کے ذریعے دیکھے اور سنے جاتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب کی وفات کے بعد درسوں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، اور رسالہ طلوع اسلام بھی اسی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ پرویز صاحب خود اتنا کچھ لکھ گئے ہیں کہ اس تحریک کی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے وہ کافی ہے۔

خواجہ ازہر عباس، اس تحریک سے 1948ء سے وابستہ ہیں اور اس تحریک کے دیرینہ رکن ہیں۔ وہ قرآنی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ عرصہ سے ان کے فکر انگیز مضامین رسالہ ''طلوع اسلام'' اور رسالہ ''صوت الحق'' میں شائع ہوتے چلے آ رہے ہیں، جن کو قرآنی احباب نہایت پسندیدگی سے دیکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی تیسری کتاب ''ذہن جو قرآن بناتا ہے'' ادارہ طلوع اسلام نے شائع کی ہے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی زیر طبع ہے۔ میں عرصہ دراز سے تحریک طلوع اسلام کا لٹریچر پڑھ رہا ہوں لیکن خواجہ صاحب کی اس کتاب سے مجھے بھی بہت کچھ حاصل ہوا۔ خصوصاً دین کا تصور بہت ہی واضح ہو گیا۔ میرے خیال میں یہ کتاب قرآن کریم کے ہر طالب علم کو پڑھنا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ خواجہ صاحب کی جملہ کتب کے مضامین آئندہ نسلوں تک پڑھے جائیں گے۔

خواجہ صاحب کے فرزند عزیز خواجہ ضیاء عباس صاحب ایک معروف بینکر Banker ہیں۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو ہر طرح کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا ہوا ہے تا کہ خواجہ صاحب اپنا سارا وقت قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کر سکیں خواجہ صاحب اور قرآنی حلقے ان کے بھی شکر گذار ہیں۔

ڈاکٹر سید ابو راشد جعفری

سابق پرنسپل ہیلی کالج آف کامرس، لاہور

وسابق ڈین فیکلٹی آف پبلک ایڈمنسٹریشن پنجاب یونیورسٹی، لاہور

فرقہ بندی منع ہے

قرآن کریم نے مسلمانوں کو ایک ایسی قوم قرار دیا ہے، کہ جو تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگراں ہو اور ان کی مرکزی اتھارٹی اور حاکم اعلیٰ ان کا نگراں ہو۔ چنانچہ فرمایا ٥ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (2/143) ٥ اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسطیٰ بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر نگران بنو اور پیغمبر تم پر نگران بنے۔

قرآن کریم امت مسلمہ پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ پوری دنیا میں تمام اقوام کی نگرانی کرے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ امت مسلمہ کے پاس اتنی قوت اور طاقت ہو کہ وہ ہر قوم کو عدل و انصاف پر قائم رہنے پر مجبور کرے اور اس طاقت کے ذریعہ زیادتی کرنے سے روک دے۔ یہ قوت و طاقت اور یہ بلند مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان خود آپس میں اتحاد و اتفاق قائم رکھیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو اِخوہ قرار دیا ہے ٥ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (49/10) ٥ یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کا فرض ہے کہ بھائیوں کی طرح پیش آئیں۔ اگر ان میں آپس میں دو فریقوں میں کوئی اختلاف ہو جائے تو باقی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کا اختلاف دور کرا کر ان کے مابین صلح کرا دیں (49/9)

قرآن کریم مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کرتا اور اس اختلاف کے واقع نہ ہونے کا ذریعہ قرآن کریم سے تمسک قرار دیتا ہے۔ اسی لئے حکم ہوتا ہے ٥ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (3/103) ٥ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے

پکڑے رہنا اور فرقے نہ بنانا۔ اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو تاکیدی حکم ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنا اور فرقہ نہ بنانا۔ آیت کے الفاظ واضح اور بہت موثر ہیں۔ آیت کا پہلا حصہ موجبہ اور دوسرا اسالبہ ہے۔ یعنی پہلے حصے میں یہ امر ہے کہ قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ اور دوسرے حصے میں نہی ہے کہ فرقہ نہ بننے دینا اسی طرح آیت کے مفہوم کو بہت Forcefully بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقہ نہ بنانا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ فرقہ بنتا اس وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کی رسی ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی رسی ہاتھ میں رہے گی فرقہ نہیں بنے گا، فرقہ صرف اسی صورت میں بنتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی رسی ہی (قرآن کریم) کو چھوڑ دیں اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب قرآن کریم کو ترک کرنا ہے۔ اور فرقہ پرست کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں رہتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ○ (30/31.32) اور مشرکوں میں سے نہ ہو جانا ○ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے ہو گئے اور سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو ان کے پاس ہے ○ اس آیت شریفہ میں قرآن کریم میں فرقہ بندی کی مذمت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ○ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159) ○ جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے اے نبی ان سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ان تین آیتکریمات (30/32-6/159-3/103) سے علی الترتیب ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ قرآن کریم سے رہتا ہے اور نہ اللہ و رسولؐ سے۔ فرقہ بندی کرنے والے اور کسی ایک فرقہ کو اختیار کرنے والے اپنے زعم میں وہ کتنا ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار قرار دے دیں لیکن قرآن کریم کی رو سے ان کا کوئی تعلق بوجہ شرک اللہ، رسول یا کتاب سے برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کریم ان قطع علائق پر بس نہیں کرتا۔ مزید ارشاد ہوتا ہے

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ o (3/105)

o اوران لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے بنالئے اور احکام آنے کے بعد ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے o اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کے خلاف واضح احکامات آنے کے بعد بھی اگر فرقہ بندی کی گئی، تو فرقہ بندی کرنے والوں کے لئے عذاب عظیم ہے۔ قرآن کریم نے عذاب الٰہی کی یہ مختلف شکلیں بھی خود ہی شمار کرادی ہیں۔

(1) دنیاوی زندگی میں ذلت اور خواری اللہ کا عذاب ہے (20/134)

(2) بھوک وخوف اللہ کا عذاب ہے (16/112)

(3) برکات سماوی اور ارضی کے لئے دروازوں کا بند ہو جانا عذاب ہے (7/96)

(4) گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (6/65)

(5) باہمی اختلاف عذاب ہے (3/104)

(6) اور اختلاف کا دور ہونا رحمت ہے (11/118)

یہ عذاب الٰہی کی چند شکلیں ہیں اسی طرح قرآن کریم نے ان تمام مصائب ونوائب و بلیات کو جو فرعون کی قوم اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر کرتی تھی عذاب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے (20/47) قرآن کریم نے مندرجہ بالا آیت کریمہ نمبر (3/105) میں آگاہ کر دیا ہے کہ جو قوم بھی فرقہ بندی کرے گی اس کے لئے عذاب عظیم ہے۔ اور قرآن کریم نے عذاب عظیم کی مختلف شکلیں خود بیان فرمادی ہیں جو فرقہ بند قوم پر وارد ہوتی ہیں۔ اور عملاً ہماری قوم فرقہ بندی کی وجہ سے عذاب کی ان تمام کیفیتوں میں مبتلا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم میں اب تک اس کا احساس نہیں (اختصار کی وجہ سے آیات درج نہیں کی گئیں، قرآن کریم کے کسی نسخے سے آیات تلاش کرلی جائیں)

انسان کی آخری حالت موت کے وقت کی ہوتی ہے۔جس وقت ہر مرنے والے کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کا رب کریم اس سے راضی ہو۔اس عین موت کے وقت کے لئے فرمایا کہ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ o(3/102) اور تم مرنا تو صرف مسلمان ہی مرناo۔آخری حالت میں مسلمان ہی ہونا چاہئے۔کسی فرقے کے نام سے منسوب ہونا مناسب نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو اور انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ حضورؐ نے خود کو بھی اول المسلمین فرمایا ہے۔اس لئے ہمیں بھی قرآن کریم کے حکم اور حضورؐ کی اتباع میں خود کو مسلمان کہنا اور کہلوانا چاہئے اور جو لوگ اتباع سنت کا ادعا بہت جوش وخروش سے کرتے ہیں ان کے لئے تو از بسکہ لازم ہے کہ وہ صرف مسلمان کہلائیں۔اور کسی بھی فرقے سے منسلک نہ ہوں۔فرقہ بندی کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں قرآن کریم کا موقف بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم فرقہ بندی کی کس قدر مذمت کرتا ہے لیکن حیرت اور تاسف کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں فرقہ بندی نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ہر عالم، ہر مسجد، ہر جامع، ہر مدرسۃ العلوم کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ منسوب ہے۔اور جتنا بڑا عالم ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ اپنے فرقے میں متشدد اور غالی ہوتا ہے۔اور ان تمام واضح آیات کریمات کے باوجود جو درج کی گئیں ہیں، فرقہ بندی کی لعنت سے صرف نظر کرتا ہے کہا جاتا ہے کہ فرقہ بندی بندی کے خلاف کوئی اعتراض نہیں اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ فرقے آپس میں تنازعات نہ کریں بلکہ ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آئیں۔لیکن یہ بات قرآن کریم کے بھی خلاف ہے اور عملاً بھی ممکن نہیں۔کیونکہ فرقے بننے کے بعد ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ درست ہے اور دوسرا فرقہ غلطی پر ہے۔ اس لئے فرقہ بندی کے بعد رواداری بالکل ممکن نہیں ہے۔غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ فرقہ بنتا کیسا ہے اور فرقہ بندی کا تدراک کیا ہے؟ اور فرقہ کی تعریف کیا ہے؟

قرآن کریم چونکہ ایک ابدی اور عالمگیر کتاب ہے اس لئے جو نظام حیات وہ پیش کرتا

ہے اس میں اس نے بہترین معاشرے کی تشکیل کے لئے صرف اصول بیان کئے ہیں جن کی جزئیات ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنے اپنے ادوار اور ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ صدر اول میں حضورؐ کے دور میں اور خلافت راشدہ کے دور میں اس کی جزئیات حکومت کی طرف سے مقرر ہوتی رہیں اور ان کا اجراء ہوتا رہا۔ انسانیت کی بدقسمتی سے وہ نظام ختم ہوگیا اور ملوکیت کو غلبہ حاصل ہوگیا، اس میں دنیاوی امور بادشاہ خود طے کرنے لگے اور دینی امور دینی ماہرین سے مخصوص ہوگئے۔ چونکہ مختلف حضرات نے اپنی اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی جزئیات مقرر کیں اس لئے ان میں وقت ومقامات اور ذاتی میلانات کے اختلاف کی وجہ سے ان جزئیات میں بھی اختلاف ہوا۔ یہ جزئی قوانین جو ان حضرات نے نے وضع فرمائے تھے یہ اس دور کی شریعت اور فقہ تھے۔ یہ شریعت اور فقہ ابدی حیثیت کے حامل نہیں تھے۔ نہ ہی اس کے مدون کرنے والوں کا یہ خیال تھا ابدیت اور ہمیشگی اور استقلال تو صرف قوانین الٰہی کے لئے مخصوص ہے۔ اور ہم صرف اسی کی اتباع کے مکلف ہیں۔ ٥اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (7/3) ٥جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اس کے علاوہ سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ یہ مختلف فقہ اور شریعت جن کی اتباع کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوئی یہ سب بنوعباس کے دور میں مدون ہوئی تھیں اور وہ حکومتیں صرف مسلم حکومتیں تھیں۔ ان میں بادشاہت کا موجود ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ملوکیت کے تابع مسلم حکومتیں تھیں۔ اسلامی حکومتیں ہرگز نہیں تھیں۔ جس طرح آج کی ترکی، مراکش، مصر وغیرہ کی حکومتیں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں، مگر اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوعباس کی حکومت مسلم حکومت تو تھی مگر اسلامی حکومت نہ تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی نہیں ہوسکتے اور اُس دور کہ حکومت کے قوانین کی پابندی اُس دور کے لوگوں کے لئے ضروری تھی ہم اس کی اطاعت کے مکلف نہیں ہیں۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اس دور کی شریعت اور فقہ ہوتے ہیں۔ ہم غلطی سے ان سابقہ قوانین کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ فقہ مختلف حضرات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے

ہم میں مختلف آئمہ کے اختلاف کی وجہ سے فرقہ بندی قائم ہے۔ لیکنا گر ہم اب اسلامی حکومت قائم کرکے اپنی ضروریات کے مطابق قرآن کریم کی جزئیات خود مقرر کرتے رہیں اور وہ بطور قانون جاری کرنے لگیں تو فرقہ بندی از خود ختم ہوجائے گی۔

مثلاً قرآن کریم نے روزے کے متعلق فرمایا أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (2/187) روزے کو رات تک پورا کرو۔ اس دور میں مختلف فقہ میں رات کو مختلف وقت سے شروع کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزہ کھولنے کا ایک وقت نہیں رہا اور مختلف فرقوں میں اختلاف ہے۔ اس دور کی اسلامی حکومت خود رات کا تعین کردے کہ رات فلاں وقت شروع ہوتی ہے اور سب مسلمان اسی وقت روزہ کھولیں۔ اسی طرح یہ اختلاف رفع ہوجائے گا۔ اسی طرح قرآن کریم نے چوری کی سزا قطع ید بیان فرمائی ہے مگر چور اور ہاتھ کی خود تعریف نہیں فرمائی اس لئے اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اسلامی حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ اس طرح اختلافی مسائل حل کردے۔ ہمارے ہاں اختلاف جزئیات کے مختلف تعین کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کے سبب مختلف فقہیں وجود میں آئے۔ صرف ان فقہ کی وجہ سے فرقہ بندی پیدا ہوئی۔ اس کا واحد حل اسلامی حکومت کا قیام ہے اور وہ حکومت خود قرآن کریم کے اصول واحکامات کی جزئیات مقرر کردے، وہی اس دور کی فقہ ہوگی کیونکہ ہم سابقہ کسی دور کی فقہ کی پابندی کے مکلف نہیں۔ اس طرح فرقہ بندی ختم ہوسکتی ہے۔

ماہ جنوری 2003ء

2

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے (حصہ اول)

قرآن کریم قوموں کے عروج وزوال کے اسباب بیان فرماتا ہے اور گذشتہ اقوام کے حالات بطور استشہاد پیش کرتا ہے۔ کہ سابقہ اقوام کو ان ہی اصولوں کے مطابق عروج وزوال سے دوچار ہونا پڑا۔ عرب جن اقوام سے بخوبی واقف تھے ان میں سے ایک قوم عاد بھی تھی۔سورۃ ہود میں قوم عاد کے جرائم ومعائب اور حضرت ہودؑ کی تعلیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد قرآن کریم صرف ایک آیت میں ان کی ذہنی پستی اور قلبی خباثت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ o وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍo(11/59)o یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام وقوانین سے انکار کیا اور اپنے رسولوں کی دعوت سے سرکشی برتی لیکن (حیرت یہ ہے) کہ اپنے ان سرکش اور ظالم حکام کی اطاعت کرتے رہے جو عمداً حق کی مخالفت کرتے تھےo بعینہ یہی حالات آج ہم مسلمانوں کے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور اسلامی حکومت کے قیام اور قانون الٰہی کے اجراء سے ابا کرتے ہیں لیکن جو بھی ظالم اور جابر حکمران برسراقتدار آیا، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بالکل رضامند ہوتے ہیں۔قرآن کریم نے انسان کی حکومت انسان پر مطلقاً حرام قرار دی ہے اور انسانوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں دیا إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (12/40) حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو زیب نہیں دیتی۔وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًاo(18/26) اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتاo اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین (قرآن مجید) کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں تو قرآن کریم کے وعدے کے مطابق وہ

تمام اقوام پر غالب بھی ہوں گے اور دیگر تمام اقوام کے نگران بھی۔ مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے دین اور نظام کے عروج زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں پر ہر حالت میں فرض ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے تحت زندگی بسر کریں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے سے مطلقاً گریز کریں۔ صدر اول میں مسلمانوں کے عروج کا راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو متمکن کیا اور اس کے ماتحت زندگی بسر کی۔ جب سے مسلمانوں نے دین اسلام کو ترک کیا اسی دن سے ان پر زوال و ادبار کی ابتداء ہوگئی۔ زندگی کی جتنی پریشانیاں، برائیاں، معائب واسقام ہو سکتے تھے وہ سب امت مسلمہ میں در آئے۔ نکبت واخلاص، غربت وجہالت، محکومی ومسکینی، تملق وخوشامد، پریشانی ودرماندگی، مسلمانوں کا شعار زندگی بن گئے۔ لیکن سب سے بڑی لعنت اور مصیبت جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ حال اور برباد کردیا وہ ان کا آپس کا افتراق وشقاق تھا اور ہے جس نے ایک ہزار سال سے فرقہ بندی کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور روز بروز اس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہیں، ایک فرقہ دوسرے فرقے کا دشمن اور خون کا پیاسا ہوگیا ہے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو قوتیں اور صلاحیتیں مسلمان دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے، وہ آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے استعمال کررہے ہیں۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بنص صریح شرک قرار دیا ہے ارشاد حضرت باری عزاسمہ ہے۔ o
مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ o(30/31.32) o اللہ کی طرف رجوع رکھو اور اس سے ڈرو، صلوٰۃ کی پابندی کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہوجانا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور بہت سے گروہ ہوگئے اور ہر ایک گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے o

اس آیت کریمہ کی رو سے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خود گروہ در گروہ ہوجانا شرک ہے

جس سے اجتناب لازم ہے۔ اور قرآن کریم نے فرقہ بندی کو جو شرک قرار دیا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دین میں تو آخری سند قرآن کریم ہے، جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ لیکن فرقہ بندی کے بعد ہر شخص اپنے فرقے کا پابند ہوتا ہے اور ہر فرقہ میں آخری سند وہ ذات ہوتی ہے جس کی نسبت سے وہ فرقہ بنتا ہے۔ اس لئے فرقہ بندی میں آخری سند قرآن کریم کے ساتھ اس فرقہ کی منتسب الیہ ذات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ فرقہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد عالی ہے ٥ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159) ٥ بے شک جنہوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کے مطابق تو ایک امت واحدہ بنتی ہے، یہ الگ فرقہ بنانے والے ایک متوازی دین کے متبع ہو گئے، اس لئے ان کا تعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نہیں رہتا۔ تاکید مزید کے طور پر قرآن کریم نے سورۃ آل عمران میں نہایت پر شکوہ الفاظ میں فرمایا ٥ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (3/103) تم سب مل کر قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔ یہ وہ آیت کریمہ ہے جو ہمارے دین کی اساس اور بنیان مرصوص ہے۔ اسی میں ہماری ترقی اور عروج کا راز پنہاں ہے اور اسی سے خود دین کا استحکام و تمکن ممکن ہے۔ یہ حَبْلِ اللّٰہ ہی وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا اور یہ کسی زمان، مکان، قوم، خطہ سے مخصوص نہیں۔ ذہن انسانی کے خود ساختہ قوانین زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے فرسودہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضابطہ الٰہی ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے اور تمام حدود و قیود و امتیازات سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ اس کے اصول وہ ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اسی آیت مجیدہ پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت پر زور، موثر اور اپنے مفہوم پر بہت اصرار کرنے والی ہے۔ آیت کا ایک حصہ امر پر دوسرا حصہ نہی پر مبنی ہے تاکہ اپنے مفہوم اور حکم پر سخت تاکید کر سکے۔ قرآن کریم کو تھامے رہو اور فرقہ بندی نہ کرو۔ آیت سے

واضح ہے کہ فرقہ بندی صرف اس صورت میں ہوتی ہے، جب حَبلِ اللّٰہِ چھوڑ دی جائے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی رسی کو تھامے رہیں گے فرقہ بندی نہیں ہو سکتی۔ فرقہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھنا محض اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ آیت کے الفاظ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ فرقہ بندی سے بچنے کا واحد ذریعہ قرآن کریم کو تھامے رکھنا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح اور روشن ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں رہتا، کیونکہ فرقہ بنتا ہی جب ہے جب قرآن کریم کو چھوڑ دیا جائے۔

ان تینوں آیات کریمات سے واضح ہوا کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم سے کوئی تعلق برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی نہ صرف کفر و شرک ہے بلکہ اس کا نتیجہ تباہی، بربادی اور رسوا کن عذاب ہے۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد گرامی ہے۔ o وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَـٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ o(3/105) o خبردار رہو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آ جانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہاں قرآن کریم نے فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم قرار دیا ہے اور جو عذاب اس کے نتیجے میں وارد ہوتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں جو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہیں۔ بھوک، پیاس، تکلیف، خوف، وحزن، خانماں خرابی سب کے لئے قرآن کریم میں عذاب کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان تمام سختیوں، تکلیفوں کے لئے جو فرعون کی قوم غالب نے اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھی تھیں عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (20/47) سورۃ بقرہ میں مُفْلِحُونَ کے مقابلہ میں وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ o(2/7) لا کر واضح کر دیا کہ عذاب کے ملنے سے زندگی کی خوش گواریوں سے محرومی و ناکامی، ذلت و خواری، محکومی و عاجزی، افلاس، اور غربت، ان تمام صفات کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم ہے اس لئے یہ تمام صفات منطقی طور پر فرقہ کے نتیجہ میں

حاصل ہونا لازمی ہیں اور قرآن کریم کی تنذیر کی صداقت ہم سب کے سامنے ہے کہ ہم میں فرقہ بندی اور تفرقہ اندازی کی وجہ سے وہ سارے معائب واسقام موجود ہیں جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کے نتیجہ میں لفظ عذاب کے ضمن میں شمار کرائے ہیں۔

قرآن کریم نے اسلام کو ملت ابراہیم کہا ہے (2/135) یعنی وہ طریقہ جسے وحی الٰہی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنایا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا (22/78) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے، نزول قرآن سے پہلے بھی اور قرآن میں بھی۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی ملت ہیں۔ انہوں نے ہی ہمارا نام ''مسلم'' رکھا ہے۔ جو ان کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارا نام ہے، اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے نام سے موسوم کرنا اور کسی تشخص سے خود کو معروف کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاکید بھی فرمائی کہ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ o (2/132) پس تم نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو o انسان کی آخری حالت موت کی ہی ہوتی ہے جس میں ہر انسان چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس کا پروردگار اس سے راضی ہو، اس آخری حالت کے لئے بھی یہ تاکید ہے کہ اس وقت بھی انسان کی سوائے مسلمان کے اور کوئی حالت نہ ہونی چاہئے۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت اور تنقیص کی کہ اسے شرک ٹھہرایا اور قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے ہے نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نہ ہی قرآن کریم سے باقی رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی خجالت ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں یہ فرقہ بندی ایک ہزار سال سے چلی آرہی ہے اور مسلمان اس کو تسلیم (Recognise) کرتے چلے آرہے ہیں اور اس سے بڑھ کر حیرت اور استعجاب اس پر ہے کہ ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی ہے اور کبھی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتی۔ بلکہ خود اپنے کو کسی نہ کسی فرقے سے مربوط رکھتی ہے۔ وہ صرف اس بات کے

خلاف ہے کہ آپس میں تصادم و تزاحم نہ ہو اور ملک میں اس کی وجہ سے فساد برپا نہ ہو۔ اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری، محبت اور تعاون سے زندگی بسر کر لیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے قطعاً کوئی تعرض نہیں ہے۔

اتحاد بین المسلمین کے معنی ہی یہی ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں اور باہمی تصادم و تزاحم سے اجتناب کریں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی منع ہے اور شرک ہے خواہ وہ آپس میں محبت اور مودت ہی سے کیوں نہ رہیں۔ فرقہ بندی چونکہ ہم نے قبول کر رکھی ہے اس لئے اس کے اثرات، عقائد کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ سب میں ہی سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ بندی نے عقائد کے اختلاف کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ کو بھی متاثر کیا جس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

قرآن کریم نے قرآن فہمی کے اصول وضوابط خود متعین فرمائے ہیں جن کے مطابق اگر قرآن کریم کو سمجھا جائے تو دو اور دو چار کی طرح قرآن کریم خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ منجملہ دیگر اصولوں کے قرآن فہمی کا پہلا اصول جو خود قرآن کریم نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے تصریف آیات ہے۔ انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ o(6/65) دیکھئے تو سہی ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ لوگ ان کو سمجھ جائیں o۔ حضورؐ کے متعلق بھی بیان فرمایا۔ ان کا طریقہ بھی قرآن فہمی کا تصریف آیات ہی تھا۔ وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُواْ دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ o(6/105)o اور اے رسول ہم اسی طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ آپ (تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) تا کہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا اور (تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تا کہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیات کی خود تبیین کر دیں o۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ذریعے درس قرآن دیا کرتے تھے۔ یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا۔ لیکن ہمارے ہاں تفاسیر میں اس قدر اہم طریقہ جو خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے

بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔آپ کسی بھی معروف تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیں، اس اصول کو کسی مفسر نے بھی پیش نگاہ نہیں رکھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ تصریف آیات سے کسی فرقہ کی تائید مشکل تھی۔شان نزول کی وجہ سے مختلف فرقوں کی تائید آسانی سے مہیا ہو جاتی ہے۔شان نزول کی مختلف ہونے کی وجہ سے آیات کا مفہوم ہی بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔مثلاً جو آیات مجموعی طور پر صحابہ کی تعریف وتوصیف میں وارد ہوئیں اور جن کا تعلق کسی بھی خاص شخصیت سے نہیں تھا شان نزول نے ان آیات کو مختلف حضرات کے متعلق قرار دے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ نے ان سے کسی کی تعریف مقصود لی اور دوسرے نے کسی دوسرے صاحب کی۔مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی آیت کے دو دو تین تین شان نزول بیان کر دیئے گئے۔قرآن کریم عالمگیر ضابطہ حیات ہے(28/1)اس کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں لیکن شان نزول کی وجہ سے قرآنی احکام کی عمومیت کو، جو قیامت تک کے لئے پوری نوع انسانی کے لئے تھی صرف چند افراد کے لئے محدود کر دیا گیا ہے۔آپ سارا قرآن مجید پڑھ جائیں، ہر ایک آیت کسی نہ کسی شخصیت یا کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دی گئی (مثالیں آگے آئیں گی)اور اس کی عمومیت ختم کر دی جاتی ہے۔اس طرح شان نزول کا طریقہ نہ صرف قرآن کریم کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے بلکہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے،اور صرف فرقہ کی تقویت کے لئے ہی اس کو ایجاد کیا گیا۔

قرآن کریم میں حضورؐ کو کفار کے لئے طلب مغفرت سے منع کیا گیا ہے فرمایا o اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (9/80)o اے رسول ان منافقین کے لئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں ہمارے لئے برابر ہے۔اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے،تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔آیت کریمہ اتنی صاف اور واضح ہے کہ ہر شخص اس کا مفہوم بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس میں حضورؐ کو منافقین کے لئے مغفرت طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ حضورؐ اگر ان کے لئے طلب مغفرت کر بھی لیں تو بے سود ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔اس وضاحت کے بعد اب آپ اس آیت کا

شانِ نزول ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ نافع ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا حضورؐ کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں اپنا کرتا عنایت فرما دیں کہ ہم اس سے اس کا کفن بنائیں اور آپ اس پر جنازے کی نماز پڑھائیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کریں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا کرتہ عنایت کیا اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو نماز پڑھا دوں گا۔ جب آپ نے اس کا نماز جنازہ پڑھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کو کھینچا اور کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے (9/80) آپؐ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کے لئے دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو اگر آپؐ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے، تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ چنانچہ آپؐ نے اس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اتری ٥ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا (9/84) کا شانِ نزول کہ آیت کریمہ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کے انداز بلاغت سے حضرت عمرؓ تو یہ بات سمجھ گئے کہ حضورؐ کو منافقین کے لئے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن خود حضورؐ نے قرآنی انداز فصاحت و بلاغت کا الٹا مفہوم لیا۔ فرمایا کہ ٥ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کے لئے طلب مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں۔ اور اس غلط اخذ شدہ مفہوم کی بنا پر حضرت عمرؓ کے منع کرنے بلکہ مُصَلّٰی پر سے کھینچنے کے باوجود آیت نمبر (9/80) کی مخالفت کا ارتکاب کیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے فہم کی تصدیق اور حضورؐ کے فہم کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ آپ نے (9/80) کا مفہوم درست نہیں سمجھا، یہ آیت کریمہ ٥ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم نازل فرمائی۔

ایک اور آیت کریمہ مع ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیں۔ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا

فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ (5/6) اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور میں سے آئے، یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ آئے، تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کے ساتھ صاف کر لیا کرو اور منہ اور ہاتھوں سے گرد و غبار پونچھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا۔ آیت کریمہ بالکل صاف ہے، قرآن کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ابہام اور اشکال نہیں ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اس آیت کو بخوبی سمجھ کر اس پر عمل کر سکتا ہے مگر اب اس کا شان نزول ملاحظہ فرمائیں

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ساتھ سفر میں تھے۔ قافلہ ایسے مقام پر تھا جہاں پانی موجود نہیں تھا، قافلے کو روانگی کا حکم ملا چنانچہ کوچ ہونے والا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ صحابہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ دیکھئے آپ کی بیٹی نے کیا کیا۔ نماز کا وقت جا رہا ہے پانی ہے نہیں اور اس نے قافلے کو روک دیا۔ اس پر حضرت ابو بکرؓ نے انہیں بہت سخت سست کہا، لیکن انہوں نے اس لئے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ حضرت عائشہؓ صحابہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد بزرگوار کے طعنوں کو زہر کا گھونٹ سمجھ کر پی گئیں تو اس وقت تیمم کا حکم نازل ہوا کہ پانی نہ ہو تو تیمم کر لیا کرو (ملخص بخاری شریف قرآن محل صفحہ نمبر 770) آیت بالکل واضح ہے کسی تفسیر یا شان نزول کی ضرورت نہیں ہے لیکن شان نزول نے ناموس رسالت اور عزت صحابہ کو مجروح کیا۔ مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سفر کے دوران بھی بالکل بے فکری کے عالم میں اپنی زوجہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے آرام فرما رہے ہیں اور نماز کا کوئی خیال تک نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہار کا گم ہو جانا اتنا بڑا جرم نہیں کہ سب صحابہؓ اور حضرت ابو بکرؓ اس پر اس قدر برہم ہوں، اور حضرت عائشہؓ کا کوئی پاس کسی کو نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں تھا کہ ہم مسلمانوں پر ایسے وقت بھی آئیں گے جہاں وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں ہوگا۔ تیمم کا حکم وضو کے حکم کے ساتھ ہی کیوں نہ نازل ہوا ہے۔ کیونکہ یہ آیت بالکل وضو کی آیت سے متصل و ملحق ہے۔ عقلی

اعتبار سے بھی شان نزول کا تصور درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منشاو تدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر بالفرض وہ واقع پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر واقعات زیادہ پیش آتے یا ان سے مختلف نوعیت کے پیش آجاتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ممکن تھا؟

ماہ جولائی 2003ء

3

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے (حصہ دوم)

یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔قرآن کریم کے نجماً نجماً نازل ہونے پر کفار اعتراض کرتے تھے کہ قرآن کریم یکشمت کیوں نہیں نازل ہوگیا، سورۃ فرقان میں ان کا اعتراض اور ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔جبکہ فرمایاoوَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا o(25/32)oاور جو لوگ اس ضابطہ حیات سے انکار کرتے ہیں ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ قرآن کریم پورے کا پورا یک وقت کیوں نہ نازل کیا گیا(تاکہ اس کی مجموعی تعلیم شروع ہی سے معلوم ہوجاتی)اے رسول اس قرآن کو اس لئے بتدریج نازل کیا کہ اس کے وقتاً فوقتاً نازل ہونے سے آپ کے دل کو تقویت رہے اور ہم نے اس کی بہترین ترتیب دی ہےoاس آیت مبارکہ سے بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کریم ایک خاص پروگرام اور ترتیب کے ساتھ نازل ہوا ہے۔یہ Hapharzardly نازل نہیں ہوا۔اور اس کے نزول سے کسی بھی واقعہ یا شخصیت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور قرآن فہمی کے لئے شان نزول معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر کے بعد اسی طرح روایات،جنہیں احادیث رسول کہا جاتا ہے فرقہ بندی کی زد میں آئیں مختلف فرقوں نے اپنے اپنے ذخیرے جمع کئے۔ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن احادیث کا انتخاب کیا، وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلے کا نتیجہ تھا۔ان روایات کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی سند تھی اور نہ اس کی سند حضورؐ نے عنایت فرمائی تھی، نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ(Written Material) تھا جس سے

انہوں نے ان روایات کا انتخاب کر لیا ہو لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنے عقائد و میلانات و ترجیحات کے مطابق چھان پھٹک کر کے اپنے مجامع میں شامل کیا۔ ان میں سے بیشتر وہ تھیں جو ان کے عقائد کو تقویت دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے مختلف فرقوں کی مختلف کتب احادیث مرتب ہوئیں۔ صحاح ستہ اور کتب اربعہ کی احادیث کو آپ ایک نظر مطالعہ فرمائیں۔ مشکل سے کوئی قدر مشترک ملے گی۔ قرآن کریم سے تو فرقہ بندی کو کوئی تقویت نہیں ملتی البتہ حدیث کے مجموعے اپنے اپنے فرقوں کو نہ صرف تقویت دیتے ہیں بلکہ فرقہ بندی کو بھی جائز قرار دیتے ہیں جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور تصریف آیات کے بجائے احادیث کے ذریعے جب آیات کی تفسیر کی جاتی ہے تو اور بھی فرقہ پرستی میں اضافہ ہوتا ہے۔

شان نزول اور احادیث سے اگرچہ فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا اور اب بھی ان ہی کے سہارے فرقہ بندی قائم ہے۔ لیکن جس چیز نے اس سے بھی زیادہ فرقہ بندی کو مضبوط کیا وہ یہ نظریہ تھا کہ حضورؐ کو قرآن کریم کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور وحی ہوتی تھی اور وہ وحی، وحی ''خفی'' تھی اور موجودہ احادیث کے ذخیرے بھی وحی خفی ہی ہیں۔ وحی جلی کو وحی متلو اور وحی خفی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ حالانکہ وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے، خارج از قرآن وحی کا تصور بالکل باطل ہے۔

مسلمانوں کے زوال کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی تو قرآن کریم کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کریم کے باہر حدیث میں ہے۔ یہ عقیدہ اپنے اپنے نظریات کو جائز قرار دینے اور انہیں Justify کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کی اور ان کے زوال وادبار کا باعث بنا۔ اس سے ایک ایسا دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحی الٰہی قرار دے کر حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا لیکن قرآن حکیم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن کریم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وحی الٰہی صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے، چنانچہ ارشاد گرامی قدر ہے۔ ○ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ

وَقُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ o(36/69)o اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے شایان شان بھی نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک نصیحت اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے (ترجمہ اشرف علی تھانوی)

اس آیت کریمہ میں نفی اور اثبات کے حصر کے ساتھ نہایت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حضورؐ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن کریم ہے اور اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کی نفی کی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں ھُوَ کا ضمیر مرجع تعلیم ہے اور جو کچھ بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن کریم ہے۔ ذکر کی وضاحت خود قرآن کریم نے سورۃ حم سجدہ میں یوں فرمائی کہ o اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِالذِّكۡرِ لَمَّا جَآءَهُمۡ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ o لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ o(41/41.42)o جو لوگ اس قرآن کو جب کہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں اور یہ قرآن باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے یہ رب حکیم وحمید کی طرف سے نازل کیا گیا ہے o (مولوی اشرف علی) اس آیت شریفہ نے ذکر کی خود وضاحت کردی کہ ذکر قرآن کریم ہے اور قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ البتہ ایک اشکال ذکر اور قرآن کریم کے درمیان والی واؤ کا بھی عمداً پیدا کیا جاتا ہے، کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور چونکہ معطوف اور معطوف علیہ میں متغائرت ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ واؤ واؤ عاطفہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد عالی ہے۔ o هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ (9/33)o وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی سچا دین دے کر بھیجا ہے۔ اگر اس آیت میں واؤ کو واؤ عاطفہ شمار کیا جائے جو مغائرت کے متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے۔ جو بالبداہت غلط ہے لہٰذا یہاں واؤ واؤ بیانیہ ہی لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کریم کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیریہ ہے جس کے معنی ہیں کہ حضورؐ

کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن کریم تعلیم کیا گیا ہے اور حضورؐ کو اس کے علاوہ اور کوئی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل نہیں ہوا۔غیب کا علم بھی جو حضورؐ کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ وحی کے ذریعے قرآن کریم میں ہی دیا گیا ہے۔اس کی وضاحت بھی قرآن کریم نے کردی چنانچہ سورۃ یوسف سورۃ ہوداور سورۃ آل عمران تینوں مقامات میں تقریباً ایک سے الفاظ ہی میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ o ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ (3/44)o یہ غیب کی خبریں ہیں ہم ان کی وحی بھیجتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ حضورؐ کو آئندہ یا گزشتہ معلومات حاصل کرنے کا نہیں تھا۔اس لئے آئندہ کی خبریں جو دجال سے متعلق یا حضرت عیسیٰ کے نزول سے متعلق ہیں بالکل بے بنیاد ہیں اور آئندہ کے بہت سے واقعات کے بارے میں وہ تمام روایات بے بنیاد ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے اور ان سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے اور فرقہ بندی کو تقویت دینے کے سلسلہ میں یہ روایات بیان کی گئی ہیں۔

فرقہ بندی جہاں اور علوم میں سرایت کر گئی ہے۔اسی سلسلے میں ہماری تاریخ بھی آتی ہے ۔قرآن کریم نے فرمایاo وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماً o(4/93)o اگر کوئی مومن کسی مومن کو عمداً قتل کردے تو اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا۔اس پر اللہ کا غضب وارد ہوگا۔وہ اللہ کی نگاہوں میں ملعون ہوگا اس کے لئے اللہ نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہےo۔

قتل عمد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں اور اس کے بعد صدر اول کی مروجہ تاریخ میں ذرا اس واقعہ فاجعہ کے منظر کو سامنے لائیں کہ جنگ جمل اور صفین میں صحابہ کبارؓ کی نصف تعداد ایک طرف کھڑی ہے اور دوسری نصف اس کے مقابل اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے حملہ کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں جنگ جمل میں دس ہزار عام مومنین نہیں بلکہ صحابہ کرام ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں اور دوسری جنگ میں اسی طرح ستر ہزار صحابہ کرام قتل کئے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ کسی خاص Issue کے سبب نہیں۔صرف اقتدار کی خاطر۔حالانکہ قرآن

کریم نے آیات نمبر (19/96-48/29) میں بالتصریح کہہ دیا ہے کہ صحابہ کرام آپس میں لڑ نہیں سکتے۔ ہماری تاریخ میں کوئی بات یقینی نہیں عموماً واقعات مختلف فیہ ہیں، حضورؐ کی پیدائش اور وفات کی تاریخ، حضورؐ کی اولاد خصوصاً صاحب زادیوں کی تعداد طے شدہ نہیں، حضورؐ کے والدین کریمین کا ایمان لانا مختلف فیہ ہے۔ حضرت ابوطالب کے ایمان لانے یا نہ لانے کے متعلق اب تک کتب تحریر کی جاتی ہیں، مناظرے ہوتے ہیں لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔ حتیٰ کہ نماز بھی جو ہمارے دین کی اہم عبادت ہے اختلافات سے مستثنیٰ نہیں۔ حضورؐ نے دس سال مسلسل صحابہ کرام کے مجمع میں نماز ادا کی اور دن میں پانچ مرتبہ ادا کی، لیکن یہ طے نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ کس طرح نماز ادا کرتے تھے، ہاتھ باندھتے تھے یا کھولتے تھے اور اگر باندھتے تھے تو کس جگہ باندھتے تھے؟ نماز کے علاوہ کسی بھی عبادت، روزہ، زکوٰۃ، خمس، جہاد، حج میں اتفاق نہیں اور آج کسی طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ ان کی ادائیگی کس طرح فرماتے تھے؟ حضورؐ کے انتقال کے فوراً بعد خلافت کا مسئلہ پیش آیا، اس کے لئے اس قدر مختلف، متضاد بیانات اور مواد کتب میں تحریر ہے کہ پڑھنے والا کسی دوٹوک نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ خصوصاً سقیفہ بنی ساعدہ کے جو حالات مرقوم ہیں وہ صحابہ کرام کی کوئی قابل تعریف تصویر پیش نہیں کرتے۔ غرضیکہ تاریخ خود فرقہ بندی کی زد میں رہی اور آج کوئی صورت کسی مسئلہ میں دو ٹوک فیصلہ کرنے کی نہیں ہے۔ تقریباً سوڈیڑھ سو کتب ہیں جو مستند خیال کی جاتی ہیں۔ جو صاحبان آج کل تاریخ اسلام میں ریسرچ کرتے ہیں، وہ انہیں کتابوں میں غوطہ مارتے رہتے ہیں اور سابقہ طے شدہ عقائد کے مطابق ''لولوء لالاء'' تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ مضمون چونکہ مختصر ہے اور حوالہ جات پیش کرنے سے طوالت کا خدشہ ہے اس لئے حوالہ جات نہیں دیئے گئے ورنہ متضاد متخالف حوالہ جات کی کوئی کمی نہیں، لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ تاریخ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اب تک اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو کتنی سختی اور تاکید سے منع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا کوئی علمی گوشہ فرقہ بندی سے محفوظ نہیں رہا۔

شروع میں یہ مندرجہ بالا سب علوم فرقہ بندی سے متاثر ہوئے اور اب یہ علوم فرقہ بندی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک (Vicious Circle) ہے جس کا توڑنا مشکل ہے البتہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ جب تم مشکلات میں گھر جاؤ اور کوئی راہ نکلنے کی نظر نہ آئے تو قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کرو۔ وہی ملاذ المشکلات اور مشکل کشا ہے۔o وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (40/60)o اور تمہارے پروردگار نے فرمایا کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست کا جواب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا جواب اس کے کلام قرآن کریم سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (6/57) حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص سے کلام نہیں کرتا، اس لئے اس نے اپنے انبیاء کرام کے ذریعے اپنے احکامات اپنی کتابوں میں نازل فرمائے تاکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جا سکے۔ آخری کتاب قرآن کریم حضورؐ کے توسط سے انسانیت کو عطا کی گئی اور چونکہ حضورؐ نے قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم فرمائی اور حضورؐ اس کے اولین سربراہ تھے، اس لئے حضورؐ کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت قرار پائی۔ فرقہ بندی کے انسداد اور قرآن فہمی کے لئے یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کا سمجھنا ازبسکہ ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، تقویٰ، دین، طاغوت، فی سبیل اللہ وغیرہ یہ سب عربی الفاظ ہیں جو نزول قرآن سے پیشتر عربوں میں متداول تھے۔ لیکن قرآن کریم ان کو اپنے معانی پہنا کر اپنی اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح ''اللہ و رسول'' کے الفاظ قرآن کریم اپنی ایک مخصوص جامع اور اہم اصطلاح کے طور پر استعمال فرماتا ہے۔ چونکہ اللہ اور رسول کے دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لئے ہمارے ہاں عام طور پر اس سے مراد دو الگ الگ اطاعتیں قرار دی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے مراد قرآن کریم کی اطاعت اور رسول کی اطاعت سے حدیث کی اطاعت مراد لی جاتی ہے۔ اس طرح عملاً رسول کا ترجمہ حدیث قرار پاتا ہے اور چونکہ حدیث مختلف فرقوں کی مختلف ہیں اس لئے

اللہ اور رسول کی اطاعت بھی مختلف طریقوں سے ادا کی جانے لگی اور یہیں سے فرقہ بندی کا آغاز ہوتا ہے، جو آج تک قائم ہے لیکن قرآن کریم میں ذرا سا بھی غور و تفحص کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی اطاعت دو الگ الگ مطاعوں (جن کی اطاعت کی جائے) کے لئے استعمال نہیں کی، بلکہ اس سے مراد اسلامی حکومت کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے۔ حضورؐ چونکہ اسلامی حکومت کے سربراہ تھے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ ہو رہے تھے اس لئے ان کی اطاعت میں اللہ اور رسول دونوں کی ہی اطاعت شامل تھی۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد اسلامی نظام کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور یہ ایک اطاعت ہے اور اس کے لئے قرآن کریم سے متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن چونکہ اس مضمون کا موضوع یہ نہیں ہے، اس لئے چند آیات بطور ثبوت کے پیش کی جاتی ہے۔

(1) جنگ احد میں جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور حضورؐ بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپؐ نے صحابہ کرام کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ حضورؐ کے گرد اگرد پروانوں کی طرح جمع ہو گئے بظاہر یہ آواز حضورؐ کی تھی مگر چونکہ یہ حضورؐ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپؐ نے بہ حیثیت سربراہ مملکت اسلامیہ یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو اللہ اور رسول کی آواز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد گرامی ہےo اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيْمٌ o(3/172)o جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد اللہ اور رسول کا کہنا مانا ان میں سے جن لوگوں نے نیکی اور پرہیزگاری کی ان کے لئے بڑا ثواب ہےo

(2) اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فساد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔o إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (5/33)o جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے بھڑتے اور امر (حکم کو نہیں مانتے) اور فساد پھیلانے کی غرض سے ملکوں ملکوں دوڑتے پھرتے ہیں ان کی سزا ایسی ہے کہ یا تو مار ڈالے

جائیں یا انہیں سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پیر ہیر پھیر کر کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں اپنے وطن کی سرزمین سے شہر بدر کیا جائے۔ (ترجمہ جناب فرمان علی صاحب)

اس آیت کریمہ میں اللہ اور رسول سے مراد اسلامی نظام ہے اور اللہ اور رسول سے محاربہ کا مطلب اسلامی نظام سے محاربہ کرنا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کون لڑ سکتا ہے۔

(3) o إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (33/57) o بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔ اس آیت مجیدہ میں اگر اللہ تعالیٰ سے مراد ذات الٰہی اور رسول سے حضورؐ کی ذات مراد لے لی جائے تو بات بالکل مبہم ہو جاتی ہے۔ رسول کو اذیت دی جا سکتی ہے کہ وہ انسان تھے اور اردگرد کے لوگوں کی ان تک رسائی تھی کہ ہر طرح کی تکلیف ان کو دی جا سکتی تھی اور عملاً دی بھی گئی، لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ وہ انسان کی رسائی سے باہر ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دینے سے مراد نظامِ الٰہی کو نقصان دینا ہے۔ ایک آیت کریمہ اس بارے میں اتنی روشن اور بین ہے کہ اس بات کے ثبوت میں صحت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا o(4/100) اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرے گا پھر اس کو موت آ پکڑے، تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں o اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے، کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کئے جانے سے سوائے اسلامی حکومت (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا اور اللہ اور رسول کی اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

ماہ اگست 2003ء

4

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے (آخری حصہ)

اللہ و رسول کے دو الفاظ ہیں لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے (بوجہ اختصار جس کی صرف چار مثالیں پیش خدمت کی جا چکی ہیں) اس لئے اس کے لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر، بخوبی روشن کر دیا ہے کہ یہ دو اطاعتیں (قرآن و حدیث) نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایک اطاعت ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

o يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ o(9/62)o یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو ان کو راضی کر لیں o

یہاں اللہ اور رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ يُرْضُوهُ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ واحد ضمیر لا کر انہیں ایک شمار کرنے سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے۔ جو صرف ایک ہے اور دو نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ (9/74) انہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قائم کیا۔ اس نے انہیں غنی کر دیا۔ فَضْلِهِ میں ضمیر واحد لا کر دونوں الفاظ اللہ اور رسول کو بطور ایک اصطلاح استعمال کر کے ایک قرار دیا گیا ہے۔

جب تک یہ اطاعتیں ایک رہیں اور اسلام بطور دین کے قائم رہا اور قرآن کریم بطور ضابطہ حیات مسلمانوں میں نافذ رہا اور اس دین کی اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت شمار کی جاتی رہی، اس وقت تک مسلمانوں میں نہ کسی قسم کا تفرقہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ راہ پا سکا۔ مذہبی فرقہ کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ اس نظام کی اطاعت سب پر لازم تھی۔ جو اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے حکم جاری ہوا، اس کا اطلاق ایک ایک شہری پر لازم تھا، اور اس کی اطاعت سب پر فرض تھی۔ اور اس کی اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ لیکن جب نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی بد قسمتی سے دین کا نظام ختم ہوا اور ان اطاعتوں سے بجائے ایک اطاعت کے دو اطاعتیں شمار کی جانے لگیں تو مسلمانوں میں فرقہ بندی کی ابتداء ہوگئی۔ فرقے مذہب میں ہوتے ہیں دین میں تو فرقہ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس دن سے اللہ اور رسول کی اطاعت کا غلط مفہوم لینا شروع کیا گیا وہ ہی مسلمانوں کی ادبار کا پہلا سنگ میل تھا۔ سب سے پہلے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوئی اور مختلف حضرات اور مختلف گروہوں کے نزدیک اللہ اور رسول کی اطاعت کا مفہوم مختلف ہوگیا۔ اور اسی اختلاف کی کی وجہ سے فرقے بن گئے۔ اور امتداد زمانہ سے ان میں مزید استحکام پیدا ہوتا چلا گیا۔ چونکہ حکومت کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں رہی اور اللہ اور رسول کی اطاعت انفرادی قرار دی جانے لگی اس لئے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے مختلف فقہ بنے اور ہر فقہ کے متبعین دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو گمراہ سمجھنے لگے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفریق، فقہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک فقہ کے متبعین کا ایک فرقہ ہے اور دوسرے فقہ کے متبعین دوسرا فرقہ شمار ہوتے ہیں۔ اور فقہ کے اختلاف کی وجہ سے ہی آپس میں اس قدر بغض و عناد ہے۔

عقائد کا تعلق دنیا میں عملی زندگی پر براہ راست کم پڑتا ہے جو واقعات تاریخ اسلام میں گزر چکے ہیں، ان کو نہ تو کوئی مٹا سکتا ہے (Un-do) ہے اور نہ ہی ان کا کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری روز کی زندگی میں جس چیز کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے اور جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے وہ فقہ کا ہی اختلاف ہے۔ وہی ہماری عبادت پر حاوی ہے اور اسی کی بنیاد پر عدالتوں

میں فیصلے ہوتے ہیں اور انہیں کو عدالتوں میں نظائر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہماری فقہ جس کو ہم سب اس قدر اہمیت اور تقدس دیتے ہیں اس کی اصل صورت حال یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اس پر غور کرنے کے سلسلہ میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

اولاً جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہماری یہ تمام فقہیں بنو عباس کے دور میں مدون ہوئیں تھیں اور وہ دور بادشاہت، پیشوائیت، جاگیرداری، استحصال اور سرمایہ داری کا دور تھا۔ بادشاہت کی وجہ سے سخت استبدایت تھی، فکر کی آزادی بالکل مسلوب تھی۔ اقلیتوں، مزدوروں، کسانوں، غریبوں، اور بچوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا، خصوصاً عورتوں کے حقوق کا بالکل فقدان تھا۔ عورتوں کے متعلق زیادہ تر قوانین قرآن کریم کے بالکل خلاف بنائے گئے۔ وہ قرآن کریم جو انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا، اسی سے غلامی اور بردہ فروشی کے قوانین کی سند حاصل کی گئی۔ قرآن کریم نے جتنے ذرائع Exploitation of man by man بند کئے تھے، فقہ نے ان سب کو بالکل کھول دیا، قرآن کریم جتنی (Progressive) اور Revolutionary کتاب ہے، اتنا ہی اس کو فقہ کے قوانین میں جکڑ کے Retro-gressive بنا دیا۔

ثانیاً قابل غور یہ بات ہے کہ وہ دور بالکل ابتدائی اور سادہ دور تھا۔ آج کل کے مشکل اور پیچیدہ مسائل اس زمانہ میں درپیش نہیں تھے۔ آج کے پیچیدہ مسائل کا دس فیصد حصہ بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ موجودہ دور کے مسائل کا اُس زمانہ میں فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ثالثاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انسانی عقل اور انسانی معاشرے آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے جارہے ہیں، آج سے ایک ہزار سال پیشتر مغربی ممالک میں بھی جو قوانین بہت سخت خلاف عقل اور جامد تھے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے قوانین کی تشکیل میں عقل و بصیرت سے کام لیا اور آج ان کے قوانین اس ایک ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں آج سے ایک ہزار سال قبل انسانی عقل اور انسانی معاشرے اس قابل نہیں تھے کہ وہ ایسے عمدہ اور قابل عمل اور بصیرت پر مبنی قوانین بنا سکیں۔ کہ وہ آج ہمارا ساتھ دے سکیں۔ وحی الٰہی کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر

آئندہ آنے والے دور کا نہ صرف ساتھ دے سکے بلکہ ہر دور میں راہنمائی بھی کرے اور عقل انسانی سے آگے آگے رہے۔ لیکن انسانوں کے خودساختہ قوانین کی یہ صورت نہیں ہوتی عقل انسانی اپنے ماحول سے یقیناً متاثر ہوتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اپنے زمانے سے آگے نہیں جاسکتی۔ ہمارے فقہائے عظام کے بنائے ہوئے قوانین بھی اپنے مخصوص معاشروں سے متاثر ہوئے اور وہ اپنے دور کے لئے تو خود مکتفی تھے آج کے دور کا وہ ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

رابعاً یہ نکتہ پیش خدمت کرنا ضروری ہے کہ اسلامی حکومت اور مسلم حکومت میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ ہر مسلم حکومت اسلامی حکومت نہیں ہوتی۔ مثلاً آج ہمارے اس دور میں ترکی، مصر، مراکش اور انڈونیشیا وغیرہ کی حکومتیں مسلم حکومتیں ہیں کیونکہ وہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن یہ حکومتیں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوعباس کے دور کی حکومت بے شک مسلم حکومت تھی کیونکہ اس کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن وہ اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ بادشاہت پر مبنی نظام تھا اور بادشاہ کا حکم صحیح شارہ ہوتا تھا۔ وہ غیر اسلامی حکومت تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے نافذ کردہ قوانین اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ چونکہ یہ قوانین خود غیر اسلامی حکومت کے مدون کردہ تھے اس لئے وہ کسی طرح بھی اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے، لیکن ہم نے انہی قوانین کو اسلامی ٹھہرا کر اپنی فقہ قرار دیا ہوا ہے۔ فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی، اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ آج اگر پھر سے اسلامی نظام کہیں متمکن ہوجائے تو اس حکومت کے قوانین ہی فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت ہوں گے۔ ہم ان سابقہ غیر اسلامی حکومتوں کے قوانین کا اتباع کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ o اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (7/3) o جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ قرآن کریم نے اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ کے جملے مُوجبہ سے صرف قرآن کریم کے اتباع کا حکم فرمایا اور وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ کے سالبہ

جملہ سے قرآن کریم کے علاوہ ہر مذہب، فرقہ، فقہ، مشرب اور مسلک کے اتباع کی نفی فرما دی۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ قرآن کریم محض تبرکاً ہی رہ گیا ہے اور اتباع کے لئے مختلف فقہ اور اپنی اپنی منتخب شخصیتیں مقرر کی گئیں ہیں جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے اور جس کی پیش گوئی قرآن کریم نے آیہ نمبر (3/104) میں پہلے ہی کر دی ہے۔ کہ جو قوم مجابہ روش اختیار کرے گی اس کے لئے عذاب عظیم ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان صرف وحی الٰہی اور ہر اس حکومت کے جس میں بھی قوانین الٰہی جاری ہوں کے اتباع کرنے کے مکلف ہیں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی پابندی ان پر لازم نہیں ہے کیونکہ اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرے اور اس راستے کی اتباع کا جو قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔

ہمارے ہاں اتباع سنت پر بہت اصرار کیا جاتا ہے اور سنت کے مفہوم میں اتنی وسعت رکھی گئی ہے کہ حضورؐ کے ذاتی شخصی امور بھی سنت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حضورؐ ایک خاص خطہ زمیں اور ایک خاص دور میں تولد ہوئے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک کی معاشرت ہی اختیار فرمانی ضروری تھی۔ حضورؐ کے وہ معمولات جو حضورؐ کے خورد ونوش، نشست، و برخواست عام روش زندگی سے متعلق تھے۔ انہیں بھی سنت کی تعریف میں شامل کر کے ان کے اتباع پر اصرار کیا جاتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ حضورؐ کی اولیں سنت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ حضورؐ کی اولیں سنت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کریم کا اتباع کرتے تھے ٥ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ (10/109) ٥ اے رسول جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو، اسی راستے کے اتباع کو حضورؐ نے صراط مستقیم کا اتباع قرار دیا ہے۔ ٥ وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ (6/153) یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر میں گامزن ہوں تم سب بھی اسی کا اتباع کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کا اتباع ہی اتباع سنت رسول اللہ ہے اسے اور کسی جگہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور جو حضرات اتباع سنت پر اصرار کرتے ہیں، انہیں سب سے پہلے حضورؐ کی اسی سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے حضورؐ کو اول المسلمین قرار دیا ہے۔ حضورؐ نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلم ہی کہا ہے۔ اور اس میں تقدم

زمانی کے ساتھ ساتھ تقدم کیفی بھی شامل ہے یعنی حضورؐ نہ صرف سب سے پہلے مسلمان ہوئے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی حضورؐ اول المسلمین ہیں۔ ان کی مثل اور نظیر اور کوئی مسلمان نہیں۔ قرآن کریم کے واضح حکم کا اتباع کرتے ہوئے حضورؐ نے اپنے کو ہمیشہ مسلم ہی قرار دیا۔ اس لئے اس سنت سے اہم سنت اور ضروری اور کون سی ہو سکتی ہے؟ لیکن افسوس کہ جو حضرات اور تمام سنتوں جیسے مسواک کرنا، ایک خاص وضع کا لباس پہننا، بیٹھ کر پانی پینا وغیرہ جیسی معمولی سنتوں تک کی نگہداشت کرتے ہیں وہ اس سنت پر بالکل عمل نہیں کرتے۔

سابقہ صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے اور فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے بالکل نہیں رہتا۔ ان میں سے ہر شق کے بارے میں متعلقہ آیات ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں۔ مزید یہ تحریر کیا گیا ہے کہ حضورؐ کی سنت بھی یہ ہے کہ فرقہ بندی سے مجتنب رہا جائے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہا جائے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ دستور پاکستان میں ان دونوں باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور فرقہ واریت کو آئینی تحفظ دیا گیا ہے۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل (1)227 میں درج ہے۔

''تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو''

اس شق کے مطابق تمام قوانین کا ماخذ صرف قرآن وسنت کو قرار دیا گیا تھا اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف وضع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد صدارتی حکم نمبر 14 مجریہ 18 ستمبر 1980ء میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کر دی گئی۔ وضاحت: جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لاء (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی۔

دستور کی شق نمبر (1)227 کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا تحفظ مل گیا جس سے

عملاً دو دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ پہلی دشواری یہ ہوگی کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک مختلف قوانین وضع کئے جائیں گے۔ اس طرح ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق غیر اسلامی حکومت میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں تو وہاں پرسنل لاء اسلامی جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو تو وہاں پبلک اور پرسنل لاء کی تفریق مناسب نہیں۔ اسلامی حکومت میں قوانین حکومت کی طرف سے مدون اور جاری ہوتے ہیں، ان کا اطلاق سب مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کو مختلف فرقوں کے معیارات میں جانچنے کی پابندی ختم کر دی جائے۔ کیونکہ جب تک یہ پابندی ختم نہیں ہوگی نہ عدالت کچھ کر سکے گی اور نہ قرآن وسنت کو صحیح مقام حاصل ہوگا۔ لہٰذا ملک میں فرقہ بندی کو مزید تقویت ملنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قوانین کو وضع کرنے کے لئے عدالت کو صرف قرآن وسنت تک ہی پابند کیا جائے اور اس کے علاوہ ہر اس پابندی سے آزاد کیا جائے جس سے قانون سازی میں مزید دشواریاں بھی پیدا ہوں اور فرقہ بندی کو بھی مزید فروغ حاصل ہونے کا خدشہ ہو۔ نیز ہر مسلمان شہری کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ قرآن کریم کی اطاعت اور حضورؐ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہے اور اس کے علاوہ کسی اور نام سے اپنے آپ کو موسوم نہ کرے۔ اگر حکومت مناسب سمجھے اور عوام تعاون کریں تو حکومت اس کو قانون کی حیثیت سے نافذ کر دے اور اس کے عدم تعمیل کو جرم قرار دے۔

آج مسلمان جس مجبور و مقہور حالت میں ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرقہ بندی کی لعنت سے جان چھڑانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مسلمان غالب رہنے کے لئے آیا ہے مغلوب رہنے کے لئے نہیں۔ امت مسلمہ کو حکم ہے کہ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (16/123) تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ حضرت ابراہیم

کو امام للناس کہا گیا کہ وہ ساری انسانیت کے امام ہیں۔ ان کا مقام ساری انسانیت کے لئے رہبر اور قائد کا مقام ہے اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (2/125) تم مقام ابراہیم کو اپنے لئے مصلیٰ بنالو یعنی ان کے مقام کے بالکل پیچھے پیچھے چلو چونکہ ابراہیمؑ کا مقام نوع انسانی کی امامت تھی اس لئے تمہارا مقام بھی نوع انسانی کی امامت اور رہبری ہونی چاہئے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت کا نگران بنایا۔ o وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (2/143) o اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا جو عالمگیر حیثیت کی مالک ہے۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں تم سے برابر فاصلے پر ہوں تمہارے لئے عدل والنصاف کے زاویہ نگاہ سے تمام اقوام یکساں ہوں۔ تمہارا منصب یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال وکردار کے نگراں رہو اور خود تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا اس نظام کی مرکزی اتھارٹی اور حاکم اعلیٰ ہو۔ یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی، ان سب پر نگراں اور ان کا مرکز رسول اور رسول کے بعد ان کے جانشین ان کے اعمال کے نگراں۔ افسوس صد افسوس اور صد ہزار افسوس کا مقام ہے کہ قرآن کریم کے مطابق ملت اسلامیہ کا دنیا میں کیا مرتبہ اور فریضہ تھا۔ ایک وہ قرآن کریم کی بیان کردہ ملت اسلامیہ ہے اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہونے کے مدعی ہیں کہ دوسروں کے اعمال کے نگراں ہونا تو بڑی بات ہے ہم خود اقوام عالم میں سب سے زیادہ ذلیل و پست ہیں کیونکہ ہم نے آپس میں فرقہ بندی اور دشمنی اور عناد پیدا کیا ہوا ہے۔

جن قوموں کے پاس وحی الٰہی کی روشنی نہیں وہ کسی بھی قدر کے پابند نہیں۔ ان کی کوئی مستقل اقدار (Values) ہی نہیں جس قدر میں فائدہ دیکھا وہ اختیار کرلی۔ مگر ہم مسلمانوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے ہمارے پاس وحی ہونے کے سبب سے مستقل اقدار ہیں جن پر عمل کرنے کے ہم پابند ہیں اور وہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہے۔ ان اقدار پر عمل کرنا نہ صرف ہمارے لئے ضروری ہے بلکہ اس بات کی نگرانی کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے کہ عالم انسانیت میں

وہ اقدار (انسانی حقوق) نافذ و جاری ہوں قرآن کریم نے ان مستقل اقدار کے لئے ایک جامع اصطلاح معروف ومنکر کی استعمال کی ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام وقوانین سے لے کر قرآن کریم کی مستقل اقدار سب شامل ہو جاتی ہیں قرآن کریم کے مستقل اقدار میں سے ایک قدر تکریم انسانیت ہے۔ مسلمان قوم کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا میں اس بات کی نگرانی کرے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں تکریم انسانیت ہو رہی ہے یا نہیں۔ جان کی قدر و قیمت، محنت کا پورا پورا معاوضہ، عفت، عصمت، زمیں کا ساری انسانیت کے لئے برابر کا استحقاق ہر شخص کو اس سے برابر کا فائدہ اٹھانے کا موقع دینا، بنیادی ضروریات کا فراہم ہونا رزق، تعلیم مکان کا ہر شخص کے لئے مہیا ہونا۔ عدل وانصاف کا مفت اور آسان مہیا ہونا۔ اس قسم کے بے شمار معروف ہیں جن کا نفاذ اسلامی حکومت کرتی ہے اور دیگر اقوام کی نگرانی کرتی ہے کہ ان سب میں یہ معروف جاری ہوں۔ قرآن کریم کے مطابق امت مسلمہ کا یہ مقام ہے اور عملاً جو ہماری حالت ہے اس کے لئے حالم مپرس صورت ہبین کی مثال ثابت آتی ہے۔

ہم مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر غیر مسلم اقوام ہماری اس حالت سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ چاہتی ہیں کہ ہم مستقلاً اس حالت میں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے رہیں۔ ہم اس بات کا اندازہ ہی نہیں کرتے کہ غیر مسلم اقوام کو ہمارے سے کتنی عداوت ہے اور کتنی دشمنی ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی دشمنی کی ایک رمق جو ظاہر ہوئی ہے غیر مناسب نہیں ہوگا اگر اس کا مختصراً تذکرہ اس مضمون کے بالکل آخیر میں کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام کو اندازہ ہو کہ غیر مسلم اقوام کو ہم سے کس قدر دشمنی ہے۔

پروفیسر MR.SAMUEL.P.HUNTINGTON جو ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک معروف پروفیسر ہیں، ان کا ایک مضمون THE CLASH OF CIVILIZATION ایک مشہور رسالہ FOREIGN AFFAIRS کے SUMMER 1993 کے ISSUE میں طبع ہوا تھا اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔ ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں

دوسرے مضمون کا موضوع پرکشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہذیبوں کا ہوگا۔ ایک طرف مسلمان اور کنفوشش کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔ مضمون پُر مغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات و واقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے زیر نظر مضمون کو اس کی صحت و سقم سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ اس زیر تسوید مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو بات قارئین کرام کی خدمت عالیہ میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخر میں انہوں نے دیگر سات مشورے دینے کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دے ان مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

To Exploit Differences and Conflicts Among Confucius and Islamic States کنفوشش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں آپس کے اختلافات سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یعنی کنفوشش کے پیروکاروں میں جو باہمی اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہئے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں جو باہمی اختلافات، مناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہ وہ تجاویز ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔

مسلمانوں کی عزت و ذلت، اقبال، ادبار عروج و زوال ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ان کا دین قائم ہے تو یقیناً مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا۔ اگر انہوں نے اپنے دین سے اعراض کیا، اپنے خود ساختہ قوانین جاری کئے تو مسلمانوں کو کبھی عروج حاصل نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں

کے لئے عروج وتمکن حاصل کرنے اور فرقہ بندی کی لعنت کو دور کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان قرآن کریم کے نظام کو جاری کریں اور اسلام کو بحیثیت دین کے متمکن کریں۔ مسلمانوں کی قائم کردہ اسلامی حکومت قرآن کریم کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرے وہی ان کی فقہ اور وہی ان کی شریعت ہوگی۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین شریعت ہی اس دور کے لئے فقہ اور شریعت ہوتے ہیں۔ سابقہ فقہ اور شریعتوں کے بجائے، ان کا اتباع ہی ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ اس طرح فرقہ بندی وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔

آخر میں تمام مسلمان بھائیوں سے نہایت دل سوزی اور دردمندی سے درخواست ہے کہ خدارا اپنی حالت زار پر رحم کرو۔ اس سے زیادہ زوال وادبار شاید ہی کسی اور قوم کے نصیب میں لکھا ہو۔ کیوں اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کو آوازیں دے دے کر بلاتے ہوں۔ اپنی عورتوں، بچوں، آل اولاد کو پیش نظر رکھو۔ اُن پر رحم کھاؤ، آپس کی فرقہ بندی اور دشمنی ترک کریں، قرآن کریم کا اتباع کر کے دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرو۔

ماہ ستمبر 2003ء

خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے

قرآن کریم، فرقان حمید وہ حبل المتین اور عروۃ الوثقیٰ ہے جس کے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے پر امت مسلمہ کے عروج وزوال کا انحصار ہے۔ یہ وہ محور ہے جسے امت مسلمہ نے ڈیڑھ ہزار سال سے تھاما ہوا ہے۔ اور اس پر برابر غور وفکر وتدبر تفکر کرتی چلی آ رہی ہے۔ سینکڑوں تفاسیر مختلف طرز کی تحریر کی گئیں۔ ہر فرقہ کے علماء نے بے شمار تفاسیر تحریر کیں اور ہر فن کے ماہرین نے مختلف علوم کی روشنی میں تفاسیر تحریر کیں۔ لیکن اس سب کے باوجود امت کی بگڑی نہیں بنی اور یہ امت مسلمہ جس گرداب میں پھنسی چلی آ رہی تھی اسی میں گردش کر رہی ہے تفسیر طبری جو کہ قرآنی لٹریچر میں اولیں تفسیر ہے، اس سے لے کر موجودہ دور کی تفاسیر کا قرآن فہمی کا طریقہ اس ڈیڑھ ہزار سال میں ایک ہی رہا ہے۔ اور اس سے کسی مفسر نے سر مو انحراف نہیں کیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کرنے کا جب سلسلہ شروع ہوا تو اس سے پیشتر نہ تو اصول تفسیر ہی مرتب اور طے کیے گئے، نہ ان کی چنداں ضرورت محسوس کی گئی۔ اسی وجہ سے اصول طے کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اگرچہ اصلاً یہ بات نہایت ضروری تھی کہ تفسیر تحریر کرنے سے پیشتر اس کے اصول وقواعد خود قرآن کریم سے اخذ کرنے چاہئے تھے۔ تاہم بغیر اصول طے کیے تفاسیر تحریر کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔

ہمارے برصغیر ہندو پاک میں بھی بہت سی تفاسیر تحریر کی گئیں۔ نیز اصول تفسیر پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن پھر بھی کوئی واضح حل مسلمانوں کے سامنے نہیں آیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (1763-1703ء) سے لے کر سرسید احمد خان اور مولوی عبدالحق حقانی تک بے شمار تفاسیر تحریر کی گئیں لیکن

سب کا قرآن فہمی کا طریقہ ایک ہی تھا، تا آنکہ یہاں یعنی برصغیر ہند و پاک میں چند بیدار مغز علمائے اہل قرآن نے اس خامی کو محسوس کیا اور قرآن فہمی کے قرآنی اصول خود قرآن کریم سے مستنبط کیے، انہوں نے سابقہ مفسرین کا طریقہ یعنی شان نزول اور روایات کی بیان کردہ تفسیر کو ترک کر کے قرآن کریم کا تجویز کردہ طریقہ یعنی تصریف آیات اور محاورہ عرب کو اختیار کر کے چودہ سو سال بعد قرآن فہمی کا ایک نیا دور شروع کیا اور گذشتہ دور کی تفاسیر کو پر کاہ برابر اہمیت نہیں دی۔ اس طرح تفاسیر کے نئے شہ پارے وجود میں آنے شروع ہوئے۔ اس میں اولیت کا شرف مولوی محمد عبداللہ مرحوم چکڑالوی (1860ء ـ 1918ء) کو حاصل ہے۔ کہ انہوں نے سب سے پہلی تفسیر محاورہ عرب اور تصریف آیات کے مطابق تفسیر القرآن بآیات القرآن نام کی تحریر فرمائی، وہ دور سخت مخالفت کا دور تھا اور حالات ان کے سخت نامساعد تھے۔ انہیں تین مرتبہ زہر دیا گیا جس سے وہ مفلوج ہو گئے تھے۔ وہ جامع مسجد سریانوالہ بازار لاہور کے خطیب تھے۔ ان کے اپنے مالی حالات چونکہ قابل اطمینان نہیں تھے، اس لئے ان کے ایک رفیق خاص شیخ محمد چٹو سوداگر چرم لاہور نے ان کی مالی معاونت فرمائی اور یہ تفسیر بڑے سائز میں ایک ایک پارہ کر کے طبع ہوئی۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصر مولوی خواجہ احمد الدین امرتسری نے بھی اپنی تفسیر "بیان للناس" تحریر فرمائی۔ چونکہ علامہ اقبال مرحوم اور خواجہ صاحب موصوف کے دیرینہ تعلقات تھے، اس لئے علامہ بھی خواجہ صاحب سے استفادہ فرماتے تھے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ پی ایچ ڈی ہیڈ آف عربک ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی ان دونوں کے درمیان رسل و رسائل کا ذریعہ تھے۔ علامہ اقبال کے خطوط میں جہاں بھی صرف مولوی صاحب تحریر ہے وہاں ان کی مراد انہی خواجہ احمد الدین صاحب سے ہوتی ہے۔ مسئلہ عول میں علامہ کو بہت تردد تھا، خواجہ صاحب سے ہی علامہ نے اس معاملہ میں رجوع کیا تھا، جس کی تفصیل ان کے خطوط میں موجود ہے۔ ان کی تفسیر کی طباعت میں بھی علامہ نے ان کی بہت حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ ان کے علاوہ چکوال کے دو بھائی مولوی محمد فاضل اور مولوی محمد عالم اور ان کے ساتھی مولوی عبدالخالق صاحب نے بلاغ القرآن کا پرچہ گوجرانوالہ سے (1923 سے 1925)

تک جاری رکھا۔مولوی حشمت علی مرحوم نے اشاعت القرآن نام کا رسالہ جاری کیا اور مولوی محمد رمضان نے گوجرانوالہ میں وحی صرف قرآن کریم میں ہے کے موضوع پر تقاریر جاری رکھیں۔اور 1902ء میں چوک دالگراں گوجرانوالہ میں اس موضوع پر مناظرہ ہوا جس میں مولوی محمد رمضان نے علمائے اہل حدیث کو لاجواب کر دیا۔مولوی محمد رمضان مرحوم اور ان کے صاحب زادے میاں مولوی اسماعیل کی اس معاملہ میں عام شہرت تھی کہ وہ دونوں اس موضوع پر بڑے مختصر وقت میں مخالف کو لاجواب کر دیتے تھے۔مولوی محمد اسماعیل اور مولوی محمد علی رسول نگری نے پھر 1960ء سے دوبارہ رسالہ بلاغ القرآن جاری کیا، جواب تک جاری ہے۔

ان علمائے اہل قرآن نے نہ صرف تفاسیر تحریر کیں، بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں قرآن کریم سے متعلق مضامین تحریر کئے۔امرتسر سے ہی ایک ضخیم اور مبسوط رسالہ ''البیان'' جاری ہوا۔جس کے ایڈیٹر علامہ محمد حسین عرشی تھے جس میں بڑے پُرمغز مضامین شائع ہوتے تھے۔علامہ حکیم محمد حسین عرشی خواجہ عباد اللہ اختر، حکیم فیروز الدین طغرائی وغیرہ کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ان ہی علمائے اہل قرآن میں حافظ محمد اسلم جیراجپوری تھے جو جامع ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی میں تاریخ اسلام کے پروفیسر تھے انہوں نے مسئلہ محجوب الارث پر ایک مبسوط مضمون تحریر کیا، خود ہی اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور عالم اسلام میں اس مسئلہ کو متعارف کرایا، اسی عرصہ میں بہار بھارت میں حافظ محمد محب الحق نے دعوت الحق، منہاج الحق وغیرہ بلند پایہ کتب تحریر کیں۔غرض کہ اس دور میں برصغیر ہندو پاک میں علمائے قرآن کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے قرآن فہمی کا طریقہ بالکل تبدیل کر دیا اور قرآن کریم کی تعلیم اور اس کے نظریات قرآنِ خالص کی روشنی میں مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جس سے مسلمانوں کا ایک تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہوا اور ان نظریات کی اشاعت میں کوشاں ہوا۔جو طریقہ علمائے اہل قرآن نے قرآن فہمی کا اختیار کیا، اس سے خالص قرآنی نظریات خود بخود نکھر کر سامنے آنے لگے اور خارج از قرآن نظریات جو سابقہ تفاسیر میں بھرے ہوئے تھے چھٹتے چلے گئے۔

علمائے اہل قرآن کے قابل عزت گروہ کے علاوہ تحریک طلوع اسلام بھی علامہ اقبال کی

ایما پر شروع ہوئی۔ طلوع اسلام کا پہلا شمارہ اپریل 1938ء میں جاری ہوا اور محترم نذیر نیازی مرحوم اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن بہت ہی قلیل عرصہ کے بعد اس کے اشاعت کی ذمہ داری محترم المقام جناب غلام احمد پرویز نے اٹھائی۔ چونکہ وہ اس وقت سرکاری ملازمت کر رہے تھے، اس لئے وہ رسالہ کے ایڈیٹر کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مختلف حضرات کے نام بطور ایڈیٹر طبع ہوتے رہے۔ لیکن وہ ایک formality پوری کرنی ہوتی تھی۔ مولانا حسین امام صاحب، مولوی عبدالستار خان نیازی، محترم مظہر الدین صدیقی اور چند دیگر حضرات کے نام بطور ایڈیٹر سرورق پر طبع ہوتے رہے۔ ورنہ فی الواقعہ یہ پورا رسالہ عموماً پرویز صاحب خود ہی نکالتے تھے۔ مختلف فرضی نام مثلاً حق گو شاہد عادل رازی وغیرہ اس سلسلے میں اختیار کرتے رہے۔ اس تحریک کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ اور چند مخلص حضرات نے اس کی ذمہ داری برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ رسالہ چار سال جاری رہا مگر سخت نامساعد حالات کی وجوہ پر بند کر دیا گیا۔ لیکن وہ احباب اس کو دوبارہ جاری کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ بالآخر اس کا دوسرا دور جنوری 1948ء سے شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ محترم پرویز صاحب فروری 1985ء میں فوت ہوئے اس وقت تک وہ اس کو خود طبع کراتے رہے۔ اور مرحوم سراج الحق کا نام بطور ایڈیٹر طبع ہوتا رہا۔ یہ تحریک فرقہ اہل قرآن کی تحریک کی نسبت زیادہ ہمہ گیر زیادہ Rational اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تھی، اس تحریک نے زیادہ مسائل کا احاطہ کیا اور موجودہ دور کی مشکلات کا حل قرآن کریم سے پیش کیا چونکہ اس تحریک میں زیادہ کشش تھی اس لئے خود اہل قرآن حضرات کی نئی نسل اس میں شریک ہوگئی۔ چونکہ دونوں تحریکوں کے نظریات میں ہم آہنگی زیادہ اور اختلاف کم تھے، اس لئے قرآن کریم کے طلباء نے دونوں تحریکوں سے بھرپور استفادہ کیا اور قرآن کریم سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے میں دونوں تحریکوں سے فائدہ اٹھایا۔ ان حضرات کے آپس میں تعلقات اور مراسم بھی اچھے تھے۔ اس لئے ایک دوسرے کے درسوں میں شرکت کرتے تھے اور درس کے اوقات اس طرح مقرر کرتے تھے کہ آپس میں وقت کا ٹکراؤ نہ ہو اور سہولت سے دونوں درسوں میں شرکت کی جا سکے۔

البتہ صرف ایک مرتبہ ایک مضمون طلوع اسلام میں فرقہ اہل قرآن کے خلاف شائع ہوا تھا اور اس کی بھی یہ وجہ تھی کہ اہل قرآن حضرات نے اپنا لٹریچر طلوع اسلام کے درس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا، نیز دوسری وجہ یہ تھی کہ فرقہ اہل قرآن اپنے الصلوٰۃ کے موقف کی وجہ سے عام مسلمانوں میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ عام لوگ ان دونوں تحریکوں میں نمایاں فرق نہیں کرتے تھے۔ اس لئے تحریک طلوع اسلام پر بھی تین نمازوں کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا تھا اس سے تحریک کی بدنامی ہوتی تھی۔ اس لئے اس الزام سے بچنے کی خاطر مضمون شائع کیا گیا تھا۔ فرقہ اہل قرآن میں اس مضمون سے ناراضگی پیدا ہوئی، لیکن اس کا جواب لکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لیکن بعد میں علی پور چٹھہ (گوجرانوالہ) کے گروپ نے ماسٹر محمد علی مرحوم کو اس کا جواب تحریر کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے کبیدہ خاطری سے جواب تحریر کیا۔ اس تمہید اور پس منظر کے بعد اب اصل مضمون کی ابتداء کی جاتی ہے۔

ان دونوں تحریکوں میں زیادہ تر نظریات مشترک ہیں، اور کم نظریات مختلف فیہ ہیں۔ سب سے پہلا نظریہ اور عقیدہ جو ان دونوں تحریکوں میں مشترک ہے اور جو ان دونوں کی اساس اور بنیاد ہے۔ وہ وحی صرف قرآن کریم میں ہونے کا نظریہ ہے، خارج از قرآن وحی کے تصور کو باطل سمجھتے ہیں۔ ہم مسلمانوں میں صدر اول میں یقیناً یہی عقیدہ تھا۔ صدر اول کے بعد معتزلہ کے جملہ مذاہب اور امام ابوداؤد ظاہری کا ظاہری فرقہ اسی نظریہ کے قائل رہے۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر تمام مسلمان حدیث کو بھی وحی ماننے لگے۔ اس عقیدہ کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمانوں کی تباہی بربادی کا بنیادی سبب بنا۔ حدیث کو وحی الٰہی ماننے سے صدہا غیر قرآنی نظریات ہمارے یہاں در آئے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ خلاف قرآن عقیدہ ایک ہزار سال سے ہمارے ہاں متداول ہے اور آج بھی جملہ مسلمانوں میں صرف ان دو قابل قدر تحریکوں کو چھوڑ کر کسی جگہ بھی وحی صرف قرآن کریم میں ہے کا نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ آج کل ایران میں بھی جو اہل قرآن ہیں اور آیت اللہ صادقی کے پیرو ہیں وہ بھی اہل قرآن ہونے کے باوجود

حدیث کو وحی الٰہی شمار کرتے ہیں ۔ یہ شرف اور فضیلت صرف ان دو تحاریکوں کو حاصل ہے کہ یہ وحی صرف قرآن کریم میں تسلیم کرتے ہیں اور حدیث کو حضوؐر کے ذاتی اقوال اور ان کے غور و فکر، تدبر و تفحص کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ۔ جب تک مسلمان حدیث کو وحی شمار کرتے رہیں گے نہ قرآن خالص ان کے سامنے آئے گا اور نہ ہی ان کی تباہی و بربادی ان کا ساتھ چھوڑے گی ۔

دوسرا مشترکہ نظریہ ان دونوں کے مابین قرآن فہمی کے سلسلہ میں تصریف آیات کا ہے، ہم مسلمانوں میں چونکہ قرآن کریم سمجھنے کا یہ طریقہ مقرر ہے کہ آیت کا شان نزول دیکھتے ہیں اور پھر اس آیت کی تشریح اس شان نزول کی روشنی میں مختلف احادیث سے کرتے ہیں ۔ چونکہ شان نزول بھی اکثر آیات کے دو دو تین تین ہوتے ہیں اور احادیث بھی حتمی طور پر درست نہیں ہوتیں ۔ اس لئے قرآن فہمی میں ظن و تخمین سے کام لیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم ظن و تخمین سے مبرا اور پاک ہے ۔ لیکن اس کے سمجھنے میں شان نزول و احادیث سے کام لے کر اس کے مفہوم میں ظن و تخمین شامل کر دیا جاتا ہے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی آیت کا یقینی اور حتمی مفہوم سامنے نہیں آتا ۔ اور صدہا غیر قرآنی نظریات قرآنی تعلیم میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس تصریف آیات کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چونکہ ایک آیۃ دوسری آیۃ کی تشریح کرتی ہے اس لئے اس میں خارج از قرآن کوئی مفہوم داخل نہیں ہوسکتا ۔ اس طرح خالص قرآن کی تعلیم ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور قرآن کریم خود آپ سے بولنے لگتا ہے ۔ یہ دونوں قابل شرف تحریکیں اسی نظریہ کی حامل ہیں اور اسی نظریہ کے مطابق دونوں تحریکوں نے قرآن کریم کی تفاسیر تحریر کی ہیں جو خالص قرآنی تعلیم پر مشتمل ہیں اور اسی کی تعلیم سے جگمگ جگمگ کرتی ہیں ۔

ان دونوں تحریکوں میں تیسری قدر مشترک خصوصیت ان کی سنت کی تعریف ہے ۔ عام طور پر حضوؐر کے جملہ کاموں کو سنت خیال کیا جاتا ہے ۔ اور حضوؐر کے شب و روز کے ذاتی معمولات سنت نبوی تصور کئے جاتے ہیں ۔ لیکن ان دو تحاریک کے نزدیک حضوؐر کے صرف وہ افعال جو حضوؐر نے دین کی ترویج و توسیع میں سرانجام دیئے سنت ہیں اور حضوؐر کے باقی افعال وہ آپؐ کے ذاتی

معمولات تھے۔ان کا دین سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں تھا۔مثلاً اگر حضوؐر دائیں کروٹ لیٹ کر سوتے تھے ،تو صحابہ کرامؓ بھی اسی کروٹ لیٹ کر نہیں سوتے تھے ۔اگر حضوؐر کسی روز مثلاً شرینی تناول فرماتے تھے تو ضروری نہیں کہ سب صحابہ کرامؓ اسی روز شرینی تناول فرمائیں ۔یہ حضوؐر کا ذاتی فعل تھا۔ بھلا اس کو دین سے کیا واسطہ؟ اور اس کو سنت سے کیا علاقہ؟ اس کے برعکس حضوؐر کا یہ کہنا، کہ میں دین کی طرف دلائل کی رو سے بلاتا ہوں ۔یہ حضوؐر کی سنت تھی۔ ہمارے لئے یہ سنت ہے کہ ہم لوگوں کو دین کی طرف دلائل سے بلائیں ۔حضوؐر نے اپنی ذاتی زندگی کا بے داغ ہونا اپنے دین کی صداقت کے لئے پیش کیا۔ یہ ہے حضوؐر کی سنت کہ جو بھی داعی الی اللہ ہو اس کی زندگی بے داغ ہونی چاہئے ۔ حضوؐر نے اپنے ساتھیوں میں مواخات (بھائی چارے) کا جذبہ پیدا کیا، یہ حضوؐر کی سنت ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں ۔یہ ہمارے لئے سنتیں ہیں جس پر ہمیں عمل کرنا چاہئے ۔لیکن ڈاڑھی رکھنا ،مسواک کرنا، استنشاق ،مضمضہ، ایک خاص وضع کی ہیت کذائی بنانا، خاص وضع کا لباس پہننا، سنت نہیں ہے ۔یہ اس زمانہ کی تہذیب و معاشرت تھی ۔جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ۔اس معاشرت کو دین کا جزو بنانے سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ معاشرہ بالکل منجمد ہو جاتا ہے۔جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں مذہب کا مقصود نجات اخروی حاصل کرنا ہوتا ہے۔تمام مذاہب چند عالمگیر سچائیوں ،اخلاقی مواعظ اور کچھ عبادات پیش کر دیتے ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے آخرت میں فلاح حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ صرف قرآن کریم ہی ہے کہ جو مذہب کی سٹیج سے پورا ضابطہ حیات پیش کرتا ہے ۔اور اس دنیا کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔لیکن اس کے برعکس قرآن کریم ایک نظام پیش کرتا ہے، اس نظام کی معرفت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین جس کو حضوؐر نے اس دنیا میں عملاً نافذ فرمایا تھا، اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی ،حضوؐر کے عہد سعادت مہد میں آپ کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت اور اس نظام کی اطاعت کے مترادف تھی ۔آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی

اطاعت اس نظام کی اطاعت تھی۔ پھر حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ جب تک وہ نظام قائم رہا۔ ان حضرات کی اطاعت اس نظام کی اطاعت تھی۔ اس نظام کے ذریعہ انسان اور اللہ تعالیٰ کا رابطہ قائم تھا۔ جب وہ نظام بکھر گیا (جیسا کہ اس دور میں بھی ہے) تو نہ تو اللہ اور رسول کی اطاعت ہی ممکن رہی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم رہا۔ یہ وہ نظریہ ہے کہ طلوع اسلام اول دن سے اس نظریہ کا داعی رہا۔ جہاں تک اہل قرآن حضرات کا تعلق ہے شروع کے علماء کے ہاں یہ نظریہ نہیں پایا جاتا البتہ کچھ عرصے بعد علماء اہل قرآن نے بھی اس نظریئے کو اپنایا۔ اور وہ اس نظریہ کے قائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب بلاغ القرآن دوبارہ 1960ء میں جاری ہوا تو وہ شروع سے اس نظریہ کا داعی تھا۔

یہ وہ چار بنیادی نظریات ہیں جن میں یہ دونوں تحاریک مشترک اور دونوں کے نظریات میں ان چاروں نقاط میں باہم اتفاق ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں۔ اس کے علاوہ بیشتر فروعی مسائل ہیں، مثلاً محجوب الارث، قتل مرتد، رجم، ایصال ثواب، استمداد عن الموتٰی، انکار معجزات، ملکیت زمین، ربوٰ کی تعریف، تحویل کعبہ، قربانی، غلام، لونڈی، بردہ فروشی جیسے بہت سے مسائل میں یہ دونوں مدارس فکر جمہور مسلمانوں سے الگ ہیں۔ اور ایک دوسرے کے موید ہیں، کیونکہ ان دونوں نے مسائل کا استخراج براہ راست قرآن کریم سے کیا۔ ان نظریات کے سلسلہ میں دونوں اداروں نے بے شمار مضامین اور پمفلٹ تحریر کئے۔ قرآن کریم کی جن آیات کریمات سے یہ نظریات مستفاد ہوتے ہیں، ان آیات کی جگہ جگہ موقع بموقع خوب خوب وضاحت کی۔ ان مسائل کے لئے اتنا مواد فراہم کردیا کہ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرکے مسائل میں اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں کافی مواد طبع شدہ موجود ہے۔

ان مشترکہ نظریات سے قطع نظر ان دونوں تحریکوں میں اختلافات بھی موجود ہیں جو تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے کم ہیں۔ سب سے پہلا اور اہم اختلاف صلوٰۃ کے بارے میں ہے۔ طلوع اسلام کا نظریہ ہے کہ جس جس جگہ قرآن کریم میں صرف صلوٰۃ کا حکم آیا ہے اس سے مراد یہی اجتماعات صلوٰۃ ہیں۔ جو ہم قائم کرتے ہیں اور جس طرح سے عامۃ المسلمین پانچ وقت نماز ادا کرتے

ہیں، اسی طرح سے نماز ادا کرتے رہیں، نیا فرقہ بنانے سے اجتناب کریں۔اس سلسلہ میں اتنا اصرار قائم رہا کہ طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن کے دوران سب لوگ قریب کی مساجد میں جا کر نماز ادا کرتے رہے۔طلوع اسلام کے پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔کہ ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ الگ نماز وضع کر دی جائے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ طلوع اسلام کا یہ نظریہ بھی ہے جہاں جہاں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں، وہاں ان سے مراد اسلامی حکومت ہے۔جس کا قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔چنانچہ اس بارے میں سورۃ حج کی اکتالیسویں آیت (22/41) اتنی واضح ہے کہ اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں، اس آیت کریمہ میں غلبہ اور اقتدار کو صلوٰۃ کی بنیادی شرط قرار دیا ہے، کہ اگر اقتدار حاصل نہیں ہے تو صلوٰۃ قائم نہیں ہوسکتی۔علماء اہل قرآن صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ایک جگہ آنے سے اسلامی نظام کا مفہوم تو اسی طرح لیتے ہیں جیسا کہ طلوع اسلام سمجھتا ہے۔اس سلسلہ میں دونوں کے نظریات ایک ہیں۔جہاں صرف صلوٰۃ آیا ہے اس سے بھی طلوع اسلام کی طرح اجتماعات صلوٰۃ ہی مراد لیتے ہیں۔لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ قرآن کریم سے صرف تین اوقات کی نماز اخذ کرتے ہیں۔اور قرآن کریم سے ہی نماز کا طریقہ استخراج کرتے ہیں، ان کی نماز عام مسلمانوں سے منفرد ہے۔یہ صرف فجر ظہر اور مغرب کی نماز ادا کرتے ہیں۔ہر نماز میں دو رکعت پڑھتے ہیں۔ہر رکعت میں ایک سجدہ کرتے ہیں۔امام آگے کھڑا ہونے کے بجائے پہلی صف میں کھڑا ہوتا ہے۔اسی وجہ سے ان کی مساجد میں محراب نہیں ہوتی۔ان کی مساجد علی پور چٹھہ، فیصل آباد، گوجرانوالہ، اور چمن آباد لاہور میں موجود ہیں جن میں جمعہ ہوتا ہے۔زیادہ تر تعداد ان حضرات کی علی پور چٹھہ (گوجرانوالہ) میں ہے۔جہاں کی مسجدیں کشادہ ہیں اور وہاں ان کے سالانہ جلسے بھی ہوتے ہیں۔راقم سطور صرف پانچ سال ان کا امیر رہا اور اس دور میں سالانہ جلسے علی پور چٹھہ میں ہی ہوتے تھے۔

دوسرا اختلاف ان دونوں مکاتب فکر کا مقام حدیث پر ہے۔طلوع اسلام کا نظریہ ہے، کہ جو احادیث قرآن کریم کے خلاف ہیں ان کو رد کر دینا چاہیے۔اور جو قرآن کریم سے مطابقت

رکھتی ہیں ان کو قبول کر لینا چاہئے ۔ بہت عرصہ تک طلوع اسلام کے ٹائٹل پیج پر ایسی حدیثیں طبع ہوتی رہیں ۔طلوع اسلام کے سالانہ کنونشن پر بھی بڑے بڑے بینرز پر مختلف احادیث آویزاں ہوتی تھیں ۔جن میں سے ایک یہ بھی تھی ۔ **من استواء یو ماہ فھو مغبون** لیکن اس کے برعکس فرقہ اہل قرآن کے علماء احادیث کو چنداں اہمیت نہیں دیتے ۔ وہ ان احادیث کو ذخیرہ روایات کہتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہ الفاظ جو حضورؐ کے دہن مبارک سے صادر ہوئے وہ حدیث تھیں، لیکن جب ان کو کسی راوی نے روایت کر دیا، پھر وہ حدیث کے بجائے روایت کے زمرے میں آ گئے اور یہ روایت بھی بالمعنی ہوتی تھی ۔اس لئے یہ الفاظ حدیث نہیں رہے ۔ یہ کتب جنہیں ہم کتب حدیث کہتے ہیں کتب روایات ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں ۔

اسی طرح اہل قرآن حضرات انسان کے جسم کے ساتھ نفس، روح، وغیرہ کسی چیز کے قائل نہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ انسان کا جسم ہی اللہ تعالیٰ کا شاہکار عظیم ہے ۔اس کے ساتھ اور کوئی چیز نہیں ہے جو اس کو زندہ رکھ رہی ہے ۔ مشہور شاعر چکبست کا ایک شعر ہے ۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے؟ انہی اجزا ء کا پریشاں ہونا

رسالہ بلاغ القرآن نے اپنے ایک ایشو میں اس شعر پر بھرپور تبصرہ کیا، اور اس شعر کو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق قرار دیا ۔ان کے خیال کے مطابق مرنے کے بعد جسم انسانی سے ہی باز پرس ہوگی ۔ اسی کو سزا اور جزا کا مستحق قرار دیا جائے گا ۔اس سلسلہ میں مولوی محمد عبداللہ نے اپنی تفسیر میں بڑی طویل بحث کی ہے اور کافی مواد پیش کیا ہے ۔ نیز ایک مضمون روح کا تجزیہ بھی ادارہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ۔ جو مرحوم سرمد صاحب مشہور اہل قرآن عالم کا تصنیف کردہ تھا ۔جس میں اس موضوع پر قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے ۔ یہ مضمون غور سے مطالعہ کرنے کا متقاضی ہے ، کہ تمام عالم اسلام کے علی الرغم ان حضرات نے یہ نظریہ قرآن کریم سے مستنبط کیا ہے ۔ یہ موضوع اس کا متقاضی ہے کہ اس پر غور وخوض کیا جائے اور رسالہ صوت الحق اس موضوع پر علماء کو دعوت

دے۔

قرآن کریم ساری انسانیت کا ضابطہ حیات ہے اور چونکہ ہمیشہ کے لئے ہے اس لئے اس میں انسانی زندگی کی راہنمائی کے اصول مندرج کر دیے گئے ہیں۔ انسانی زندگی ارتقاء پذیر ہے، انسانی معاشرے برابر ترقی کر رہے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم جزئیات کا تعین خود نہیں فرماتا تاکہ ہر دور کے انسان اپنے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے ضروریات کے مطابق خود ہی جزئیات کا تعین کر لیں۔ چنانچہ طلوع اسلام کا یہی موقف ہے کہ قرآن کریم کے اصول ابدی و سرمدی ہیں۔ لیکن ان کی جزئیات اسلامی نظام اپنے وقت کے مطابق خود طے کر لے گا لیکن اس کے برخلاف فرقہ اہل قرآن کا مسلک یہ ہے کہ وہ اصول کے علاوہ جزئیات بھی قرآن کریم ہی سے طے کرتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی سے وہ ان میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح قرآن کریم کے اصول غیر متبدل ہیں، اسی طرح اس کی جزئیات بھی غیر متبدل ہیں۔

یہ وہ چند نظریات ہیں جن میں یہ دونوں مدرسہ فکر اختلاف کرتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان دونوں تحاریک کے بنیادی نظریات میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اہل قرآن حضرات نے اپنا مرکز نسبت روڈ گیتا بھون بلڈنگ لاہور میں دارالقراان کے نام سے قائم کیا۔ جہاں عرشی صاحب مرحوم اور حافظ سردار احمد صاحب رہتے تھے۔ جو نابینا تھے، جمعہ کا خطبہ حافظ صاحب مرحوم ہی پنجابی زبان میں دیا کرتے تھے، ان دنوں وہاں کافی مجمع ہوتا تھا۔ یہ ہال مولوی محمد ابراہیم ناگی سیٹلمینٹ کمشنر نے ان کو الاٹ کیا تھا۔ وہ امرتسر کے رہنے والے تھے اور خود بھی اہل قرآن تھے۔ یہ ہال اب بھی امت مسلمہ کے زیر تحویل ہے۔ اور اس کا بندوبست ڈاکٹر سخیہ کے ذمہ ہے۔ جو خواجہ احمد الدین کی پوتی اور ڈاکٹر سخاء اللہ مرحوم کی بیٹی ہیں۔ ڈاکٹر سخاء اللہ پشاور یونیورسٹی میں عربی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ جب تک محترم جناب پرویز صاحب لاہور منتقل نہیں ہوئے تھے، تو جب وہ لاہور تشریف لائے، ان کی تقریر اسی حال میں ہوتی تھی۔ جب وہ مستقل طور پر لاہور رہنے کے لئے آئے تو اسی ہال میں ان کو استقبالیہ دیا گیا تھا۔ اس میں کافی حضرات نے

شرکت کی تھی۔ ان میں جماعت اسلامی کے حضرات بھی تھے، اور نصر اللہ خان عزیز پرویز صاحب سے بغل گیر ہوئے۔

یہ وہ معلومات ہیں جو کمترین کی ذاتی ہیں۔ جنہیں کمترین نے تفصیل سے لکھنے سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ ان کا کسی جگہ ریکارڈ نہیں ہے۔ میں اٹھارہ سال کی عمر سے ان تحریکوں سے منسلک رہا، اب ستر سال سے میری عمر متجاوز ہے۔ یہ معلومات اس لئے تحریر کی گئیں ہیں کہ تا کہ محفوظ رہیں۔ کیونکہ آئندہ یہ معلومات کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکیں گیں۔

ماہ اکتوبر 2003ء

قرآن کریم کا نظریہ جہاد، اور
خلافِ قرآن نظریات کی نشان دہی

قرآن کریم کا اصرار ہے کہ کسی بھی ضابطہ حیات کو ہمیشہ پورے کا پورا یعنی مکمل طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں ہوسکتے اسی طرح ضابطہ الٰہی کو بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے کا انکار کیا جائے گا۔ جس طرح جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح جو قوم ضابطہ الٰہی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے اس کا نتیجہ بھی ذلت اور رسوائی ہوتی ہے۔ (2/85) قرآن کریم کے اس دعویٰ کی صداقت تو ہمارے حال سے عیاں ہے۔ ضابطہ حیات کی مثال گھڑی کی مانند ہوتی ہے، آپ اس کے پرزے الگ کر کے میز پر اپنے سامنے رکھ دیں وہ بالکل غیر مفید ہوں گے۔ جونہی آپ ان پرزوں کو مناسب ترتیب سے جوڑ کر گھڑی کی شکل میں منتقل کر دیں گے وہ اپنا نتیجہ بتا دینگے۔ اور گھڑی کی سوئیاں وقت بتانا شروع کر دیں گی۔ اسی لئے فرمایا۔

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْنَ آمَنُـوْا ادْخُـلُـوْا فِـيْ السِّـلْمِ كَـآفَّةً وَلَا تَتَّبِـعُـوْا خُطُوَاتِ الشَّيْـطَـانِ (2/208)۔ اسلامی نظام میں اجتماعی طور پر پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور اپنی شیطانی خواہشات کے پیچھے مت چلو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے بیشتر احکامات پر اسلامی نظام کے تحت ہی عمل ہوسکتا ہے۔ اور غیر اسلامی نظام میں ان پر انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ ربوٰ، صدقات، اجتہاد، تمام اسلامی تعزیرات، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد اسی قبیل سے ہیں۔ ربوٰ جس کا ترجمہ عام طور سے سود کیا جاتا ہے ربوٰ کا صحیح مفہوم و منطوق ادا نہیں کرتا اسی لئے ربوٰ

کے مسئلہ پر جس قدر بھی علماء نے غور وفکر و تحریر وتصنیف کیا، اسی قدر وہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ کیونکہ غیر قرآنی معاشرے جن میں معاشیات کا اپنا پورا نظام جاری ہوتا ہے، اس میں بغیر سود کے نظام چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ہاں البتہ پورے کا پورا معاشی نظام ہی قرآن کریم کے احکامات کے مطابق ہو تو معاشیات کا نظام بغیر ربو کے استوار کیا جاسکتا ہے۔ یہی صورت اجتہاد کی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اجتہاد صرف اسلامی حکومت کرسکتی ہے۔ فرداً فرداً اجتہاد کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت قرآن کریم کو سامنے رکھ کر غور وفکر کے بعد اجتہاد کرتی ہے۔

مثلاً آج کل مسئلہ کشمیر کے متعلق حکومت جو سابقہ پالیسی میں ترمیم کرے گی وہ اس کا اجتہاد ہوگا۔ اسی طرح حکومت غور وفکر کے بعد طے کرے گی کہ اسرائیل کو تسلیم کرے یا نہیں یہ اس کا اجتہاد ہوگا۔ ہمارے ہاں چونکہ حکومتیں اسلامی نہیں رہیں، اس لئے سابقہ حکومتوں کا اجتہاد اور ان کے فیصلے پر ہی ہم عمل درآمد کرتے ہیں۔ قاضی، مفتی، واجب، فرض، مکروہ، مکروہ تحریکی، یہ سب سابقہ حکومتوں کی اصطلاحیں ہیں جن پر ہم عمل کر رہے ہیں۔ اسلامی حکومتوں کے منقرض ہونے پر فرداً فرداً اجتہاد کیا گیا۔ لیکن سابقہ ادوار میں انفرادی اجتہاد سے نقصان یہ ہوا کہ ملت کا اتفاق جاتا رہا مختلف مکتبہ فکر پیدا ہوئے اور اس کے بعد فرقہ بندی شروع ہوگئی۔ انفرادی اجتہاد سے فرقہ بندی کی گرہیں خوب مضبوط ہوگئیں جو آج تک چلی آرہی ہیں۔ اور جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ اب جب بھی اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ خود اجتہاد کرے گی اور ہم سابقہ اجتہاد کردہ انفرادی احکامات کے پابند نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ہم فرقہ بندی سے بھی نجات حاصل کرلیں گے۔ اور سابقہ انفرادی اجتہاد کے احکامات جو نہایت تاریک ترین دور کے تراشیدہ ہیں۔ ان کے غلط نتائج سے بھی محفوظ رہیں گے۔ اسی قبیل میں جہاد آتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاد کے باقاعدہ قوانین واحکامات تفصیل سے مندرج ہیں (جن کی تفصیل آگے آتی ہے) جہاد صرف حکومت کرتی ہے اور قرآنی حکومت میں ہی یہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاد اس وقت تک جائز ہی نہیں جب تک مرکز، ملت (خلیفہ) کی طرف سے باقاعدہ حکم جہاد نہ دیا گیا

مسلمانوں کی تو زندگی کا مقصد ہی لوگوں کو نفع پہنچانا ہے۔حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ **خیر الناس من ینفع الناس** ۔بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے ۔مسلمان کا کیا کام کہ کسی کو نقصان پہنچائے۔

آج ساری دنیا میں مسلمان بطور تخریب کار مشہور ہو گئے ہیں ۔لیکن مسلمانوں کا یہ عمل بالکل قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔آج جبکہ ساری دنیا بمع امریکہ اپنے اپنے معاشروں اور اپنے معاشرتی اصولوں سے غیر مطمئن ہے ان کو اسلامی دعوت کی طرف مائل کرنے میں تشدد اور تخریب کاری سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔اسلام کے معاشرتی اصول اس قدر کامیاب، سادہ اور پر کشش ہیں کہ اگر وہ ان کے سامنے نہایت ملاطفت سے پیش کئے جائیں، تو ممکن نہیں کہ وہ اسے تسلیم نہ کریں۔نسلی عصبیت، بدکرداری، بدامنی، دھوکہ فریب، شراب، جوا، جھوٹ، یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں معاشرہ کا ہر شخص مذموم قرار دیتا ہے۔اس کے مقابلے میں اگر اسلام کی صحیح تعلیم نفع رسانی، رواداری، خوش اخلاقی، عصمت، عفت، شرم وحیا، ایثار وصداقت، شراب وجوا کی حرمت، عورتوں اور بزرگوں کا احترام، رشتہ داروں کی محبت کا اصول۔ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو وہ آسانی سے اسلام کے قریب آسکتے ہیں۔لیکن تبلیغ کے سلسلہ میں تشدد، وتخریب کاری مضر اثرات چھوڑتی ہے اور سخت رکاوٹ کا کام دیتی ہے۔

جہاد کے مقاصد: جہاد کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ اور تسلیم کیا جائے۔کوئی انسان دوسروں پر حکومت کرنے کا مجاز نہ ہو۔اور دنیا کے تمام انسان ایک ہی رب کے محکوم ہوں، اور مساویانہ طور پر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعماء سے فائدہ اٹھائیں۔یہ ہے جہاد کا اصل مقصد۔جہاد اس جہد وجہد کا نام ہے جو دنیا سے ظلم وتشدد اور انسانوں کا خود ساختہ معیار شرف کو مٹاتا ہے، اور مظلوم انسانوں کی کثیر تعداد کو حقوق انسانی مہیا کرتا ہے۔قرآن کریم نے مسلمانوں کو جہاد کی صرف پانچ حالات میں اجازت دی ہے۔

(1) قانون الٰہی کے قیام ونفاذ کے لئے۔

قرآن کریم چونکہ ایک نظام حیات پیش کرتا ہے اس لئے وہ اپنی ایک ایک مملکت اور اور حکومت کا داعی اور متقاضی ہے۔ ہر نظام حیات اس بات کا لازماً داعی ہوتا ہے کہ اس کو عملاً جاری و نافذ کے جائے۔ظاہر ہے کہ اس کے نفاذ میں غلبہ واقتدار اولیں شرط ہے۔قرآن کریم مسلمانوں کو امت وسطی قرار دیتا ہے تاکہ وہ انسانیت کے نگران رہیں۔اور خود رسول یا مرکز ملت امت مسلمہ کا نگراں رہے۔لیکن چونکہ غیر مسلموں کی یہ کوشش رہے گی کہ اللہ کے دین سے ہٹ کر غیر ادویان کی پرستش کی جائے اور الٰہی نظام حیات کے بجائے انسانی دستور زندگی کے تحت زندگی بسر کریں۔اس لئے اسلام اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے استقلال اور استحکام کے لئے ہر کاوٹ دور کرے اور سنگین مزاحمت کا استیصال کرے تاکہ اس کا نظام متمکن رہے۔o قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَo(9/29)

o اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ تو اللہ ہی پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ ہی سچے دین کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ ذلیل ہو کر ہاتھ سے جزیہ دیں o

اس آیہ کریمہ میں جزیہ کا لفظ آیا ہے جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک ہی مرتبہ آیا ہے۔اس کا لغوی معنی عہد یا کسی خدمت کا معاوضہ ہیں۔اصطلاحاً یہ وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے بدلے میں لیا جائے اور ان پر جنگ وغیرہ میں شریک ہونے کی ذمہ داری نہ ڈالی جائے۔چونکہ غیر مسلموں سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی، اس لئے اسے زکوٰۃ کے عوض بھی شمار کیا جاتا ہے۔ آیہ کریمہ میں حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَo(9/29) آیا ہے تاکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر تمہارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کرلیں۔ وَهُمْ صَاغِرُونَ اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کرلیں۔

لیکن چونکہ اب صورت حال بالکل مختلف ہے اور بہت سے اسلامی ممالک میں، نیز

پاکستان میں بھی غیر مسلم امن پسند شہریوں کی طرح رہ رہے ہیں اور اسلامی ممالک کے قدیم باشندے ہیں اور ان سے جنگ کے حالات کا کوئی سابقہ بھی نہیں پڑا ہے، اس لئے ان حالات میں جزیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور فی زمانہ اس پر عمل ساقط سمجھنا چاہیے۔

(2) اپنی مملکت کی حفاظت میں جوابی کاروائی۔

اس سلسلہ میں یہ بات پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ وہ آیات جو اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے قرآن کریم میں آئی ہیں، ان میں جہاں جہاں مشرکین و کفار اور منافقین کا ذکر آتا ہے اس سے اولاً مراد زمانہ نزول قرآن کے مخالفین تھے، جن کے ساتھ حضورؐ کو سابقہ پڑا تھا۔ ان آیات میں ہر زمانہ کے غیر مسلم مراد نہیں ہیں۔ ان آیات کریمات سے البتہ اصول مستنبط کئے جائیں گے۔ جن کے مطابق ہمارے زمانے کے نظام الٰہی کے مخالفین سے عندالضرورت جنگ کرنی پڑے تو اس سلسلہ میں یہ شرط ہے کہ ابتداء غیر مسلموں کی جانب سے ہو، اور مسلمان صرف جوابی کاروائی کریں۔

(1) ٥وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ٥(2/190)

٥اور جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا٥

(2) ٥أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ٥(22/39)

٥جن مسلمانوں سے کفار لڑا کرتے تھے چونکہ وہ بہت ستائے گئے اس وجہ سے انہیں بھی جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور اللہ تو ان لوگوں کی مدد پر قادر ہے٥۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔

(3) ٥إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ(5/33)

٥جو لوگ اللہ اور رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے، یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پیر مخالف سمت سے کاٹے

جائیں۔

ان تینوں آیات کریمات میں اسلامی مملکت کی حفاظت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اورصرف جوابی کاروائی کی اجازت دی گئی ہے۔ جب اسلامی پر حملہ کیا جائے تو اس کی مدافعت کرنے میں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔

(3) تیسرا موقع جہاں قرآن کریم جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مظلوم انسانوں کی حمایت ہے۔خواہ وہ کسی بھی ملک، مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں۔انسانوں کا یہ اہم اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد میں کوئی کمی نہ کریں۔ بلکہ مظلوم کی جس قدر مدد کرسکیں وہ ضرور کریں۔اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ظالم کو ظلم کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔o وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا o(4/75)o (مسلمانو) تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور ان کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے واسطے جہاد نہیں کرتے جو اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال باہر کیا، تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنا اور تو خود ہی اپنی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار بناo۔

(4) چوتھا موقع جہاں جہاد کی اجازت ہے وہ نقض عہد ہے۔یعنی مشرکین وکفار کی وہ جماعت جو معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرے۔اس سے جہاد کرنے کی اجازت ہے۔ چونکہ نقض عہد ایک بدترین جرم ہے اس لئے اس موقع پر جہاد کی اجازت اس وجہ سے دی گئی ہے تاکہ ایسی قوم کو قوت کے زور پر اطاعت کرنے پر مجبور کردیں تاکہ وہ آئندہ عہد شکنی نہ کریں۔o الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ o(8/56)o جن لوگوں سے تم نے عہد وپیمان کیا تھا پھر وہ لوگ اپنے عہد کو ہر بار توڑ ڈالتے ہیں اور پھر اللہ سے نہیں ڈرتے الی الآخرo۔

(5) پانچواں مقام جہاں قرآن حکیم جہاد کی اجازت دیتا ہے، غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کا

تحفظ ہے۔قرآن کریم کی رو سے دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2/256) جو شخص اپنی مرضی سے چاہے اسلام قبول کرلے اور جس کا دل چاہے دائرہ اسلام سے باہر چلا جائے، قرآن کریم کی رو سے ارتداد کوئی جرم نہیں ہے۔ ہر شخص کو اپنا مذہب (Choose) کر کے اختیار کرنے کا حق ہے۔ جس شخص کو بھی اسلام کی صداقت کا یقین نہیں رہتا، اس کے معنی ہیں کہ اس کا ایمان بھی باقی نہیں رہتا، اور جس کا ایمان باقی نہ رہے۔ اسے دائرہ اسلام سے باہر نکلنے کا ہر وقت اختیار ہے۔ وہ بغیر کسی خوف وملامت کے اسلام چھوڑ سکتا ہے۔ اور اس کے بعد اگر وہ اسلامی ملک میں رہنا چاہے تو دوسرے غیر مسلموں کی طرح رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی اور ملک میں جانا چاہے تو اسے جانے کا اختیار ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول کوئی سا بھی مذہب اختیار کرنے میں کامل آزادی عطا کرتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد آپ خود اندازہ فرمالیں، کہ کیا اسلام اس بات کا خواہاں یا متقاضی ہوگا کہ لوگوں کو مجبور کر کے مسلمان بنائیں؟ اور اس سلسلہ میں جنگ کی اجازت دے۔ یقیناً ہرگز نہیں۔ اسلام کلی طور پر مذہبی آزادی دیتا ہے۔ جس جگہ قرآن کریم نے غیر مسلموں کی مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ اس سے مراد ہی غیر مسلموں کی مذہبی آزادی سے ہے۔ کیونکہ پرستش گاہیں متعلقہ مذاہب کی علامات ہوتی ہیں۔ اگرچہ قرآن کریم ان مذاہب کو باطل قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی قوت کسی مذہب کو زبردستی مٹانا چاہے، تو مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس قوت کا مقابلہ کریں اور اس مذہب کی حفاظت کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ عزّ وجلّ ہے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (22/40) اور اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دور دفع نہ کرتا تو گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مجوسیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے کب کے ڈھا دیئے گئے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی حالت میں بھی جہاد وقتال کی اجازت نہ دی جاتی تو دنیا کے شریف اور نیک انسانوں کو زمین کے کسی گوشے میں بھی امن وچین

نصیب نہ ہوتا۔ اور نہ ہی مختلف مذاہب کے ماننے والے باقی رہتے۔

جہاد کے سلسلہ میں ایک اصولی ہدایت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے جس کی تاکید قرآن کریم بار بار فرماتا ہے۔ کہ اگرچہ مظلوم کی مدد کے لئے قوت کا استعمال کوئی جرم نہیں ہے، لیکن یہ استعمال اس قدر ہونا چاہیے جس قدر استعمال ظالم نے کیا ہے جرم کی سزا جرم کی مناسبت سے ہی دینی چاہیے۔ اور اس میں زیادتی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے o وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (42/40) o اور برائی کا بدلہ تو ویسے ہی برائی ہے۔ نیز فرمایا۔ o وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ o (42/41) o اور جس نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا تو اس پر کوئی باز پرس نہیں o۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔ o وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ (16/126) o اور اگر سختی کرو بھی تو ویسی ہی سختی کرو جیسی سختی ان لوگوں نے تم پر کی تھی۔

مندرجہ بالا سورۃ نحل کی آیہ کریمہ اس باب میں نہایت واضح اور قطعی ہے کہ جس نوعیت کا جرم اس کے مطابق اس کی سزا ہوگی۔ اسی اصول کا اطلاق جہاد میں ہوگا۔ قرآن کریم کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہ پانچ مقامات ہی ایسے معلوم ہوتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقام جہاد کا متقاضی نہیں ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور امراء سلاطین نے جہاد کے نام پر جو خوفناک لڑائیاں لڑی ہیں۔ یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ قرآن کریم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ ان مقامات کے علاوہ جہاں چند اور مقامات پر جہاد کا ذکر آیا ہے وہ آیات سب حضورؐ کے دور سے متعلق ہیں اور ان کے مطالعے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق ان مقامی حالات وواقعات سے تھا۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کہ جہاد کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کیا جائے، اگرچہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کا قانون غالب کرنے کی ہر کوشش آجاتی ہے۔ لیکن اس کا آخری مقام وہ ہوتا ہے کہ جہاں مسلمان قوم میدان جنگ میں باطل کی قوتوں کے سامنے نبرد آزما ہو جاتی ہے تاکہ جان کی بازی لگا کر اس معاشرہ کو قائم کیا جائے جس میں صرف

قانون الٰہی جاری ہو۔ جہاد کی اس آخری شکل کو قرآن کریم نے قتال فی سبیل اللہ کہا ہے۔ یعنی جہاد و قتال میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوتی ہے۔ اور قتال میں فی سبیل اللہ کی قید اور شرط لازمی ہے۔ اس لئے بادشاہ وسلاطین کی لڑائیاں جوان کی اپنے منفعت کی وجہ سے ہوئیں تھیں اور فی سبیل اللہ نہیں ہوتی تھیں، جہاد کی تعریف میں نہیں آتیں۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم: فی سبیل اللہ کے الفاظ قرآن کریم نے بطور اپنی ایک اصطلاح کے استعمال کئے ہیں۔ یہ متعدد مقامات پر آئے ہیں، اس کے مقابلہ میں فی سبیل طاغوت کے الفاظ آئے ہیں۔ مومنین فی سبیل اللہ قتال کرتے ہیں اور مشرکین و کفار و فی سبیل الطاغوت قتال کرتے ہیں۔ اس تقابل سے فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ طاغوت کے معنی سرکشی اور وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو اپنے تابع چلائیں، اس لئے فی سبیل اللہ کے معنی قوانین الٰہی کی اطاعت ہیں۔ ہر وہ کوشش جو دین کے قیام و نظام الٰہی کے استقلال و استحکام کے لئے کی جائے وہ فی سبیل اللہ کی تعریف میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ اصل مقصود و غایت تو اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اور جہاد ہو یا قتال سب اسی جدوجہد کی مختلف شکلیں ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم پر عمل کرنے کے نتائج صرف اسلامی نظام میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔

قتال کے سلسلہ میں قرآن کریم نے دو مختلف مقامات پر المقتول فی سبیل اللہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح جہاد کو قتال کے معنی میں بھی استعمال کر لیتے ہیں، اسی طرح شہید کا لفظ بھی مقتول فی سبیل اللہ کے بدلے استعمال کر لیتے ہیں۔ جو قرآنی محاورہ کے اعتبار سے غلط استعمال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے o وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ o (2/154) o اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ نہ کہنا، بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں مگر تم کچھ بھی شعور نہیں رکھتے o۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ o وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ o (3/169) o اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے

وہ روزی پاتے ہیں o۔

مندرجہ بالا دونوں مقامات میں مقتول فی سبیل اللہ کو زندہ شمار کیا گیا ہے، جو اُن تصادمات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ انہیں مردہ نہیں کہنا چاہیے۔ وہ دائمی زندگی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم جس طرح انسان کی طبعی زندگی اور موت کا احساس اپنے حواس کے ذریعے کر لیتے ہیں۔ یعنی دیکھ سکتے ہیں کہ فلاں شخص زندہ ہے یا مردہ، راہ اللہ میں جان دینے والوں کی زندگی کا ادراک اس طرح نہیں کر سکتے۔ ان کی وہ زندگی ہمارے محسوسات کی گرفت سے باہر ہے۔ البتہ وہ رب کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں رزق بھی عطا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے لئے عِنْدَ رَبِّهِمْ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ البتہ ان کا ہماری دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے۔

جہاد کے احکامات میں ایک پہلو مالِ غنیمت کا بھی ہے۔ قبل اسلام عربوں میں دستور تھا کہ جنگ کے دوران جو شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو مقتول کے تمام مال و متاع کا مالک ہو جاتا تھا۔ ان کے جنگ کا محرک ہی مالِ غنیمت ہوا کرتا تھا۔ لیکن چونکہ اسلام کے آنے کے بعد جنگ کا زاویہ نگاہ ہی بدل گیا اور اس کا محرک مالِ غنیمت نہیں رہا۔ اس لئے قرآن کریم نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے لئے بھی پورا نظام مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ انفال میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ o وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (8/41) o اور جان لو کہ جو کچھ تم لو اس میں سے پانچواں حصہ مخصوص اللہ اور رسول اور قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے۔

لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ کے الفاظ میں غنیمت کے مال کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے مختص ہے۔ جس سے مراد اسلامی حکومت کا مرکز ہے۔ باقی چار حصص رشتہ داروں، یتیموں اور مساکین و مسافروں کے لئے ہیں چونکہ حصص ہی کل پانچ ہیں۔ جو ایک حصہ قرآن کریم نے مقرر فرمایا ہے وہ ۱/۵ پر مشتمل ہے اسی لئے عقل کا تقاضہ ہے کہ باقی چار حصص بھی برابر کے ہوں گے۔

یعنی ہر حصہ ۵/۱ پر مشتمل ہوگا، ہمارے لئے رشتہ داروں والا حصہ سادات کو دے دیا جاتا ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں اس کا کوئی قرینہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ آیہ کریمہ سے پیشتر 41 آیات میں و مابعد بھی جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ چلا آ رہا ہے۔ اس لئے یہاں قوی قرینہ یہ ہے کہ رشتہ داروں سے مراد مجاہدین کے رشتہ دار ہیں۔ جو اپنے کنبے کے ایک فرد سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات وہی فرد روزی کمانے والا ہوتا تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے مجاہدین کے رشتہ داروں کے لئے خصوصی رقم مختص کی ہے۔ تاکہ مجاہدین یہ خیال نہ کریں کہ ان کے کام آ جانے کے بعد ان کے بیوی بچوں کی کفالت کیسے ہوگی۔ عقلاً بھی یہاں سادات کی کوئی توجیہ نہیں بنتی۔ جان کی بازی کوئی لگائے اور مال غنیمت مفت میں سادات لیں یہ کونسا انصاف ہے۔ لیکن ہمارے ہاں لاکھوں روپے خمس کے نام سے سادات کرام کو ملتے ہیں۔ مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ احکامات صرف مال غنیمت کے لئے ہیں لیکن ہمارے ہاں اس آیہ کریمہ کے سہارے جو خمس سادات کے لئے الگ مخصوص کیا جاتا ہے وہ عام آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔ جس کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ موجودہ خمس کا نظام جو لاکھوں روپوؤں پر مشتمل ہوتا ہے سب قرآن کریم کے احکامات کے خلاف ہے۔

جہاد کے متعلق آخری عنوان اقلیت کا ہے۔ جو بہت اہم اور حساس ہے، قرآن کریم نے خود اقلیت کے حقوق مقرر نہیں فرمائے۔ البتہ ایک تو ان کے معابد اور پرستش گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے ان کے مذہب کے ساتھ رواداری فرض قرار دی ہے۔ ہر غیر مسلم کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ قرآن کریم میں جو حکم جزیہ کے متعلق آیا ہے۔ اس کے سلسلہ میں صدر مضمون میں تحریر کر دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق آج کل کی اقلیت سے نہیں بنتا۔ کیونکہ یہ اقلیت جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آئی۔ بلکہ یہاں کی ہی آبادی پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ملک کی اقلیت کے ساتھ بہت محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح زیور تعلیم سے آراستہ کرائیں۔ اور ہر ممکن سہولت انہیں دیں۔ تاکہ ان کو بھی ملک سے محبت ہو۔ البتہ قرآن کریم کی رو سے کوئی غیر مسلم مملکت کا صدر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اس آئیڈیالوجی پر

ایمان نہیں رکھتے۔ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں اور صرف مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے۔ کسی بھی کمیونسٹ ملک کا صدر غیر کمیونسٹ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی کمیونسٹ امریکہ کا صدر بن سکتا ہے۔ موجودہ ملکہ برطانیہ الزبتھ دوئم کے شوہر پرنس فلپ آبائی طور پر گریک چرچ کے ماننے والے تھے۔ لیکن جب ان کی شادی ملکہ موصوفہ سے ہونا قرار پائی تو وہ شادی سے پیشتر Anglican Church سے وابستہ ہوئے، تب ان کی شادی ہوئی۔ حالانکہ دونوں Church عیسائی مذہب کے ماننے والے ہیں۔ برطانیہ کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ انگلش چرچ سے وابستہ ہو۔ بغیر اس کے وہ بادشاہ نہیں بن سکتا۔

جہاد کے متعلق احکامات آپ نے ملاحظہ فرمائے وہ پانچ مقامات تھے جہاں قرآن کریم نے جہاد کی اجازت دی ہے۔ ایک بار پھر خالی ذہن ہو کر بلا تعب مطالعہ کریں اور انصاف سے فرمائیں کہ ان میں سے کوئی ایک مقام ایسا ہے جس پر کوئی بھی قوم عمل کرے تو وہ انسانیت کے معیار کی خلاف ہو۔ ان میں سے کسی اجازت میں بھی Terror کی گنجائش نہیں، نہ ہی کسی شق میں انسانیت کے خلاف کوئی اقدام ہے۔ بلکہ پانچوں مقامات وہ ہیں جن سے مجموعی طور پر پوری انسانیت کی فوز و فلاح پیش نگاہ ہے۔

لیکن افسوس کہ ہم مسلمانوں نے جہاد کے لفظ کو اس قدر غلط اور موقع بے موقع استعمال کیا ہے کہ یہ لفظ غیر مسلموں کے لئے تنفر کا باعث بن گیا۔ ہم نے خود جہادی گروپ اور جہادی تنظیمیں بنا بنا کر جہاد کے نظریہ کو بدنام کیا اور جہاں بس چلا اس کی آڑ میں قتل و غارت اور جدال و قتال پر اتر آئے۔ اس سے ساری دنیا میں مسلمان من حیث الکل بدنام ہوئے اور ہر کوئی یہ سمجھنے لگا کہ مسلمان Terrorist ہیں اگر یہ بدنامی مسلمانوں کی اپنی وجہ سے ہوتی تو بھی باعث ملامت تھی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ غیر مسلم دنیا یہ سمجھتی ہے کہ مسلمانوں کا سارا یہ Terror ان کے اپنے مذہب اسلام اور اس کے خاص نظریہ جہاد کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ اس میں اصل قصور ہمارا ہے کہ ہم نے خود یہ اعلان کیا کہ ہم جہاد کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے رہے کہ اس سے ہم مسلمانوں کی حالت بہتر ہو جائے گی

اور قرآن کریم نے جو وعدے ہماری برتری کے کئے ہیں ہم اس طرح وہ جہاد سے حاصل کر لیں گے۔ لیکن یہ ہماری غلطی تھی اور یہ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

موجودہ دور میں کسی بھی قوم کو برتری اور مرفہ الحالی حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے تعلیم اور وہ بھی Technology کی تعلیم عام کرنی ہوگی، قرآن کریم نے تسخیر کائنات پر اور اس کے ماحصل کو انسانیت کی خدمت کے لئے استعمال کرنے پر جس قدر اصرار کیا ہے وہ قرآن کریم کے ہر طالب علم پر عیاں ہے۔ اس کے علاوہ قوت کا فراہم کرنا نہایت ضروری ہے o وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ (8/60) o اور مسلمانوں ان کفار کے واسطے جہاں تک تم سے ہو سکے طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے ہر قسم کی قوت حاصل کرو۔ آیت کریمہ میں قوت کا لفظ نکرہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں ہر طرح کی قوت آ جاتی ہے۔ جس میں اسلحہ اور فوجی ساز و سامان کے علاوہ، معاشی سیاسی بین الاقوامی سب قوتیں آ جاتی ہیں۔ تا کہ ان کے ذریعہ اپنا رعب اپنے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر طاری کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں آپس میں اتحاد اور اتفاق لازمی ہے۔ جو مذہبی، سیاسی، مملکتی ہر طرح کے اتحاد پر محیط ہو، کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا کہ اگر آپس میں جھگڑا کرو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ o وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (8/46) o اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

ہماری قرآنی قدریں کسی بھی بہترین معاشرہ قائم کرنے کے لئے بہترین قدریں ہیں ۔ اگر ان کو صحیح طور پر نشر کیا جائے تو ممکن نہیں کہ لوگ ان کی صداقت، افادیت اور ضرورت سے انکار کریں۔ وحی میں اپنی خوداتی قوت اور کشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ صرف اس کا ابلاغ درست طور پر، حکمت اور دلائل پر مبنی، مخلصانہ اور رواداری سے مملو ہونا چاہیے۔ اس دور میں جب کہ تمام دنیا کے معاشرے بے چین ہیں اور تمام عالم ایک باطنی اضطراب میں مبتلاء ہے قرآن کریم کی

امن وسلامتی پرمبنی تعلیم کی تبلیغ آسان ہے۔قرآن کریم کی کوئی قدر ایسی نہیں کہ اس دور کا ساتھ نہ دے سکے۔ ہر طرح کی فکری اور مذہبی آزادی، مساوات، اخوت،عورتوں کی مردوں پر برتری ،دولت سے دولت کما کرغریب کا خون چوسنے کی ممانعت،اور معاوضہ صرف محنت کا اصول قائم کرنا، زمین کی ملکیت حرام قرار دینا،نسلی امتیاز کا استیصال،تکریم انسانیت ساری انسانیت کوایک امت واحدہ قرار دینا۔غرض ان میں سے کونسی قدر ہے جو بہترین معاشرہ قائم کرنے میں مدومعاون نہیں ہوتی۔قرآن کریم کا تو موضوع ہی بہترین معاشرہ کا قیام ہے۔قرآن کریم کی تعلیم کو بہتر طور پر پھیلایا جائے اور اس پر خود بھی عمل کیا جائے اور دہشت گردی سے پرہیز کیا جائے۔انسانیت کی خدمت کواہمیت دی جائے۔

یہی ہے عبادت یہی دین وایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اور آخری اور بنیادی بات یہ ہے کہ جہاں بھی بس چلے قرآن کریم کا نظام قائم کر دیا جائے کہ قرآن کریم کے نظام کے عروج وزوال سے ہی مسلمانوں کا عروج وزوال وابستہ ہے۔
وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَo(10/10)

ماہ نومبر2003ء

استمداد عن غیر اللہ

قرآن کریم، فرقان حمید وہ واحد ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں، جس سے انسان کا اور اللہ تعالیٰ کا تعلق قائم ہو سکے۔ جس وقت بھی قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے، انسان مخاطبہ الٰہی سے مشرف اور مکالمہ الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا واحد ذریعہ قرآن کریم کے قائم کردہ نظام کی اطاعت ہی ہوتی ہے۔ اگر قرآن کریم کا نظام قائم ہے تو اس کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حق ادا ہو رہا ہے۔ لیکن اگر وہ نظام قائم نہیں ہے تو نہ صرف انسانیت اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے محروم ہے بلکہ انسانوں کا اللہ تعالیٰ سے تعلق بھی قائم نہیں رہتا۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے انسان کی حکومت انسان پر قطعی حرام ہے اور یہ تکریم انسانیت کے منافی ہے، کہ کوئی انسان دوسرے انسان پر حکومت کرے، چونکہ ہر انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس نظام کے ذریعے ہوتا ہے، اس لئے اسی ممانعت کے زمرہ میں پیشوائیت، ملوکیت اور انسان پرستی بھی آجاتی ہے۔ انسان کی طبیعت اور جبلت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ فوق عادت چیزوں کو پسند کرتا ہے اور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اسے تقرب الٰہی کا وسیلہ بناتا ہے۔ جب کہ قرآن کریم قطعاً اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص کسی ہستی کو بھی اس تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔ نوع انسانی میں انبیائے کرام سے بڑھ کر اور کسی کا مرتبہ اور درجہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ان کو بھی نوع انسانی کے افراد ہی قرار دیا ہے۔ اور مافوق البشریت کا کوئی درجہ عنایت نہیں فرمایا، البتہ جب قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے بزرگوں کو الوہیت تک کے درجہ پر پہنچا دیتی ہیں۔ ہم مسلمانوں میں قبر پرستی اور پیر پرستی اسی زوال کی سبب رواج پذیر ہوئیں اور چونکہ قرآنی

نظام کا تصور ذہنوں میں باقی نہیں تھا، اس لئے انہیں ہی تقرب الٰہی اور تعلق باللہ کا ذریعہ قرار دیا جانے لگا۔ حالانکہ یہ قرآن کریم کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ تعلق باللہ کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اطاعت ہے۔

تمام انبیائے کرام کی مجموعی تعلیم یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبد تھے اور ہمارے جیسے بشر تھے۔ لیکن ہر نبی کی قوم نے اس بات پر اصرار کیا کہ نبی کو عام انسانوں جیسا نہیں ہونا چاہیے اس سلسلہ میں قرآن کریم نے قوم عاد، قوم لوط، اور دیگر اقوام کے اقوال و اعتراض بیان فرمائے ہیں، جس میں انہوں نے انبیاء کرام کے مافوق البشر ہونے پر اصرار کیا، لیکن قرآن کریم نے ہر قوم کے مطالبہ کی تردید فرمائی۔ اور تمام انبیائے کرام کو نوع انسانی کے افراد قرار دیا۔ آخر میں حضور علیہ السلام کے مخاطبین نے بھی یہی مطالبہ کیا کہ حضورؐ کو بھی مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہونا چاہیے تھا لیکن قرآن کریم نے حضورؐ کے سلسلہ میں بھی وہی موقف اختیار کیا کہ حضورؐ ہمارے جیسے بشر تھے۔ اس بات کے باوجود کہ حضورؐ انسانیت کی معراج کبریٰ پر فائز تھے اور انسانیت کے گل سرسبد تھے، مختلف مقامات پر متعدد آیات کریمات میں ان کی بشریت کو نکھار کے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ o قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (18/110) اس آیت کریمہ نے حضورؐ کو عام بشری حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد عالی ہے۔ فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ (24/54) تو اس کے ذمہ ہے جو بوجھ اس پر رکھا اور تمہارے ذمہ ہے جو بوجھ تم پر رکھا (موضح القرآن) اس کے علاوہ سورۃ احقاف میں ارشاد ہے۔ o قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ (46/9) o تو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں آیا، اور مجھ کو معلوم نہیں کیا ہونا ہے مجھ سے اور نہ تم سے (موضح القرآن)

اس آیت کریمہ میں واضح فرما دیا کہ ان سے کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں۔ رسالت کی طرح میں نے نہیں ڈالی۔ نہ ہی میں تم سے کوئی عجیب بات کہہ رہا ہوں۔ سلسلہ رسالت شروع سے چلا آ رہا ہے اور ہر قوم میں اللہ تعالیٰ کے رسول آ چکے ہیں۔ میں بھی ان ہی جیسا ایک رسول ہوں اور وہی پیغام لایا

ہوں جو گزشتہ انبیائے کرام لاتے رہے ہیں۔ مجھے اس کا یقین تو ہے کہ جو نظام حق وصداقت میں پیش کر رہا ہوں وہ باطل پر ضرور غالب آکر رہے گا، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تصادم اور ٹکراؤ میں جو میرے اور تمہارے درمیان ہو رہا ہے میرا ذاتی انجام کیا ہوگا اور تمہارے ساتھ کیا بیتے گی۔ نہ ہی مجھے اس سے کوئی سروکار ہے، حضورؐ ہی کے بارے میں دو مختلف مقامات پر یہ یکساں الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔o قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ o(10/15-6/15)o تو کہہ میں ڈرتا ہوں اگر حکم نہ مانوں اپنے رب کا ایک بڑے دن کے عذاب سےo یعنی اگر میں اپنے نشوونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں تو اس کا قانون مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں نیز (11/113)

قرآن کریم نے حضورؐ کی بشریت کے سلسلہ میں جو ارشادات فرمائے ہیں، ان میں سے چند بیان کر دیئے گئے ہیں ورنہ اس موضوع پر بے شمار آیات پیش کی جاسکتی تھیں طوالت کے خوف سے مزید آیات نقل نہیں کی جاتیں، البتہ ایک آیت کریمہ جو تمام انبیائے کرام کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ وہ نقل کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ انبیائے کرام عام انسانوں کی طرح ماتحت پرستش ومحاسبہ تھے، اور عام لوگوں کی طرح ہی جواب دہی اور باز پرس کے پابند ہوں گے، ارشاد ہوتا ہےo فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِينَ o(7/6)o سو ہم کو پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے تھے اور ہم کو پوچھنا ہے رسولوں سے بھیo (موضح القرآن)

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ ان سے اسی طرح سے باز پرس ہوگی جس طرح سے عام انسانوں سے ہوگی۔ سورہ شوریٰ میں وحی کرنے کے مختلف طریقے بیان فرمانے کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہےo وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (42/51) یہاں وحی کے مختلف طریقے بیان فرمانے کے سلسلہ میں بشر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ جن انبیائے کرام پر وحی نازل ہوتی تھی، وہ سب بشر ہوتے تھے

اور حدودِ بشریت سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔

مندرجہ بالا آیات کریمات سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضورؐ سمیت جملہ انبیاء کرام ہم جیسے بشر تھے انسانیت کے جس قدر حوائج وضروریات ہوتی ہیں وہ سب ان میں موجود تھیں (25/20) ان کا خود اقرار ہوتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں اور بشر ہیں۔ عام انسانوں سے ان کا خصوصی امتیاز یہ ہوتا تھا کہ ان پر وحی نازل ہوتی تھی اور چونکہ وہ وحی الٰہی کے متبع ہوتے تھے، اس لئے وہ انسانیت کی معراج کبریٰ پر فائز ہوتے تھے۔ قرآن کریم کے مطابق صرف یہ دو امتیازی خصوصیات انبیائے کرام کی ہوتی تھیں ان دو امتیازی خصوصیات کے علاوہ عام انسانوں جیسے بشر ہوتے تھے۔

یہ تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں جو حضرات قبر پرستی اور پیر پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں ان پر اولاً یہ واضح کر دیا جائے کہ جب انبیائے کرام کی قرآن کریم کے مطابق یہ پوزیشن ہے کہ وہ کسی مافوق الفطرت قوتوں کے مالک نہیں ہوتے تھے تو دیگراں راچہ رسد۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو فتح وکامیابی ہو رہی تھی اور غلبہ حاصل ہو رہا تھا کہ عین اس وقت مسلمانوں کے تیر اندازوں کے ایک دستے سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی جس کی وجہ سے فتح مبدل بہ شکست ہوگئی۔ حضورؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ فتح شکست میں بدل گئی۔ اس تمہید کے بعد پیر پرستی اور قبر پرستی کا جائزہ قرآن کریم کی تعلیم کے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔

یوں تو قرآن کریم پورے کا پورا ہدایت عظیم اور وحی الٰہی ہے اور اس کی ہر آیت گوہر تابندہ ہے، لیکن بعض آیات ایسی ہیں کہ اگر قرآن کریم کی پوری تعلیم سامنے نہ بھی ہوں تو وہ صرف ایک ہی آیت قرآن کریم کو وحی ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مضمون کی طوالت کی وجہ سے ان آیات کو نقل نہیں کیا جاتا اور اس مضمون کا موضوع بھی اعجاز القرآن نہیں ہے۔ اس لئے صرف ان آیات کے حوالہ جات تحریر کئے جاتے ہیں جو حضرات قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے اور اعجاز القرآن کے سلسلہ میں ثبوت کے خواہاں ہوں وہ خود ان حوالہ جات کے مطابق قرآن کریم کے کسی

نسخے سے یہ آیات تلاش کر کے ان کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ انہیں قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہر آیت مبارکہ سے حاصل ہوگا۔ ان میں سے چند آیات کے حوالہ جات یہ ہیں۔
(42/29-41/53-41/30-13/17-13/11-8/53-6/38)

ان ہی بے مثل و بے نظیر آیات میں سے سورہ زمر کی یہ آیت کریمہ ہے o اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (39/42) o اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے پھر جن پر موت کا حکم ہو جاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے، اور دوسروں کو ایک مقرر وقت تک واپس بھیج دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ نفس کو اس حالت و کیفیت کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو نیند اور موت میں یکساں ہے، موت کے وقت اس کو روک دیا جاتا ہے، لیکن جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اس کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ نیند کے دوران سب کچھ باقی رہتا ہے صرف شعور باقی نہیں رہتا۔

نفسیات کے موجودہ ماہرین کے مطابق اس میں تحت الشعور تک باقی رہتا ہے۔ صرف شعور نہیں رہتا اس لئے یہاں اس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد انسانی شعور ہے جو نیند اور موت دونوں حالتوں میں باقی نہیں رہتا۔ جب آدمی بیدار ہو جاتا ہے تو اس کا شعور واپس آ جاتا ہے لیکن مرنے والے کا شعور واپس نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ اس کو روک لیتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق جب انسانوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی o (20/55) اور تم کو ہم (قیامت میں) دوسری مرتبہ اسی زمین سے نکالیں گے o نیز فرمایا۔ o ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ تُبْعَثُوْنَ o (23/16) o پھر بے شک تم (مرنے کے بعد) قیامت کے دن زندہ کئے جاؤ گے o اس دن پھر شعور واپس کر دیا جائے گا۔ ہماری اس زندگی میں ہمارا شعور جسم کے ذریعے کام کرتا ہے لیکن بعثت ثانیہ کے بعد یہ شعور بغیر جسم کے کام کرے گا۔ یہ کس طرح ہوگا ہم اس دنیا میں اس کو نہیں سمجھ

سکتے۔ نہ ہی قرآن کریم نے یہ سمجھایا ہے کیونکہ ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ مرنے کے بعد سے لے کر بعثت ثانیہ تک شعور معطل رہتا ہے اور بعثت ثانیہ کے وقت ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی مرے تھے اور موت کا مزہ منہ میں ہوگا۔ کیونکہ ورودِ موت اور بعثت ثانیہ کا یہ طویل عرصہ بغیر کسی احساس وشعور کے ایک لمحہ کے طور پر گزر جائے گا اور بعثت ثانیہ کے وقت ہر شخص یہ سمجھے گا کہ بس ابھی چند منٹ پہلے فوت ہوئے تھے کیونکہ اتنے عرصہ شعور معطل جو رہا تھا۔ البتہ بعثت ثانیہ کے بعد لوگ آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننے لگیں گے اور ایک دوسرے کو Recognize کریں گے۔ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ (10/45) اور ایک دوسرے کے خلاف جو کام ایک دوسرے سے چھپا کر کئے ہوں گے، سب ظاہر ہو جائیں گے۔

آیت زیرِ نظر کی وضاحت سے مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ مرنے کے بعد سے بعثت تک کے پورے طویل عرصہ میں مرنے والے کا شعور معطل ہوتا ہے۔ اور وہ نہ تو کسی کی سن سکتا ہے اور نہ ہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے نفس پر کوئی اثرات مرتب ہوتے ہیں جب اس کا شعور ہی معطل ہے تو وہ کس طرح کسی کی بات سن سکتا ہے، اور کس طرح کسی کے کام آ سکتا ہے، اس لئے مُردوں کو پکارنا، ان کو ثواب پہنچانا، ان سے مدد طلب کرنا سب امور اس آیت کریمہ کی روشنی میں بالکل بے کار عبث ہیں۔ قبروں پر جانا، عرس منانا، فاتحہ پڑھنا، اور آخر میں مدد طلب کرنا، بالکل خلاف قرآن عقیدے ہیں۔ یہ جتنے بڑے بڑے مزار، جو عقیدت کے مراکز ہیں، خواہ وہ برصغیر ہندو پاک میں ہوں، یا ایران وعراق میں ہوں، ان کی تعمیر تزئین سب قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قبر پرستی، مزار پرستی، کے عقیدہ کی تردید کے سلسلہ میں قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ حُجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے اور صرف ایک اسی آیت سے جملہ عقائد کا بطلان ہو جاتا ہے۔

سورہ زمر کی زیرِ نظر آیت کریمہ کی تائید میں سورہ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے o وَاتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَا يَخْلُقُونَ شَيْئاً وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتاً وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُوراً o(25/3)o اور لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود

بنا رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود دوسرے کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور وہ خود اپنے لئے بھی نہ نقصان پر قابو رکھتے ہیں نہ نفع پر اور نہ موت پر ہی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زندگی پر اور نہ مرنے کے بعد" جی اٹھنے پر"o اسی مضمون کو دوسری جگہ فرمایا۔o أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ o وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ o(7/191.192)o کیا وہ لوگ خدا کا شریک ایسوں کو بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکے بلکہ وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں اور نہ ہی ان کی مدد کی قوت رکھتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں o ان دونوں آیات کریمات کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ خود اپنی ہی جیسی مخلوق سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں اور وہ بھی وہ کہ خود کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتے۔ وہ اپنی ذات کے لئے بھی نفع ونقصان پر قادر نہیں، تو دوسروں کی کیا مدد کریں گے۔ پھر اسی تسلسل میں ارشاد ہوتا ہے۔o إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ o(7/194)o بے شک وہ لوگ جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں بھلا تم انہیں پکار کے تو دیکھو تو اگر تم سچے ہو تو وہ تمہاری کچھ سن لیں o۔

یہ چند آیات کریمات محض تائیداً پیش کی گئی ہیں۔ اس مضمون کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سب کا نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ اس مسئلہ کی اساس محکم تو قرآن کریم کی سورہ زمر کی سابقہ مندرجہ آیت نے ہی بیان کر دی جس سے قبر پرستی کے عقیدہ کی ساری عمارت ایک ہی آیت میں منہدم ہو جاتی ہے اور اس نظریہ کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے مرنے والوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ o(23/100) اور ان کے پیچھے ایک روک ہے یوم بعثت تک o لہٰذا یہ جو ہم مُردوں سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور ان سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں یہ سب ہمارے اپنے پیدا کردہ اعتقادات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی قرآن کریم سے کوئی واسطہ۔ قرآن کریم کے مطابق تو قبر کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ اس میں اس لئے دفن کیا جاتا

ہے کہ مرنے والے کی بے حرمتی نہ ہو اور فضا میں تعفن نہ ہو۔ نہ ہی قبر میں کسی عذاب وفشار کا سوال پیدا ہوتا ہے کیونکہ جس جسم کو دفن کیا جاتا ہے اس میں شعور ہی نہیں ہوتا۔ جب قبر کی کوئی حقیقت نہیں یہ صرف مردے کو ٹھکانے لگانے (Dispose of) کا ایک طریقہ ہے۔ تو قبر پرستی کی اہمیت کیسے ہوسکتی ہے۔ جہاں تک نماز میت کا تعلق ہے اس سے مردہ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے مرنے والے کے لواحقین ورشتہ داروں کے غم کو تسکین وسکون دینا مطلوب ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص نہایت متقی پرہیزگار ہے اور کسی وجہ سے اس کی نماز جنازہ ادا نہیں کی جاسکی، تو اس کی بخشش ومغفرت میں نماز کا ادا نہ ہونا کسی طرح مانع نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی کے اعمال صالح کم ہیں تو اس کے لئے ہزاروں نمازیں بھی ادا کی جائیں، وہ اس کی مغفرت کا باعث نہیں بن سکتیں۔ مغفرت اور بخشش صرف مرنے والے کے اعمال کراتے ہیں۔ پیر پرستی کے عقیدہ میں اولیاء اللہ کے تصور کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لئے اس مضمون میں اس تصور کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

اولیاء ولی کی جمع ہے۔ قرآن کریم میں **ولی** اور **عدو** دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک لفظ کی وضاحت سے دوسرے لفظ کی وضاحت از خود ہو جاتی ہے۔ سورۃ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے یَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ عَدُوِّى وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ (60/1) اے ایمان والوں، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ یہاں عَدُوٌّ اور أَوْلِيَاء ایک دوسرے کی ضد استعمال ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو دوست نہ بنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ٥ وَأَعِدُّوا۟ لَهُم مَّا ٱسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ ٱلْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (8/60) ٥ اور مسلمانوں ان کفار کے مقابلہ کے لئے جہاں تک ہوسکے قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے مہیا کرو تاکہ تم اس قوت کے ذریعے اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈرا سکو۔ ان دونوں آیات کریمات میں اللہ تعالیٰ کے دشمن وہ ہیں جو قانون خداوندی کی مخالفت کریں، اور قرآنی نظام کو قائم کرنے میں مانع آئیں۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے ولی اللہ وہ ہے جو قوانین الٰہی کو جاری کرنے میں مددگار ہو اور قرآنی نظام حکومت قائم کرنے میں حد درجہ

کوشش کرے۔دوسری جگہ ولی اللہ کی تعریف Definition خود قرآن کریم نے بیان فرمادی۔o
اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ oالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ o(10/62.63)o آگاہ ہوجاؤ کہ اس میں شک نہیں کہ دوستان اللہ پر نہ خوف ہوگا نہ حزن o یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیاo۔یہاں قرآن کریم نے بیان فرمایا کہ ہر وہ شخص جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرے وہ ولی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کا دوست ہے۔ قرآن کریم میں ولی کی یہ تعریف اس قدر مختصر اور جامع ہے کہ اس سے انکار کی کسی کو مجال نہیں ہوسکتی۔قرآن کریم کی رو سے اولیاءاللہ کا کوئی خاص الگ گروہ نہیں ہوتا۔تمام مومنین اولیاء یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔یہ جو ہم میں خاص خاص انسانوں کو اولیاء سمجھا جاتا ہے،اور ان کی خصوصیت مافوق الفطرت کرامات کا ظہور قرار دی جاتی ہے تو یہ تصور بالکل خلاف قرآن ہے۔

ہر مسلمان اپنی آخرت اور دنیاوی زندگی کو اچھا بنانا چاہتا ہے۔اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ نظریات اختیار کرے جن کی قرآن کریم نے ممانعت نہ کی ہو۔اور جن کی قرآن کریم نے اجازت دے رکھی ہو، جو حضرات پیروں فقیروں پر بھروسہ کرتے ہیں وہ خود بھی کوئی کام قرآن کریم کے خلاف نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ خود اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کررہے ہیں اور وہ اپنی دانست میں قرآن کریم کے مطابق امور سرانجام دے رہے ہوتے ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ قرآن کریم سے ان نظریات کا جواز مل جائے اس سلسلہ میں وسیلہ کا نظریہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے کوئی وسیلہ حاصل کرنا ضروری چیز ہے اس کے لئے انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت مبارکہ کو اس کی اساس قرار دیا ہوا ہے۔فلہٰذا ضروری ہے کہ اس آیۃ مبارکہ کا درست مفہوم پیش خدمت کیا جائے امتداد زمانہ اور مرور ایام کی وجہ سے الفاظ اپنے معنی بدل لیتے ہیں اور بعض الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے کی وجہ سے بھی اپنا بنیادی Original معانی ترک کردیتے ہیں۔اس قسم کے الفاظ قرآن کریم میں بے شمار ہیں جن کے معنی عربی میں کچھ ہیں اور

ہم نے اردو میں اس کے معنی مختلف کر دیئے ہیں۔ان الفاظ کی فہرست بہت طویل ہے۔اسی لئے قرآن فہمی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی اختیار کئے جائیں جو نزول قرآن کریم کے وقت ان کے بنیادی Original معنی تھے۔ان الفاظ میں ایک لفظ وسیلہ کا بھی ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں صرف دو جگہ (5/35-17/57) استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ مرتبہ، منزلت، رتبہ، مقام کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ایک مقام پر سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا کہ تم جن لوگوں کو اللہ کے علاوہ پکارتے ہوان کو پکار کر دیکھو، وہ تمہاری کوئی تکلیف دور نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں اور جنہیں یہ اللہ کا مقرب سمجھتے ہیں۔ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ (17/57) وہ خود اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام و منزلت تلاش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے اور وہ مقام و منزلت تلاش کرنے والے اللہ کی رحمت کے متلاشی اور اس کے عذاب سے خائف ہوتے ہیں۔اس آیت کریمہ کے الفاظ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ نے وسیلہ کی خود وضاحت کر دی کہ وسیلہ کے معنی قرب الٰہی کے ہیں۔

دوسرے مقام پر یہ لفظ سورۃ مائدہ میں استعمال ہوا ہے جہاں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔o يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ o(5/35) یہاں بھی لفظ وسیلہ قرب و منزلت کے معانی میں استعمال ہوا ہے کہ اے ایمان والوں تقویٰ اختیار کرو، وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ اور جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ میں آمدہ درمیانی واؤ تفسیری ہے اور وسیلہ کے معنی قرب ہے اور اس کا طریقہ جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ یعنی اللہ کا قرب اس کے قوانین کے مطابق مسلسل اور انتھک کوشش کرتے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والوں تم قوانین الٰہی کی نگہداشت کرو اللہ تعالیٰ کے ہاں درجہ، مرتبہ، قرب طلب کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستہ میں پوری پوری جدوجہد کرتے رہو۔اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و منزلت اور قرب حاصل ہوگا۔اسی چیز کی تائید (96/19) میں فرمائی کہ وَاسْجُدْ

وَاقْتَرِبْ o(96/19) کہ سجدہ کر، یعنی قوانین الٰہی کی اطاعت کرتے جاؤ، اسی سے قربِ خداوندی حاصل ہو جائے گا۔

بہرحال یہ عقیدہ قرآن کریم کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہے، قرآن کریم کی رو سے انسان اور اللہ تعالیٰ کا براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔ یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کے قوانین اور اس کے نظام کی اطاعت کرتا ہے۔ تو اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ تعلق حاکم ومحکوم اور عبد ومعبود کا ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی درمیانی واسطہ ذریعہ یا وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں فرمادیا کہ اے رسول جب میرے بندے تجھ سے میری بابت سوال کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں اور ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ o(2/186) انہیں چاہیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تاکہ انہیں رشد وہدایت مل جائےo بات بالکل واضح ہے جو شخص قوانین الٰہی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اطاعت کرتا ہے اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے دوسرے لوگ ''مرشد'' تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مرشد نہیں (18/17) اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب سے مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن کریم اوجھل ومستور ہوا اور اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کی جگہ انسانوں کے نظام نے لے لی تو اسلام کا صحیح تصور ان کی نگاہوں سے غائب ہو گیا اور انہوں نے اس قسم کے غیر قرآنی تصورات وعقائد دوسروں سے مستعار لے کر انہیں جزو اسلام بلکہ عین اسلام بنالیا۔

زیرِ نظر عنوان کے تحت ذہن کا مسئلہ شفاعت کی طرف منعطف ہونا بھی لازمی ہے، کیونکہ ہم مسلمانوں میں شفاعت کا مسئلہ بھی نہ صرف اہمیت کا حامل ہے بلکہ بطور ایک قطعی وحتمی عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک مقام پر شفاعت کو افتراء محض کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ

عَنۡہُم مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ○ (7/53) کیا آج کوئی شفاعتوں میں سے کوئی ہمارا شفیع ہے۔ جو ہماری شفاعت کرے یا ہم دنیا میں لوٹائے جائیں تاکہ ہم ان برے اعمال کے خلاف جو ہم کرتے تھے (اچھے) عمل کریں۔ بیشک انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور وہ بہتان جو وہ باندھتے تھے کہ قیامت کو ہماری شفاعت ہو جائے گی۔ ان سے گم ہو جائے گا○۔ اس آیت کریمہ میں شفاعت کے عقیدہ کو افتراء و بہتان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے قُل لِّلَّـهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا۔ اے رسول آپ فرمائیں کہ شفاعت ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ (2/254) اس دن سودا بازی، دوستی اور شفاعت میں سے کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اس موضوع پر قرآن کریم میں متعدد آیات کریمات موجود ہیں لیکن چونکہ کسی نہ کسی طرح شفاعت کے عقیدے کا جواز تلاش کرنا تھا اس لئے ایک آیت اس قسم کی ہاتھ لگ ہی گئی کہ جس کے غلط مفہوم سے اس عقیدہ کی سند مل گئی کیونکہ وہ مفہوم طبیعت کے لئے زیادہ دل پسند تھا اس لئے اس آیت کریمہ کو سر آنکھوں پر رکھا اور باقی آیات سے جن سے شفاعت کی تردید ہوتی تھی بالکل آنکھیں بند کر لیں جس آیت کریمہ سے شفاعت کی سند حاصل کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مَن ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ (2/255) اور اس کا حسب مراد غلط مفہوم کیا جاتا ہے کہ کون ہے جو اللہ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے بس صرف اور صرف یہ ایک آیت کریمہ ہے جس سے شفاعت کی سند حاصل کی جاتی ہے، حالانکہ تصریف آیات کے مطابق یہاں اِلَّا بِاِذۡنِہٖ کے معنی ہیں کہ اس کے قانون کے خلاف کون شفاعت کر سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اِذۡن بمعنی قانون کے استعمال کیا ہے۔○ وَالۡبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخۡرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذۡنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیۡ خَبُثَ لَا یَخۡرُجُ اِلَّا نَکِدًا (7/58)○ اور صحت مند زمین کی پیداوار اپنے رب کے قانون (اِذۡن) کے مطابق اچھی اور جو ناقص زمین ہے نہیں پیدا ہوتی اس سے پیداوار مگر ناقص ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں اِذۡن کے معنی قانون کے ہیں اسی طرح (2/255) میں بھی اِلَّا بِاِذۡنِہٖ کا مفہوم بھی اِذۡن بمعنی قانون کے مطابق یہ ہے کہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کر سکے۔ اور اللہ تعالیٰ کو

شفاعت کی عدم ضرورت ، کی خبر ہمیں اگلے الفاظ میں اس طرح دی گئی ہے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ (2/255) وہ اللہ تعالیٰ خود جانتا ہے کہ جو کچھ مجرموں کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے مکمل حالات وہ خود جانتا ہے، اسے کسی شفاعتی کی کیا ضرورت ہے۔ حتمی اور قطعی بات یہ ہے کہ اس کے ہاں شفاعت صرف اس کے قانون کے مطابق ہو سکتی ہے جو شخص اعمال حسنہ کرے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اس کی شفاعت خود بخود قانون خداوندی کے مطابق ہو جائے گی ۔ اور جس شخص کے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا اس کی شفاعت اس کے صالح اعمال کی کمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق نہیں ہوگی ۔ سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوگا۔

قرآن کریم نے کائنات کو تخلیق کرنے کی وجہ ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ کائنات اس لئے عالم وجود میں لائی گئی ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے دیا جائے ۔o وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ o (45/22) اللہ نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا (یونہی بے کار پیدا نہیں کیا بلکہ مقصد اس سے یہ ہے) کہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ اسے دے دیا جائے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو o ۔ دوسری جگہ اسی مفہوم کی تاکید مزید کے لئے فرمایا o اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ (40/17) o اور ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ان آیات کریمات سے واضح ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق کی اساس ہی مکافات عمل پر مبنی ہے، قرآن کریم تو مکافات عمل کو اسقدر اہمیت دیتا ہے اور ہم مسلمان اس کے بالکل برخلاف شفاعت کے عقیدہ کو قطعی گردانتے ہیں ۔ واضح صاف بین اور محکم آیات شفاعت کی سخت تردید کرتی ہیں لیکن چونکہ ہمیں یہ عقیدہ پسند ہے، اور ہمیں نیک اعمال کرنے سے مستغنی کر دیتا ہے ۔ اس لئے اس کو زبردستی صرف ایک آیت کریمہ کی غلط توجیہہ کی وجہ سے مانتے چلے آرہے ہیں ۔ اور اس سے بدعملی کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں ۔ ہر مسلمان یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے بد اعمال کے باوجود

ہماری نجات شفاعت کی وجہ سے ہو جائے گی۔

پیر پرستی یا قبر پرستی کی جس قدر توجیہات کی جاتی ہیں ان سب کا جائزہ قرآنی تناظر میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت ہی ضعیف البنیان واقع ہوا ہے۔o اِنَّ الْاِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًاo (70/19) اور اپنی پریشانی دور کرنے کے لئے جو بھی سہارا ہاتھ لگتا ہے وہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ مصائب، غموم و ہموم میں گھرا ہوا انسان، اپنی پریشانی دور کرنے کے لئے جگہ جگہ جاتا ہے اور ان کا حل تلاش کرتا ہے۔ معاشرہ جس قدر پریشان کن ہوتا ہے اسی قدر لوگ مزاروں اور پیروں کے پاس جاتے ہیں۔ کسی خاتون کے بچے کو تعلیم سے فراغت کے بعد نوکری مل جاتی ہے تو وہ کسی مزار پر نہیں جائے گی۔ لیکن اگر اسی بچے کو دو سال تک ملازمت نہیں ملے گی تو وہ خاتون اپنے بچے کی پریشانی کے پیش نظر مزاروں پر بھی چکر لگائے گی اور پیروں فقیروں کے پاس بھی جائے گی، اگر اتفاق سے اس بچے کو ملازمت کسی مزار پر جانے کے بعد مل گئی تو وہ خاتون ساری عمر کے لئے اس مزار کی عقیدت مند ہو جائے گی۔ اور مزار پرستی اپنا عقیدہ بنا لے گی، معاشرہ میں جس قدر پریشانیاں ہوں گی، قبر پرستی میں اضافہ ہوگا، معاشرہ جس قدر آسودہ حال ہوگا، مزاروں اور پیروں کی تعداد کم ہو جائے گی۔

کسی تاریخ و روایت میں حضورؐ کے کسی مزار پر حاضری دینے کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ایک روایت بھی ضعیف سے ضعیف ترین، اس بارے میں مل جاتی، تو یہ حضرات اس کو بہت اہمیت دیتے۔ جب حضورؐ کا کسی طرح بھی مزار پر جانا ثابت نہیں ہوتا تو وہ حضرات جو سنت کے عاشق و دیوانے ہیں اور ذرا ذرا سی سنت پر عمل کرتے ہیں۔ اپنی ہیئت کذائی سنت کے مطابق بنتے ہیں۔ اپنا لباس سنت کے مطابق بناتے ہیں، اونچی اونچی شلواریں پہنتے ہیں، جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ شاید چھوٹے بھائی کی زیب تن کر لی ہے۔ جنہیں سنت کے اتباع پر اس درجہ اصرار ہے، وہ مزاروں پر کیوں جاتے ہیں جبکہ وہ خلاف سنت عمل ہے۔

جہاں تک شفاعت کے عقیدہ کا تعلق ہے وہ مطلق شفاعت ہے۔ اس میں اس بات کے

ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں کہ کسی کے گناہ کس قدر ہیں اور اعمال صالح کس قدر۔ ہر حال میں اس کے شفاعت کی توقع ہے۔امام بُصیریؒ کا قصیدہ بُردہ شریف بہت مشہور اور متبرک قصیدہ شمار کیا جاتا ہے۔اس کا وِرد بھی کیا جاتا ہے،اور وظیفہ بھی۔اس کا ایک مشہور شعر ہے جو عموماً مساجد میں کندہ ہوتا ہے۔

هَوَالحبيبُ الّذى تُرجىٰ شُفاعةُ

لِكُل هِولٍ عنَ الاهوالِ مُقتَحِمِ

(حضورؐ) وہ حبیب ہیں کہ ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے کہ ہر پریشانی اور خوف کے حال میں بھی حضورؐ کی شفاعت حاصل ہوگی۔اسی طرح یہ شفاعت حضورؐ تک محدود نہیں بلکہ اس سے اولیاءاللہ اور بزرگان دین کو بھی متصف کیا جاتا ہے کہ ان کے طفیل گناہ گاروں کی بھی بخشش ہوگی۔شیخ سعدی کا مشہور شعر ہے۔

شُنیدم کہ در روز امید وبیم

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

اس عقیدہ کی وجہ سے مسلمان معاشروں میں جرائم کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔اور بے عملی پھیلتی جارہی ہے،اس لئے اس خلاف قرآن عقیدہ کو جس قدر جلدی ترک کردیں اتنا ہی بہتر ہے۔

پیر پرستی قبر پرستی ، وسیلہ، شفاعت اولیاء اللہ کے ذریعے تقرب خداوندی یہ سب عقائد خلاف قرآن نظریات پرمبنی ہیں اور جب تک مسلمان ان توہمات سے اپنا تعلق منقطع نہیں کرینگے، مسلمان کبھی بھی ترقی نہیں کرسکیں گے،مسلمانوں کے لئے نجات اخروی اور فلاح دنیاوی کی واحد صدرت تمسک باالقرآن ہے اور دنیا کے کسی خطہ میں بھی قرآن کریم کا ضابطہ حیات عملاً نافذ کرنا ہے ۔کیونکہ قراان کریم نے مسلمانوں سے فوز وفلاح ،قوت وحشمت ، برتری اور اعلَون کونے کے جس قدر دعوے کئے ہیں یہ سب اس کے نظام کے قیام سے مربوط ہیں اوران کے نظام کے قیام پر ہی ان

کا انحصار ہے اور قرآن کریم کے نظام کے عملاً نافذ ہونے سے ہی اس کے نتائج مشہود شکل میں ساری انسانیت کے سامنے آئیں گے۔ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کہ زمین پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے اس نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی، عادی، مجرم اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔ اور سنت کے مطیع ہوں۔ ہر مسلمان اپنی اپنی جگہ اس کے قائم کرنے کی کوشش کرے۔ ارشاد خداوندی ہے o قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ (34/46) o میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے لئے ایک ایک دو دو ہو کر ہی کھڑے ہو جاؤ۔

اس لئے اس بات کا خیال نہ کرو کہ کام بہت بڑا ہے اور وسائل بہت مختصر، اگر حکم خداوندی کے مطابق ایک ایک دو دو بھی اٹھ کھڑے ہوں تو آہستہ آہستہ تعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور وسائل بھی دستیاب ہوتے چلے جائیں گے۔

o فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ (40/44) o تو جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں عنقریب ہی تم اس کو یاد کرو گے۔

ماہ دسمبر 2003ء

قرآن کریم میں ملائکہ کی حقیقت

قرآن کریم کی رو سے ملائکہ پر ایمان لانا ہر مومن پر فرض ہے۔ اس فرضیت سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ملائکہ کو کس قدر اہمیت دی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ملائکہ کا صحیح تصور جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے ہر مسلمان کے سامنے ہو۔ دورِ جاہلیت اور ما قبل نزول قرآن ملائکہ کو دیوی اور دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے اس قسم کی توہم پرستیوں کو دور کیا اور ملائکہ کے صحیح مقام اور منصب سے انسان کو مطلع کیا۔ ملائکہ کے صحیح مقام و منصب کو سمجھ لینا ہی ان پر ایمان لانا کہلائے گا۔ مومن وہی ہے جو ملائکہ کی اس حقیقت پر ایمان لائے۔ یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ، رسل، کتب، آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ یعنی ملائکہ کے متعلق وہ تصور قائم کرے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے اور انہیں وہی مقام و مرتبہ دیا جائے جو قرآن کریم نے ان کے لئے مقرر فرمایا ہے۔

عمومی انداز میں یعنی (Roughly) ملائکہ کو تین صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، ایک قسم تو ملائکہ کی عالمِ امر میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ آگ چیزوں کو جلائے گی اور پانی آگ بجھائے گا، یہ کبھی نہیں ہوگا کہ آگ موجود ہو اور وہ چیزوں کو نہ جلائے۔ یا پانی کو اگر آگ بجھانے کے لئے استعمال کریں تو وہ آگ کو نہ بجھائے۔ ان چیزوں کی خصوصیات عالمِ امر میں متعین کر دی گئیں ہے، آگ کی وہ حرارت اور اس کی وہ تمازت جو چیزوں کو جلاتی ہے وہ ایک مَلک ہے۔ عالمِ امر میں اس بات کا فیصلہ کر دیا گیا اور اس ملک کی خصوصیت کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں ہر

قانون متعین ہوتا ہے اور ہر اسکیم بنائی جاتی ہے۔ ان قوانین اور تدابیر کے اندر جو قوتیں پنہاں و مضمر کی گئی ہیں وہ عالمِ امر کے ملائکہ ہیں، عالمِ امر میں یہ مدبرات امورِ الٰہیہ کس طرح کارفرما رہتے ہیں ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔

دوسری طرح کے ملائکہ وہ ہیں جو ہماری اس کائنات میں، یعنی عالمِ آفاق میں کام کر رہے ہیں۔ یہ ملائکہ فطرت کی وہ قوتیں ہیں جو عالمِ محسوس میں کارفرما ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ کائنات تخلیق کی تو اس کو چلانے کے قوانین وضوابط بھی مقرر فرمائے۔ جو قوتیں ان قوانین کی رو سے کائنات کو چلا رہی ہیں ان کو ملائکہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے وَأَوْحَى فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا (41/12) ہم نے ہر سماء کی طرف اپنا امر وحی کر دیا۔ اس سے مراد وہ قوانین الٰہی ہیں جن کی رو سے یہ اجرام فلکی اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور جو قوتیں ان قوانین کو روبہ عمل لا رہی ہیں وہ ملائکہ ہیں۔ سورۃ النّزِعٰت میں o فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا o (79/5) کہہ کر مزید وضاحت فرمادی کہ یہ ملائکہ تدبیر امور کرنے والی قوتیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ سورج کا مشاہدہ فرمائیں، سورج ان قوانین کا پابند ہے، کہ وہ وقت مقررہ پر طلوع ہو اور اپنے مقررہ وقت پر غروب ہو سورج کو اس طرح طلوع اور غروب کرنے کی قوت ایک ملک ہے، سورج کی تمازت، دھوپ میں یہ خصوصیات رکھ دی گئی ہے کہ وہ فصل کو پکاتی ہے، اور دھوپ کی حرارت بخارات اٹھاتی ہے، فصل پکانے کی قوت، اور سمندر سے بخارات اٹھانے کی قوت یہ دونوں قوتیں عالمِ امر میں قوانین الٰہی (Physical forces) کے تابع روبہ عمل ہیں جنہیں عالمِ امر میں طے کر دیا گیا تھا، یہ وہ ملائکہ ہیں جن کا علم ہم حاصل کر سکتے ہیں اور ان کو ہم مسخر کر سکتے ہیں ان کا مسخر کرنا ہی مقامِ آدم ہے۔ یہ ہر جگہ روبہ عمل ہیں اور ان کو صرف دریافت کرنا ہوتا ہے، ایجاد کرنا نہیں ہوتا صرف اوپر سے (Cover) دور کر کے (Discover) کرنا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ ان قوانین میں سے کچھ ایسے ہیں جو انسانی علم کے احاطہ میں آ گئے ہیں، یعنی ان کا (Cover) دور کر دیا گیا ہے، باقی ایسے ہیں جو

ابھی احاطہ ادراک سے باہر ہیں لیکن یہ تمام قوتیں ملائکہ ہی ہیں۔

تیسری قسم ملائکہ کی وہ ہے جو ہمارے عالمِ انفس میں کام کر رہی ہے۔ یہ ملائکہ ہماری داخلی قوتیں ہیں۔یعنی ہمارے اعمال کے وہ اثرات جو ہماری ذات پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ جب انسانی اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔قرآن کریم اس کو قیامت کا نام دیتا ہے۔اور چونکہ انسانی زندگی اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ موت کے بعد بھی آگے جاتی ہے اس لئے اعمال کے ظہورِ نتائج کا یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔اس لحاظ سے فرمایا کہ ملائکہ کا نزول قیامت میں بھی ہوگا(25/25)یعنی ہماری موجودہ زندگی میں بھی ظہورِ نتائج ملائکہ کی قوتوں سے ہوتا ہے اوراس کے بعد بھی ظہورِ نتائج اسی طرح ہوگا۔اثرات ونتائج مرتب ہونے کی آسان مثال اس طرح ہوسکتی ہے کہ کھانا بظاہر ایک ہی فعل ہے حرام کھانا اور حلال کھانا، جوشخص حلال کھاتا ہے اس کہ اچھے اثرات نفس پر مرتب ہوجاتے ہیں، لیکن جوشخص حرام کھانا کھاتا ہے اس کے برے اثرات اس کے نفس پر مرتب ہوجاتے ہیں،حرام کھانے کے برے اثرات ملائکہ مرتب کرتے ہیں۔لیکن ملائکہ یہ اثرات کس طرح مرتب کرتے ہیں ہم اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ ملائکہ جو اثرات ہمارے نفوس پر مرتب کرتے ہیں یا جو(PartPlay) کرتے ہیں ہم وہ نہیں جان سکتے۔ یہ مختصر سی(Roughly) تقسیم ہے جو ملائکہ کی پیش کی گئی ہے۔اب ملائکہ کی تینوں اقسام کی مفصل الگ الگ بحث پیش خدمت ہے۔

ملائکہ کا سجدہ: کائناتی قوتیں سب کی سب قوانین الٰہی کی اطاعت کے لئے مجبور ہیں
o وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ o(16/49)o ارض وسماء میں جو کچھ ہے خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب قوانین الٰہی کے سامنے مطیع وفرمانبردار ہیں۔وہ ان سے کچھ سرکشی اختیار نہیں کرسکتے o۔کائنات کی ان ہی قوتوں کے متعلق قصہ آدمؑ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ تمام قوتیں آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئیں۔یعنی یہ کہ فطرت کی تمام قوتیں بنی نوع انسانی کے لئے مسخر ہیں،اس کے تابع فرمان ہے o أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ

سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی الْأَرْضِ (22/65)o کیا تم نے نہیں دیکھا کہ زمین میں جو کچھ ہے، اللہ نے اسے تمہارے لئے مسخر کردیا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہواo وسخّر لکم مّا فِی السّماوات وما فی الأرض جمیعاً مّنہ (45/13)o جو کچھ سماوات اور زمین میں ہے ان سب کو اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یہ آدمؑ کے سامنے ملائکہ کا سجدہ ہے یعنی انسان قوانین فطرت کا علم حاصل کر کے، ان اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتے ہیں۔

ملائکہ کی خصوصیات: ملائکہ خواہ عالمِ امر میں ہوں، خواہ عالمِ آفاق یا عالمِ انفس میں ہوں ملائکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ ملائکہ دکھائی نہیں دے سکتے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو تبدیل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ مختلف مواقع پر تثبیتِ قلوب کے لئے جو ملائکہ کا نزول ہوا، اس کے لئے وضاحت کر دی گئی کہ تم ان ملائکہ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جنگِ حُنین کے موقع کے لئے سورۃ توبہ میں ارشاد ہوا کہ oثُمَّ أَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَo(9/26)o تب اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنین پر اپنی (طرف سے) تسکین نازل فرمائی اور فرشتوں کے لشکر بھیجے جنہیں تم دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور کفار پر عذاب نازل فرمایا اور کافروں کی یہی سزا ہےo۔

اس آیت شریفہ میں وضاحت فرمادی گئی کہ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے، لیکن تفسیر حسینی میں ملا حسین واعظ کاشفی نے لَّمْ تَرَوْهَا کی تفسیر کے ذیل میں تحریر فرمایا ''ندیدند شما ایشانرا اما کفار مید ندآنہا ملائکہ بودند باجامہائے سفید وعمامہائے سرخ، علاقہ بین الکتفین گذاشتہ براسپ ابلق سوار شدہ عدد ایشاں پنج ہزار یا ہشت ہزار، یا شانزدہ ہزار بودہ'' (ترجمہ) تم نے تو ان ملائکہ کو نہیں دیکھا تاہم کفار نے ان کو دیکھا کہ وہ ملائکہ تھے کہ انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سرخ عمامے، دونوں کندھوں کے درمیان دستار تھی اور وہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی تعداد پانچ ہزار یا آٹھ ہزار یا تیرہ ہزار تھی۔ جو مفسرین کا طریقہ ہے کہ کبھی کوئی دوٹوک بات تحریر نہیں کرتے، یہاں بھی ملائکہ کی مختلف تعداد لکھی ہے، اور اندازہ یہ ہے کہ وہ کفار نے ہی شمار کی ہوگی کیونکہ مومنین کے نہ دیکھنے کا تو

مفسر محترم نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ حالانکہ آیت بالکل واضح ہے اور خود مفسر بھی مجبور ہیں کہ ملائکہ کو غیر مرئی خیال کریں۔ لیکن چونکہ روایتی مفہوم شامل کرنا تھا اس لئے لَّمْ تَرَوْهَا کی وجہ سے اس پر تو مجبور ہو گئے کہ مومنین نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اتنی گنجائش نکال لی کہ کفار انہیں نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ شمار بھی کر رہے تھے۔ دوسرے مقامات پر قرآن کریم نے خود بھی نازل شدہ ملائکہ کی تعداد بیان فرمائی ہے، جس کی وضاحت برموقع پیش کی جائیگی۔

اسی طرح سورۃ انفال میں ارشاد ہوا o إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا (8/12)o جب تمہارا پروردگار فرشتوں سے فرما رہا تھا کہ میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان داروں کو ثابت قدم رکھو۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے فتح الرحمٰن میں اس کا ترجمہ تحریر فرمایا "آنگاہ کہ وحی می فرستاد پروردگارِ تو بسوی فرشتگان کہ من با شمام، پس استوار سازید مسلماناں را" اس کی تفسیر میں ملا واعظ کاشفی نے مشہور تفسیر مدارک کے حوالے سے تحریر فرمایا۔" در مدارک آوردہ کہ فرشتگان بر صورتِ آدمیاں در پیش صفِ لشکرِ مومنان۔ می رفتند وی گفتند بشارت باد کہ شما غالب شدی و خدا یار شما است و مردانہ باشید کہ دشمنان شما اندک اند و نصرت مرشمارا است، پس معنی ایت این باشد کہ ای فرشتگان شما بشارت بدید" یعنی یہاں بھی وہی نظریہ کہ فرشتے آدمیوں کی صورت میں مومنوں کی صفوں کے آگے آگے چلے جا رہے تھے، اسی طرح یہاں بھی ملائکہ کی مدد کا ذکر ہے۔ ان مفسرین کرام نے انہیں مرئی بیان فرمایا ہے، جو قرآن کریم کی آیت کے خلاف ہے۔

ملائکہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات وقوانین کی نافرمانی و معصیت نہیں کر سکتے، تعمیل ارشادِ الٰہی میں ان کی یہ کوشش اور جدوجہد ہی ہے جس سے یہ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہی ہے۔ اس لئے وہ ان احکامات کو نافذ کرتے ہیں۔ ان میں اپنا دخل عمل کچھ نہیں دیتے۔ انہیں اس دخل اندازی یا خلاف ورزی احکام کی قدرت ہی نہیں o وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ o(16/49)o جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنے جانور زمین میں ہیں۔ سب اللہ کے سامنے سر بسجود ہیں اور فرشتے تو

ہیں ہی وہ کہ اللہ کے حکم سے سرکشی نہیں کرتے o۔ نظامِ عالم میں جس قدر قوتیں ہیں جب تک وہ ایک مرکزی طاقت کے ماتحت نہ ہوں، یہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ پوری کائنات کے قانون میں ہم آہنگی (Universality) ہے۔ سورۃ الملک میں ارشاد ہوا۔ o اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (67/3)o اس نے فضا کی وسعتوں میں مختلف کروں کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ کائناتی قوتوں یعنی ملائکہ کی قانون کی پابندی ہی ہے کہ تمام کرے، صحیح نظام سے چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ کوئی سائنسدان کسی بھی کرے میں تحقیقات کرے ساری کائنات میں اسے ایک ہی قانون کارفرما نظر آئیگا۔ یہ ہے مفہوم ملائکہ کی اطاعت گذاری کا اور عدم معصیت کا۔

ملائکہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے مختلف ہے اور اسی میں ملائکہ پر تحقیقات اور ریسرچ کرنے کا راز ہے کہ ان کا باطن تلاش کیا جائے۔ قصہ آدمؑ میں ملائکہ کو مخاطب کر کے ارشادِ الٰہی ہوتا ہے کہ۔ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ o(2/33) تو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے تھے میں وہ سب کچھ جانتا ہوں o۔

آپ اشیائے کائنات پر غور فرمائیں، جب یہ کائنات عالمِ وجود میں آئی یہ تمام چیزیں اس میں موجود تھیں جوں جوں انسان کی ترقی کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا ان اشیاء کی مضمر صلاحیتیں بے نقاب ہوتی چلی گئیں۔ ایتھر ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اب اسی ایتھر سے کئی طرح کے کام لئے جاتے ہیں، ٹی وی اور ریڈیو کی لہریں اسی کے ذریعے منتشر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایٹم (Atom) ہے، یہ تخلیقِ عالم کے وقت بھی موجود تھا۔ لیکن اس کی ساری صلاحیتیں مخفی تھیں۔ محسوس طور پر وہ سامنے نہیں آئی تھیں۔ اس دور میں یہ تحقیقات بعد میں سامنے آئیں۔ یہ ہے اشیاءِ کائنات کی وہ حالت جسے مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ o(2/33) سے تعبیر فرمایا اور اس کے بعد جب ان کی قوتیں استعمال میں آنے لگیں تو وہ ان کی وہ حالت ہے جو مَا تُبْدُوْنَ (2/33) میں بیان

فرمائی گئی ہے۔سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر 5 میں (Ozone) کی طرف اشارہ ہے۔ جب فرمایا کہ
oتَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِن فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ
لِمَن فِي الْأَرْضِ (42/5)o قریب تھا کہ فضائے آسمانی پھٹ پڑتی ،لیکن اللہ کی کائناتی قوتیں (ملائکہ) ہروقت سرگرم عمل ہیں اور اسی طرح اہلِ زمین کو اپنے سامانِ حفاظت میں لئے ہوئے ہیں، اگر کائنات کی قوتیں (ملائکہ) درمیان میں نہ ہوتیں تو فضائے آسمانی اب تک پھٹ چکی ہوتی۔ قرآن کریم نے ملائکہ کو اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ بھی کہا ہے یعنی کئی کئی پروں والے ملائکہ۔ فرمایا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35/1) دودو، تین تین، چار چار، پروں والے ملائکہ، یہ وہ ملائکہ یا کائناتی قوتیں ہیں جن کے اندر کئی صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں۔ جیسے سورج سے خارج شدہ توانائی، فصل بھی پکاتی ہے، روشنی بھی مہیا کرتی ہے، سمندر سے بخارات بھی اٹھاتی ہے، اس لئے اس توانائی (ملک) کو کئی پروں والی بیان فرمایا ہے۔ اسی آیت کریمہ کے آخری حصہ نے یہ بھی بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں برابر اضافہ کرتا چلا جارہا ہے اور اب جن ملائکہ کا اضافہ ہو رہا ہے، ابھی ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ ان میں کتنی کتنی اور کس قدر صلاحیتیں (Potentialities) مخفی ہونگی۔ جن کو اب تک عقل انسانی دریافت نہیں کرسکی۔

ملائکہ کی شہادت: ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ oشَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ o(3/18)o اللہ، فرشتوں اور علم والوں نے گواہی دی ہے کہ اس (اللہ) کے سوا کوئی معبود نہیں (قابل اطاعت) نہیں ہے اور وہ اللہ عدل وانصاف کے ساتھ (کاردوعالم) کو سنبھالنے والا ہے o۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کہ الٰہ (حاکم) ہونے پر تین شہادتیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی، ملائکہ کی اور صاحبانِ علم کی پیش کی گئی ہیں۔ چونکہ موضوع زیرنظر صرف ملائکہ کی تسبیح سے متعلق ہے اس لئے اس آیت کریمہ کی دوسری شہادتوں کی علمی وضاحت کسی دوسرے مقام پر پیش خدمت کی جائے گی، یہاں صرف اجمال پر اکتفاء کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت تو وحدت کائنات سے ظاہر ہے۔ یہ قانونِ الٰہی کی وحدت اور ہم آہنگی

(Universality) ہے جس سے یہ سلسلہ اس قدر محکمیت کے ساتھ چل رہا ہے چونکہ کائنات کی یہ وحدت ناقابلِ تقسیم ہے اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ وحدت قانون اور وحدت الٰہ ہے۔ اس لئے ساری کائنات فطرت کی قوتیں اور اس میں جاری وساری تمام قوانین، اس بات کی گواہی پیش کرتے ہیں کہ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں خود اللہ تعالیٰ کی شہادت موجود ہے، جب کہ ارشاد ہوا۔ o لٰـكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ (4/166) o یعنی اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ساتھ گواہی دیتا ہے جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے۔ گواہ کی شہادت اس کے زبانی یا تحریری بیان کی رو سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا بیان اس کی کتاب ہے اور اس کی کتاب کی تعلیم کا محور، توحید ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی الٰہ نہیں ہے، آپ قرآن کریم کا اول تا آخر مطالعہ کر جائیں، یہی تعلیم اس میں جگہ جگہ آپ کو ملے گی۔

دوسری شہادت اہل علم کی ہے جو قَآئِمًا بِالْقِسْطِ بھی ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمایا کہ o وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ o (13/43) o (اے رسول) کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو تو تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لئے اللہ اور وہ شخص کافی ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے o۔ دونوں آیات کریمات میں اربابِ علم کو بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے۔ آیت کریمہ (6/59) میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کتاب مبین فرمایا ہے، اور کائنات کے قوانین کے جاننے والے کو عالم کہا ہے، اسی سلسلہ میں متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن چونکہ زیر نظر مضمون صرف ملائکہ سے متعلق ہے، اسی لئے اولوا العلم کی شہادت کی تفصیلی بحث کو ملتوی کیا جاتا ہے۔ البتہ ملائکہ کی شہادت سے مراد قرآن کریم کے دعائی کی عملی طور پر تصدیق اور ان کا عملی طور پر روبہ عمل ہونا ہے۔

عملی طور پر ملائکہ کی شہادت یہ ہے کہ قرآن کریم نے دعویٰ فرمایا کہ o وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (45/13) نیز اس کو پھر (Point out) کیا اور

فرمایا کہ o وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (14/33)o یعنی شمس وقمر کو اللہ نے مسخر کر دیا ہے، جس وقت قرآن کریم نے یہ دعویٰ فرمایا تھا، اس وقت شمس وقمر انسان کے تابع نہیں تھے۔ اب جس وقت بھی انسان نے سورج کی توانائی (Solar Energy) استعمال کرنی شروع کر دی، اسی وقت قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جائے گی، اور سورج کی اس توانائی کا مسخر ہونا، ملائکہ کی منہ بولی شہادت ہوگی۔ اسی طرح کائنات کی جو بھی توانائی مسخر ہوتی چلی جائیگی، قرآن کریم کے دعویٰ کی تصدیق ہوتی چلی جائیگی اور ملائکہ کی شہادت مہیا ہوتی چلی جائے گی۔

ملائکہ کی تسبیح: ملائکہ کی تسبیح سے مراد یہ ہے کہ وہ ان امور کی سرانجام دہی میں حد درجہ مصروف رہتے ہیں جن کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے o أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ o(24/41)o کیا تو نہیں دیکھا کہ جتنی مخلوقات زمین وآسمان میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے ہیں، غرض سب اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ سب اپنی تسبیح اور صلوٰۃ کا طریقہ خوب جانتے ہیں اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ اس سے خوب واقف ہےo۔

یہاں تَسْبِيحَ اور مَا يَفْعَلُونَ ایک دوسرے کا بدل اور مبدل منہ، آیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جاندار کا وہ کام جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوا تھا اس کو ادا کرنا ہی اس کی تسبیح ہے۔ اسی طرح ملائکہ کی تسبیح ان کی منظور کردہ فرائضِ منصبی کو تکمیل کرنا ہی ہے o وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ o(16/49)o اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے۔ جانداروں اور کائناتی قوتوں (ملائکہ) میں سے، سب اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور سرکشی اختیار نہیں کرتےo۔ مثلاً اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جنگلوں اور درختوں کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ آکسیجن مہیا کریں۔ اب ہر درخت اپنا یہ فریضہ ادا کر رہا ہے اور کوئی جنگل یا درخت اب ایسا نہیں ہوگا جو آکسیجن پیدا نہ کر رہا ہو۔ آکسیجن کا مہیا کرنا یہ درختوں کی تسبیح ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے پہاڑوں کو اَوْتَادًا کہا ہے، یعنی پہاڑ

زمین کے لئے مثلِ کھونٹیں کے ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کی تسبیح یہ ہے کہ وہ زمین کو قائم رکھیں، جب تک پہاڑ زمین کے لئے مثلِ کھونٹوں کے کام کر رہے ہیں وہ اپنی تسبیح ادا کر رہے ہیں، ملائکہ کی تسبیح ان کے فرائض کی تکمیل کا ہی نام ہے۔

ملائکہ کی لعنت: ملائکہ کی لعنت کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے o إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ o(2/161)o بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ لعنت کے لغوی معنی کسی کو ناراضگی کی بناء پر اپنے سے دور کر دینا۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد قوانین الٰہی سے انکار کرنے کی بناء پر اس کے قوانین کے خوش گوار نتائج سے محرومی اور لوگوں کی لعنت سے مراد ہے، ان تمام انسانوں کے تعاون سے محروم ہو جانا، جن کو اس باب میں ساتھ دینا تھا اور ملائکہ کی لعنت، جو اس مضمون کا موضوع ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جو قوم کائنات کے قوانین (ملائکہ) میں ریسرچ کرتی ہے اور انہیں تسخیر کرتی چلی جاتی ہے، وہ اس کے ماحصل سے نفع اندوز ہوتی ہے اور جو قوم تسخیر کائنات نہیں کرتی اور کائنات کی قوتوں کو تابع کر کے، ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی وہ ان کے ماحصل سے محروم رہتی ہے اور یہی ملائکہ کی لعنت ہے۔ اس کی عملاً مثال یورپ کے ممالک اور اس کے برعکس ہم اور ہمارے ممالک ہیں۔ ان ممالک نے کائنات کی قوتوں (ملائکہ) کو زیر کر کے، ان سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ ہم نے نہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کیا نہ ان سے فائدہ اٹھایا اور ہم اس سے محروم رہے یہی ملائکہ کی لعنت ہے۔ آج امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک جو آسائشیں حاصل کر رہے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے ملائکہ پر پورا پورا قبضہ کیا ہوا ہے۔ اور اس کی قوتوں میں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان پر ملائکہ کی لعنت نہیں ہے، ورنہ جن ممالک میں (Homosexuality) جیسے شرمناک اور گھناؤنے جرائم بھی قانوناً درست سمجھے جاتے ہوں، ان کی کیا تہذیب، کیا تمدن، اور کیا معاشرت۔

ملک الموت: o قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ

تُرْجَعُوْنَ o(32/11)o (اے رسول) تم کہہ دو کہ ملک الموت جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کریگا، اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے o۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طبعی تغیرات انسان کے جسم پر وارد ہوتے ہیں اور جس کا آخری انجام اس کی موت ہوتا ہے، انہیں بھی ملائکہ کی قوتوں اوران کے اثرات سے موسوم کیا گیا ہے، جو توضیح اب تک پیش خدمت عالی کی گئی ہیں۔ ان کا تعلق عالم امر اور عالمِ آفاق کے ملائکہ سے تھا۔ اب عالمِ انفس کے ملائکہ کے متعلق معروضات، پیش خدمت اقدس ہیں۔

ارشاد جناب باری تعالیٰ ہے oإِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ o(86/4)o کوئی نفس ایسا نہیں کہ جس پر کوئی محافظ مقرر نہ ہو o۔ نیز ارشاد ہوا وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (6/164) ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود برداشت کرنا ہوگا۔ نفس انسانی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ اثرات ملائکہ ہی مرتب کرتے ہیں۔ ایک شخص مرفہ الحال ہے لیکن وہ اپنی کمائی میں حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتا، اور جو چیز اسے ملتی ہے وہ کھا لیتا ہے، اس کے برخلاف ایک آدمی غریب ہے اور عزت کی زندگی گذارتا ہے۔ لیکن وہ تنگی کے باوجود کوئی حرام چیز نہیں کھاتا۔ کھانا کھانے کا فعل تو ایک ہی ہے لیکن حلال وحرام روزی کھانے کے جو اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، یہ اثرات ملائکہ مرتب کرتے ہیں، لیکن ملائکہ یہ اثرات کس طرح مرتب کرتے ہیں، یہ بات ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح قانون الٰہی کی اطاعت میں ہم ہر عمل سرانجام دیتے ہیں اس سے اچھے اثرات ہمارے نفوس پر مرتب ہوتے ہیں جن سے ہمارا نفس مضبوط ہوتا ہے۔ اور ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر محمول ہوتا ہے، اس کے بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس سے ہمارے نفوس کی نشونما رک جاتی ہے۔

ملائکہ کے اثرات معاشرہ پر: اگر کسی بھی معاشرہ میں زیادہ تر لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان کے ہر عمل کا اثر ان کے نفس پر مرتب ہو رہا ہے اور ان کے پیش نظر تزکیہ نفس اور ارتقاء بھی ہو، تو اس معاشرہ میں ہر شخص یہی کوشش کرے گا کہ کوئی کام ایسا نہ کیا جائے جو قانون الٰہی کے خلاف ہو اور

نفس بُرے اثرات کا حامل ہو۔ ملائکہ پر اس طرح اور اس جہت پر ایمان لانے سے دنیا میں بہترین معاشرے کی تشکیل از خود ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے جو مستقل اقدار عنایت فرمائی ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرنے سے نفس انسانی کی نشونما ہوتی ہے۔ اگر دنیاوی مفاد اور مستقل قدر میں مقابلہ (Tie) آپڑے اور ہم ذاتی، دنیاوی مفاد کو چھوڑ کر، مستقل قدر پر عمل کریں، تو اس سے ہمارے نفس میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک نوجوان شخص کو بدچلنی کا موقع میسر ہو اور ہر طرح کی ترغیبات اسے بدچلنی پر آمادہ کر رہی ہوں مگر وہ اس خیال سے کہ یہ عمل قانونِ الٰہی کے خلاف ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوتی ہے، وہ اس عمل بد سے دور رہے، تو اس کے نفس پر اس کے عمدہ ترین اثرات مرتب ہوں گے، قرآن کریم نے فرمایا کہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9) وہ تنگی ہونے کے باوجود اپنے نفوس پر ایثار کرتے ہیں تو ہر وہ شخص جو قرآن کریم کی اس قدر پر عمل کرے گا اس کے نفس پر ایک عمدہ اثر مرتب ہوگا۔ اس طرح قرآن کریم نے فرمایاo الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ o(92/18)o جو کوئی اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ ان مستقل اقدار پر عمل کرنے سے نفس پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں یہ سب ملائکہ رُوبہ عمل لاتے ہیں۔

طاغوتی معاشرہ، یعنی وہ معاشرہ جس میں انسانوں کے خودساختہ قوانین جاری ہوں۔ وہ سیکولر اسٹیٹ (Secular State) ہوتی ہے۔ ہم اس اسٹیٹ میں رہ کر اس کے قوانین کی بھی اطاعت کرتے ہیں، لیکن چونکہ ان میں مستقل اقدار کو دخل نہیں ہوتا، اس لئے ان کی اطاعت سے نفسِ انسانی پر کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس اگر کسی معاشرہ میں قوانین الٰہی جاری ہوں، اور وہ قرآنی حکومت ہو، جس میں مستقل اقدار کا نفاذ ہو رہا ہو، اس حکومت میں ہر ہر حکم کی اطاعت سے نفس انسانی کی بالیدگی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے اسلامی حکومت میں اگر کوئی شخص اپنی کار میں جا رہا ہے اور وہ ٹریفک سگنل کے اشارے پر رک جاتا ہے تو چونکہ اس نے اسلامی حکومت کی اطاعت کی، جس میں مستقل اقدار کا نفاذ

ہو رہا ہے۔اس کے نفس پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور اس کا نفس نشوونما حاصل کرے گا۔ یہ سب اثرات ملائکہ مرتب کرتے ہیں۔ چونکہ اسلامی حکومت میں، حکومت کے ہر عمل کی اطاعت سے نفسِ انسانی میں بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔اس لئے اسلامی حکومت کا قائم کرنا ضروری ہوتا ہے، کہ اس میں از خود نفسِ انسانی نشونما حاصل کرتی ہے۔اور اس کی مضمر صلاحیتیں برومند ہوتی رہتی ہیں اور صفاتِ الٰہی از خود منعکس ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کیونکہ مستقل اقدار صفاتِ الٰہی پر قائم ہوتی ہیں۔ غیر اسلامی حکومت میں یہ فوائد کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتے۔اس لئے قرآن کریم کا نظام قائم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہوتا ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ، واحد، مکمل، اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظامِ الٰہی (جو قرآن کریم کی مستقل اقدار پر مبنی ہو) کہ قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہیں اس جدوجہد کو شروع کردے کیونکہ نظامِ الٰہی کا قیام کسی مقام اور کسی دور سے مختص نہیں ہے، اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام حیات کو اکھاڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کے خواہش مند ہوں، ان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جاری کریں، جو لوگ اللہ اور رسول کے عطا کردہ نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں۔وہ اللہ اور رسول کے باغی، نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں

موجودہ دور کی حالت: آج مسلمان بحیثیت قوم سخت ترین مشکلات اور مصائب سے دوچار ہیں اور اس گرداب بلاء سے نجات حاصل کرنے کی کوئی توقع اور امید بھی نظر نہیں آتی۔ اپنی اس حالت پر ہر مسلمان خون کے آنسو روتا ہے اور ہر شخص جو بھی اس کی سمجھ میں آتا ہے، نہایت خلوص سے مشورہ پیش کردیتا ہے بظاہر چار امور ایسے ہیں جو مسلمانوں کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ہر درجہ کے سائنسی علوم حاصل کیے جائیں جن سے ملائکہ کو تسخیر کیا جائے۔قرآن کریم نے سورج کو بھی انسان کے لئے مسخر

قرار دیا ہے اور تمام ملائکہ میں اس کی توانائی کو خاص اہمیت دی ہے۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی نے اپنی کتاب (حدیث القرآن) آج سے تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصہ پیشتر تحریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ مجھے سخت رنج ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سورج کی توانائی بالکل ضائع ہو رہی ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، ان کا یہ مشورہ بہت صحیح تھا۔ قرآن کریم میں بیان ہوا ہے۔ o وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (8/60) o مسلمان ان کفار کے مقابلہ کے لئے جہاں تک ہو سکے قوت مہیا کریں۔ قوت کا لفظ نکرہ استعمال کیا ہے اس میں ہر طرح کی قوت آ جاتی ہے اس لئے موجود ٹیکنالوجی جس قدر بھی حاصل ہو سکتی ہے حاصل کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی صفوں میں اتحاد اور اتفاق قائم رکھیں، فرقہ بندی اور سیاسی اختلافات سے اجتناب کریں اس سے دشمنوں کے سامنے ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ ہم مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ کتنا بڑا شرک ہے۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ خالص قرآن کریم کی تعلیم سامنے ہونی چاہیے آج ہم مسلمانوں کے نظریات کا بیشتر حصہ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور ہمارے مروجہ نظریات میں جبلی طور پر (in-built,in-born) اور inherit، تباہی، بربادی مضمر ہے اور یہ تباہی اس درجہ مضمر ہے کہ اگر کوئی ترقی یافتہ قوم ان سارے نظریات کو اپنا لے تو وہ تباہ ہو جائے گی۔ جب تک ہم مسلمان ان خلاف قرآن عقائد اور نظریات کو ترک نہیں کریں گے، اور خالص قرآنی نظریات اختیار نہیں کریں گے، ہرگز ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکیں گے۔ یہ ہم مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارا گذشتہ ایک ہزار سال کا لٹریچر جو دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے اور جس کو ہماری پیشوائیت نیاز کے دانے کی طرح معتبر سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہے، اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ وہ ملوکیت کا تاریک ترین دور تھا۔ جب تک ہم اس لٹریچر پر قرآنی تناظر میں نظر ثانی نہیں کریں گے، ہم اس موجودہ تباہی و بربادی سے کبھی باہر نہیں نکل سکتے۔ ہم مسلمانوں کی بدبختی ہے کہ ہماری پیشوائیت

اس کوترک کرنے کے لئے نہ صرف آمادہ نہیں ہے بلکہ جس طرف سے بھی خالص قرآنی آواز بلند ہوتی ہے، وہ اس کو بند کرنے کی حد درجہ کوشش کرتی ہے اور اس کی مخالفت کرتی ہے۔

اس کمترین راقم سطور کے ذمہ ہر ماہ رویتِ ہلال کمیٹی کے ارکان عالی مقام کو سرکاری طور پر چاند دکھانے لے جانا ہوتا تھا۔ مولوی عبدالقادر آزاد مرحوم، خطیب بادشاہی مسجد لاہور، جنہوں نے کمترین کے اصرار پر اپنے نام کے ساتھ سید لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہمراہ ہوتے تھے اور مولانا محمود احمد رضوی مرحوم، حزب الاحناف والے، اس زمانہ میں رویت ہلال کمیٹی کے صدر ہوتے تھے۔ ہلال کمیٹی کے اراکین باتمکین، ریڈیو اسٹیشن، لاہور کی چھت پر جمع ہوجاتے تھے اور محکمہ موسمیات والے بھی اپنی دوربین لے کر آتے تھے، ایک ماہ تقریباً سب حضرات کو چاند نظر آ گیا لیکن ایک مشہور عالم دین، جو ضعیف تھے، اور اسی وجہ سے ان کی نگاہ کمزور تھی۔ ان کو چاند نظر نہیں آرہا تھا، ساتھ کے کئی علماء نے ان کی مدد کی مگر بے سود۔ اس پر محکمہ موسمیات کے ایک صاحب نے ان کو تجویزاً عرض کیا کہ وہ دوربین کی مدد سے چاند دیکھ لیں۔ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ نہیں سنت یہ ہے کہ صرف آنکھ سے چاند دیکھا جائے کیونکہ حضورؐ صرف اپنی چشمِ مبارک سے، ہلال ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔ اس پر محکمہ موسمیات کے ان صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے عینک بھی تو لگا رکھی ہے، جس کے بغیر تو آپ چند قدم کا فاصلہ بھی نہیں دیکھ سکتے، اور چاند تو بغیر عینک کے کسی طرح بھی نظر نہیں آسکتا، اس پر وہ عالم دینِ متین، اور حاملِ شرعِ مبین خاموش ہوگئے۔ مقصد اس واقعہ کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام، خواہ وہ کسی درجہ کے بھی ہوں، ٹیکنالوجی سے تنفر بھی رکھتے ہیں۔ اور اس کے استعمال کو پسند نہیں فرماتے، اسی وجہ سے سائنسی دریافت کو برا سمجھتے ہیں۔ چوتھی اور آخری، مگر اہمیت کے اعتبار سے اولین بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا نظام کسی نہ کسی طرح، کسی بھی جگہ، ایک مرتبہ قائم کر دیا جائے، اس سے مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا کیونکہ مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے نظام سے وابستہ ہے۔ اگر ان کے نظام کو عروج ہوگا تو مسلمانوں کو بھی عروج حاصل ہوگا، اور اگر ان کے نظام کو زوال ہوگا تو مسلمانوں کو بھی زوال ہوگا۔ جب تک مسلمان اپنے نظام

سے وابستہ نہیں ہوں گے، وہ اس تباہی اور ذلت کے گرداب سے کبھی باہر نہیں نکل سکیں گے۔

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمایا، کمترین چونکہ مدارس عربیہ سے وابستہ رہا ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کی ابجد سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔ اسی لئے صرف ایک آنکھ رکھتا ہے۔ اس عنوان پر صرف سائنسدان حضرات ہی لکھ سکتے ہیں۔ جو دونوں آنکھیں رکھتے ہوں۔ عالم امر کے ملائکہ کا علم ہم نہیں رکھ سکتے۔ عالم انفس کے ملائکہ کا علم سائیکولوجسٹ (Sychologist) حضرات کسی قدر دریافت کر سکتے ہیں۔ البتہ عالم آفاق کے ملائکہ کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے جو صرف سائنس دان صاحبان ہی کر سکتے ہیں، جہاں تک قرآن کریم اور ملائکہ کے عنوان کا تعلق ہے۔ جس سے قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن ملائک اور ان کی قوتوں کی نشاندہی خود فرمائی ہے، ان کی ریسرچ کر کے، ان کی تصدیق کی جائے کہ وہ نشاندہی واقعتاً درست ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر برق کے متعلق فرمایا تھا کہ بجلی میں صرف خوف ہی نہیں ہے بلکہ اس میں طمع یعنی فائدے بھی ہیں کہ اس کے ذریعے قانونِ فطرت کے مطابق سمندروں سے بادل ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر گھومتے پھرتے ہیں (13/13)، نیز رعد کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل اس طرح کررہی ہے کہ دیکھنے والے کی زبان سے حمدِ الٰہی جاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًاo (51/1) وہ قوتیں جو کسی پیغام کو پھیلانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے، یہ مثالیں صرف نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مثالیں بھی صرف سائنسدان ہی تلاش کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے جو ملائکہ کی قوتوں کا ذکر کیا ہے جو اب بے نقاب ہو رہی ہیں، ان کی تصدیق کرنے سے، قرآن کریم کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہی اس مضمون کا مقصد تھا۔ کمترین نے یہ مضمون بطور ایک (Lay Man) کے لکھا ہے، تو اس میں خالص قرآنی نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں روایتی یا اسرائیلی عنصر سے پوری طرح اجتناب کیا گیا ہے۔

مضمون کے دوران نازل کردہ ملائکہ کی تعداد کا ذکر بھی ایک جگہ آیا ہے جس کی تصریح میں

کمترین سے فروگذاشت ہوئی ہے وہ یہاں حاضر ہے، نازل کردہ ملائکہ کی تعداد مخالفین کی تعداد کے برابر ہوتی تھی، جنگ احد میں چونکہ کفار کی تعداد تین ہزار تھی اس لئے تین ہزار ملائکہ سے ان کی مدد کی گئی تھی۔ نیز یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ اختیار کیا تو اگر دشمن کی تعداد پانچ ہزار ہوگی تو تمہاری مدد بھی پانچ ہزار ملائکہ سے کی جائے گی۔ ملائکہ کی تعداد کا تناسب دشمنوں کی تعداد پر منحصر تھا۔

محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسری است
کسے کہ خاک درش نیست خاک برسر او

اللھم صلِّ علیٰ محمدٍ ختمِ المرسلین رحمۃ للعلمین شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللّٰہ باذنہٖ و سراجاً منیرا

ماہ اپریل 2004ء

۹

شہادۃ الفرقان علیٰ کفایت القرآن

ابتدائے آفرینش سے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کی بعث کا سلسلہ شروع کیا جو بنی آدم کو آگاہ کرتے تھے کہ وحیٔ خداوندی کے اتباع میں زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوش گوار ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج نوع انسانی کے لئے کس قدر پریشان کن ہوں گے۔ ان تمام انبیائے کرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین وضوابط ارسال فرمائے تاکہ وہ لوگوں کے اختلاف کا فیصلہ ان قوانین کے مطابق کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے عقل انسانی اس قابل ہے ہی نہیں کہ وہ انسانوں کے اختلافات صحیح طور پر بلا کسی رو و رعایت کے طے کر سکے اور انسانی مشکلات کا حل تلاش کر سکے۔ کیونکہ

عقل خود بین غافل از بہبود غیر!   سود خود بیند نہ بیند سود غیر!
وحی حق بینندۂ سود ہمہ!   در نگاہش سود و بہبود ہمہ!

لیکن انسان اگر وحی الٰہی کا اتباع کرے تو اس کے اتباع سے ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں انسانوں کے باہمی اختلافات بخوبی طے ہوتے ہیں اور انسانی مشکلات ومصائب کا حل بھی صحیح طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے اور اس معاشرہ میں کسی بھی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہتا نیز یہ کہ اسی قوم کو دیگر اقوام کی امامت بھی نصیب ہوتی ہے اور وہ دیگر تمام اقوام عالم پر بطور نگران کے زندگی گزارتی ہے۔ سورۂ نور میں وحی کی اہمیت کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جو قوم بھی وحی کا اتباع کرے گی ان کے لئے وحی خود بھی روشن ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی روشنی دیتی ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ وحی کی راہنمائی سے اعراض کرتے ہیں ان کے اعمال حیات کی مثال ایسی ہوتی

ہے جیسے کوئی پیاسا چٹیل میدان میں سراب کو پانی سمجھ کے اس کی طرف لپکے لیکن جب وہ اس کے قریب ہو تو وہاں کچھ بھی نہ ہو۔ یا وحی کے مخالفین کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے وہ سمندر کی گہرائیوں میں انتہائی تاریکی میں ہوں اور کسی جگہ بھی انہیں روشنی کی کرن نصیب نہ ہو۔ دوسرے مقام پر قرآن کریم نے وحی سے استفادہ کرنے والوں کو زندہ اور اس سے مستفید نہ ہونے والوں کو مردہ قرار دیا ہے اور فرمایا کہ وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے (6/122) آج پوری دنیا جس باطنی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل فرمودہ احکامات سے روگردانی کر کے دنیا میں انسان کے خود ساختہ قوانین Man made rules پر معاشرہ متشکل کیے ہوئے ہیں حالانکہ قرآن کریم نے نہایت مؤثر انداز پر یہ بات کہی ہے کہ

وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (46/26) اور انہیں کان، آنکھ اور دماغ سب کچھ دیے گئے تھے تو چونکہ وہ لوگ اللہ کے قوانین سے انکار کرنے لگے تھے تو نہ ان کے کان ہی کچھ ان کے کام آئے اور نہ آنکھیں اور نہ دماغ۔

قوانین الٰہی سے انکار کرنے کے بعد انسان کے اپنے حواس خمسہ سے حاصل کردہ علوم کسی کام نہیں آ سکتے اور نہ ہی وہ حاصل کردہ علوم انسان کو صحیح نتائج تک پہنچا سکتے ہیں اس لئے انسان کے لئے مناسب اور ضروری یہی ہے کہ وہ وحی الٰہی کے نور سے مستنیر ہو کے اسی کے قوانین کے مطابق معاشرہ تشکیل کرے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون جو انبیائے کے واسطے سے انسانوں کو ملتا تھا وحی کہلاتا ہے قرآن کریم نے اس کو وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ o(7/62) ”میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے“ کے الفاظ میں Define کیا ہے یہ علم صرف انبیائے کرام کو ہی ملتا تھا کوئی غیر از نبی اس علم میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اور انبیائے کرام کو بھی یہ علم بطور بخشش کے ہی ملتا تھا۔ اور ان کے کسب و ہنر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا نہ ہی ان کے خیالات یا آرزو کی اس میں کوئی آمیزش

ہوسکتی تھی اس میں مطلقاً معروضیت، Objectivity ہوتی تھی نبی کو خود اس بات کا علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ علم اسے ملنے والا ہے۔

○ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَى إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ○ (28/86) ○ اور تم کو تو یہ امید نہ تھی کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کتاب نازل کی جائے گی مگر تمہارے پروردگار کی مہربانی سے نازل ہوئی تو تم ہرگز کافروں کے پشت پناہ نہ بننا ○ نیز ارشاد ہوا وَمَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (42/52) تم تو نہ کتاب ہی جانتے تھے کہ کیا ہے اور نہ ایمان کو۔ یہ نظریہ کہ نبی ماں کے پیٹ سے نبی ہوتا ہے درست نہیں ہے۔ کیونکہ فرمان الٰہی ہے ○ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا (16/78) ○ اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماں کے پیٹ سے نکالا کہ تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے۔ چناں چہ حضرت یوسف کے متعلق بالتصریح موجود ہے کہ ○ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (12/22) ○ اور جب وہ یوسف اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو حکم اور علم عطا کیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کے متعلق فرمایا۔

○ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (28/14) ○ اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچے اور (ہاتھ پاؤں نکال کے) درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا۔ البتہ اس بارے میں حضرت عیسیٰ کے واقعے کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ بچپن میں گفتگو کرنے لگے اس لئے نبوت بچپن میں ہی مل جاتی ہے اس خیال کی تائید میں صرف یہی ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

تکلم فی المہد کا صحیح مفہوم: قرآن کریم چونکہ وحی الٰہی ہے اس لئے اس میں تضاد و تخالف کا امکان نہیں ہے وہ اپنے من جانب اللہ ہونے کے دعویٰ کے لئے دلیل ہی یہ دیتا ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ○ (4/82) اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بڑا اختلاف پاتے ○۔ جن آیات سے تکلم فی المہد کا استدلال کیا جاتا ہے وہ سورہ مریم کی یہ آیات ہیں ○ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ○ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ

آتَانِیَ الْکِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا o وَجَعَلَنِیْ مُبَارَکًا أَیْنَ مَا کُنتُ وَأَوْصَانِیْ بِالصَّلَاةِ وَالزَّکَاةِ مَا دُمْتُ حَیًّا o (19/29.30.31) o تو مریم نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا وہ لوگ بولے ہم گود کے بچے سے کیوں کر بات کریں o کہا تحقیق میں بندہ اللہ کا ہوں، مجھ کو اسی نے کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھ کو نبی بنایا ہے اور میں کہیں بھی رہوں مجھے مبارک بنایا ہے اور مجھ کو، جب تک زندہ رہوں صلوٰۃ کی اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

یہاں جن الفاظ سے مغالطہ ہوتا ہے وہ صرف فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا کے الفاظ ہیں حقیقت یہ ہے کہ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا کے الفاظ یہاں بطور محاورہ کے آئے ہیں اس سے مراد واقعاً گہوارہ کا بچہ نہیں ہے کیونکہ گہوارے میں لیٹے ہوئے بچے کو نہ کتاب دی جاتی ہے اور نہ ہی اس پر صلوٰۃ اور زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، یہاں جو کچھ حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے اس کے مطابق ان پر صلوٰۃ اور زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی جو گہوارے میں پڑے ہوتے بچے پر فرض نہیں ہو سکتی تھی، مَہد کے لغوی معنی مصباح اللغات نے گہوارہ تحریر کئے ہیں مگر شاہ رفیع الدین صاحب مرحوم اور مولوی حافظ فرمان علی صاحب مرحوم (شیعہ) دونوں بزرگوں نے مَہد کا ترجمہ گود کیا ہے۔ جو لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محاورۃ ترجمہ کیا گیا ہے اصل یہ ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کا تکلم فی المہد کا بیان قرآن کریم کا اپنا بیان نہیں ہے بلکہ قرآن کریم نے علماء یہود کے طنزیہ بیان کو صرف نقل کیا ہے اور خود اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے ایک اور مقام پر یہودیوں کے قول کو بجنسہ نقل کیا گیا ہے۔

o وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیحَ عِیسَى ابْنَ مَرْیَمَ رَسُولَ اللّٰهِ (4/157) o اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ اللہ کے رسول کو قتل کر ڈالا۔ یہاں یہود نے حضرت عیسیٰ کو رسول اللہ بطور استہزاء و استخفاف کے کہا ہے ورنہ اگر یہود ان کو رسول اللہ تسلیم ہی کر لیتے تو پھر کوئی اختلاف باقی ہی نہیں رہتا تھا تکلم فی المہد بھی صرف علماء یہود کا بیان ہے جو انہوں نے اپنی بزرگی، کبرسنی اور پیرانہ سالی کے مقابلہ میں اور حضرت عیسیٰ کی خوردگی اور کم عمری پر پھبتی کسی ہے اور قرآن کریم نے ان کی یہ پھبتی بجنسہ بلا تبصرہ نقل کرنے کے بعد خود حضرت عیسیٰ کے الفاظ میں اس

کی تردید کی ہے کہ وہ بچے نہیں تھے بلکہ پختہ عمر کے تھے۔ کیونکہ انہیں نبوت اور کتاب مل چکی تھی اور ان پر صلوٰۃ اور زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔

انبیاء پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتے تھے: قرآن کریم کی رو سے چونکہ یہ صاف طور پر واضح ہے کہ انبیاء کرام پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتے تھے اس لئے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچے نہیں ہوتے تھے بلکہ اتنی پختہ عمر ہوتی تھی کہ وہ وحی پر ایمان لا سکیں چنانچہ ارشاد حق ہے o آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ (2/285) o پیغمبر (محمدؐ) جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور ان کے (ساتھ) مومنین بھی۔ نیز ارشاد ہوا وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ (42/15) اور کہہ دو کہ ایمان لایا میں اس چیز کے ساتھ کہ اتارا ہے اللہ نے کتاب سے اور حکم کیا گیا ہوں کہ عدل کروں تمہارے درمیان۔ مزید یہ کہ حضرت لوطؑ کے متعلق ارشاد ہوا o فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي (29/26) o پس اس پر لوطؑ ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا کہ بے شک میں وطن چھوڑنے والا ہوں۔ ان آیات سے ظاہر ہے کہ جو وحی انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی تھی وہ خود بھی اس پر ایمان لاتے تھے۔

میثاق انبیاء: اس سلسلہ میں ایک عجیب وغریب نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی بچپن سے نبی ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کرنے سے پیشتر ہی عالم ارواح میں ہی ان کو نبی بنا دیا اور وہاں ہی ان سے عہد لیا تھا کہ اگر وہ حضور نبی اکرمؐ کے دور کو پائیں تو ان کی مدد کریں o وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ o فَمَن تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ o (3/81.82) o اور جب اللہ نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ ہم تم کو جو کچھ کتاب وہ حکمت دیں اس کے بعد تمہارے پاس کوئی رسول آئے اور جو کتاب تمہارے پاس ہے اس کی

تصدیق کرے تو (دیکھو) تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (اور) اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کرلیا اور زیادہ ہے پر جو ہم نے تم سے اقرار لیا تم نے میرے (عہد کا) بوجھ اٹھالیا؟ سب نے عرض کیا ہم نے اقرار کیا، ارشاد ہوا (اچھا) تو تم (آج کے قول وقرار کے) آپس میں ایک دوسرے کے گواہ رہنا اور تمہارے ساتھ میں بھی ایک گواہ ہوں o پھر اس کے بعد جو شخص (اپنے قول سے) منہ پھیرے تو وہی لوگ فاسق ہیں o۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ابن کثیر نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے عہد لیا کے اس کی زندگی میں اگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے تو ان پر فرض ہے کہ وہ آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی امداد کرے'' بالکل یہی مضمون تفسیر حسینی میں مندرج ہے۔ نیز مجمع البیان میں منقول ہے کہ ''حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک تمام نبیوں سے عہد لیا گیا کہ محمد مصطفیٰؐ مبعوث ہوں گے تو اگر تم زندہ ہو تو ان پر ایمان بھی لانا اور ان کی مدد بھی کرنا اور یہی عہد تمام نبیوں نے اپنی امتوں سے لیا۔ اور تفسیر صافی میں قمی اور عیاشی سے منقول ہے کہ حضرت صادقؓ نے فرمایا کہ تمام انبیاء ایک دفعہ پھر رجعت کریں گے اور امیر المومنین کی نصرت میں داخل ہوں گے'' تقریباً اسی مفہوم کو عام طور پر تفاسیر نے اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام سے عہد لیا تھا کہ وہ اگر حضورؐ کے دور کو پائیں تو ان کی مدد کریں۔ لیکن یہ مفہوم بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی نبی کو بھی جب حضورؐ کا دور پانا ہی نہیں تھا تو ان کی مدد کس طرح کر سکتے تھے۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین سے دو جگہ تسامح ہوا ہے ایک تو انہوں نے رسول کے لفظ سے حضورؐ کو مراد لیا ہے حالانکہ یہاں رسول نکرہ ہے اور اس سے کوئی بھی رسول مراد ہو سکتا ہے دوسرے انہوں نے لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ (3/81) کا مخاطب انبیاء کو لیا ہے۔ حالانکہ اس جگہ مخاطب بنی اسرائیل ہیں کیونکہ کتاب انبیاء کرام کی معرفت عوام کو دی جاتی تھی جیسا کہ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ (2/231)، مَا أُوتِيتُمْ (3/73) سے ظاہر ہے نیز اس بات کی تائید میں آیات (16/44-2/136-3/84-5/68-3/68) بھی ہیں کہ کتاب وحکمت عوام کو انبیاء کرام کی

معرفت دی جاتی تھی۔

آیت کریمہ کا صحیح مفہوم: آیت کریمہ کے الفاظ ٥ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ (3/81) میں نبیوں سے لیا ہوا عہد نہیں ہے بلکہ نبیوں کے متعلق بنی اسرائیل سے لیا ہوا عہد ہے کہ بے شک میں نے تمہیں کتاب وحکمت عطا کی ہے اگر تمہارے پاس کوئی بھی رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور بالضرور اس کی مدد کرنا نیز فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا فرمایا بس تم گواہ رہو میں بھی تمھارے ساتھ (اس عہد کے) گواہوں میں سے گواہ ہوں پھر اس پختہ عہد کے بعد جو روگردانی کریں گے پس وہ لوگ فاسقوں میں سے ہوں گے۔ اس آخری آیت نے بالکل واضح کر دیا کہ عہد ان لوگوں سے لیا گیا تھا جن میں سے بعض روگردانی اور عہد شکنی کرنے والے نہیں تھے اور بعض عہد شکنی کرکے فاسقوں میں سے ہونے والے تھے اور یہ خیال انبیاء کرام کے لئے کسی طرح بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پختہ وعدہ کرنے کے بعد اس سے پھر جائیں جنہیں نعوذ باللہ فاسق کا خطاب دیا گیا ہے بلکہ یہ عہد شکن بنی اسرائیل ہی تھے جن کا ذکر اس آیت کریمہ سے ماقبل اور مابعد مسلسل ہو رہا ہے اور اس کے باعث درمیان میں کسی چیستانی قسم کے معاہدہ کا امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ بہرحال نہ تو انبیاء کرام بچپن سے نبی ہوتے تھے اور نہ ہی ان سے ان کی ولادت سے قبل کوئی عہد لیا گیا تھا بلکہ وہ پختہ عمر ہونے کے بعد نبی ہوتے تھے اپنی وحی پر پہلے خود ایمان لاتے تھے اور پھر دوسروں تک اس کی تعلیم عام کرتے تھے اسی سنت اللہ کے مطابق حضورؐ کو بھی وحی عنایت فرمائی گئی تھی۔

حضورؐ کو عطا شدہ وحی صرف قرآن کریم میں ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو جو وحی عنایت فرمائی گئی ہے وہ صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ وحی کی دو قسمیں یعنی وحی جلی اور وحی خفی قرار دینا اور وحی جلی کو قرآن کریم کے اندر تسلیم کرنا اور وحی خفی کو قرآن کریم کے باہر قرار دینا، قرآن کریم کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے قرآن کریم کی آیات سے ظاہر ہے کہ وحی صرف قرآن کریم کے

اندر محفوظ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ (12/3) (میری طرف سے یہ قرآن تمھاری طرف وحی کیا) اور حضورؐ کا اقرار ہے کہ واوحی الی ھذا القرآن (میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے) دونوں آیات میں اسم اشارہ ھذا لاکر حصر کر دیا گیا ہے۔ جو کمل التمیز کا فائدہ دیتا ہے کہ یہی قرآن ہم نے نازل کیا اور یہی قرآن مجھ پر نازل کیا گیا ہے دونوں آیات سے مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم کے علاوہ کسی بھی چیز کو وحی کرنے کی خبر قرآن کریم میں نہیں ہے اگر قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور چیز بھی دی جاتی تو اس کا ذکر بھی قرآن کریم میں ضرور کیا جاتا۔ آپ سارے قرآن مجید کا مطالعہ کر جائیں کسی جگہ بھی قرآن کریم کے علاوہ کسی چیز کو وحی کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

کتاب و ما انزل ایک ہی چیز ہے: سورۃ انعام میں ارشاد ہوا o وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ o (6/155) o اور یہ کتاب جس کو ہم نے نازل کیا ہے برکت والی کتاب ہے تو تم لوگ اسی کی پیروی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے o۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ o اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (7/3) o جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ پہلی آیت کریمہ میں کتاب کے اتباع کا حکم ہے اور دوسری میں مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ کے اتباع کا حکم ہے صرف الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال Substitute کیا گیا ہے دونوں آیات کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ صرف کتاب ہے جس کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے نیز ارشاد الٰہی ہے o آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ (2/285)

o پیغمبر جو کچھ ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور ان کے ساتھ مومنین بھی۔ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ آیت بالا سے ظاہر ہے کہ انبیاء کرام پر کتاب کے علاوہ کوئی چیز نازل نہیں کی گئی ورنہ

ایمان رسول وایمان صحابہ کی تعریف میں کُتُبِــــہٖ کے ساتھ وہ بھی درج ہوتی۔ نیز یہ کہ کِتٰبٍ نے مَــا اَنـزَلَ لَـہٗ کی خود وضاحت کردی ہے۔ کہ مَــآ اَنــزَلَ اللّٰہُ صرف کتاب ہے۔ اور ایمان صرف کِتٰبٍ پر لانا ہی ضروری ہے مومن کا ایمان تو جب ہی درست ہوسکتا ہے جب وہ ان چیزوں پر ایمان لائے جن پر حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ ایمان لائے تھے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضورؐ خود بھی اور آپؐ کے صحابہؓ کبار بھی (1) اللہ تعالیٰ (2) ملائکہ (3) کتب (4) رسل پر ایمان لائے تھے خارج از کتاب وحی پر ایمان لانے کا کوئی ذکر اس آیت میں نہیں ہے مزید یہ کہ حضورؐ کا ارشاد گرامی وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ (42/15) (کہہ دو جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان لایا) بھی قطعی حجت ہے کہ حضورؐ خود بھی صرف کتاب پر ایمان لائے تھے کتاب کے علاوہ بھی اگر حضورؐ پر کوئی وحی ہوئی ہوتی تو حضورؐ یقیناً اس پر ایمان بھی لاتے اور دونوں آیات میں اس کا ذکر ضرور کیا جاتا۔

حصر نزول: ٥اَفَمَــنْ یَعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی (13/19)٥وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے، اس شخص کے برابر ہوسکتا ہے جو مطلق اندھا ہے؟ آیت ہذا میں اَنَّمَا کلمہ حصر ہے جس سے بالتحقیق ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضورؐ کی طرف حق یعنی قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور چیز نازل نہیں کی گئی ہے اور فقط قرآن کریم ہی نازل کیا گیا ہے کیونکہ مختلف آیات (3/60-3/74-4/70-10/76-10/94-35/31) اور دیگر بے شمار مواقع میں قرآن کریم نے صرف اپنے لئے ہی حق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایسے کلمہ حصر کے ہوتے ہوئے قرآن کریم کے علاوہ کسی اور کتاب کو وحی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے اس آیت میں مــا تعمیم کا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو میرے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے وہ صرف حق یعنی قرآن کریم ہے اور حق کے علاوہ کوئی چیز نازل نہیں کی گئی ہے۔

ما یوحی اور قرآن ایک ہی چیز ہے: ٥وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (18/27) ٥اور جو کتاب تمہارے پروردگار کی طرف سے وحی کے ذریعہ نازل ہوئی ہے اس کو پڑھا کرو اس کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ سورۃ نمل میں ارشاد ہوا وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ٥وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ (27/91.92) اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں ٥اور یہ کہ میں قرآن پڑھا کروں۔ پہلی آیت میں ما یوحی اور قرآن کریم ایک ہی چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کیے گئے ہیں اور ما یوحی صرف قرآن کریم ہے۔ نیز یہ کہ پہلی آیت میں من بیانیہ ہے۔ یہ کسی طرح بھی تبعیضہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے من بیانیہ نے مَا أُوحِيَ کی تشریح خود کر کے واضح کر دیا کہ مَا أُوحِيَ یعنی کتاب کی تلاوت کا حکم ہے اور ما یوحی صرف کتاب ہے۔

وحی صرف قرآن کریم میں ہونے کے عقلی دلائل: علماء کرام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قرآن کریم کے علاوہ بھی حضورؐ کا ہر قول وحی الٰہی تھا اور وحی صرف قرآن کریم میں محصور نہیں ہے لیکن یہ موقف بوجوہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اگر قرآن کریم کے علاوہ بھی حضورؐ کا ہر قول وحی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ اپنی فراست سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ اور صرف وحی کے الفاظ ہی حضورؐ کی زبان مبارک سے ادا کرائے جاتے رہتے تھے۔ حالانکہ قرآن کریم میں جگہ جگہ تمام مومنین کو حکم ہے کہ تدبر، تعقل اور عقل و فکر سے کام لیں۔ جس میں حضورؐ بھی شامل ہیں نیز حضورؐ کے متعلق واضح ارشاد ہے کہ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12/108) میں اور میرا پیرو (دونوں) مضبوط دلیل پر ہیں۔

لیکن عام نظریہ یہی ہے کہ آپؐ اپنے اختیار و ارادہ کے مالک نہیں تھے اور نہ ہی آپؐ میں فکر و نظر کی آزادی تھی آپؐ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے، نہ ہی آپؐ اپنی مرضی سے کسی معاملہ میں کوئی Initiative اقدام لے سکتے تھے اور نہ ہی کوئی لفظ سوچ سے بول سکتے تھے، لیکن یہ نظریہ نہ صرف قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس سے حضورؐ کی توہین بھی ہوتی ہے کہ آپؐ اپنی فراست

اور اختیار سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ فراست اور اختیار انسان کا مابہ الامتیاز شرف ہے جس سے عام لوگوں کو بھی محروم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضورؐ کا ہر قول ان کے اپنے فہم اور اختیار کا نتیجہ تھا آپؐ اپنی فراست فراوان اور ذکاوت بے پایاں سے کام لیتے تھے اور اس سے آپؐ نے قرآن کریم کے پورے نظام کو اپنی حیات مبارکہ میں متشکل Establish کر کے دنیا کو دکھایا۔ قرآن کریم صرف اصول وقواعد بیان فرماتا تھا۔ حضورؐ نے اپنی فراست اور اپنے اختیار سے اس کو بطور نظام جاری فرمایا تھا قرآن کریم کے علاوہ حضورؐ کا ہر قول اپنا ذاتی، بشری، عقل وفہم کا نتیجہ ہوتا تھا نہ کہ وحی الٰہی۔ اسی لئے روایات کے مجموعے وحی الٰہی نہیں ہیں بلکہ حضورؐ کے ذاتی فہم وذکاء کی کوشش کے نتائج ہیں۔

بروز قیامت جملہ انبیاء جوابدہ ہونگے: قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق قیامت کے روز ہر شخص اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے o فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِيْنَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ o (7/6) o پھر ہم تو ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے (ہر چیز کا) سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے o۔ اس سے ظاہر کہ بروز قیامت جملہ انبیاء کرام اور جملہ امم اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہیں۔ امتوں سے سوال ہوگا کہ انہوں نے انبیاء کرام کو کیا جواب دیا۔ ان سے سوال ہوگا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (6/130) کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے میرے رسول نہیں آئے تھے اور آج کے دن کی حاضری سے تمہیں آگاہ کرتے تھے امتوں سے سوال اتمام حجت کے لئے کیا جائے گا اور مرسلین سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے میرا پیغام پہنچایا تھا نیز جو کچھ تمہاری امتیں تمہاری تعلیم کردہ ہدایت کے نام سے امور سرانجام دیتی رہی تھیں کیا تم نے خود اس کی انہیں تعلیم دی تھی یا انہوں نے خود یہ تعلیم تمہاری طرف منسوب کر دی تھی۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ سے سوال ہوگا۔

o وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (5/116) o اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ سے سوال

کرے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے ساتھ ملا کر دو الہٰ بنالو۔ حضرت عیسیٰ سے یہ سوال اس لئے ہوگا کہ ان کی امت کا خیال ہے کہ تین الہٰ کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ اس پر حضرت عیسیٰ مطلقاً نفی میں جواب دیں گے۔ اسی طرح حضورؐ کی امت میں یہ عقیدہ بطور مسلمہ کے رائج ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ انی اوتیت ومثلہ القران ومسبہ معہ کہ مجھے قرآن کریم بھی دیا گیا ہے اور اس کی مثل بھی دی گئی ہے۔

چنانچہ حضورؐ سے ارشاد الہٰی ہوگا کہ قرآن کریم کے مثل وحی دیے جانے کی تعلیم کیا آپؐ نے خود اپنی امت کو دی تھی جس کے باعث امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا جس پر حضورؐ شکایتاً ارشاد فرمائیں گے o وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا o (25/30) o اور وہ وقت قابل ذکر ہے جس وقت اللہ کا رسول یہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا ہوا تھا میں نے انہیں اس عقیدہ کی ہرگز تعلیم نہیں دی تھی o

چنانچہ جملہ انبیاء کرام سے بروز محشر سوال ہوگا کہ انہوں نے اپنی نبوت کے فرائض کما حقہ ادا کر دیے تھے یا نہیں۔ چنانچہ حضرت یونسؑ کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ ان سے تبلیغ رسالت میں غصہ کی وجہ سے لغزش واقع ہوئی اور اسی وجہ سے حضورؐ کو حکم ہوا کہ آپؐ ان کی طرح نہ ہو جائیں۔ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ (68/48) نیز ایک جگہ بطور خاص حضورؐ سے ہی فرما کر آنجناب کو جواب دہ قرار دیا گیا ہے چناں چہ ارشاد ہوا o وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ o (43/44) پس آپ کہ عقلی واختیاری کام جو ابھی زیر حساب اور ماتحت محاسبہ تھے وہ پیشتر سے وحی الہٰی کیسے قرار پا سکتے ہیں۔ نیز آپؐ کو صحابہ کرامؓ کے ساتھ مشوروں سے پختگی حاصل کرنے کا حکم بھی تھا (3/159) لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کے اقوال وحی الہٰی نہیں تھے بلکہ آپؐ کے ذاتی، بشری، اختیاری مبنی بر بصیرت اقوال ہوتے تھے اور وحی نہیں ہوتے تھے وحی صرف قرآن کریم کے اندر محصور ہے۔ البتہ کتب روایات حضورؐ کی فکری کاوشوں کے نتائج ہیں اور بس۔

کفار کا اعتراض: کفار اعتراض کیا کرتے تھے کہ قرآن کریم پورے کا پورا یک وقت کیوں نازل نہیں کر دیا گیا؟ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا o وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا o(25/32.33)o اور کفار کہنے لگے کہ ان کے اوپر قرآن کل کا کل ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا (ہم نے اس طرح اس لئے (نازل کیا) تاکہ تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا o اور یہ کفار چاہے کیسی ہی (انوکھی) مثل بیان کریں مگر ہم تمہارے پاس (اس کا) بالکل ٹھیک جواب لے آتے ہیں تاکہ ہم بہترین تفسیر بھی کر دیں o کفار کے جواب میں قرآن کریم کو نجماً نجماً نازل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے تین وجوہات بیان فرمائی ہیں۔

پہلی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم کو نجماً نجماً نازل کرنے سے حضورؐ کی تسکین قلب مقصود تھی جب کبھی بھی حضورؐ نامساعد حالات سے دوچار ہوتے اور دل گرفتگی محسوس ہوتی تو حضورؐ کی ہمت بڑھانے کے لئے وحی کا نزول ہوتا تھا اور حضورؐ کی اس سے دل جمعی کی جاتی تھی۔ دوسری وجہ قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے کہ جو اعتراضات کفار قرآن کریم پر کرتے تھے یا دین کی صحیح تعلیم حاصل کرنے کے لئے مختلف سوالات کرتے تھے ان کے قرآن کریم میں ہی جوابات دیے جا سکیں۔ تیسری وجہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے تاکہ قرآن کریم کی ضروری تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہوتی جائے۔ ان تینوں بیان کردہ وجوہات سے عیاں ہے کہ وحی صرف قرآن کریم میں ہی ہے اگر قرآن کریم کے علاوہ بھی حضورؐ کو کوئی اور وحی ملتی ہوتی تو اس کے ذریعہ ہی یہ تینوں امور سرانجام دیے جاسکتے تھے اور اگر وحی خارج از قرآن تسلیم کرلی جائے تو کفار کے اعتراضات کے جوابات جو اس آیت کریمہ نے دیے ہیں درست نہیں ٹھہر سکتے۔ قرآن کریم کا بیان کردہ یہ جواب صرف اس صورت میں ہی درست ٹھہر سکتا ہے جب وحی صرف قرآن کریم میں ہی تسلیم کی جائے۔ یہ آیت کریمہ اس موضوع پر حجت قاطعہ اور برہان ساطعہ کا درجہ رکھتی ہے کہ حضورؐ کو قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں ملتی تھی۔

وحی کی امتیازی خصوصیات: قرآن کریم نے خود وحی کی چند امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وحی صرف قرآن کریم ہے اور روایات ان معیار Criterian پر صحیح نہیں اترتیں جو معیار اور خصوصیات قرآن کریم نے وحی کی بیان فرمائی ہیں: (1) وحی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ o وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُمْ (2/41) o اور ایمان لاؤ ساتھ اس کے جو میں نے نازل کی درانحالیکہ وہ تصدیق کرنے والی ہے۔ اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے اسی وجہ سے ہم قرآن کریم پر ایمان لاتے ہیں لیکن روایات پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے اسی وجہ سے کوئی مسلمان ان پر ایمان نہیں لاتا جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وحی نہیں ہیں۔ (2) وحی کے ایک ایک لفظ کو درست سمجھنا ضروری ہے وحی کے کسی لفظ کا انکار بھی مستلزم کفر ہے۔ اسی وجہ سے ہم قرآن کریم کی کسی آیت کا انکار نہیں کر سکتے اس کے بر خلاف روایات کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ ذخیرہ روایات میں سے کچھ درست تسلیم کی جاتی ہیں اور بہت کچھ کا انکار بھی کیا جاتا ہے۔ (3) وحی قطعی ہوتی ہے اسی لئے قرآن کریم قطعی ہے o وَبِالْحَقِّ أَنزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (17/105) o ہم نے اس قرآن کو بالکل ٹھیک نازل کیا اور یہ بالکل ٹھیک نازل ہوا۔ قرآن کریم میں کسی قسم کے شک وظن کا کوئی گذر نہیں۔ اس کے برخلاف روایات بالکل ظنی اور قیاسی روایات کے اس قدر کثیر مجموعے میں سے کسی ایک روایت کے متعلق حتمی اور قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعاً حضورؐ کا قول ہے (4) وحی صرف متلو ہوتی ہے۔ o كَذَلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَنِ (13/30) o اور اے رسول اسی طرح ہم نے تم کو اس امت میں بھیجا۔ جس سے پہلے اور بھی بہت سی امتیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو کچھ ہم نے تمہیں وحی کیا ہے اس سے واضح ہے مطلق مایوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضورؐ فرمایا کرتے تھے قرآن کریم چونکہ وحی ہے اس لئے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ روایات بھی اگر وحی ہوتیں تو ان کی تلاوت کی جاتی۔

قرآن میں لفظ روح کا استعمال: قرآن کریم نے متعدد مقامات پر لفظ رُوحَ کا

استعمال وحی کے معنی میں کیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہےo رَفِیۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الۡعَرۡشِ ۚ یُلۡقِی الرُّوۡحَ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ لِیُنۡذِرَ یَوۡمَ التَّلَاقِ o(40/15)o اللہ تعالیٰ تو عالی مرتبہ عرش کا مالک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی نازل کرتا ہے تا کہ وہ (بندہ) ملاقات کے دن سے ڈرائےo (ترجمہ، حافظ فرمان علی صاحب) دوسری جگہ ارشاد ہواo یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ (16/2)o وہی اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہتا ہے وحی دے کر فرشتوں کو بھیجتا ہے (ترجمہ، حافظ فرمان علی صاحب) نیز ارشاد ہواo وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (42/52)o اور اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف اپنے حکم سے رُوح وحی کی۔ یہاں اَوۡحَیۡنَا فعل کا مفعول رُوح لاکر قطعی طور پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ رُوح کے معنی وحی کے ہیں۔ ان ہر سہ مقامات میں قرآن کریم نے رُوح کا لفظ وحی کے معنی میں استعمال فرمایا ہے اور ہر جگہ وضاحت فرمادی کہ رُوح کا تعلق عالم امر سے ہوتا ہے عالم خلق سے نہیں ہے۔

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ اللہ کی دنیا، اس کی پیدا کردہ مادی کائنات ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ماوراء بھی ہے۔ قرآن کریم نے مادی کائنات کو عالم خلق قرار دیا ہے اور اس ماورائی دنیا کو عالم کہہ کر پکارا ہے۔ ارشاد ہوا اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ (7/54) آگاہ ہو کر عالم خلق اور عالم امر دونوں اللہ کی، دنیائیں ہیں۔ عالم امر کے متعلق انسانی ذہن صحیح طور پر کچھ نہیں جان سکتا۔ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ کرفرما ہوتا ہے اور وہاں سے ہی عالم خلق کے متعلق فیصلے ہوتے ہیں اور اس کے قوانین مرتب ہوتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کا ارادہ بالکل آزاد ہوتا ہے اور کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا اس کے برخلاف عالم خلق کا نظام اللہ تعالیٰ نے قواعد وضوابط کے ماتحت کیا ہوا ہے اور کوئی کام قوانین خداوندی کے خلاف انجام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ عالم اسباب وعلل ہے اور اس عالم میں تمام امور اسباب وعلل کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

سابقہ تحریر کردہ ہر سہ آیات سے واضح ہے کہ وحی الٰہی کا تعلق عالم امر سے ہے اور عالم

امر کا تعلق مشیت خداوندی سے ہے۔ وہاں علل و اسباب کا کوئی سوال نہیں ہے عالم امر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مشیت اور ارادہ پر منحصر ہوتا ہے۔ وحی ایک بخشش عظمیٰ ہوتی ہے جس میں نبی کی سوچ کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بھی حضورؐ کی ذاتی سوچ اور فکر کا کوئی دخل نہیں تھا اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں اور ان کا انتخاب عالم امر میں ہوا ہے۔ اس کے برخلاف اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ وہ اسباب و علل کے ماتحت ہوتے تھے جب کوئی مقدمہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوتا تھا اس کے تمام کوائف حضورؐ کے سامنے لائے جاتے تھے تو حضورؐ ان تمام حالات و کوائف پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنی بصیرت سے کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے۔ اور اس فکر اور نتیجہ کو اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے وہ الفاظ حضورؐ کے اپنی بصیرت پر مبنی ہوتے تھے اور حضورؐ ان لفظوں کا انتخاب فرماتے تھے۔ یہ پورا Process بالکل عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے اس پورے Process کا عالم امر سے کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ وحی (قرآن) کا تعلق کلیۃً عالم امر سے ہے۔

وحی صرف انبیاء کرام کو ہی ملتی تھی: ٥وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (42/51)٥ اور کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے۔ غرض وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں ایک مرسلین اور دوسرے مرسلین کے علاوہ تمام عام انسان (2/97) پہلے رسولوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان تک وحی الٰہی کس طرح پہنچتی تھی۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک اس وحی کے ذریعے جو ذریعہ کی وساطت سے ارسال کی جاتی تھی۔ جیسے کہ محمدؐ پر وحی آتی تھی۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2/97) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست اختیار کیا گیا اس طرح کہ صرف آواز سنائی دے جیسے کہ حضرت موسیٰ کی طرف وحی جس میں فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ٥(20/13) سے پیشتر بالوضاحت نودی یا موسیٰ کہا گیا۔

یہ دونوں طریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔ باقی رہے عام انسان تو ان کے لئے فرمایا۔ کہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا تھا اور ان رسولوں کی معرفت اپنا علم اللہ تعالیٰ عام انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ کسی بھی غیر رسول سے اللہ نہ تو کلام کرتا تھا اور نہ ہی اس کی طرف فرشتے کے ذریعے کوئی وحی بھیجتا تھا۔ عام انسانوں یعنی غیر از انبیاء کو جو بھی علم اللہ کی طرف سے ملا وہ صرف اور صرف انبیاء کرام کی معرفت ہی ملا ہے۔

اس آیت کریم کے مضمون کی تائید میں سورۃ جن میں فرمایا گیا کہ ٥عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ٥إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (72/26.27)٥وہی غیب دان ہے اور اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا٥ مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ نیز فرمایا کہ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ (3/179) اللہ ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی باتیں بتادے مگر وہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چن لیتا ہے۔ ان دونوں آیات بینات سے اس مفہوم کی مزید توثیق فرمادی کہ جو کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عالم انسانیت کو ملا وہ صرف انبیاء کرام ہی کو ملا تھا اور اس کا واحد ذریعہ وحی تھی۔ البتہ غیر از نبیاء کی وحی ہونے کے لئے آیہ کریمہ ٥وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ (21/73)٥اور ان سب کو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے تھے۔ اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے کی وحی بھیجی تھی۔ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ انبیاء کے علاوہ آئمہ کو وحی ہوتی تھی۔ لیکن یہ استدلال آیت کریمہ کے سیاق وسباق سے الگ کر کے کیا جاتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے بیشتر انبیاء کرام کا ہی ذکر تسلسل سے چلا آرہا ہے۔ اور اس کے بعد یہ آیت کریمہ ہے۔ جس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ یہ تمام انبیاء کرام اپنی اپنی قوم میں کوئی پست درجہ کے لوگ نہیں تھے بلکہ ہم نے ان سب کو اپنی اپنی قوم میں رہبر لیڈر اور رہنما بنایا تھا۔ اور انہیں حکم تھا کہ وہ نیک کام کریں۔ یہاں جن مقدس ہستیوں کی طرف وحی کرنے کا ذکر ہے وہ سب اپنی اپنی قوم کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ نبی بھی تھے۔ ان میں کوئی ایک مقدس شخصیت بھی

غیر از نبی نہیں تھی۔

گزشتہ وآئندہ کا علم بھی وحی کے ذریعے ہی ملتا تھا: ٥ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ (3/44)٥ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں۔ سورہ ہود میں حضرت نوحؑ کا پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا٥تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا (11/49)٥ یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کے ذریعے پہنچاتے ہیں جو اس سے قبل نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم جانتی تھی۔

ان آیات بینات سے بخوبی واضح ہے کہ حضورؐ کو جو علم گزشتہ اقوام وملل کا دیا گیا تھا وہ صرف وحی کے ذریعے دیا گیا تھا۔ نیز یہ کہ آئندہ کا علم بھی وحی کے ذریعے ہی دیا گیا تھا چنانچہ بیت الحرام کو مسلمانوں کی تحویل اور تولیت میں آنے کے لئے فرمایا گیا کہ فَلَـنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰٮهَا (2/144) اس کے بعد فتح مکہ کی خبر پیش از وقت دی گئی۔ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ (48/27) فتح روم کی اطلاع بھی سورہ روم کی ابتدائی آیات میں دی گئی یہ تمام خبریں قبل از وقوع حضورؐ کو دی گئیں جو وحی کے ذریعے ہی دی گئیں تھیں۔ انبیاء کرام کو گذشتہ یا آئندہ کا جو علم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جاتا تھا وہ صرف وحی کے ذریعے ہی دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعہ علم الٰہی حاصل ہونے کا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ مطلق عالم الغیب ہے۔ انبیاء کرام کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کرتا تھا۔ چونکہ وحی اب تمام تر صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ کردی گئی ہے اور کوئی ایک لفظ بھی وحی کا قرآن کریم کے باہر نہیں ہے اور قرآن کریم کے بعد وحی کا سلسلہ بھی ختم کردیا گیا ہے اس لئے اب کسی شخص کا غیب کا علم حاصل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو شخص بھی غیب کا علم حاصل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ختم نبوت کی تردید کرتا ہے۔

نظریہ کشف والہام: کشف والہام کے ذریعہ علم الٰہی حاصل ہونے کا نظریہ بھی عام طور پر مروج ہے۔ خصوصاً صوفیاء کرام کی تو بنیاد ہی اس نظریہ پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم کشف والہام

کے ذریعہ بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ اور اولیاء کرام صوفیاء کرام مکالمہ الٰہی اور مخاطبہ خداوندی سے سرفراز ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ کشف کے لغوی معنی امام راغب نے چہرہ پر سے پردہ اٹھانے کے کہے ہیں۔ نیز تحریر کیا ہے کہ مجازاً اس کے معنی غم واندوہ کے دور کرنے کے بھی ہیں چنانچہ قرآن کریم نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ علم الٰہی حاصل ہونے کے لئے یہ لفظ قرآن کریم میں کسی جگہ بھی استعمال نہیں ہوا۔ جہاں تک الہام کا تعلق ہے۔ اس کے معنی امام راغب نے کسی چیز کو نگل جانے کے لئے کہے ہیں۔ التھم الفیصل مافی الضرع۔ اونٹنی کے بچے نے تھنوں سے تمام دودھ نگل لیا۔ قرآن کریم نے یہ لفظ صرف ایک جگہ سورۃ الشمس میں استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ o فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا o(91/8) جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اندر دونوں طرح کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ خواہ وہ اپنی نفس کو نیک عمل کر کے مضبوط کر دے اور خواہ وہ برے کام سرانجام دے کر نفس کو مضمحل اور کمزور بنا دے۔ فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا کی ضمیر ''ھا'' خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بیان نفس کی دونوں کیفیات کا کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ دراصل یہاں انسان کے اختیار و ارادہ کو بیان کیا جا رہا ہے کہ ان کے اندر یہ دونوں صلاحیتیں ودیعت کر دی گئی ہیں اب یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان دونوں صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے اس کے علاوہ الہام کا لفظ قرآن کریم میں کسی جگہ استعمال نہیں ہوا جس سے براہ راست حاصل ہونے کی سند لائی جا سکے۔ مختصر یہ ہے کہ۔

(1) انسان کی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلسل انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور انہیں براہ راست (بذریعہ ملائکہ) اپنی طرف سے علم عنایت فرمایا جو وحی کہلائی جاتی ہے۔ (2) اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی پوری انسانیت کو حاصل ہوا وہ صرف وحی کے ذریعے حاصل ہوا ہے وحی حصول علم الٰہی کا واحد ذریعہ تھا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ علم الٰہی حاصل کرنے کا نہ تھا اور نہ ہے حضرت نوحؑ سے لے کر حضورؐ تک تمام انبیاء کرام کو علم الٰہی وحی کے ذریعے ہی ملا۔ (3) وحی صرف انبیاء کرام

کو ملتی تھی انبیاءِ کرام کے علاوہ کسی کو بھی یہ علم براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ملا۔(4) نبوت چونکہ حضوؐر پر ختم ہوگئی، اس لئے اللہ تعالیٰ سے براہ راست (بذریعہ ملائکہ) علم حاصل ہونا، اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا، اس کی طرف سے وحی حاصل ہونا بالکل بند ہو گیا ہے، حضوؐر کے بعد علم الٰہی حاصل ہونے کا عقیدہ ختم نبوت کی نقیض ہے۔

(5) حضوؐر کو جو وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی وہ قرآن کریم میں بہ تمام وکمال محفوظ ہے وحی کا ایک لفظ بھی قرآن کریم سے باہر نہیں ہے وحی صرف قرآن کریم میں ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے۔

وھھنا منا تم الکلام! علی مصطفنا الوف سلام

ماہ مئی 2004ء

مسئلہ ایصالِ ثواب

مغربی مؤرخین عموماً یہی بات دہراتے رہتے ہیں کہ واٹرلو(Waterloo) کی لڑائیوں نے یورپ کا نقشہ بدل دیا۔ اسی طرح مشرقی مؤرخین بھی یہ ادعا کرتے ہیں کہ پانی پت کی لڑائیوں نے مشرق کا نقشہ بدل دیا۔ جب کہ قرآن کریم کا طالب علم خوب سمجھتا ہے کہ بدر کی لڑائی نے تمام دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ نہ صرف اپنے دور میں بلکہ ہمیشہ کے لئے مٹھی بھر مسلمانوں نے انسانیت کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ اور مسلمانوں نے برقِ تپاں کے طور پر تمام نظام ہائے حیات کو خاکستر کر کے اپنا انسانیت پرور نظام جاری کر دیا جس میں پہلی اور آخری مرتبہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اس کے بعد انسانیت اپنے لئے مختلف نظام ہائے حیات بناتی اور توڑتی رہی، لیکن آج تک تو کسی بھی نظام میں انسان کو سکون حاصل نہیں ہوا۔ لیکن صد بافسوس کہ وہی مسلمان جنہوں نے وہ انسانیت ساز نظام قائم کیا تھا، انہوں نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے اس نظام کی شکست و ریخت کی۔ مسلمانوں کا عروج و زوال چونکہ ان کے نظام سے وابستہ تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس شکست و ریخت کے بعد وہ خود کیسے مصئون و مامون رہ سکتے تھے۔ اس کے بعد ان کے مقدر میں جور و سیاہی لکھی گئی، آج تک مسلمان اسی سے دوچار ہیں اور جب تک وہ دوبارہ اس قرآنی نظام کو قائم نہیں کر لیں گے اس بربادی اور تباہی سے کبھی نہیں نکل سکتے۔

قرآن کریم کے نظام کے منقرض ہونے کا منطقی نتیجہ مسلمانوں کا زوال و ادبار تھا۔ اس دور میں مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری در آئی اور اس کے ساتھ ساتھ ہر وہ عقیدہ و نظریہ جو مسلمانوں کو برباد کرنے والا تھا، انہوں نے اختیار کر لیا۔ تصوف، دنیا سے نفرت، فرقہ بندی،

فکری جمود و تعطل، تقلید آباء، رجعت پسندی، الہام، کشف، وسیلہ، شفاعت، قبر پرستی، سب مسلمانوں میں آ گئے۔ قرآنی نظام تو منقرض ہو ہی چکا تھا، اس لئے قرآن کریم بھی آخری سند نہیں رہا تھا۔ دین میں تو آخری سند قرآن کریم ہوتا ہے، لیکن مذہب میں قرآن کریم آخری سند نہیں ہوتا، اس میں آخری سند کوئی نہ کوئی شخصیت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دین میں فرقہ بندی نہیں ہوسکتی، فرقہ بندی صرف مذہب میں ہوتی ہے۔ جب قرآن کریم کا مقام آخری سند کی حیثیت سے نہ رہا تو پھر مسلمان آزاد تھے، جو بھی نظریہ اور عقیدہ قائم کرلیں۔ ان کی سند احادیث، روایات اور آثار سے بخوبی اور آسانی سے مل جاتی تھیں۔ ان نظریات و عقائد کی فہرست طول طویل ہے کیونکہ اب تو ہم مسلمانوں کے اسی فیصد نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان نظریات میں کچھ زیادہ نقصان دہ تھے اور کچھ کم۔ مثلاً نزول مسیح و آمد مہدی کا نظریہ زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا جو قطعاً قرآن کریم کے خلاف ہے اس نظریے کی وجہ سے ہر دور میں نئے نئے فرقے بنتے رہے۔ صرف ہمارے اپنے دور میں مہدی سوڈانی، بہاء اللہ، مہدی جونپوری اور مرزا غلام احمد۔ ان تمام حضرات اپنا اپنا نظریہ قائم کیا اور امت کو مزید نقصان پہنچایا۔ اس سے پیشتر صدر اول سے لے کر اب تک تقریباً ۳۰ مدعیین سابقہ ادوار میں گذر چکے ہیں، جنہوں نے اس قسم کے دعاوی کئے۔ ان خلافِ قرآن نظریات کی تفصیل، جیسا کہ عرض کیا بہت طویل ہے، اس سلسلۂ مضامین میں ہر خلافِ قرآن عقیدے کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا جائے گا، اور آیاتِ قرآنی کی مدد سے ان کا خلافِ قرآن ہونا ثابت کیا جائیگا۔ اس وقت اس مضمون کا موضوع عقیدہ ایصالِ ثواب ہے، جو قطعاً قرآن کریم کے خلاف ہے اور جس نے مسلمانوں کو عمل سے برگشتہ کرنے میں کافی کردار ادا کیا ہے۔

ایصال ثواب کا نظریہ ہم مسلمانوں میں تقریباً ہر فرقے میں تسلیم کیا جاتا ہے اور تقریباً ہر مسلمان اس کا قائل ہے۔ اصل یہ ہے کہ چونکہ ثواب کا قرآنی مفہوم مسلمانوں کے سامنے نہیں رہا اسی لئے ایصالِ ثواب کا نظریہ قائم ہوا، لیکن اگر ثواب کا قرآنی مفہوم پیشِ نگاہ ہو تو ایصالِ ثواب کے ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ثواب کا قرآنی مفہوم سمجھنا ضروری

ہے۔

ثواب کا قرآنی مفہوم: مصباح اللغات میں ثواب کے لغوی معنی 'لوٹنا'، 'اکٹھا ہونا' اور 'بدلہ دینا' لکھے ہیں۔ اور جو چیز چلی جائے اس کا واپس آجانا۔ کوئی بھی کام جس کے سرانجام دینے میں آپ محنت کریں، اپنی قوت صرف کریں، اس کا جو بھی بدلہ آپ کو حاصل ہو وہ اس کا ثواب ہے۔ آپ نے سارا سال کرکٹ کی پریکٹس کی۔ سال کے بعد آپ نے میچ جیت لیا تو آپ کو سارے سال کی محنت کا ثواب حاصل ہوگیا۔ آپ نے سارا سال اپنی تعلیم کے سلسلے میں محنت کی، سال کے بعد آپ امتحان میں کامیاب ہوگئے تو آپ کو اپنی محنت کا ثواب مل گیا۔ قرآن کریم نے ثواب کے مفہوم کو خود ہی خوب واضح فرمادیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ o إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا o(18/30)o بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے، تو بے شک ہم ان کے اچھے اعمال کا بدلہ ضائع نہیں کرتے o۔ لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا o (ترجمہ: اچھے اعمال کا بدلہ ضائع نہیں کرتے) کی وضاحت اگلی آیت میں نِعْمَ الثَّوَابُ سے کردی۔ یعنی اجر کا ضائع نہ ہونا، اور اس کا پورا پورا بدلہ مل جانا ثواب ہے۔ یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کا بدل اور بدل منہ ہیں۔ یعنی اعمال کا جو بدلہ ملتا ہے وہ ثواب ہے، اعمال کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ ان اعمال کے ثواب ہیں۔ ایمان اور اچھے اعمال کے ثواب کی مزید وضاحت فرمادی کہ سرفرازی و سربلندی کے نشانات اعلیٰ مراتب کی نشست گاہیں اور عمدہ لباس ہوں گے۔(18/31)

نیز سورۃ مائدہ میں o فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ o(5/85) یہاں فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ کی وضاحت جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ سے کردی کہ یہ ان کے ایمان و عمل کا بدلہ ہے۔ اسی طرح بیعت رضوان کے سلسلہ میں بیان ہوا کہ جب صحابہ کرامؓ نے سخت نامساعد حالات کے پیش نظر حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی جانیں قربان کرنے پر آمادہ ہوگئے تو اس کے بدلے کے لئے ارشاد ہوا کہ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا

قَرِیۡبًا o وَّ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً (48/18.19) اور انعام دی ہم نے انہیں ایک قریبی فتح o اور بہت مالِ غنیمت ۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ مومنین کو جو فتح قریب اور مالِ غنیمت حاصل ہوئے وہ ان کی بیعتِ رضوان اور قربانیوں کا ثواب تھا۔ اس آیت نے ثواب کی مزید تشریح کر دی کہ اعمال خود ہی اپنا ثواب یا اپنی جزا ہوتے ہیں، اور خود عمل کے اندر ہی اس کا نتیجہ پوشیدہ ہوتا ہے ۔ ان ہر سہ مقامات میں جو مثال کے طور پر تحریر کئے گئے ہیں، ان سب میں قرآن کریم نے اعمال کے نتیجے کو ہی ثواب بیان فرمایا ہے۔ اور دوسری بات یہ واضح فرما دی کہ ان اعمال کا بدلہ یا ثواب مشہود ہوتا ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی کہ جو محسوس نہ ہو۔ سرفرازی و سر بلندی کے نشانات، اعلیٰ مراتب کی نشست گاہیں، فتح قریب، مغانم کثیرہ یہ سب ثواب (یا نتائج) مشہود و محسوس شکل میں ہوتے ہیں۔

اس مضمون میں یہاں تک ثواب کا قرآنی مفہوم پیش خدمت کیا گیا ہے کہ ثواب، انسانی اعمال کا وہ نتیجہ ہوتا ہے جو محسوس طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے ۔ ثواب کے اس قرآنی مفہوم کی وضاحت کے بعد ہر شخص ایصالِ ثواب کے عقیدے کے متعلق خود سمجھ سکتا ہے کہ یہ عقیدہ عملاً ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ جب ثواب کے معنی اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں تو ایک شخص کے اعمال کے نتائج کسی دوسرے شخص کی طرف کیسے منتقل ہو سکتے ہیں۔ یہ معمولی سمجھ کا انسان بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہ تجویز عقل عامہ کے خلاف ہے ۔ چہ جائیکہ اس کے لئے اس کتاب حکیم سے سند حاصل کی جائے، جس کا ایک ایک لفظ حکمت سے مملو اور اپنی جگہ ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ مستحکم ہے۔ اس نظریہ کی صحت کی تو معمولی فراست کا شخص بھی تصویب نہیں کر سکتا۔ اور جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے وہ تو اس نظریہ کی واضح تردید و تغلیط کرتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اگر آپ کے ذہن میں ثواب کا قرآنی تصور صاف اور واضح ہو گیا ہے تو پھر ایصالِ ثواب کے نظریہ پر بات کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی، تاہم چونکہ قرآن کریم ہمارے لئے آخری سند اور حجت کا درجہ رکھتا ہے اس لئے اس بارے میں قرآن کریم کی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے تخلیق کائنات کا مقصد مکافات عمل قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45/22) یعنی اللہ نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا اس لئے ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے، اور اس طرح کسی معاملے میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے o نیز فرمایا۔ o اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (40/17)o یعنی آج ہر شخص کو بدلہ دیا جائے گا اور بے شک آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ہر دو آیات میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر شخص کو صرف اسی کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا اور دونوں آیات میں لَا يُظْلَمُوْنَ اور لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ بھی آئے ہیں، جن سے واضح ہے کہ صحیح صحیح بدلہ پانا ظلم نہ ہونے کے مترادف ہے اور اگر ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ نہ ملے تو قرآن کریم کی رو سے یہ بڑا ظلم ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے، دوسروں کے اعمال کا بدلہ کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یہی فرمان الٰہی ایصالِ ثواب کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6/164) یعنی انسان اپنے ہر عمل کا خود ذمہ دار ہوتا ہے، اور اس کا نتیجہ اس ہی بھگتنا پڑتا ہے، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اس مسئلہ کے بارے میں صرف چند آیات پر ہی اکتفا کیا گیا ہے ورنہ اس سلسلے میں اتنی آیات ہیں کہ ان کا احصاء (گنتی) مشکل ہے۔ جن حضرات کو مزید آیات درکار ہوں وہ اپنے نسخہ قرآن کریم سے مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمالیں، ہر شخص کو اپنے اعمال کا نتیجہ خود بھگتنا ہوگا، کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں: (3/90-2/48-2/123-2/254) اور ان کے علاوہ متعدد آیات ہیں۔

ہمارے یہاں ایصالِ ثواب کا نظریہ تو قبول عام حاصل کر گیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایصالِ عذاب کا کوئی تذکرہ کبھی سننے میں نہیں آیا۔ قرآن کریم نے ثواب کا لفظ برے اعمال کے برے نتائج کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے (83/36) یعنی اب منکروں نے اپنے اعمال کا بدلہ پایا۔ اس آیت کریمہ میں ثواب کا لفظ بُرے بدلے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب

ثواب کا ایصال اچھے بدلے میں ہوسکتا ہے تو اس کا ایصال برے بدلے میں بھی ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کی کسی سے مخاصمت تھی تو یہ ہوسکتا ہے کہ آپ چندروز عمداً نماز قضا کردیں اور اس نماز کی قضا کا (برا) ثواب اس کو منتقل کردیں۔ اجتماعی حیثیت سے بھی اس کی مثال ہوسکتی ہے۔ ہم پاکستان میں بزرگوں کے ایصالِ ثواب کے لئے ان کا عرس مناتے ہیں کیونکہ انہوں نے دین کی خدمت کی تھی۔ اس کے برخلاف لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پٹیل، نہرو اور دیگر ہندو زعماء جنہوں نے پاکستان سے دشمنی کی تھی، تو ایصالِ ثواب کے نظریہ کی رو سے یہ ہونا چاہیے کہ ان دشمنانِ اسلام کی بھی کوئی نشانی (Symbol) بنا کر ان کو ایصالِ عذاب کیا جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایصالِ ثواب کے ماننے والے، ایصالِ عذاب کے قائل نہیں۔ اس نکتہ پر اب تک کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن بہر حال ہے یہ توجہ کا مستحق۔

آخر میں ایک بات کی وضاحت کرنی بھی ضروری ہے۔ ایصالِ ثواب کے قائلین اپنی تائید میں نماز میت کو پیش کرتے ہیں، کہ میت کی نماز پڑھنے سے اس میت کو ثواب ملتا ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ میت کی نماز اس کے رشتہ دار اپنے سکون قلب کے لئے پڑھتے ہیں۔ میت کو اس نماز کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی کی نماز نہ پڑھی جائے اور اس کے اعمال بہت اچھے تھے تو نماز نہ پڑھنے سے اس کی مغفرت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس کے برعکس اگر کسی کے اعمال زیادہ عمدہ اور بہتر نہیں ہیں اور ہزاروں ہزار رکعات بھی اس کے لئے ادا کی جائیں، وہ اس کی مغفرت میں فائدہ نہیں دیں گی۔

ماہ جون 2004ء

11

انسانی زندگی کی کہانی، کچھ قرآن کریم کی کچھ روایات کی زبانی

زندگی آج جس مقام پر پہنچ چکی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم سب اس زندگی کے مختلف پیکر ہیں اور اس کی نمود کی مختلف شکلیں۔ زندگی اس مقام پر ہزار ہا سال گزرنے کے بعد اور بے شمار پیکر تبدیل کرنے کے بعد آئی ہے۔ زندگی کس طرح از خود وجود میں آ گئی اس کے متعلق نہ تو سائنس ہی کوئی نشان دہی کرتی ہے اور نہ قرآن کریم نے اس پر روشنی ڈالی ہے کہ زندگی وجود میں کیسے آئی؟ البتہ قرآن کریم نے زندگی جن جن مراحل سے گزری ہے یعنی بالکل ابتدائی مراحل سے لے کر آج تک کے تمام مراحل کی نشان دہی کر دی ہے۔ وہ ابتداء ہی یہاں سے کرتا ہے کہ زندگی کی نمود کیسے ہوئی، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کو اس کے مادی پیکر اولیں جرثومۂ حیات میں آنے سے پیشتر پیدا کر رکھا ہو، لیکن چونکہ اس وقت وہ ہمارے احساسات کی گرفت میں نہیں آئی تھی، اس لئے اُس جل جلالہ نے ہماری اس حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد جب پھر اس کی نمود ہو جائے گی۔ تو اسے حیات بعد الممات سے تعبیر کیا جائے گا۔

عالم موجودات کی سب ذی حیات مخلوق، نباتات، خوردبینی حیوانات سمیت ایک سلسلہ تکوین کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جن کو ان کے اعضاء واشکال کی ترتیب کے مطابق ایک تدریجی سلسلہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب تکوین زندگی کے اولیں مراحل سے ایک مقررہ ترتیب و تدریج سے ہوئی ہے۔ اس کی انتہائی شکل انسان کی صورت میں ہمارے سامنے آج موجود ہے۔ زندگی طولاً و عرضاً ناقابل تقسیم ہے۔ اس نے ہزاروں سال میں بحیثیت ایک اکائی کے ترقی کی ہے۔ اور موجودہ حالت پر پہنچی ہے۔ اب انسان کی کلی کے جس قدر افراد ہوں گے ان میں انسانیت کا مشترک ہونا

لازمی ہوگا۔ اس کلی کا کوئی فرد اس کی بنیادی خصوصیات سے محروم نہیں ہو سکتا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کلی کا کوئی فرد نطق یا ارادہ سے محروم ہو۔ اسی طرح اس سے فروتر حالت میں یعنی حیوانات میں ان کی زندگی کا خاصہ ہوگا کہ وہ حرکت کریں اور نشو ونما کی صلاحیت ان میں موجود ہو۔

حیوانات کی صورت میں زندگی نے صرف اسی حد تک ترقی کی ہے، لیکن اس حد تک ترقی کردہ کلی کے تمام افراد میں زندگی کی خصوصیات مشترک ہوں گی۔ اس کلی کا کوئی فرد اس خصوصیت سے محروم نہیں ہوگا۔ ہر حیوان حرکت کرے گا اور نشو ونما حاصل کرے گا۔ مختصر یہ ہے کہ حیات یا زندگی مجموعی طور پر ترقی کرتی ہے۔ اس کے تمام افراد مل کر ترقی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسلمانوں نے اس مسئلہ پر مغربی مفکرین سے پہلے غور و فکر شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں فارابی متوفی 950ء ابن سینا، ابن ماجہ، ابن مسکویہ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مغربی مفکرین میں ہکسلے اور ڈارون زیادہ نمایاں ہیں۔ ڈارون نے اپنی مشہور زمانہ کتاب The Origin of Specie (1859) میں طبع کرائی اور اس مسئلہ کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا لیکن اس عظیم الشان نظریہ کی ارتقائی شق کے دعویٰ کو جن علماء نے مستقل صورت دی وہ مسلمان مفکرین ہی تھے۔ مولانا روم نے بھی اپنی مثنوی شریف میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد جب مسلمانوں میں فکری جمود آ گیا اور مفکرین کے بجائے صرف علماء ہی پیدا ہونے لگے تو اس قسم کے مسائل پر مزید تحقیق و تفتیش نہیں ہو سکی۔ وجہ یہ ہے کہ عالم اور مفکر میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو نمایاں کرنے میں انگریزی الفاظ زیادہ واضح ہیں جن کے لئے سکالر اور تھنکر کا استعمال زیادہ مفید مطالب ہوگا۔ سکالر کا کام یہ ہے کہ اس نے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا ہوتا ہے اور ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہ فوراً نشان دہی کر دے گا کہ اس مسئلہ کے متعلق امام ابوحنیفہ سے لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب نے فلاں فلاں کتاب کے متن اور فلاں صاحب نے اس کتاب کے حاشیہ میں یوں لکھا ہے۔ اسے منہیات تک پر پورا عبور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک Cataloguer اور بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے ایک وراق کی سی ہوتی ہے اس کی نگاہ بڑی وسیع ہوتی ہے۔ لیکن تھنکر کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا مطالعہ مقابلۃً کم ہی کیوں نہ

ہو، وہ اپنی منفرد تھیوری پیش کرتا ہے اور نئے نئے تصورات پیش کرتا ہے۔ ہمارے برصغیر میں علامہ شبلی، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، حمید الدین فراہی، علامہ سلیمان ندوی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا ابوکلام آزاد مرحوم اور سب قابل قدر حضرات کا شماران علماء کرام میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان میں سے چند حضرات شمس العلماء کے خطاب سے نوازے گئے۔

ان سب حضرات کا شمار علماء میں ہوسکتا ہے۔ اس کے برخلاف اس دور کے مفکرین میں سرسید احمد خاں، مولوی چراغ علی، شمس العلماء علامہ محب الحق بہاری، علامہ اقبال، علامہ اسلم جیراجپوری، مولوی محمد عبداللہ خطیب مسجد اہل قرآن لاہور، خواجہ احمد الدین امرتسری اور سب سے اہم اور بیدار مغز علامہ غلام احمد پرویز کا شمار ہوتا ہے۔ ان حضرات نے قرآن فہمی کا طریقہ ہی بالکل بدل دیا اور قرآن کریم کی وہ اقدار و نظریات پیش کئے جو ان حضرات سے پیشتر تیرہ سو سال طویل عرصہ میں تحریر میں نہیں آئے تھے۔ اس مضمون کا یہ موضوع نہیں ہے۔ ورنہ ان حضرات کی منفرد نظریات کی فہرست بہ آسانی پیش کی جاسکتی ہے۔ جن سے ان کے مفکر تھنکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ہم مسلمانوں میں ابن خلدون کے بعد سے صرف علماء ہی پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں۔ تھنکر خال خال ہی صدیوں بعد نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے فکری جمود ہے۔

قرآن کریم نے انسانی زندگی کے ارتقاء سے بھی بحث کی ہے۔ اور کائنات کی تخلیق اور اس کے ارتقاء سے بھی بحث کی ہے۔ اس مضمون کا موضوع صرف انسانی زندگی کے سفر کی کہانی بیان کرنا ہے۔ انسانی زندگی جسے انگریزی میں The Life سمجھنا چاہیے۔ اس انگریزی لفظ سے زندگی کا مفہوم زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ کائنات کی پیدائش اور اس کے ارتقاء سے اس مضمون کو کوئی علاقہ نہیں ہوگا۔ اس موضوع کے لئے الگ مضمون درکار ہوگا۔ انسانی زندگی کی پیدائش کے سلسلہ میں روایات پر مبنی جو غیر علمی و مضحکہ خیز تصورات ہم مسلمانوں میں چلے آرہے ہیں۔ اور جو قرآن کریم کے علمی نظریات کے بالکل خلاف ہیں اولاً ان کا بیان اور قرآن کریم کی روشنی میں ان کی تردید پیش کی جائے گی۔ پھر قرآن کریم کا محاکمہ اور اس کا اپنا قابل قدر نظریہ پیش کیا جائے گا۔

انسانی پیدائش کے سلسلہ میں ہمارے ہاں یہ مسلمہ عقیدہ چلا آرہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کا بت بنایا اس میں اپنی روح پھونکی اور ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ آدم زمین میں خونریزی اور فساد پیدا کرے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اس نظریہ اور عقیدہ کے مطابق آدم کو ایک Finished Product کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی نسل کو اس سے ہی نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی بیوی کو اس کی پسلی سے نکالنا پڑا جو اس کے پیٹ سے پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی بیٹی ہی ہوسکتی ہے۔ اس طرح باپ بیٹی کو میاں بیوی بنانا پڑا۔ حالانکہ خود اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق باپ بیٹی کا نکاح حرام ہے، اس نظریئے پر متعدد اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں آگے چل کر زندگی کی ابتداء و نشوونما کی صحیح صورت قرآن کریم کی آیات کے مطابق پیش کی جائے گی۔ جس کی روشنی میں اس تصور پر عائد شدہ تمام اعتراجات از کود رفع ہوجاتے ہیں۔

انسانی زندگی برقی توانائی کی نظیر ہے۔ جو عالم گیر ہے اور ساری کائنات میں برق تپاں کی طرح جاری ہے، اس لئے زندگی (The life) ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اور اس کے افراد اس وحدت کے مختلف پیکر ہیں۔ آپ، میں زید و بکر، عمر ہم سب اسی وحدت کے پیکر ہیں۔ الیکٹرانک ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس کے بلب جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں یہ سب اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ جب حیات Divine Energy شعور سے متمسک ہوجاتی ہے۔ تو یہ انسانی انا یا یہ پیکر یا یہ مظہر وجود میں آجاتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں نفس انسانی حیات اور شعور کے تمسک سے متشخص ہوتا ہے۔ ہمارے پرانے صوفیائے کرام جو وحدت الوجود کے قائل تھے، اُن میں سے کچھ نے اس کی مثال ستلی (ڈوری) سے دی ہے۔ آپ ایک لمبی ستلی (ڈوری) لے کر اس پر چند گرہیں ڈالتے جائیں، جس قدر گرہیں آپ ڈالتے جائیں گے، اس قدر پیکر نمودار ہوتے چلے جائیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ گذشتہ صوفیائے کرام اس گرہ کا وجود نہیں مانتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اگر اس گرہ کو کھول دیں تو وجود صرف تلی، یعنی وحدت الوجود کا رہ جائے گا۔ لیکن علماء اہل قرآن کا

نظریہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ گرہ پڑ گئی تو یہ گرہ پھر کھل نہیں سکتی۔ جو پیکر یا وجود ایک مرتبہ بن گیا وہ معدوم نہیں ہو سکتا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بن گیا۔ اس لئے وہ گرہ یا ہمارا وجود اس وحدت سے مختلف ہے اور اپنا وجود رکھتا ہے۔ فتدبروا

اب اس سلسلہ میں قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کی ابتدا کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔o وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ (6/98)o اور اس نے تم کو نکالا ایک جان سے۔ نفس واحدہ کی قرآنی تفسیر کے لئے سورۃ مومنون میں ارشاد ہوتا ہےo وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ o(23/12) یعنی نفس واحدہ اور سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے بدل اور مبدل منہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی پیدائش کے لئے اور بھی چند الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ صفت میں ارشاد ہوتا ہے إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (37/11) بے شک ہم نے انسانوں کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیاo سورۃ الحجر میں فرمایاo وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ o(15/26)o انسان کو سڑی مٹی کے بدبودار گارے سے پیدا کیاo سورۃ رحمان میں فرمایاo خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ o(55/14)o انسان کو آگ میں پکی ہوئی سڑی ہوئی مٹی سے پیدا کیاo صَلْصَالٍ کے معنی سڑی ہوئی مٹی اور فَخَّارِ کے معنی آگ میں پکی ہوئی مٹی ہے یہ تعریف ہے اس مٹی کی جس سے آدمی کو پیدا کیا۔ یہ زمین پہلے آگ کا گولا تھی اس لئے اس کی مٹی آگ میں پک کر موجودہ صورت میں آئی تھی۔ اور پانی میں ملی ہوئی مٹی کو طِينٍ کہتے ہیں اور لَّازِبٍ کے معنی ہیں لیس دار۔ اس سے آگے حَمَإٍ مَّسْنُونٍ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حما کنوئیں کی تہ سے نکالے ہوئے بدبودار کیچڑ کو کہتے ہیں اور مسنون کے معنی ہیں سڑا ہوا اس لئے پورے کرہ ارض پر جہاں جہاں مٹی صَلْصَالٍ، كَالْفَخَّارِ، طِينٍ، لَّازِبٍ بن کر حَمَإٍ مَّسْنُونٍ کی صورت میں بدبودار ہو کر سڑ گئی وہاں ہر جگہ سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ انسانی جرثومہ حیات سڑے ہوئے گارے سے پیدا ہو گئے اور کرہ ارض کے مختلف مقامات پر وجود میں آ گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے مفسرین سے زندگی کی ابتداء اور اس کی نمود کے سلسلہ میں جو تسامح ہوا، وہ نفس واحدہ کا غلط مفہوم سمجھنے سے ہوا۔ مزید غلطی ان سے یہ ہوئی کہ اسرائیلیات کے زیر اثر مفسرین نے نوع انسانی کی پیدائش ایک بت سے شروع کر دی۔ حالانکہ قرآن کریم میں متعدد بار ارشاد ہوا کہ ہم نے انسان کو زمین سے پیدا کیا ہے۔ ہمارے گزشتہ مفسرین کا دور اس درجہ تحقیق و تفتیش کا نہیں تھا اور یہ مسئلہ بھی قدرے نظری نوعیت کا تھا۔ اس لئے ان سے لغزش کا ہونا کوئی بعید نہ تھا۔ لیکن موجودہ دور کے علماء کرام کو ضرور اس مسئلہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان علماء عظام کے سامنے یہ مواد اس درخواست کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ وہ اس پر غیر جانبدار ہو کر غور فرمائیں کیونکہ یہ مسئلہ ایسا اہم ہے کہ اس کے درست ہونے سے قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے وقت عقل انسانی اس معیار پر نہیں پہنچی تھی کہ اس قسم کے مسائل پر بحث و تمحیص کرے۔ قرآن کریم کا اس مسئلہ کو پیش کرنا اور اس پر بھرپور روشنی ڈالنا اور آج سائنسی اور علمی دنیا کا قرآن کریم کے بیانات کی تصدیق کر دینا، اس کے وحی الٰہی ہونے کا واضح اور بین ثبوت ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم کا درست تصور پیش کرنے کے لئے دو امور کی وضاحت ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ثابت کرنا ہے کہ زندگی کی ابتداء آدمؑ کے بت سے نہیں ہوئی بلکہ زندگی کی ابتداء اور نمود زمین سے ہوئی ہے اور مختلف مقامات پر زندگی کی ابتداء ہوتی ہے صرف ایک بت سے نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے نفس واحدہ کا جو لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد آدمؑ کا بت نہیں ہے بلکہ انسانی نطفہ ہے۔ جس سے زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔ ان دو امور کی وضاحت سے قرآنی تصور سامنے آجاتا ہے۔ پہلا غلط قدم کہ نوع انسانی کی پیدائش ایک بت سے ہوئی اس کی تردید میں بہ تکرار قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

(1) هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا (11/61)

اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اسی میں تمہیں آباد کیا۔

(2) oمِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىo(20/55)

o ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور ہم تمہیں اسی زمین میں واپس لوٹا دیتے ہیں اور اس سے دوبارہ نکالیں گے o

(3) هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ(53/32)

اور اللہ خوب جانتا ہے جب تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کی پیٹ میں جنین کی صورت میں تھے۔

(4) oوَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا oثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًاo(71/17.18)

oاور اللہ نے تمہیں زمین اگایا ٹھیک ٹھاک اگانا پھر تمہیں اسی زمین میں لوٹا دیتا ہے۔پھر وہ تمہیں دوبارہ زمیں سے نکالے گا ،ٹھیک

ٹھاک نکالناo۔یہ چاروں آیات کریمات اس بات پر حجت قاطعہ ہیں کہ انسان کی پیدائش زمین سے ہوئی۔مختلف مقامات پر ہوئی جس جگہ بھی مٹی حَمَإٍ مَسْنُونٍ کی شکل میں بدبودار ہوکر سڑ گئی وہاں ہر جگہ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ انسانی جرثومہ حیاتAmeba سڑے ہوئے گارے سے پیدا ہوگئے۔اور کرہ ارض کے مختلف مقامات پر زندگی نمودار ہوگئی۔نفس واحدہ سے مراد حضرت آدمؑ یا ان کا بت یا پتلا نہیں ہے۔بلکہ پوری نوع آدم کا جرثومہ حیات مراد ہے۔جو زمین میں موجود جملہ عناصر کا جوہر ہے۔وہ آیت کریمہ جس سے ''نفس واحدہ'' کے معنی صرف انسانی نطفہ ہی ہوسکتا ہے ۔درج ذیل ہے۔یہ آیت کریمہ غور کی متقاضی ہے۔اور اس میں کچھ عربی قواعد بھی زیر غور آئیں گے۔اس لئے اس کو آسان کرنے کے لئے چند حواشی ساتھ ساتھ درج کر دیئے گئے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

oهُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا

تغشاها حملت حملاً خفيفاً فمرت به فلما أثقلت دعوا الله ربهما لئن آتيتنا صالحاً لنكونن من الشاكرين o(7/189)o وہی جس نے تم کو بنایا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا کہ اس پاس آرام پکڑے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانپا حمل رہا ہلکا حمل پھر چلنے لگی اس سے پھر جب بوجھل ہوئی دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو اگر تو ہم کو بخشے گا بھلا چنگا تو ہم تیرا شکر کریں گے o ۔قرآن کریم میں نفس واحدہ کی ترکیب پانچ مرتبہ آئی ہے (39/6-31/28-7/189-6/98-4/1) اور صفت موصوف میں تنوین تعریف جنس کے لئے آئی ہے۔ مفسرین کرام نے ہر پانچ جگہ اس سے مراد آدم کا پتلا یا آدم کا بت، بحیثیت ایک Finished Product کے لئے ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک زندگی انسانیت کے معیار پر نہیں آتی تو نفس واحدہ کی اصطلاح جرثومہ حیات Life Cell کے لئے استعمال کی گئی ہے جیسا کہ سابقہ مضمون میں آیات کریمات کے حوالہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن جب زندگی حیات The Life انسانی پیکر میں منتقل ہوگئی اور توالد و تناسل کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر نفس واحدہ سے مراد انسانی نطفہ ہے۔ جیسا کہ ابھی مندرجہ بالا آیت کریمہ (7/189) کے ذیل میں ثابت کیا جائے گا کہ اگرچہ مفسرین کرام نے اس سے مراد آدم کا بت لیا ہے لیکن یہ آیت کریمہ کسی طرح بھی اس مفہوم کو ادا نہیں کرسکتی بلکہ اس سے مراد انسانی نطفہ ہی ہوسکتا ہے۔ پورے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی آدم کے بت کا ذکر نہیں ہے۔ اس جگہ یہ بات تحریر کرنے کو دل مجبور کرتا ہے کہ علامہ مشرقی نے اپنی بلند پایہ کتاب حدیث القرآن میں جملہ بہت سی باتوں کے دو باتیں بہت قیمتی تحریر فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کا طریقہ اس کے شرف و مقام کے مطابق نہیں ہے۔ اس طریقہ پیدائش سے انسانی مقام کی عظمت مجروح ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنا خیال ظاہر فرمایا کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ شاید لاکھ دو لاکھ سال بعد یا مدت مدید یا عرصہ طویل کے بعد انسان کی پیدائش کا یہ طریقہ بدل جائے۔ اور انسان کسی اور باعزت طریقہ سے پیدا ہونا شروع ہوجائے۔

آیت کریمہ مندرجہ بالا (7/189) کا ترجمہ درج کر دیا گیا ہے جس سے مراد مفسرین کرام نے آدم کا بت ہی لیا ہے۔ اب اس کا درست مفہوم عرض خدمت ہے عالی ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم میں مفسرین کرام نے تخلق فعل ماضی کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ قرآن کریم کا اسلوب بیان ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کو اگرچہ ماضی کے صیغہ میں استعمال کرتا ہے لیکن اس سے اس کی مراد حال اور استمرار ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔ وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (2/22) اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے کھانا تمہارا (ترجمہ عبدالقادر)

یہاں أَنزَلَ وأَخْرَجَ دونوں ماضی ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ آسمان سے بارش ہوتی ہے اور اس کے سبب پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جس طرح اس سنت جاریہ استمراریہ کے لئے أَنزَلَ وأَخْرَجَ کے الفاظ ماضی برائے مضارع آئے ہیں، اسی طرح آیت کریمہ محولہ بالا میں خَلَقَ، حَمَلَتْ، الفاظ مضارع کے لئے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس ترجمہ کی تائید کے لئے یہ آیات کریمات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ (13/17-2/164) نفس واحدہ سے یہاں وہ جرثومہ حیات مراد ہے۔ جواب نطفہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ پھر نوع انسانی، مرد اور عورتیں سب اسی سے پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اسی نفس واحدہ، جرثومہ حیات نطفہ انسانی میں اس کا جوڑا رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی مذکر اور مونث۔ یعنی ایک ہی نطفہ انسانی ہے جس میں ذکوریت وانوثیت دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ نفس واحدہ کا مفہوم جرثومہ حیات یا نطفہ انسانی لینے سے قرآن کریم کا صحیح، مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اور تمام خلاف قرآن نظریات رفع ہو جاتے ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے اس تاریک دور میں زندگی کی ابتداء اس کی نمود اور اس کی تبدیلیوں پر جو روشنی قرآن کریم نے ڈالی ہے اس سے اس کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مضمون زیر نظر میں زندگی کی نمود اور اس کی منزل بہ منزل ترقی بیان کی گئی ہے۔ کہ زندگی جرثومہ اولیں سے ترقی کرتے کرتے اور مختلف پیکر بدلتے بدلتے اب پیکر انسانی میں موجود ہے جس

کے نمائندے ہم اور آپ سب لوگ ہیں۔اب سوال مزید ترقی کا ہے، کہ آیا یہ مزید ترقی کرے گی یا اب اس کی تمام منازل طے ہوگئیں ہیں۔قرآن کریم کی رو سے زندگی مزید مدارج طے کرے گی۔ ہزاروں ہزار سالوں میں جو جسمانی ترقی ہوئی ہے اس میں طبیعاتی قوانین بروئے کار رہے ہیں اور اب بھی ہمارے اجسام پر انہیں طبیعاتی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔سردی گرمی بھوک پیاس، ان تمام حالات پر یہ قوانین ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔لیکن زندگی پر ان قوانین کا اطلاق مطلقاً نہیں ہوتا ہے۔ زندگی کی بالیدگی واضمحلال کے لئے وحی الٰہی کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔اور یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کا وحی الٰہی محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے خود ساختہ قوانین کا اطلاق زندگی پر نہیں ہوسکتا۔وحی الٰہی کی مستقل اقدار وہ روشنی کا مینار ہیں جن سے زندگی کی نشوونما ہوتی ہے۔اور یہی وہ اقدار ہیں جن کا جس قدر اتباع کیا جائے گا اور جن کو جس قدر اپنے اندر منعکس کیا جائے گا اسی قدر زندگی کی نشوونما ہوتی جائے گی۔اس کا واضح طریقہ یہ ہے کہ اگر انسان کے ذاتی مفاد اور کسی مستقل قدر میں ٹکراؤ آپڑے تو اگر کسی نے ذاتی مفاد کو ترجیح دی تو اس کی زندگی کو نقصان پہنچے گا۔لیکن اگر کسی نے اپنے ذاتی مفاد کی قطعاً کوئی پروا نہیں اور مستقل قدر کو ترجیح دے کر اس پر عمل کیا تو اس کی زندگی میں نشوونما ہو جائے گی۔مثال کے طور پر اگر آپ کو سخت عسرت کا سامنا ہے اور اس حالت میں بچوں کی بھی فیس ادا کرنی ہے، لیکن آپ کے پاس اس کام کے لئے کوئی رقم نہیں ہے اور آپ کو گزارہ کرنے میں بھی سخت پریشانی ہے۔اور آپ کو آسانی سے رشوت بھی مل رہی ہے، اب آپ کے سامنے دو راستے ہیں اگر آپ اپنا ذاتی مفاد پیش نظر رکھتے ہیں اور رشوت لے لیتے ہیں تو آپ نے اس مستقل قدر کی مخالفت کی جس میں حرام مال کھانے کو منع کیا گیا ہے۔لیکن اگر آپ نے اس مستقل قدر کو پیش نظر رکھا اور یہ عزم کیا کہ میں حرام مال کبھی نہیں لوں گا، تو آپ نے مستقل قدر کو ترجیح دی اس طرح آپ کی زندگی میں نشوونما حاصل ہوگی۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہی زندگی ترقی کرتی ہے۔یہ صرف وحی الٰہی کی رو سے ہوسکتا ہے۔کیونکہ عقل انسانی مستقل اقدار طے کرنے سے قاصر ہے۔وحی کے مستقل اقدار کے علاوہ کوئی اور قانون زندگی کو نشوونما نہیں کرسکتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیا ہوا ضابطہ حیات جو قرآن کریم کے دفتین میں محفوظ ہے اس کی اساس مستقل اقدار پر ہے۔ اس لئے جس جگہ بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ حیات نافذ ہوگا اور جہاں بھی اس کی اطاعت اور فرماں پذیری ہوگی وہاں ازخود نفس انسانی میں بالیدگی ہوتی چلی جائے گی۔ طاغوتی نظام جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین پر مبنی ہوتا ہے اس کے اکثر قوانین مستقل اقدار کے قوانین کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثلاً مستقل اقدار کی رو سے ربٰو حرام ہے، کسی بھی مبنی بر ربٰو معاشرہ میں انسان کی زندگی ترقی نہیں کرسکتی۔ خواہ کوئی کتنی ہی نمازیں پڑھ لے اور کتنے ہی روزے رکھ لے۔ اسی طرح جس معاشرہ میں ملکیت زمین جائز ہوگی جو مستقل قدر کے خلاف ہے۔ اس معاشرہ میں زندگی ترقی نہیں کرسکتی۔ زندگی کی نشوونماو پرورش کے لئے تو لابدی ہے کہ وہ نظام جاری ہو جو مستقل اقدار پر قائم ہو۔ اس معاشرہ میں جس میں مستقل اقدار جاری ہوں اس میں زندگی ازخود ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر وقت مستقل اقدار ازخود مسلسل منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اس لئے مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اور مکمل وآخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک ومقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کرے۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام نظامہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے۔ اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کو اور نظام کو جاری کردے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت ہے۔ اور اسی سے زندگی میں بالیدگی ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں اور مستقل اقدار کی اطاعت سے اپنی زندگی میں ترقی کے خواہاں ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نظام جاری کریں۔ یاد رکھئے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی گزارنے کے خواہاں ہوں ان کی زندگی کبھی نشوونما حاصل نہیں کرسکتی اور وہ اللہ ورسول کے باغی اور قرآن کریم کے الفاظ میں مجرم ہیں (6/123) خواہ وہ کتنے ہی نمازوں اور روزوں کے پابند ہوں

مختصر یہ ہے کہ مستقل اقدار کی پابندی سے زندگی ترقی کرتی ہے اور اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ موت کے وقت اگر یہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ موت کے واقع ہونے کے بعد بھی اس میں مزید ترقی ہوتی چلی گئی اور یہ ارتقاء کر کے اگلی نوع میں منتقل ہوگئی تو یہ اس کی جنت ہے اور اگر موت واقع ہونے کے بعد اس میں مزید ترقی نہیں ہوتی اور یہ اگلی نوع میں منتقل نہیں ہوتی تو یہ اس کی جہنم ہے۔ جنت اور جہنم کوئی مقامات نہیں ہوں گے اس میں لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جگہ دی جائے گی بلکہ یہ زندگی کی کیفیات کی تعبیرات ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس اگلی نوع کے حواس پانچ کے بجائے سات، آٹھ یا نو دس ہوں۔ حیوانات اور انسان میں صرف ایک حواس نطق (عقل) کا فرق ہوتا ہے۔ انسان کو حیوان سے صرف نطق متمیز کرتا ہے صرف ایک حواس کے اضافہ سے اتنا عظیم فرق دونوں نوعوں میں پڑ جاتا ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ چار یا پانچ حواس مزید ہونے سے اگلی نوع کی صلاحیتوں کی کیا کیفیت ہوگی؟ اب انسان کی مزید ترقی جسمانی نہیں بلکہ زندگی کی ترقی ہوگی۔ جس ترقی کی کیفیات کو صرف تعبیرات سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک جو تحریر کیا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ زندگی نفس واحدہ سے شروع ہوتی ہے، انسانیت کے معیار سے پیشتر نفس انسانی سے مراد جرثومہ حیات ہے۔ جب زندگی انسانیت کے معیار پر پہنچ گئی اور توالد بہ تناسل کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر نفس واحدہ سے مراد انسانی نطفہ ہے۔ ان دونوں نظریات کی تائید میں متعلقہ آیات پیش خدمت عالی کر دی گئیں۔ نیز یہ بھی ثابت کر دیا کہ زندگی صرف ایک آدم سے شروع نہیں ہوئی بلکہ جس جگہ بھی جرثومہ حیات پیدا ہوا اسی جگہ زندگی کی ابتداء ہوگئی اور زندگی مختلف مقامات سے بیک وقت شروع ہوئی ہے۔ یہاں تک تو سب علماء اہل قرآن کا اتفاق ہے، لیکن انسانیت کی منزل میں زندگی کیسے آتی ہے اس میں علماء اہل قرآن کا اختلاف ہے۔ یہاں سے زندگی کی کہانی کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے۔

کہانی کا دوسرا رخ، خالص قرآنی زاویہ نگاہ: دنیا میں جس قدر بھی ادیان اور مذاہب

ہیں وہ سب روح کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ ہم مسلمانوں میں بھی روح کا عقیدہ نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ روحانی تزکیہ پر ہی نجات اخروی کا انحصار کہا جاتا ہے۔ لیکن زیر تذکرہ خالص قرآنی فکر کا حامل طبقہ علماء کسی روح، نفس کے وجود کا قائل ہی نہیں ہے۔ اس طبقہ عالیہ کے نزدیک انسان کا جسم ہی اللہ تعالیٰ کا شاہکار عظیم ہے اور اس کو اور اسی کو قیامت کے روز دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اسی جسم انسانی سے ہی ساری باز پرس اور جواب دہی ہوگی۔ ان کے نزدیک انسان، جسم اور روح کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اجزائے ترکیبی سے عبارت ہے۔ روح نام کی کوئی چیز انسان کے اندر نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان میں زندگی ہو کہ اگر وہ جسم انسانی میں داخل ہوگئی تو وہ زندہ ہے اور اگر وہ نکل گئی تو وہ مردہ ہوگیا۔ روح اور جسم ماننے والوں کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ جسم بے شعور ہے اور روح باشعور ہے اور جب کسی کو مخاطب کیا جاتا ہے تو یہ تخاطب اس کی روح سے ہوتا ہے۔ جسم سے نہیں ہوتا کیونکہ جسم تو شعور ہی نہیں رکھتا۔ لیکن قرآن کریم کا نظریہ یہ ہے کہ شعور جسم ہی کا ایک حصہ ہے۔ جسم سے الگ شعور والی کوئی چیز نہیں ہے۔ شعور جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ مر جاتا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔o كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ o(2/28)o تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو جبکہ تم نیست تھے پھر اللہ نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے o۔

بالکل ظاہر بات ہے کہ آیت کریمہ میں تخاطب نوع انسانی کے اس حصہ سے ہے جس میں شعور موجود ہے۔ بے شعور حصہ کو تو تخاطب کیا ہی نہیں جا سکتا، انسانی شعور کو ہی مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے زندگی دی ہے شعور والی چیز کو ہی کہا جا رہا ہے کہ پھر تمہیں موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس آیت کریمہ سے واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعور انسان کے اسی حصہ میں ہے جس پر انسان کی زندگی اور موت کے عمل کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور وہ جسم انسانی ہے۔ جب جسم انسانی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو زندہ ہوتا ہے اور جب موت آتی ہے تو جسم کو ہی موت آتی ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ مذکور بالا کا مخاطب جسم ہی ہے جس پر زندگی و موت کا عمل وارد ہوتا ہے، شعور

بھی جسم ہی کا ایک حصہ ہے جو جسم کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور جسم کی موت کے ساتھ مر جاتا ہے۔ بس جسم انسانی کے علاوہ روح نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس میں شعور ہو اور وہ مرے بھی نہیں

تائید مزید و توکید وثیق کے لئے عرض ہے کہ یہاں محل بحث لفظ کُنتُم ہے کہ کُنتُم سے مراد باری تعالیٰ کا کیا ہے اگر اس سے مراد صرف جسم ہے تو جسم بے شعور ہے اور تخاطب کے قابل نہیں ہے اس لئے روح جو شعور کی حامل خیال کی جاتی ہے۔ وہ بھی تخاطب میں شامل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر کو تخاطب کا ایک حصہ قرار دیں تو روح کو مارنا اور زندہ کرنا تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور ماننا ہوگا کہ موت کے وقت جسم و روح دونوں مر جاتے ہیں اور قیامت کے دن دونوں پیدا کئے جائیں گے۔ لیکن روح کے جاننے والے اس کے مرنے کے قائل نہیں تو پھر لامحالہ کُنتُم سے ذیل میں ایسا جسم ماننا پڑے گا کہ شعور اس کا ہی ایک حصہ ہو جو جسم کے اجزائے ترکیبی سے پیدا ہوگیا۔ جب جسمانی عناصر کمزور ہوتے ہیں تو شعور بھی کمزور ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں بچپن کی باتیں یاد نہیں رہتیں جب عناصر مضبوط ہو جاتے ہیں تو شعور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ قائلین روح کا عمومی نظریہ یہ ہے کہ استقرار حمل کے کچھ عرصہ بعد جنین کے اندر روح ڈالی جاتی ہے جس سے اس جنین میں روح پیدا ہو جاتی ہے اور جب انسان مرتا ہے تو روح جسم انسانی سے نکل کر عالم برزخ میں چلی جاتی ہے، قیامت کے دن جب سب کو باز پرس اور پرسش کے لئے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو یہی روحیں سب کے جسم میں داخل کر دی جائیں گی۔ روح خود غیر فانی ہے اس پر موت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اولاً تو یہ نظریہ ہی غلط ہے کہ جنین مردہ ہوتا ہے اس میں روح داخل کی جاتی ہے۔ جنین تو زندہ ہوتا ہے یہاں تک کہ اس میں رجولیت اور انوثیت کے دونوں جرثومے موجود ہوتے ہیں۔ اس میں زندگی کے لئے روح کو داخل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جنین رحم مادر میں جو پانچ مراحل و منازل طے کرتا ہے، قرآن کریم نے ان کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ (23/14) یہ مراحل نطفہ سے علقہ مضغہ استخوان کسوۃ عظام اور انسانی بچہ کی شکل

ہے۔نطفہ کو ان منازل میں شامل نہیں کیا کیونکہ نطفہ خود جاندار ہوتا ہے اگر خود نطفہ بے جان ہوتا تو وہ اتنی منازل کس طرح طے کر سکتا تھا؟ غور کی متقاضی تو یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنین کے تمام مراحل تفصیل سے بیان فرمائے لیکن کسی جگہ بھی ادخال روح کا ذکر تک نہیں فرمایا۔ اگر یہ ادخال روح واقعاً ہوتا تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا اہم مرحلہ قرآن کریم بیان نہیں فرماتا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم ادخال روح کے نظریے کی تائید نہیں فرماتا۔

سورۃ روم میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔o اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَیْبَةً (30/54)o اللہ وہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دی طاقت، پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا سفید بال (ترجمہ شاہ عبدالقادر) اس آیت کریمہ میں بچپن اور بڑھاپے کو کمزوری کا زمانہ اور جوانی کو قوت کا زمانہ شمار کیا گیا ہے۔ بچپن اور بڑھاپے دونوں حالتوں میں جب جسم کمزور ہوتا ہے تو شعور بھی کمزور ہوتا ہے اور درمیان کا دور جو جوانی کا دور ہے اس میں جسم بھی مضبوط ہوتا ہے۔ تو شعور مضبوط ہوتا ہے۔ انسانی شعور کے کمزور اور قوی ہونے کے مشاہدے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس چیز کو عام طور پر روح کہا جاتا ہے وہ اصل میں شعور ہی ہے جو انسانی جسم کا ایک حصہ ہے اس سے الگ ہوئی اور چیز نہیں ہے۔ اس طرح جب جسم مر جائے گا تو شعور بھی مر جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ روح کوئی الگ چیز ہے اور وہ شعور والی ہے تو جو لوگ دماغی توازن سے محروم ہیں اور شعور سے عاری ہوتے ہیں تو کیا ان کی روح نہیں ہوتی؟

نفخ روح: نفخ روح کا ذکر قرآن کریم میں دو مقامات پر آتا ہے۔ ایک جگہ (15/29) اور دوسری جگہ (38/72) دونوں جگہ الفاظ بالکل ایک طرح آئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔o فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ o(15/29) اسی آیت کے الفاظ سے ہمارے مفسرین کرام سے لغزش ہوئی، انہوں نے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی روح تسلیم کی، پھر اس روح کا کچھ حصہ انسان میں ڈالا حالانکہ اللہ تعالیٰ تو نہ روح اور جسم کا مرکب ہے کہ اس کی کوئی

الگ روح ہو اور اس نے اس کا ایک حصہ انسان میں ڈال دیا ہو۔ اگر اس نے اپنی روح کا حصہ انسان میں ڈالا اس مقدار کے مطابق انسان بھی الٰہ ٹھہرا۔ دوسری وجہ اس نظریہ کی تغلیط کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ اور یہ نظریہ کہ انسان میں بھی اس کی روح موجود ہے اس کے بے مثل ہونے کی صفت جاتی رہتی ہے۔ بس ان دو وجوہات پر سابقہ مفسرین کرام کا نظریہ تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے۔

قرآن کریم نے تو نَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ (32/9) اور اللہ نے اس میں اپنی روح پھونکی کا نتیجہ یہ بتایا کہ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (32/9) انسان کو سمع و بصر یعنی ذرائع علم عطا فرمائے۔ اس آیت کریمہ نے نہایت صاف طور پر واضح فرما دیا کہ مِن رُّوحِهِ کے الفاظ میں جس تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کانوں، آنکھوں، اور دماغ سے کام لینے والا ہو گیا۔ واضح رہے کہ حصول علم و دانش و بینش انہی اعضاء سے متعلق ہیں۔ انہی کے معرفت انسان کائنات کی تسخیر کرتا ہے۔ مِن رُّوحِهِ سے مراد عقل و دانش اور فہم و فراست کی وہ خصوصی خاصیت ہے جو صرف انسان کو ہی دی گئی ہے۔ محولہ بالا آیات کریمات (38/72-15/25) سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ استواء کے معنی ہیں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا السوّی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو، اور ٹھیک ٹھاک تناسب رکھتی ہو۔ جب جسم انسانی کا تسویہ ہو جاتا ہے اور جسمانی عناصر کی ترتیب درست ہو جاتی ہے، تو انسانی جسم میں از خود شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے نفخ روح سے موسوم کیا ہے۔

قرآن کریم میں روح کا لفظ بیس مقامات پر آیا ہے۔ نزول قرآن کریم کے وقت یہ روح کے معانی میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مرور ایام کے بعد جب بنو عباس کے دور میں ہمارے ہاں فلسفہ در آیا تو فلسفہ کی اصطلاح بھی رائج ہو گئیں۔ فلاسفہ قدیم روح کا لفظ اسی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جسے اب ہم روح Soul کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے مفسرین نے بھی فلاسفہ سے متاثر ہو کر اس کا مفہوم وہی اصطلاحی روح لے لیا۔ ورنہ نزول قرآن کریم کے وقت یہ لفظ

فلسفہ کی اس اصطلاح کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جو بیس جگہ استعمال ہوا ہے تو کہیں وحی کے معنوں میں اور کہیں وحی حاصل کرنے کے معنی میں آیا ہے اصطلاحی روح سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ۔ تین مرتبہ روح قرآن کریم کے معنی میں آیا ہے (97/4-52/42-40/15-17/85-16/2) دو مرتبہ وحی لانے والے جبرائیل کے لئے (16/102) اور (26/193) چار مرتبہ وحی کی تعلیم کے لئے (58/22-5/110-2/87-2/257) تین مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ۔ بعنوان وحی پانے والے (66/12-21/91-4/171) ایک مرتبہ (78/38) میں جملہ انبیاء کے لئے ۔ اسی طرح باقی تمام مقامات میں بھی وحی سے متعلق آیا ہے۔ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی انسانی روح کا ذکر نہیں آیا ہے۔

حیات الشہدا: حیات الشہدا کے متعلق جو عقیدہ ہمارے ہاں مروج ہے وہ بھی قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں رات دن شہید کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم نے یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم نے اس معنی میں اَلْمَقْتُوْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ترکیبِ الفاظ پورے قرآن کریم میں صرف دو جگہ (3/169-2/154) میں استعمال ہوئی۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔o وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ o(2/154)o اور مت کہو واسطے ان لوگوں کے کہ مارے جاتے ہیں بیچ راہ اللہ کے کہ مردے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ لیکن تم نہیں سمجھتے o (شاہ عبد القادر) اس بارے میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کو واضح کرنا ہے کہ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کیا ہے جس کے واسطے قتل ہونے والا زندہ رہتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔o وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ (4/75)o ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے بلکہ کچھ مرد عورتیں بچے کمزور کر دیئے گئے ہیں اور وہ پکار پکار کر فریاد کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نکال دے۔ اس آیت کریمہ کی

رو سے کمزوروں (ضعیفوں) کی مدد کے لئے قتال کرنا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہے۔ جو اس راہ میں مارے جائیں وہ مقتولین فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہیں۔

اس سے بھی واضح بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کی اصطلاح (2/190) میں آئی ہے۔ اس کے مقابلے میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوت (4/76) آیا ہے۔ مومنین کی جماعت فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جنگ کرتی ہے اور کفار کی جماعت فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوت جنگ کرتی ہے۔ اس تقابل سے فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ہر وہ معاشرہ جو انسان کا خودساختہ قوانین پر قائم ہو وہ طاغوت ہے۔ لہٰذا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے معنی ہوئے دین الٰہی کے قیام کی خاطر۔ لہٰذا قرآن کریم کی رو سے اَلْمَقْتُوْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ صرف وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر اپنی جان تک دے دیں۔ انہیں زندہ بھی اس احترام کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ قوم کو زندہ کرنے والے ہیں اور ملت کے لئے صد افتخار۔ انہیں طبعی موت سے مرنے والوں کی مانند مردے کہنے سے احتراماً روک دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ملت کی زندگی ہے۔ شہادت شہید کی آیت کریمہ (3/169) میں جہاں انہیں رزق دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ آیت کریمہ (22/56) کی روشنی میں مستقبل کا وعدہ ہے۔ دونوں آیت کی تصریف سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مستقبل کے لئے وعدہ ہے۔ کیونکہ (22/56) لام کی تاکید اور نون مشددہ لا کر اس کو مستقبل کے ساتھ مختص کر دیا گیا جہاں تک احیاء کے لفظ کا تعلق ہے اسی طرح اسم فاعل کے معنوں میں آیا ہے "زندہ کرنے والے" جس طرح انبیاء صفت مشبہ بطور اسم فاعل خبر پانے والے استعمال ہوا ہے اس لئے آیت کریمہ کا درست ترجمہ اور مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں (دین کے قیام کے سلسلہ میں لڑتے ہوئے قتل کر دیئے جائیں) انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ مردہ قوموں کو زندہ کرنے والے ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں کہ مقتولین فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کی وجہ سے قومیں کس طرح زندہ ہو جاتی ہیں۔

ایک عام اعتراض کا جواب: قرآن کریم کے طلباء کے ذہن میں عموماً یہ سوال آتا ہے کہ بعض مرتبہ لوگ قرآن کریم میں غور کرنے کے بعد مختلف نتیجہ پر پہنچتے ہیں اس کا کیا سبب ہے حالانکہ

سب کی سوچ کا ایک ہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا۔ اس بارے میں دو باتیں پیش نظر عالی کی جاتی ہیں۔ بعض مرتبہ تو یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی خاص علم کا ماہر ہے، لیکن دوسرا شخص اس علم کا ماہر نہیں ہے۔ تو جو شخص کسی علم کا ماہر ہوگا وہ زیادہ عمیق نتیجہ پر پہنچے گا بہ نسبت ان صاحب کے جو اس خاص علم میں مہارت نہیں رکھتے۔ کیونکہ قرآن کریم کے سمجھنے میں ہر دور کے علم کی سطح پر پہنچنا ضروری ہے۔ (10/39) دوسرا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تقریباً قرآن کریم کے سارے طلباء روایات یا روایات پر مبنی سابقہ لٹریچر سے متاثر ہیں یا کبھی متاثر تھے۔ جس شخص پر روایات کا اثر جس قدر کم رہے گا، اس کی سوچ اسی قدر قرآن کریم کے زیادہ قریب ہوتی جائے گی۔ روایات کا اثر علماء اہل قرآن پر آہستہ آہستہ کم ہوا ہے۔ کیونکہ اپنے سابقہ نظریات وعقائد انسان کو جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں اور ان کو ترک کرنے میں اَنچ اَنچ پر لڑائی ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی محمد عبداللہ صاحب کی مثال سبق آموز ہے۔ مولوی صاحب اہل حدیث تھے ان کا جو مناظرہ (1906ء) میں مرزا غلام احمد سے سیالکوٹ میں ہوا اس وقت سے وہ روایات سے بدظن ہو گئے لیکن ''صحیحین'' کو پھر بھی درست مانتے تھے اور ان سے حجت پکڑتے تھے۔ آہستہ آہستہ صحیحین کی صحت سے بھی منکر ہو گئے۔ ان کی فکر خالص قرآنی ہوگئی روایات کے سابقہ اثرات کی وجہ سے قرآن مجید سمجھنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

انسانی زندگی اس کی ابتداء، اور اس کی ترقی کی کہانی قرآن کریم کی زبانی پیش خدمت عالی کر دی گئی اس مضمون میں ''خالص قرآن فہمی کے دونوں سرچشموں'' کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ کہانی کا دوسرا رخ دوسرے سرچشمے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ دونوں رخ آپ کے سامنے ہیں، آپ کے نہایت غور وفکر تدبر وتفحص کے متقاضی آپ کو قرآن کریم کے مطابق کون سا رخ درست معلوم ہوتا ہے اس کا فیصلہ آپ کے تدبر پر چھوڑا جا رہا ہے۔ کہ اپنے فیصلے سے مع قرآنی دلائل کے جریدہ ہذا کو مطلع فرمائیں۔

ماہ جولائی 2004ء

12

دین میں حدیث کا مقام (حصہ اول)

ٹیلیوژن کے مشہور چینل Geo پر ہر منگل کی شام ،''الف'' نام کا پروگرام ہوتا ہے جو بہت مقبول ہے اس کو جناب انیق احمد صاحب Conduct کرتے ہیں ۔اس پروگرام میں اہم مذہبی ، سیاسی ، معاشرتی امور پر تبادلہ خیال کیا جاتا ہے ۔جس میں ملک کے مشہور علماء و دانشور شرکت فرماتے ہیں ۔گزشتہ دو منگل مورخہ 8 ،اور 15 جون کو اس پروگرام کا موضوع ''دین میں حدیث کا مقام'' تھا جس میں معروف و متبحر علماء نے شرکت فرمائی ۔اس چینل Panel میں تین سنی علماء اور ایک شیعہ عالم تھے ۔دونوں فرقوں کے علماء نے اپنے اپنے نظریات کی ترجمانی فرمائی ،صحاح ستہ کتب اربعہ کی اصطلات استعمال کی گئیں ۔چونکہ چاروں علماء حدیث شریف کے بارے میں ایک ہی نظریہ کے قائل تھے اس لئے کوئی اختلاف سامنے نہیں آیا ۔ہاں اگر حدیث شریف کی تعریف Definition بیان کی جاتی تو یقیناً اختلاف سامنے آتا ۔کیونکہ شیعہ حضرات کے ہاں حدیث شریف کی تعریف سنی حضرات کی تعریف سے مختلف ہے ۔شیعہ حضرات کے ہاں قول امام حدیث بھی ہے حجت بھی ہے ۔اس سے کسی حال میں اختلاف نہیں کیا جا سکتا ۔بہرحال حدیث کی تعریف کو درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے چاروں حضرات اس نتیجے پر پہنچے کہ:

(1) حدیث وحی ہے فلہٰذا اسلامی قانون کا ماخذ ہے ۔

(2) حدیث کی حجیت مسلمہ ہے ۔

(3) حدیث کی اطاعت سے حضور کی اطاعت ہوتی ہے ۔اس لئے احادیث کی اطاعت ضروری ہے ۔

(4) حدیث قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے۔اس لئے حدیث ضروری اور لازمی ہے۔

یہ وہ مسلمہ نظریات ہیں جو صرف پینلPanel کے علماء کے ہی نہیں ہیں بلکہ تمام علماء ان ہی نظریات کے حامل ہیں۔لیکن علماء کرام سے اختلاف کرتے ہوئے بصد احترام عرض ہے کہ یہ چاروں شقیں قرآن کریم سے ثابت نہیں ہوتیں بلکہ قرآن کریم کے خلاف ہیں۔حدیث نہ وحی ہے نہ قانون کا ماخذ، نہ حجت ہے اور نہ ہی قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے۔حدیث شریف صرف دین کی تاریخ ہے اور بس۔مضمون ہذا میں ان چاروں شقوں پر قرآن کریم کی روشنی میں تبصرہ نہایت انکساری، عاجزی فروتنی اور دردمندی کے ساتھ علماء کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔اس عاجزانہ درخواست کے ساتھ کہ وہ اس کو بغیر تعصب کے بغور ملاحظہ فرمائیں۔

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے کہ قرآن کریم اسلامی قانون کا ماخذ ہے،تو قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o(5/44)اور جو کوئی بما أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہےo اسی مضمون کو قرآن کریم بار بار دہراتا ہے کہ جو کوئی بھی مَا أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔یا اگر کوئی شخص منزل من اللہ میں کوئی اضافہ یا کمی کر دے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے، وہ کافر و مشرک ہے۔فیصلہ تو صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق ہونا چاہئے اور صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ ہی قانون کا ماخذ ہے چونکہ اس مضمون کی آیات اس قدر واضح اور کثرت سے ہیں اس لئے ہمارے علماء کرام بھی اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ قانون کا ماخذ صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ ہے۔اس معاملہ میں ہمارا ان کا صد فیصد اتفاق ہے۔لیکن وہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کو شامل کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ حدیث کو ماخذ قرآن کریم قرار دیتے ہیں اب ثابت یہ کرنا ہے کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث شریف اس میں شامل نہیں ہے۔اس کی وضاحت کے سلسلے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہےo وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (5/48)o اور ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو گذشتہ کتابوں کی مصدق

ہے اور سب پر شامل ہے پس تو اُن میں حکم کر، جو کچھ اتارا اللہ نے، اس کے ساتھ۔ اس آیت کریمہ نے خود ما أنزل اللهُ کی وضاحت کتاب سے کر دی کہ ما أنزل اللهُ صرف کتاب ہے جس کے مطابق حکم کرنا لازمی ہے اور اس کے علاوہ مَـا أنـزَلَ الـلّـهُ میں کوئی چیز شامل نہیں ہوتی۔ نیز سورہ رعد میں ارشاد ہوتا ہے o وَالَّـذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ (13/36) o اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو اترا تیری طرف (موضح القران) اس آیت کریمہ نے تو بات ہی بالکل واضح کر دی کہ أُنزِلَ إِلَيْكَ کی وضاحت کتاب سے کر دی یہاں کتاب اور أُنزِلَ إِلَيْكَ ایک دوسرے کا بدل اور مبدل منہ ہیں۔ یعنی جو کتاب ہے وہ أُنزِلَ إِلَيْكَ ہے اور جو کچھ بھی أُنزِلَ إِلَيْكَ ہے وہ صرف کتاب ہے اور کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے۔ اس موضوع پر کہ مَـا أنـزَلَ الـلّـهُ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث اس میں شامل نہیں اس کے لئے ان دو آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں رسالہ صوت الحق میں اس قدر تحریر کیا گیا ہے کہ اس کو یہاں تحریر کرنا صرف اس مواد کو دہرانا ہے اور قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ صرف قرآن کریم کو ہی مَـــا أنــزَلَ الـلّــهُ ثابت کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث قانون کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے ہمارے علماء کرام حدیث کو قانون کا ماخذ صرف اس لئے شمار کرتے ہیں کہ ان کے لئے حدیث شریف وحی اور منزل من اللہ ہے اور اگر حدیث شریف کو منزل من اللہ شمار نہ کیا جائے تو پھر وہ کسی طرح بھی قانون کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ غور کرنے کا متقاضی موضوع جو ساری گفتگو کی اساس ہے وہ یہی ہے کہ آیا حدیث وحی ہے یا نہیں اس سلسلے میں صرف دو آیات اس لئے پیش کی گئی ہیں کہ اس کمترین کے (4) طویل اور جامع مضامین موقر رسالہ صوت الحق میں طبع ہو چکے ہیں۔ جن کا عنوان بھی یہی ہے کہ ''وحی صرف قرآن میں ہے''۔ جن حضرات کو اس مسئلہ میں ذرا سا بھی تردد ہو، وہ ان مضامین کو ملاحظہ فرمالیں۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے کہ حدیث حجت ہے تو یہ بات بھی قرآن کریم کے

مطابق نہیں ہے۔ارشاد حضرت باری عزاسمہٗ ہے۔o اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (7/3)o جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کارسازوں کا اتباع نہ کرنا۔اس آیت مجیدہ کے دو حصے ہیں جو ایک دوسرے کے معطوف اور معلوف علیہ ہیں۔آیت کا پہلا حصہ o اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ کے امر یہ جملے میں صرف مَا أُنزِلَ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور آیت کے دوسرے حصے وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ کے ناہیہ جملے میں بھی صرف مَا أُنزِلَ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے جس میں حدیث شریف شامل نہیں ہوسکتی ۔جب کہ حدیث شریف کے اتباع کا کوئی حکم ہی نہیں ہے تو وہ حجت کیسے ہوسکتی ہے۔اس لئے اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر حجت صرف اور صرف قرآن کریم ہے حکم تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہی ہے اور صرف وہ ہی حجت ہے إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (12/40-6/57)

جہاں تک تیسری شق کا تعلق ہے کہ حدیث کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہوتی ہے۔اس لئے احادیث کی اطاعت ضروری ہے تو یہ بات بھی محل نظر آتی ہے اور اس نظریہ میں کوئی اصلیت وحقیقت نہیں ہے حضورؐ کی اطاعت کرنا ہمارا بھی ایمان ہے اور وہ کون مسلمان ہے جو حضورؐ کی اطاعت کو فرض نہیں سمجھتا۔لیکن حضورؐ کی اطاعت احادیث کے ذریعے کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔حضورؐ کی اطاعت کا قرآنی طریقہ پیش خدمت عالی ہے۔

حضورؐ کو یہ حکم ہوا کہ وہ ملت ابراہیم کا اتباع کریں o ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (16/123)o ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے بتایا کہ ملت ابراہیم کا اتباع کرو۔اس آیت میں حضرت ابراہیم کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ حضرت اسحٰقؑ ،حضرت یعقوبؑ ،حضرت سلیمانؑ ،حضرت داؤدؑ ،حضرت یوسفؑ ،حضرت موسیٰؑ ، حضرت ہارونؑ ، حضرت ذکریاؑ ،حضرت یحییٰؑ ،حضرت عیسیٰؑ ،حضرت الیاسؑ ،حضرت اسماعیلؑ ، حضرت یونسؑ ،حضرت لوطؑ سمیع ان جملہ انبیاء کرام کے نام شمار کرنے کے بعد حکم ہوا کہ۔

o أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (6/90)o یہ انبیاء کرام وہ لوگ تھے کہ

اللہ تعالیٰ نے جن کی ہدایت فرمائی، پس تم بھی ان سب انبیاء کرام کا اتباع کرو۔ یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کے پاس ان تمام انبیاء کرام کی احادیث موجود نہیں تھیں جن کے ذریعے وہ ان انبیاء کرام کا اتباع کرتے۔ یہ بات تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سند وحی ہی ہے کہ جو حضرت نوحؑ کے وقت سے لے کر حضورؐ کے وقت تک وحی الٰہی کی تعلیم ایک ہی رہی ہے۔ جب حضورؐ نے اپنی نازل شدہ وحی کا اتباع کیا تو ان گذشتہ تمام انبیاء کرام کی وحی کا بھی اتباع ہو گیا۔ ما یوحیٰ اور ما انزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہوتا ہے۔ جس طرح حضورؐ نے ما یوحیٰ کا اتباع کر کے جملہ انبیاء کرام کا اتباع کیا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اگر ما یوحیٰ کا اتباع کریں گے تو یہ حضورؐ کا ہی اتباع ہو گا اور یہ اتباع نہ صرف قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہو گا، بلکہ حضورؐ کی سنت کے مطابق بھی ہو گا کیونکہ حضورؐ بھی خود انبیاء کرام کا اتباع اسی طرح فرماتے تھے اور ہمارے علماء کرام جن کو حضورؐ کی سنت پر عمل کرنے کا شدید اصرار ہے اس طریقہ سے حضورؐ کی سنت بھی پیش نظر رہتی ہے۔ اطاعت رسولؐ کے اس قرآنی طریقہ سے حدیث شریف کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی نکتہ کی وضاحت دوسرے پیرائے میں پیش خدمت عالی ہے ارشاد ہوتا ہے ○ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَـٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ○ (3/68) ○ بلاشبہ تمام لوگوں میں سے ابراہیم کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو اس کی ملت کا اتباع کرتے ہیں اور یہ نبی اور ان کے ساتھی مومن بھی (ابراہیم کے بہت زیادہ قریب ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا مددگار ہے ○ اس آیت کریمہ میں حضورؐ کو حضرت ابراہیمؑ کا قریب ترین شخص اس لئے کہا گیا ہے کہ آپؐ ملت ابراہیمؑ کے متبع تھے۔ نیز صحابہ کرامؓ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا اقرب بتایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ حضرات حضورؐ کے متبع تھے۔ اب سلسلہ اطاعت اس طرح قائم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ حضورؐ کے متبع اور حضورؐ ملت ابراہیمؑ کے متبع اس طرح وہ صحابہ کرامؓ بھی ملت ابراہیمؑ کے متبع اور اقرب قرار پائے۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کی قربت ان کے لائے ہوئے ضابطے کی اتباع سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ روایات کے ذخیروں کی اتباع

ہے۔ کیونکہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی صحابہ کرامؓ کے پاس کوئی ذخیرہ حضرت ابراہیمؑ کی روایات کا نہیں تھا۔

نیز ارشاد ہوتا ہےo قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (6/161)o کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ کی راہ نمائی فرمائی جو مضبوط دین ہے جو ملت ابراہیمؑ ہے یعنی وہ راستہ جو حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا اس آیات کریمہ میں خود حضورؐ سے اعتراف کرایا گیا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے پیرو اور ان کے دین پر چلنے والے تھے۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ حضورؐ دین ابراہیمؑ کی اتباع وحی کی اتباع سے ہی کرتے تھے۔

کیونکہ مایوحیٰ و ماانزل کا اتباع ہی انبیاء کرام کا اتباع ہوتا ہے اور جملہ انبیاء کرام کی طرف مایوحیٰ و ماانزل صرف ایک ہی کتاب ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ (2/213) اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور ان سب کے ساتھ اپنی ایک ہی کتاب نازل فرمائی۔ چونکہ سنت الٰہی یہی ہے کہ وحی الٰہی ایک ہی تعلیم کی حامل ہوتی ہے، اس لئے وہی وحی حضرت ابراہیمؑ سمیت جملہ انبیاء کرام کو کی گئی۔ پس ثابت ہوا کہ اسی وحی کے اتباع سے جملہ انبیاء کرام کا اتباع ہوتا ہے اسی کا اتباع ملت ابراہیمؑ کا اتباع ہے اسی کا اتباع اسوۂ ابراہیمؑ کا اتباع ہے (60/4) اور اسی کا اتباع حضورؐ کا اتباع ہے (33/21)

یہ بات بھی یہاں عرض کرنی غیر متعلق نہیں ہوگی کہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک قرآن وحدیث دونوں وحی ہیں اور حدیث مثلہ معہ ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ ان کے نزدیک قرآن کریم کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک وحی سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور دوسری وحی، یعنی حدیث سے حضورؐ کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے۔ وحی کی اطاعت سے تو صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے، حضورؐ کی تو نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، تو اس بارے میں نہایت مختصر الفاظ میں واضح طور پر بطور قول سدید عرض ہے کہ جن احادیث کو خارج قرآن وحی کہا جاتا ہے اول تو یہ احادیث حضورؐ کی احادیث ہی نہیں ہیں بلکہ ذخیرہ روایت ہے۔ کیونکہ ڈھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلاً ایک زبان سے دوسری اور دوسری سے تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی پر منتقل ہوتے ہوئے آرہے ہیں ان کا اپنی اصل شکل میں موجود رہنا بالکل ناممکن ہے۔ لہٰذا وہ روایت تو احادیث رسولؐ ہیں ہی نہیں اور علمائے کرام بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ احادیث بالمعنی روایت کی گئی ہیں۔ ان کے اصل الفاظ منتقل نہیں کئے گئے (یہ Verbatim نہیں بلکہ Narrated ہیں) اسی لئے احادیث کے بعد او کما قال علیہ اسلام تحریر کیا جاتا ہے۔ یعنی جو بات روایت کی گئی ہے یا جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا ہوگا۔ موجودہ ذخیرہ روایات میں جو روایات مندرجہ ہیں یہ حضورؐ کے الفاظ نہیں بلکہ ہزاروں رواۃ کے ذہن سے نکلے ہوئے ان کے اپنے الفاظ ہیں۔ جن کو ہمارے علماء وحی کہتے ہیں۔ عقل اس بات پر ششدر و حیران رہ جاتی ہے کہ ان الفاظ کو ہمارے علمائے کرام کس طرح وحی کہہ دیتے ہیں۔ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ (68/36) تمہیں کیا ہو گیا، کیسے فیصلے کر رہے ہو) باقی رہے حضورؐ کے ارشادات گرامی قدر تو ان کے متعلق عرض ہے کہ اگر وہ وحی تھے اور دین کا جزو تھے تو حضورؐ کا فریضہ رسالت تھا کہ انہیں بھی قرآن کریم کی طرح ایک محفوظ صورت میں جمع کرا کر امت کو دے جاتے اور چونکہ حضورؐ نے ایسا نہیں کیا تو اس سے ظاہر ہے کہ آپؐ کے ارشادات گرامی قدر نہ جزو دین تھے اور نہ ضروریات دین میں شامل۔ دین خداوندی اپنی مکمل صورت میں صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔

اس مضمون کی چوتھی شق یہ ہے کہ عام خیال کے مطابق حدیث قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔ اس لئے احادیث نہ صرف ضروری ہیں بلکہ دین کا ایک حصہ ہیں۔ ہمارے ہاں جب قرآن کریم کی تفاسیر تحریر کرنے کی ابتداء ہوئی تو تفسیر تحریر کرنے کے لئے کوئی اصول منضبط نہیں کئے گئے اور اصول تفسیر طے کئے بغیر ہی تفاسیر لکھی جانے لگیں۔ وہ دور انسانیت کا بدترین دور

تھا، ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، کو عام فروغ تھا اور اسلام کا نظریہ دین کے بجائے مذہب کا ہو چکا تھا۔ ملوکیت کا شکنجہ اس قدر کسا ہوا تھا کہ دین کے نظریہ کی ایک رمق بھی اس وقت کسی کے پیش نظر نہیں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو طریقہ تفسیر اختیار کیا گیا وہ بھی خلاف قرآن کریم تھا۔ تفسیر کے لئے شان نزول لازمی قرار دیا گیا۔ یہ شان نزول عموماً فرقہ بندی سے متاثر تھے پھر ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول بنائے گئے۔ لیکن اصلاً اور عقلاً بھی یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ آیات شان نزول سے وابستہ تھیں کیونکہ اگر وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیات نازل نہ ہوتی؟ یا اگر واقعات زیادہ پیش آتے تو زیادہ آیات کا نزول ہوتا؟۔ شان نزول کا نظریہ ہی قابل قبول نہیں ہے۔ پھر شان نزول کے بعد ان احادیث سے مدد لی گئی جو ہر فرقہ سے متعلق تھی کیونکہ فرقے اس سے پیشتر وجود میں آ چکے تھے قرآن کریم از اوّل تا آخر حق ہے اور شان نزول اور روایات سب ظنّی ہیں۔ حق کی تفسیر ظن کے ساتھ کرنے سے حق بھی ظنّی ہو جاتا ہے۔ مزید حیرت واستعجاب اس بات پر ہے کہ خود قرآن کریم نے جو اصول قرآن کریم کی تفسیر کے مقرر فرمائے ہیں، مفسّرین کرام نے ان کو قابل اعتناء ہی نہیں سمجھا۔ قرآن کریم نے خود قرآن فہمی کے لئے دو اصول قرار دیئے ہیں کہ انہیں پیش نظر رکھنا نہایت لازمی ہے۔ ایک تو محاورۂ عرب کیونکہ قرآن کریم اس انداز گفتگو میں اترا ہے جو اس دور کے عربوں کا تھا۔ اور جس انداز میں عرب خود کلام کرتے تھے إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ o(51/23) بلاشبہ یہ قرآن حق ہے اور اس کا انداز وہی ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو o قرآن کریم کا دوسرا اصول تصریف آیات ہے فرمایا۔ انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ o(6/65) دیکھو ہم کس طرح آیات پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ تم سمجھو o نیز قرآن کریم کے مطابق حضورؐ کا طریقہ قرآن فہمی بھی یہی تھا۔ o وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُواْ دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ o(6/105)o اے رسول ہم اس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (یہ کہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) تا کہ لوگ کہنے لگیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا o تفسیر القرآن بالقرآن کا سب سے زیادہ فائدہ یہ ہے کہ اس طریقہ سے

خارج از قرآن نظریات شامل نہیں ہوتے۔افسوس یہ ہے کہ ایک ہزار سال سے تفسیر کرنے کا ایک ہی طریقہ ہم مسلمانوں میں چلا آرہا ہے۔تفسیر القرآن بالقرآن جو خود قرآن کریم کا تجویز کردہ طریقہ تھا وہ کسی بھی مفسر نے پیش نظر نہیں رکھا۔اس وجہ سے ہماری تفاسیر میں مشکل سے دس فیصد حصہ قرآنی نظریات کا ہوتا ہے اور بیشتر خیالات مفسرین کے اپنے ہوتے ہیں جو خارج از قرآن ہوتے ہیں۔اور جب ہم قرآن کریم کی اطاعت کرتے ہیں تو اس اطاعت میں بیشتر حصہ مفسرین کے نظریات کی اطاعت کا ہوتا ہے۔ایک اقل قلیل حصہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ہوتا ہے۔اور یہی وجہ ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی آج ہے۔ہماری موجودہ تفاسیر میں جو خامیاں ہیں،ان کا ذکر کردیا گیا ہے تاہم مختصر طور پر وہ پھر ترتیب وار درج کی جاتی ہیں وہ ملاحظہ فرمائیں،پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی تفاسیر ہیں سب ایک دوسرے کے چربے ہیں اور ایک ہی اصول یعنی تفسیر بالروایات کے طریقے پر تحریر کی گئی ہیں ان کی تعداد کی کثرت ، اسلاف سے اخلاف تک کا امتداد،ان کی صحت کے لئے کوئی دلیل فراہم نہیں کرسکتی۔ان سب کی طرف سے صرف نظر کرنا، صرف ایک اصول یا صرف ایک تفسیر سے صرف نظر کرنے سے زیادہ نہیں ہے۔

-2 دوسری بات یہ کہ اس انداز پر تفسیر لکھنے سے فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا۔چونکہ ہر فرقہ خواہش مند تھا کہ اپنے عقائد کی سند قرآن کریم سے مہیا کرے اور آیات کے الفاظ ان کی سند مہیا کرنے سے قاصر تھے اسی لئے موضوع روایات کا سہارا لیا گیا اور ہر غیر قرآنی عقیدہ کی سند تفسیر بالروایات سے حاصل کی گئی اور چونکہ موضوع روایات کی کمی نہیں تھی اس لئے اس طرح تائیدات فراہم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور اس سے فرقہ بندی میں اضافہ ہوا۔ہر فرقہ کی تفسیر الگ ہونے لگی۔ہر فرقہ کی مختلف تفاسیر ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ایک ذخیرہ تفسیر درست ہے اور باقی سب فرقوں کی تفاسیر غلط ہیں اور غلط روایات سے ان کی تائید حاصل کی گئی ہے۔

-3 ہماری تفاسیر جس دور میں لکھی جانی شروع ہوئی ہیں اس وقت تک اسلام اپنی اصل اور درست شکل میں نہیں رہا تھا۔اسلام ایک ضابطہ،حیات اور ایک دین ہے جس دین کی اطاعت اللہ

تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کے مترادف ہے۔حضورؐ نے اس دین کو جاری فرمایا اور خلافت راشدہ کا نظام اسی دین پر مبنی تھا خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت غالب آ گئی اور دین اور ضابطہ حیات کا تصور آنکھوں سے بالکل اوجھل ہو گیا۔ ہماری تفاسیر ملوکیت کے دور کی تصنیف کردہ ہیں اور قرآن کریم کو دین کے بجائے مذہب کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔آج جبکہ انسانی ذہن کے تراشیدہ نظامہائے زندگی ناکام ہو رہے ہیں۔اسلام بحیثیت ضابطہ حیات اور دین کے سامنے آ رہا ہے۔لیکن یہ تفاسیر جو قرآن کریم کو بطور مذہب پیش کر رہی ہیں اسلام کو بحیثیت دین پیش کرنے میں مانع ہو رہی ہیں اور اسلام کو بحیثیت نظام جاری کرنے میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

4- ان تفاسیر میں شان نزول کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور شان نزول کو پیش نگاہ رکھ کر ہی آیات کی تفسیر کی گئی ہے اس لئے آیات کو مقید اور محدود کر دیا گیا ہے۔قرآن کریم ایک آفاقی دین ہے اس کو کسی ملک، خطہ قوم یا دور سے مختص نہیں کر سکتے۔اسکی آفاقیت ہمہ گیر ہے۔شان نزول کی وجہ سے ان آیات کی آفاقیت ختم ہو جاتی ہے اور آیت صرف ایک واقعہ کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتی ہے عقلاً بھی شان نزول کا تصور درست معلوم نہیں ہوتا۔قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منشاء و تدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی۔یا اگر واقعات زیادہ پیش آتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ممکن تھا۔یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

5- آخری بات غور طلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو تصریف آیات پر اس قدر زور دیا ہے اور قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے خود ایک اصول متعین فرمایا ہے۔اس سے ان تفاسیر میں کوئی مدد نہیں لی گئی ہے اس اصول کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے آپ ایک ہزار سال کی تحریر کردہ ساری تفاسیر کو کھنگال ڈالیں اس اصول کی کوئی رمق آپ کو کہیں نہیں دکھائی دے گی اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس طرح تفسیر کرنے سے غیر قرآنی نظریات کی سند بالکل نہیں مل سکتی تھی جن کی سند روایات کی رُو سے مل جاتی ہے عملاً یہ صورت ہوئی کہ قرآن کریم بالکل مخفی ہو گیا اور آج جو ہمارے پیش نظر ہے وہ صرف روایات کی تعلیم ہے اور بس۔اس وضاحت سے قارئین کرام کے ذہن نشین یہ بات کرانی مقصود ہے

کہ یہ نظریہ کہ احادیث قرآن کریم کی تفسیر کے لئے ضروری ہے درست نہیں ہے۔ چاروں نکات جو احادیث کی ضرورت اور حجت کے لئے عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں ان کی تردید شق وار کر دی گئی ہے اور قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ ان نکات پر بغیر کسی تعصب کے خود غور فرمائیں اور اس کے علاوہ اس بات پر بھی غور کرنا ضروری ہے کے حدیث کے متعلق یہ چاروں نظریات ہم مسلمانوں میں کس وجہ سے در آئے کہ ساری امت، اور سارے فرقے، ان نظریات کو ایک ہزار سال سے گلے سے لگائے چلے آ رہے ہیں ۔ آئندہ مضمون میں ان وجوہات کو پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے

فتدبروا۔

اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین جس کو حضورؐ نے عملاً اس زمین پر متشکل کیا تھا اس کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت تھی چونکہ حضورؐ اس کے اولین سربراہ تھے اسی لئے ان کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت تھی۔ چونکہ یہ نظام حضورؐ کے ساتھ منقرض نہیں ہونا تھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہنا تھا اس لئے حضورؐ کے بعد آپ کے جانشین کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور جب تک بھی وہ نظام قائم رہا اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت تھی ۔ اللہ ورسولؐ دو مطاع ہیں لیکن قرآن کریم نے ان دو مطاعوں کی اطاعت کو ایک ہی اطاعت قرار دیا ہے اور ہر جگہ بجائے تثنیہ کے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ جن کے لئے آیات (9/74-9/62-8/80) کے علاوہ تقریباً 20، یا 25 آیات بطور استشہاد پیش کی جا سکتی ہیں قرآن کریم نے ان دو اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود تو اس دین کا تمکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تھا۔ لیکن انسانیت کی بدقسمتی کہ وہ نظام منقرض ہو گیا۔ اور اللہ ورسولؐ کی اطاعت کا واحد ذریعہ ختم ہو گیا۔ لیکن چونکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت تو کرنی ہی تھی اور دین کا نظام تو درہم برہم ہو کر ملوکیت در آئی تھی اس لئے مجبوراً یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور سولؐ کی اطاعت قرآن وحدیث کی اطاعت سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث شریف کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہوتی ہے اور اس ایک

اطاعت کو جس کے لئے قرآن کریم نے ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کیا اسی ایک اطاعت کو دو اطاعتوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اسی طرح نظام کا تصور بالکل محو کر دیا اور اب مسلمانوں میں دین کی جگہ مذہب آ گیا۔ دین میں حدیث کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں قرآنی نظام کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ لیکن مذہب میں حدیث کی پوزیشن بالکل بدل جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں (یعنی مذہب میں) یہ حضورؐ کی اطاعت کا ذریعہ پاتی ہے۔ اسی لئے اس کی اطاعت ضروری ہے۔ حدیث کی یہ بالکل دو مختلف حیثیتیں Positions ہیں۔ جو دین و مذہب میں اختیار کی جاتی ہیں۔ اب جو لوگ دین کے داعی ہیں وہ حدیث کو نہ حجت کا درجہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی قانون کا ماخذ بنا سکتے ہیں۔ البتہ مذہب کہ قائلین کو حدیث شریف سے مفر نہیں۔

لیکن اس کے بعد ایک اور حیرت کی بات عرض کی جاتی ہے زمانہ کے تھپیڑوں، اور حالات کے اقتضاء نے مسلمانوں کو اب مجبور کر دیا کہ وہ اسلام و قرآن کو بحیثیت ایک نظام اور دین کے اختیار کریں۔ ہمارے سامنے ایران میں اسلامی نظام کا ایک غلغلہ بلند ہوا اور انہوں نے بزعم خویش اسلامی نظام قائم بھی کیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے پھر اطاعت بجائے ایک مطاع کے دو مطاعوں کی الگ الگ قرار دی۔ جس کی وجہ سے ان کا نظام کامیاب نہیں ہو سکا اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دینا، یہ وہ اساس ہے جس پر اسلامی نظام چلتا ہے۔ اگر آپ اس اساس کو نکال دیں، تو اسلامی نظام کی کوئی اساس نہیں رہتی۔ توجہ و غور کی متقاضی تو یہ بات ہے کہ اگر اللہ و رسول کی اطاعت دو اطاعتیں ہیں اور قرآن حدیث کے ذریعہ کی جا سکتی ہیں تو پھر نظام قائم کرنے کی ضرورت کیا باقی رہتی ہے۔ مذہب کے نظریہ کے مطابق ہندوستان کا مسلمان، قرآن و سنت پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت کر رہا ہے۔ اسے قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اسلامی نظام قائم کرے۔ لیکن جو حضرات اسلامی نظام کے قائل ہیں ان کا تو منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آپ اس نظام کی اطاعت کو ایک اطاعت اور صرف نظام کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیں تب ہر شخص مجبور ہوگا کہ اللہ و رسولؐ کی اطاعت کے لئے نظام قائم کرے۔ ہمارے

ہاں پاکستان میں بھی چند جماعتیں ہیں جو نظام کی تو داعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اللہ ورسول کی اطاعت الگ الگ قرآن حدیث سے کرنے کے قائل ہیں۔ جو لوگ اسلام کا بطور مذہب کے نظریہ رکھتے ہیں ان کے لئے تو اللہ ورسول کی اطاعت قرآن وحدیث کی اطاعت سے ہوسکتی ہے۔ لیکن جو اسلامی نظام کے داعی ہیں ان کو تو لازماً نظام کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دینا ہوگا۔ اگر ایک طرف تو وہ نظام کے بھی قائل ہوں اور دوسری طرف اللہ ورسول کی اطاعت قرآن وحدیث کے ذریعہ کرنے کے بھی قائل ہوں تو یہ ایک ایسا تناقض ہے جو بالکل بدیہی اور واضح ہے۔ اور انہیں اس کو دور کرنا ہوگا۔ اور ایک کشتی میں بیٹھنا ہوگا یا مذہب پر قانع ہو جائیں اور اللہ ورسول کی اطاعت قرآن وحدیث کے ذریعہ کرلیں، لیکن اگر وہ دین کے داعی ہیں تو وہ اللہ ورسول کی اطاعت کو دین کی اطاعت قرار دیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قرآن کریم کے نظام کا تصور ختم ہو کر دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ تو قرآن کریم کے سارے نظریات میں تبدیلی کر دی گئی۔ قرآن کریم کی تفاسیر بھی بجائے دین کے مذہب کی حیثیت سے لکھی جانے لگیں اور خلاف قرآن نظریات در آئے ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، جاگیرداری، فرقہ بندی کا جواز، ملکیت زمین کا جواز، تصوف، روحانیت سب خلاف قرآن عقائد ہم مسلمانوں میں آ گئے۔ اسی طرح یہ نظریہ بھی آ گیا۔ مسلمانوں کی بربادی وتباہی دور کرنے کا واحد ذریعہ ان کے نظام کا قیام ہے۔ جس دن قرآن کریم کا نظام قائم ہوگیا اس دن یہ خلاف قرآن عقائد جن میں حجیت حدیث بھی شامل ہے، از خود ختم ہو جائیں گے۔ شرط صرف وہ نظام قائم کرنا ہے مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے نظام سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن کریم کا نظام ضرور بالضرور قائم ہوگا اب تو دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ کون خوش بخت قوم ہے کہ جو یہ نظام قائم کرے گی اور اللہ ورسول کے ہاں مثاب اور انسانیت کے سامنے سرخ رو ہوگی۔ نظام تو یقیناً یقیناً قائم ہوگا۔ لیکن افسوس صرف یہ ہے کہ۔۔۔ تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے۔

ماہ اگست 2004ء

13

دین میں حدیث کا مقام (حصہ دوم)

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ جیو ٹیلیویژن پر ''الف'' نام سے ایک پروگرام ہر منگل کی شام کو ہوتا ہے جس کو جناب انیق احمد صاحب کنڈکٹ کرتے ہیں مورخہ 18 جون کی منگل کو اس پروگرام کا عنوان ''دین میں حدیث کا مقام' تھا جس میں ملک کے معروف علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ اس پروگرام کے تبصرہ پر مشتمل ایک مضمون کمترین نے تحریر کیا جو 'صوت الحق' بابت اگست 2004ء میں طبع ہوا ہے جو قارئین کرام کے ملاحظہ سے گذرا ہوگا۔ جو کچھ اس مضمون میں تحریر کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارے ہاں حدیث کے متعلق علمائے کرام کا نظریہ یہ ہے کہ (1) حدیث وحی خفی ہے (2) حدیث اسلامی قانون کا ماخذ ہے (3) حدیث شریف کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت ہوتی ہے (4) حدیث شریف قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے۔ متذکرہ بالا پروگرام میں بھی علماء کرام تقریباً ان ہی نتائج پر پہنچے ہیں۔

اور یہ چاروں عقیدے ہمارے ہاں مسلمہ طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اس مضمون کی قسط اول میں کمترین نے بصد معذرت یہ عرض کیا ہے کہ یہ چاروں عقیدے قرآن کریم کے خلاف ہیں اور حدیث شریف کو ان چاروں مقامات میں سے کوئی مقام بھی حاصل نہیں ہے حدیث کا اصل مقام دین کی تاریخ ہے اور بس۔ ان چاروں عقائد کی تردید ترتیب وار اس سابقہ مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ مضمون کی موجودہ قسط میں ان کو دہرایا نہیں جائیگا۔ اگر کوئی صاحب اس سے دلچسپی رکھتے ہیں تو صوت الحق اگست کا پرچہ ملاحظہ فرمالیں۔ البتہ اس حالیہ مضمون میں ان اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی جائیگی جو ہمارے علمائے کرام کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں تاکہ اس موضوع پر یہ

مضمون نہایت درجہ مکمل ہو جائے ہمارے علمائے کرام کی طرف سے جو سب سے پہلا اور ان کے نزدیک سب سے زیادہ وقیع استدلال پیش کیا جاتا ہے وہ سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کا غلط مفہوم ہے اگر آپ کو حدیث شریف کے موضوع پر علمائے کرام سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے تو آپ اس بات کی تصدیق فرمائیں گے کہ حدیث کا موضوع شروع ہوتے ہی ہر عالم دین سب سے پہلے انہی آیات کا حوالہ دیتا ہے کہ حضورؐ کا ہر لفظ وحی تھا۔ اور وحی کے علاوہ حضورؐ کوئی گفتگو کرتے ہی نہیں تھے۔ اعلیٰ حضرت، عظیم المرتبت کا مشہور شعر ہے جو ہر مسجد میں ہر جمعہ کو نماز کے بعد بلند آواز سے ترنم سے پڑھا جاتا ہے۔

وہ دہن جس کا ہر لفظ وحی خدا

چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

حیرت اس بات پر ہے کہ علمائے کرام ذرا ہمت کر کے اس آیت کریمہ پر خود غور نہیں فرماتے اگر وہ خود اس آیت پر غور فرمائیں تو وہ اس نتیجے پر پہنچ سکتے جس پر وہ اب ہیں لیکن حضورؐ کے ہر نطق کا وحی ہونے کے خلاف خود قرآن کریم اور روایات میں دلائل موجود ہیں۔

مثلاً حضورؐ نے منافقین کو جب غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی اجازت عنایت فرمادی تو آیت کریمہ o عَفَا اللّٰهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ o (9/43)، نازل ہوئی۔ o اللہ کی عفو میں رہو انہیں کیوں اذن دے دیا یہاں تک کہ تم کو معلوم ہو جائیں وہ سچ کہتے ہیں اور تم جان لو جھوٹوں کو o اب اگر آپ کا منافقوں کو اجازت نہ دینا وحی سے تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس اجازت دلوانے کے بعد حضورؐ سے اس کے متعلق یہ پوچھنے کا کیا مطلب؟ حضورؐ کے قول کی اجازت کی تصویب کیوں نہ کر دی گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ آنجناب کا منافقین کو اجازت دینا بر بنائے وحی نہیں تھا بلکہ یہ آپ کا ذاتی بشری قول تھا۔

دوسری مثال حضرت خولہؓ بنت ثعلب کے واقعہ کی ہے کہ جب ان کے شوہر حضرت اوس بن صامت نے انہیں ظہار کر دیا تو کچھ عرصہ بعد ان کو رجوع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن چونکہ ظہار

کر چکے تھے۔ اس لئے رجوع کرنے میں انہیں سخت تردد اور پس و پیش تھا۔ انہیں ہمت نہیں ہوتی تھی کہ خود حضورؐ سے اس بارے میں استفسار کریں انہوں نے حضرت خولیہؓ کو حضورؐ کے پاس بھیجا کہ وہ اس معاملہ میں صحیح صورت حال معلوم کریں۔ حضورؐ نے جب ان کا واقعہ سنا تو فرمایا کہ ظہار کے بعد وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں جاسکتیں۔ اور حضورؐ نے ظہار کو طلاق قرار دیا۔ لیکن حضرت خولیہؓ بار بار یہی اصرار کرتی تھیں کہ ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ لیکن حضورؐ اسے طلاق ہی گرواتے رہے یہاں تک کہ فوراً ہی سورۃ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں o قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ o(58/1) اس قرآنی وحی نے حضورؐ کے ذاتی بشری قول کی جو عموماً وحی سمجھا جاتا ہے، تردید کردی اور حضورؐ کے قول کی تصویب نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضورؐ کا ہر قول وحی نہیں ہوتا تھا وہ حضورؐ کا بشری قول تھا۔

اس قسم کی مزید متعدد آیات ''وحی صرف قرآن میں ہے'' کے مضمون میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث ان کا دہرانا ممکن نہیں ہے یہاں دو آیات پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے آپ تصور میں لائیں حضورؐ اپنے صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور گفتگو فرمارہے ہیں اچانک کہیں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر اچانک صحابہؓ نے فرمایا کہ حضورؐ کہاں جارہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے پیاس لگی ہے پانی پی کر ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ حضورؐ پانی پی کر واپس تشریف لے آئے۔ حضورؐ کا یہ قول ''کہ میں پانی پی کر واپس آتا ہوں'' کیا کسی عقلمند آدمی کے نزدیک وحی ہوسکتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارے علماء مجبور ہوجاتے ہیں کہ وہ حضورؐ کے نبوی اور بشری اقوال میں فرق کریں۔ لیکن پھر جب حدیث کا موضوع شروع ہوتا ہے۔ تو ہمارے علماء پھر اسی آیات کو بطور سند پیش کرنے لگ جاتے ہیں۔ یا للعجب۔

اس تمہید کے بعد سورۃ النجم کی ابتدائی آیات کریمات کا درست مفہوم پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے علمائے کرام سے اصل تسامح یہ ہوا کہ انہوں نے ھو ضمیر کا مرجع بجائے نجم یعنی قرآن کے نطق قرار دیا ہے اور اس طرح مطلق نطق رسول کو وحی قرار دینے پر مجبور

ہو گئے، اور ہر قول رسول کو وحی ٹھہرایا گیا ہے جو سابقہ تحریر شدہ صفحات کی رُو سے کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ صحیح صورت حال کے مطابق ان آیات میں ھو ضمیر کا مرجع النّجم یعنی ستارۂ ہدایت قرآن ہے وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ o(53/1) شہادت ہے قرآن کی جب وہ نازل ہوا کہ تمھارا ساتھی نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہک گیا ہے وہ (وحی کے ضمن میں) بولتا ہے تو نہیں ہوتا وہ مگر وہی جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ پس ان ھو الا وحی یوحی میں ھو ضمیر کا مرجع النّجم یعنی قرآن کریم ہے۔ وحی کا تعلق عالم امر سے ہوتا ہے، جبکہ اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہوتا ہے قرآن کریم نے روح کا لفظ وحی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

(1) oرَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (40/15) oبلند درجوں والا ہے، عرش والا ہے، اپنے حکم کے مطابق روح ڈالتا ہے۔ اوپر جس کے چاہتا ہے، بندوں اپنے سے تاکہ ڈرائے ملاقات کے دن o(موضح القرآن) اسی طرح دوسرے مقام پر روح وحی کے معنی میں ارشاد ہوا oيُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (16/2) oفرشتوں کو اتارتا ہے ساتھ روح کے اپنے حکم سے اوپر جس کے چاہتا ہے اپنے بندوں سے۔ چنانچہ سورہ شوریٰ میں أَوْحَيْنَا فعل کا مفعول روح لا کر قطعی طور پر مہر تصدیق ثابت کر دی کہ روح کے معنی وحی کے ہی ہیں۔ oوَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (42/52) oاور اسی طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح کو اپنے حکم سے۔ ان مقامات میں قرآن کریم نے روح کا لفظ وحی کے معنی میں استعمال فرمایا ہے اور ہر جگہ وضاحت فرما دی کہ روح کا تعلق عالم امر سے ہے، عالم خلق سے نہیں۔ عالم امر کا تعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ وہاں علت و معلول کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ عالم امر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی مرضی، مشیت اور ارادہ پر منحصر ہوتا ہے اس کے برعکس عالم خلق کا تعلق علت و معلول سے ہوتا ہے اس میں ہر کام اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین اور ضوابط کے مطابق ہوتا ہے۔ وحی ایک موہبت عظمیٰ ہوتی تھی جس میں نبی کی سوچ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس میں خالص (Objectivity) معروضیت ہوتی تھی اور یہ

عالم امر سے متعلق ہوتی تھی اقوال رسول کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ جب کوئی مقدمہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوتا تھا اس کے تمام کوائف حضورؐ کے سامنے لائے جاتے تھے تو حضورؐ ان تمام واقعات پر غور فکر کرنے کے بعد اس کے نتائج اپنی بصیرت سے نکالتے تھے اور اس کو اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔ وہ الفاظ حضورؐ کے اپنے ذاتی بصیرت پر مبنی ہوتے تھے یہ پورا عمل (Process) عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے اس کا عالم امر سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ وحی کا تعلق خالصتاً عالم امر سے ہے

وحی کی حفاظت کے سلسلہ میں سورہ جن کی آخری آیت ملاحظہ فرمائیں۔ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ٥ لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ٥ (72/27.28) وہ وحی جو رسول کے دل پر بھی پہروں کے ساتھ نازل ہوتی تھی تاکہ اس میں رسول کے دل کے غصہ و محبت کے جذبات کا عمل اور غلطی و سہو و نسیان کا دخل نہ ہو جائے تو کیا اللہ کی وہی وحی پچھلے لوگوں کی پشت ہا پشت کی خیالی شہادتوں پر چھوڑی جا سکتی تھی۔ حاشا و کلا۔ آیت مبارکہ ٥ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي (3/31) میں فَاتَّبِعُونِي کے معنی پس میرے پیچھے چلو، میری طرح کام کرو، سو اگر تم سچ مچ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری طرح پر کرو، یعنی میری طرح مسلم ہو تا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے اور سچی توبہ کے سبب تمہارے گناہوں کو مٹاتا جائے۔

بعض علمائے کرام اپنی تائید میں حکمت کے لفظ سے بھی سہارا لینے کی کوشش فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد حدیث شریف اور وحی خفی ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے اس بات کی کوئی سند نہیں ملتی۔ حکمت یقیناً منزل من اللہ ہے مگر یہ بھی قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ ہے۔ ہر قانون کی غایت، اس کی لم، اس کا Rationale اس کی حکمت اور اس کی Why of it ہے مثلاً إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ٥ (47/7) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا ٥ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے گا اور اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ

ہمارے قدموں کو جما دے گا۔

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ، میں صلوٰۃ کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ صلوٰۃ فحش اور منکر سے باز رکھتی ہے۔ روزوں کی حکمت وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (2/185) (تا کہ تم قانون خداوندی کو غالب کردو اس عوض میں کہ اللہ نے تمہاری ہدایت فرمائی) بیان ہوئی ہے کہ روزوں کی حکمت یہ ہے کہ قانون خداوندی کو غالب کیا جائے۔ آیت کریمہ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ o(2/38) میں ہدایت خداوندی نازل فرمانے کی حکمت یہ بیان فرماتی ہے کہ اگر وحی الٰہی کا اتباع کیا جائے تو معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہے گا۔ اتباع وحی کی حکمت یہ ہے کہ معاشرے سے خوف وحزن جاتا رہے۔ کتاب وحکمت دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (4/113)، خدا نے تیری طرف کتاب وحکمت کو نازل کیا۔ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ (2/231) اور جو کچھ اتارا ہے اوپر تمہارے کتاب سے اور حکمت سے، نصیحت کرتا ہے تم کو ساتھ اس کے۔ کتاب وحکمت کے لئے صرف ایک ضمیر بِہٖ کی استعمال کر کے واضح کر دیا کہ کتاب وحکمت ایک ہی چیز ہے۔ سورۂ احزاب میں (33/44) واضح فرمایا کہ حکمت کی بھی تلاوت ہوتی ہے۔ اس لئے حکمت وحی غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہی قرآن کے باہر ہو سکتی ہے۔

حدیث کے اثرات: ہم مسلمانوں کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہنی چاہیے کہ قرآن کریم ایک نظام حیات ہے اور مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف

اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت ہے جولوگ اللہ ورسولؐ کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بس ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔جولوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے باغی، عاصی اور نافرمان ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز وروزوں کے پابند ہوں صدر اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو جاری کرنے کی وجہ سے ہی عروج واقتدار حاصل کیا تھا لیکن انسانیت کی بدقسمتی کہ مسلمانوں میں ملوکیت درآئی اور وہ نظام منقرض ہوگیا اور اسلام محض ایک مذہب بن کررہ گیا۔دین میں تو اس نظام کی اطاعت اللہ ورسولؐ کی اطاعت تھی۔ لیکن ملوکیت کو تو یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور ملوکیت ہر حال میں دوبارہ دین کے قیام کی مخالف تھی کیونکہ اسے دین کے قیام میں اپنی موت نظر آتی تھی۔اس لئے مسلمانوں میں ملوکیت کی ایما اور اس کی حمایت اور تقویت سے یہ نظریہ خوب خوب پھیلایا گیا کہ قرآن کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث کی اطاعت سے رسولؐ کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ملوکیت کو انتہا درجہ SUIT کرتا تھا۔ ہمارے ہاں جس قدر نظریات بھی خلاف قرآن ترویج پائے گئے وہ سب ملوکیت کے زیر اثر تھے دین میں فرقہ بندی حرام ہے۔لیکن مذہب میں فرقہ بندی جائز ہوتی ہے اور ہر جگہ مختلف فرقوں کے نمائندے بغیر کسی شرم وحیا کے اپنے فرقوں کی علی الاعلان نمائندگی کرتے ہیں۔حدیث کی اہمیت ومقام بھی صرف مذہب میں ہے دین میں حدیث کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔حدیث کا صحیح مقام صرف اس وقت متعین ہوگا جب ہم مسلمانوں میں دین کا تمکن ہوگا۔لیکن حدیث سے حضورؐ کی اطاعت ہونے کا عقیدہ دین کے قیام میں مانع ہے۔کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ جب اللہ ورسولؐ کی اطاعت ہورہی ہے تو نظام کیوں قائم کریں اس لئے حدیث عملاً دین کے قیام میں سخت رکاوٹ ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور حق ہے o فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (51/23) o آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔اسی

طرح یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور حق ہے۔o خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (64/3)o اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ قرآن کریم نے اپنے فقروں کو آیات کہا ہے تلک آیت القران و کتاب مبین ۔ یہ قرآن کی آیات میں، جو روشن کتاب ہے۔ اس طرح کائنات کی نشانیوں کو بھی آیات کہا ہے آیَاتٌ لِّلْمُوقِنِیْنَ (51/ 20) اور زمین میں مومنین کے لئے آیات ہیں۔ یہ دونوں چیزیں قرآن کریم اور کائنات۔ حق ہے اور دونوں آیات پر مشتمل ہیں۔ ان دونوں میں باہم کبھی اختلاف یا تضاد نہیں ہوسکتا۔ آپ یہ بات خیال میں لائیں کہ جو لوگ دنیا میں حیرت انگیز چیزیں ایجاد کرتے ہیں، جو سب کو حیران کر دیتی ہیں، یہ بلند و بالا سو سو منزلہ عمارات، کاریں، ہوائی جہاز، T.V، کمپیوٹر، وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان گھاس کا ایک پتہ Blade Of Grass ، پھول کی ایک پنکھڑی نہیں بنا سکتا۔ قدرتی چیزوں میں سے ہم کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح انسان کی بنائی ہوئی چیزوں اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ اشیاء میں واضح فرق ہوتا ہے۔ انسان کی آنکھ ایک نظر میں پہچان لیتی ہے کہ یہ چیز انسان کی بنائی ہوئی ہے یا اللہ تعالیٰ کی۔ جس طرح بڑے سے بڑا سائنسدان ان قدرت کی تخلیق کردہ کوئی چیز نہیں بنا سکتا، اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا ادیب، قرآن کریم کی آیت کے مثل کوئی آیت نہیں بنا سکتا کیونکہ یہ دونوں چیزیں۔ کائنات اور قرآن۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔

اسی طرح ان کو سمجھنے اور ان کو گرفت کرنے میں بھی دونوں میں ایک ہی طریقہ کارفرما ہے

اس طرح طبعی دنیا میں مختلف علوم کے ماہرین الگ الگ ہیں، اسی طرح قرآن کریم کی آیات، جو مختلف علوم سے متعلق ہیں، ان کو سمجھنے میں بھی ان ہی علوم کے ماہر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جس طرح سائیکالوجی کے ماہرین ہماری نفوس، Psyche میں ریسرچ کر رہے ہیں، اسی طرح وہ ماہرین قرآن کریم کی ان ہی آیات پر غور فرمائیں جو سائیکالوجی سے متعلق ہیں تو وہ ان آیات میں عام لوگوں Laymen سے زیادہ ریسرچ کر سکیں گے اسی طرح Geology کے وہ ماہرین جو زمین کی تہہ در تہہ پرتوں Layers میں ریسرچ کرتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کی ان ہی

آیات پر خصوصی غور کریں جو جیالوجی سے متعلق ہیں تو وہ ان آیات سے بہت قیمتی موتی نکال لیں گے۔قرآن کریم تو ایک سمندر بے کنارہ ہے۔یہ غواص (غوطہ خور) کی مہارت پر منحصر ہے کہ کس قسم کے موتی نکال لاتا ہے۔مختلف علوم کے ماہرین اپنے علم سے متعلق آیات پر غور کریں تو قرآن فہمی کا ایک نیا دروازہ وا ہوتا ہے،اور ایک نیا طریقہ منکشف ہوتا ہے اور جس قدر علوم انسانی میں اضافہ ہوگا اسی قدر قرآن فہمی میں اضافہ ہوگا۔

ہماری سابقہ تفاسیر میں عیب وسقم ہے کہ وہ قرآن فہمی کو باندھ دیتی ہیں۔وہ اس دور میں تحریر کی گئی تھیں جب علوم انسانی بالکل ابتدائی منزل میں تھے اور عقل انسانی نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ہمارے مفسرین کرام نے جو تفاسیر تحریر فرمائی ہیں وہ عقلی اعتبار سے اس معیار پر ہیں جو ایک ہزار سال پیشتر تھا۔ہمارے مفسرین کرام نہایت مخلص،دیانتدار،اور نیک نیت تھے لیکن وہ خود مجبور تھے کہ وہ دور علوم کی ترویج کا نہیں تھا۔اس لئے اُس دور کی تحریر کردہ تفاسیر اُس دور میں تو کامیاب تھیں۔لیکن وہ آج کے ذہن کو بالکل مطمئن نہیں کرسکتیں۔بلکہ وہ قرآن فہمی میں ایک رکاوٹ ہیں۔ہمارے موجودہ دور کے علمائے کرام اس سقم کو خوب محسوس کرتے ہیں۔لیکن ان کے سامنے وہ رکاوٹ آتی ہے کہ وہ تفسیر القرآن بالروایات کو نہیں چھوڑ سکتے اور قرآن کریم کی تفسیر حدیث کے ذریعے ہی کرنا چاہتے ہیں اور یہ عقیدہ کہ حدیث قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے،قرآن فہمی میں رکاوٹ بن رہا ہے۔اور یہ حدیث کا دوسرا اثر ہے جو کہ امت مسلمہ کو پہنچا ہے۔ضمناً یہ تحریر کرنا بھی غیر متعلق نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاں جو نام نہاد اسلامی لٹریچر ہے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس میں وہ تمام نظریات وعقائد سرایت کئے ہوئے ہیں کہ جن کو کوئی بھی قوم اختیار کرے گی وہ خود بخود زوال پذیر ہو جائیگی۔یہ واضح رہ کہ اس میں قرآن کریم کا کوئی حصہ نہیں یہ صرف مفسرین کی Contribution ہے۔جو ان کے ماحول کی وجہ سے تھی۔ان ہی مردہ جنازوں کو ہم اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔

حدیث کا تیسرا اثر امت مسلمہ کو یہ ہوا کہ حدیث کو اسلامی قانون کا ماخذ خیال کیا جاتا ہے اور ہمارے جس قدر قوانین خلاف قرآن مروج ہیں یہ سب حدیث کو اسلامی قانون کا ماخذ گردانئے کی وجہ سے ہیں، رجم، قتل مرتد، محجوب الارث، ملکیت زمین، مضاربت، مخابرۃ، عورتوں کو زدوکوب کرنا، جیسے بے شمار قوانین حدیث شریف پر مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں میراث Inheritance کے قوانین بھی حدیث کے اثر سے قرآن کریم کے خلاف وضع کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک 'عول' کا مسئلہ ہے جو بالکل خلاف قرآن ہے۔ حدیث کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دینے سے خلاف قرآن قوانین وضع ہوتے ہیں۔ اور ان کی اطاعت سے اللہ ورسولؐ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس لئے حدیث اللہ ورسولؐ کی اطاعت میں روکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں دعویٰ یہی ہے کہ احادیث بہت ہی جرح وتعدیل، وتنقیح کے بعد جمع کی گئی ہیں اس لئے انہیں قانون کا ماخذ بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن عملاً صورت یہ ہے کہ نماز جو دین کا اہم ترین ستون شمار کیا جاتا ہے، جو حضورؐ نے دس سال مدینہ شریف میں، سب صحابہؓ کے سامنے، دن میں 5 مرتبہ ادا کی، اس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس طرح ادا فرمائی۔ تو دیگر را چہ رسد؟ کسی بھی اہم مسئلہ پر اتفاق نہیں، ہر معاملہ میں متضاد بیانات موجود ہیں۔ اس لئے ان پر قانون سازی میں بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

ماہ ستمبر 2004ء

مکاتیب

برادرِ مکرم، عزیزِ محترم جناب حسین امیر فرہاد صاحب مدّ ظلہ العالی، مزاج گرامی۔

کمترین، راقم سطور نے ایک مضمون ''خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے'' تحریر کیا تھا جو آپ نے اپنے موقر جریدہ صوت الحق میں طبع فرمایا تھا۔ اگرچہ مضمون بغیر کسی کاوش کے تحریر کیا گیا تھا۔ لیکن قرآنی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ قارئین کرام نے زبانی، خطوط اور ای میل کے ذریعے حکم دیا کہ اس کی دوسری قسط بھی تحریر کی جائے۔ دوسری قسط کے لئے مواد تو بہت کافی ہے، لیکن اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے رکاوٹ یہ ہے کہ دوسری قسط زیادہ تر ان واقعات پر مشتمل ہوگی جن میں میرا ذکر لازمی ہوگا، مجھے اپنی عاجزی فروتنی اور انکسار کی وجہ سے خودنمائی سے نفور ہے اور ترفع سے میری طبیعت کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ 57 سال پر طویل واقعات قرآنی حلقوں میں پسند کئے جائیں گے وہ معلومات افزاء بھی ہوں گے، اور دونوں سرچشموں کی تاریخ کا ایک حصہ بھی ہیں اگر احباب کا اسی طرح اصرار رہا تو وہ ضبطِ تحریر کر دیے جائیں گے قرآن فہمی کے دو سرچشمے'' جن حضرات گراں قدر نے مطالعہ فرمایا ہے انہیں یہ علم ہے کہ یہ دونوں سرچشمے کون سے ہیں اور یہ کہ بحمد اللہ یہ دونوں سرچشمے اب تک رواں دواں ہیں۔ ان کی ابتداء اس نیک نیتی، اخلاص، اور تقریب الی اللہ کے جذبے پر استوار کی گئی تھی کہ وہ سرچشمے اب بھی جاری ہیں اور انشاء اللہ جاری رہیں گے۔ مذکور بالا مضمون خالص علمی تھا اور میں نے اس مضمون میں دونوں سرچشموں کے فاصلے اور قربتیں تحریر کی تھیں اور دونوں سرچشموں کے نظریات کی تاریخ Trace کی تھی۔ البتہ'' انسانی

زندگی' کے متعلق دونوں سرچشموں میں جو قربتیں اور فاصلے ہیں میں نے تحریر نہیں کئے تھے۔ کیونکہ یہ عنوان خود ایک مضمون اور سخت غور و تفحص کا متقاضی ہے۔ میں نے عمداً اس مضمون میں اس کو نظر انداز کر دیا تھا۔ تاہم ہیچمدان کو اس بات کا احساس لگا رہا کہ مضمون کو جامع اور مکمل کرنے کے لئے اس عنوان پر مضمون تحریر کروں۔ میں نے اس عنوان سے متعلق مضمون تحریر کیا جو ماہنامہ 'صوت الحق' کی اشاعت جولائی 04 میں طبع ہوا۔ اس کو "خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے" کی دوسری قسط شمار کرنا چاہئے۔ اس مضمون کو بھی قارئین کرام نے بہت پسند فرمایا اور اس پر بھی مزید تحریر کرنے کی فرمائش فرمائی۔

میں اس مضمون میں "انسانی زندگی" کے متعلق دونوں سرچشموں کی فکر Trace کر دی ہے اور غلط اور صحیح کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں غور و فکر فرما کر رسالہ ھذا کو اطلاع کریں کہ ان کے نزدیک اس مسئلہ کا کون سا رُخ درست ہے۔ رسالہ 'صوت الحق' ایک علمی رسالہ ہے اس کے قارئین اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور خالص قرآنی فکر سے منسلک ہیں۔ یہ کوئی ڈائجسٹ، یا رومانی رسالہ نہیں ہے کہ قارئین اس کو وقت گذاری یا تلذذ کی خاطر پڑھیں۔ اس کے قاری اس کو ایک خاص نقطہ نگاہ سے پڑھتے ہیں۔ لیکن افسوس اور حیرانی سے یہ بات تحریر کی جاتی ہے کہ اب تک کسی صاحب کا کوئی مکتوب اس سلسلے میں ماہنامہ کو موصول نہیں ہوا۔ اس لئے ماہنامہ ھذا کی دوبارہ درخواست ہے کہ قارئین کرام اس عنوان پر غور فرمائیں اور اپنا عندیہ تحریر فرمائیں کہ وہ ان دونوں سرچشموں میں سے کس سے اتفاق فرماتے ہیں۔ تاکہ ان خطوط کی روشنی میں مزید غور و فکر کے بعد ایک نظریہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے اپنا نظریہ مختصر اور آیات کریمات سے مستند تحریر فرمائیں تو بہتر ہوگا اور رسالہ ھذا حد درجہ ممنون ہوگا۔ آپ کے جوابات کی روشنی سے استفادہ کرنے کے بعد رسالہ ھذا اپنا موقف بیان کرے گا۔

راقم سطور، برادر مکرم، حسین امیر فرہاد صاحب کا حد درجہ شکر گذار اور دعا گو ہے کہ انہوں نے ان نامساعد حالات میں یہ ایک رسالہ جاری کیا ہوا ہے کہ جس میں قرآن کریم کی آواز بلند ہوتی

ہے۔ یہ ایک ایسی قرآنی قندیل ہے کہ جو انہوں نے اپنے خون جگر سے روشن کی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور دعا ہے کہ وہ تا دیر سلامت رہیں کہ قرآن کریم کی خدمت کرتے رہیں۔

معلوم نہیں اس عنوان کے سلسلے میں دوبارہ کب کچھ تحریر کرنے کی نوبت آئے اس لئے ایک اہم نقطہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ وہ آئندہ کے لوگوں کے کام آئے۔ کیونکہ میں یہ اصل مضمون میں تحریر کرنا فراموش کر گیا تھا۔ ایک مرتبہ پرویز صاحب سے اس عنوان پر گفتگو ہو رہی تھی انہوں نے یہ فرمایا کہ زندگی کو جرثومہ حیات سے لے کر پیکر انسانی تک پہنچنے کے لئے لاکھوں سال میں جن Stages سے گذرنا پڑتا ہے، انسانی بچہ 9 ماہ میں ان تمام Stages سے گذرتا ہے، جنین کے لئے اس مدت کو Shorten کر دیا جاتا ہے، Shorten کا لفظ ان کا ہی ہے انہوں نے یہی لفظ استعمال فرمایا تھا۔ ان کے ذہن میں اس سلسلہ میں آیت موجود تھی جو وہ Discuss کرنے والے تھے کہ فون کی وجہ سے یا کسی کے آنے کی وجہ سے گفتگو میں رکاوٹ پڑ گئی اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ پھر نوبت ہی نہیں آئے گی۔ وہ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہو گئے میں کئی مرتبہ اسپتال اور ان کے گھر حاضر ہوا لیکن ان کی تکلیف کے باعث کوئی موقع آیت کا حوالہ حاصل کرنے کا نہیں ہو سکا۔ جس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ عاش سعیداً ومات فائزاً فوزاً عظیماً۔ افسوس، صد افسوس، صد ہزار ہا افسوس، کہ وہ قرآن کریم کی شمع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

ماہ ستمبر 2004ء

اساس محکم

نوعِ انسانی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنی ساری تاریخ میں کوئی ایسا نظام اپنے لئے متشکل نہیں کرسکی جس میں ساری انسانیت سکون و آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ وہ مستقل اقدار جن پر ایسے معاشرے کی تشکیل ہو سکے، جس میں ساری انسانیت کی فلاح ہو، وہ اقدار دریافت کرنا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ عقلِ انسانی جس قدر بھی ترقی کر جائے، اور علوم حاصل کرلے، وہ انسانی معاشرے کے لئے مستقل اقدار دریافت نہیں کرسکتی۔ ارشادِ ربانی ہے، وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (46/26) چونکہ وہ آیاتِ الٰہی یعنی وحیِ الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ان کی مفاد پرستی کے جذبات ان پر غالب تھے، اسی لئے ان کی عقل و دانش، فہم و فراست ان کے کسی کام نہیں آئی اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے انہی نے ہی انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چونکہ ہر شخص کی عقل اپنا ہی مفاد پیشِ نظر رکھتی ہے اور دوسروں کے مفاد پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتی ہے اس لئے وہ ہمیشہ وہ ہی نظام بناتی ہے جو یا تو وہ اس کے اپنے مفاد میں ہو، یا اپنی قوم و قبیلہ کے مفاد میں ہو۔ ساری انسانیت کا مفاد اس کے پیشِ نظر نہیں ہوسکتا۔ علامہ اقبال کی ایک مشہور رباعی اس مضمون اور مفہوم کو خوب واضح کرتی ہے۔

عقل خود بین غافل از بہبودِ غیر   سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندہ سودِ ھمہ   در نگاہش سود و بہبودِ ھمہ

یہ صرف اور صرف وحیِ الٰہی کا خاصہ ہے کہ وہ ایسا نظام عنایت فرماتی ہے کہ جس میں

ساری انسانیت سکون و آرام کی زندگی گذار سکے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا استحصال نہ کر سکے اور Exploitation of man by man کے سارے ذرائع بند کر دیئے جائیں۔ وحی کے نظام کی بنیادی اساس محکم پر ہوتی ہے کہ اس میں حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور اس میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے کا محکوم ہوتا ہے اور نہ محتاج۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست　　　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

چونکہ قرآن کریم کا اصل اور بنیادی موضوع بہترین معاشرے کی تشکیل ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کے اصول و قواعد دینے کے ساتھ ساتھ بہترین معاشرہ کی تعریف Definition بھی خود ہی کر دی۔ فرمایا فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ o (2/38) یعنی اگر نوع انسانی اپنے معاشرے کی وحی الٰہی کے مطابق متشکل کر لے، تو اس معاشرہ میں نہ کسی قسم کا حزن ہوگا اور نہ کسی قسم کا خوف۔ عربی لغت کے مطابق کسی واقعہ کے وقوع سے بیشتر خوف ہوتا ہے اور اس کے وقوع کے بعد جو رنج ہوتا ہے وہ حزن کہلاتا ہے۔ قرآنی معاشرے میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہوں گی۔ جان کی تلافی، رزق و لباس کی کمی، رہائش کا نہ ہونا، تعلیم کا میسر نہ ہونا، زندگی کی لازمی ضروریات میں کمی، ان تمام چیزوں کا خوف اس معاشرے میں نہیں ہوگا۔ اگر کسی معاشرے میں اس قسم کا خوف یا کسی قسم کا حزن موجود ہے، تو یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ اس معاشرے میں وحی کا اتباع نہیں ہو رہا ہے، خواہ زبان سے وہ قوم کتنا ہی اتباع وحی کا دعوےٰ کرے۔

ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم نے ایسا نظام عنایت فرمایا تھا۔ اور وہ حضورؐ نے عملاً متشکل کر کے بھی دکھایا تھا لیکن وہ نظام کچھ عرصے قائم رہا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔ قرآن کریم کی رو سے کسی بھی نظام کو، اور خصوصاً قرآن کریم کے نظام کو قائم کرنے اور اس کو جاری کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو کلیتہً جاری کیا جائے۔ آدھے نظام کو قرآن کریم کے مطابق تشکیل کرنا اور نصف باقی کو قرآن کریم کے خلاف بنانے سے، قرآنی نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (2/85) کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو، اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے، نیز فرمایاo يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (2/208)o اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ صدرِ اول میں مسلمانوں نے بھی قرآن کریم کے مطابق نظام منتقل کیا۔ لیکن مسلمانوں کی، بلکہ ساری انسانیت کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس نظام کو علیٰ حالہ نہیں رہنے دیا گیا۔ جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی، تو اس نظام کا تصور بھی قراان کریم کے مطابق نہیں رہا۔

اس نظام کے کچھ حصے کو برقرار رکھا گیا اور کچھ حصہ سے انحراف شروع کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ نظام درہم برہم ہو گیا۔ قرآنی نظام کی اساسِ محکم اس نظریہ پر قائم تھی کہ اس کی اطاعت سے ہی اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور اس کی مخالفت سے اللہ اور رسول کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت ہی مسلمانوں کا مقصودِ حیات تھا۔ لیکن ملوکیت کے در آنے سے یہ تصور بدل گیا۔ اور اس تصور کی رو سے اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے نظام کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے بجائے قرآن وحدیث کی اطاعت کو، جو انفرادی طور پر ہر جگہ کی جاسکتی ہے۔ اطاعت الٰہی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح نظام کا تصور ختم کر دیا گیا۔ اور قرآنی نظام کی کوئی ضرورت اور اہمیت نہیں رہی۔ ہر نظام کو قائم کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کے لئے ایک جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم کے نظام کے قیام اور اس کی بقا اور استمرار کے لئے جذبہ محرکہ ہی یہ تھا کہ اس نظام کی اطاعت سے اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ جب یہ عقیدہ قائم نہیں رہا کہ اللہ رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ قرآنی نظام ہے تو وہ نظام زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں انفرادی طور پر عبادت رائج ہوگئی اور جسے بھی اللہ ورسول کی اطاعت کرنی ہوئی وہ انفرادی عبادت گزار، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں منہمک ہو گیا اور عبادت گزاری اور اطاعت الٰہی سے نظام اسلامی کا کوئی تعلق نہیں رہا، ملوکیت کا مقصود بھی یہی تھا اور وہ مقصداً سے اس طرح حاصل ہو گیا۔

مضمون ھذا میں یہ بات ثابت کی جائے گی کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے لئے قرآنی

نظام ایک لابدی چیز ہے اور اللہ رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا دیا ہوا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام جس کو حضوؐر نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس کی اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت تھی ظاہر ہے کہ یہ نظام حضوؐر کے بعد بھی چلنا تھا اس لئے حضوؐر کے بعد اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔ یہ اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے اور قرآن کریم کی رُو سے یہ ایک اطاعت ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے ضمیر واحد کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خمس، صدقات طاغوت سبیل المومنین، صوم وغیرہ کی اصطلاحات قرآن کریم کی اپنی وضع کردہ ہیں۔ اس لئے اس نے جہاں جہاں اللہ اور رسول کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس سے وہ نظام یا اس کی مرکزی اتھارٹی مراد ہوتی ہے۔

جنگ احد میں مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور حضوؐر بالکل تن تنہا رہ گئے تو آپ نے صحابہ کرام کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ حضوؐر کے گرد اگرد جمع ہو گئے۔ بظاہر یہ آواز حضوؐر کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ حضوؐر کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپ نے بحیثیت سربراہِ مملکت یہ آواز دی تھی۔ اس لئے اس آواز کو اللہ اور رسول کی آواز قرار دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(1) o اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيْمٌ o (3/172)

o جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو قبول کرلیا۔ بعد اس کے کہ ان کو زخم لگا تھا، ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے

ثواب عظیم ہے o

یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضوؐر کے ساتھ استوار کیا تھا اس عہد شکنی کو اللہ اور رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی تھی۔

(2) o ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ o (8/13)

○ یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور رسول کی مخالفت کرتا ہے اس کو اللہ سخت سزا دیتا ہے ○

اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فساد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

(3) ○إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا (5/33)

○ جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں۔

(4) ○إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (33/57)

○ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اگر اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ سے حضورؐ کی ذات مراد لی جائے بات بالکل الجھ جاتی ہے۔ رسول کو تو اذیت دی جاسکتی ہے، کیونکہ حضورؐ انسان تھے اور ارد گرد کے لوگوں کی ان تک رسائی تھی جو ہر طرح کی تکلیف اُنہیں دے سکتے تھے۔ اُنہیں جسمانی تکلیف بھی دی جاسکتی تھی اور روحانی بھی۔ اور عملاً ان کو تکلیف دی بھی گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ وہ انسانوں کی رسائی سے باہر ہے اسے بھلا کون تکلیف واذیت دے سکتا ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ اُسے کوئی تکلیف دے سکے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دینے سے مراد نظام الٰہی کو نقصان پہنچانا ہے۔

مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور قدرے استحکام حاصل ہونے کے بعد، سب سے پہلے اجتماع، یعنی حج اکبر میں حکومت اسلامی کی طرف سے کچھ اعلانات بھی ہوئے۔ اور اس حکومت کی پالیسی اور خارجی امور کے متعلق اعلانات ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اعلان

یہ تھا۔

(5) بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَo(9/1)

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھاo

پھر تیسری آیت شریف میں ارشاد ہوا۔

(6) oوَأَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللّٰهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ(9/3)

oاللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مُعاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے اور اسی حکومت کے نمائندے کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے ہیں۔ لیکن اُنہیں اللہ اور رسول کے اعلانات کہا گیا ہے۔ مدّعا اس حقیقت کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ تمام لوگوں پر بخوبی واضح اور مبرہن کر دیا جائے۔ کہ اگرچہ یہ تمام احکامات حضورؐ کی طرف سے صادر ہو رہے تھے لیکن درحقیقت یہ اللہ کے احکام ہیں۔ اس لئے یہ نظامِ حکومت الٰہی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے تھے۔ نیز سورۃ حشر میں ارشاد ہوا۔

(7) oلِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ

أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَo(59/8)

oاور ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جدا کر دیئے گئے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی

مدد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیںo

یہاں اللہ اور رسول کی مدد کرنے سے مراد نظامِ الٰہی کی مدد ہے اس سے چند آیات پہلے اسی سورت میں فرمایا گیا ہے۔

(8) oذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ(59/4)

یہاں بھی اللہ اور رسول کو تکلیف دینے سے مراد، اسلامی نظام کو نقصان پہنچانا ہے ایک آیت کریمہ اس بارے میں اتنی روشن و بیّن ہے کہ اس بات کے ثبوت میں حُجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

(9) وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (4/100)

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمے اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کر کے جانے سے بجز اسلامی حکومت (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا۔ اللہ اور رسول کی اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے

اللہ اور رسول دو الفاظ ہیں، لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے، جس کی اوپر مثالیں دی جا چکی ہیں، اس لئے اس کے لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر بخوبی واضح کر دیا ہے کہ یہ اطاعتیں دو نہیں بلکہ ایک ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(10) o يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَo(9/62)

o یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تا کہ تم کو راضی کرلیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اس کو راضی کریں o (ترجمہ اشرف علی)

یہاں اللہ اور رسول کے دو الفاظ ہونے کے باوجود ضمیر واحد آتی ہے۔ واحد ضمیر لا کر انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ جملہ اللہ اور رسول، اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے جو ایک ہے اور دو نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے

(11) أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِن فَضْلِهِ (9/74)

اُنہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو اللہ اور رسول نے، اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے اس نے اُنہیں غنی کر دیا ہے۔ فَضْلِهِ میں ضمیر واحد لا کر، دونوں الفاظ اللہ اور رسول کو بطور اصطلاح استعمال کر کے، ایک قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا۔

(12) o يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ o (8/20)

o اے ایمان والو، اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا کہنا ماننے سے روگرانی نہ کرو اور تم سُن تو لیتے ہی ہو o

اس آیت کریمہ میں وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ کی واحد ضمیر واضح کر رہی ہے کہ یہ دونوں اطاعتیں ایک ہی ہیں۔ اور دو ہرگز نہیں ہیں۔

ان بارہ آیات کریمات پر اکتفاء کیا جاتا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کو ایک قرار دیا ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ اس سے مراد قرآن و حدیث کی اطاعت انفرادی طور پر کرنی نہیں ہے۔ سیکولر سٹیٹ اور اسلامی سٹیٹ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ سیکولر سٹیٹ کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں مذہبی رسوم اور عبادات انفرادی طور پر ادا کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص حکومت کے خلاف کوئی جرم

(Crime) کرتا ہے تو وہ محض سٹیٹ کا جرم ہے اس سے اللہ اور رسول کی کوئی نافرمانی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص گورنمنٹ کے واجبات (Revenue) ادا نہیں کرتا تو اس سے اللہ اور رسول کے ہاں کوئی محاسبہ نہیں ہے۔ اگر کوئی مجرم جرم کرنے سے بیشتر ایسا انتظام کر لے کہ اسے جرم کی کوئی سزا نہ ملے، تو اسے جرم کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ لیکن اسلامی حکومت کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ اس میں حکومت کا ہر مجرم اللہ رسول کے ہاں قابل مواخذہ ہے۔ جس طرح اسلامی حکومت کی اطاعت اللہ رسول کی اطاعت ہے اسی طرح اسلامی حکومت کی نافرمانی، اللہ اور رسول کی نافرمانی ہے۔ اسلامی حکومت کے جرائم (Crime) گناہ بھی اسلامی حکومت کے (Sin) ہوتے ہیں۔ اس میں جرم اور گناہ (Sin & Crime) ایک ہی ہوتے ہیں۔ یہی وہ اساس محکم، اور العروۃ الوثقیٰ ہے جس پر اسلامی حکومت کے قیام کا انحصار ہوتا ہے۔ اور اسی سے مواخذہ کی وجہ سے اس میں جرائم یا گناہ کم ہوتے ہیں۔ اور اس مواخذہ کا تصور ختم کرنے کی وجہ سے ہی جرائم کی کوئی روک تھام نہیں ہو سکتی۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص سخت گرمی کے موسم میں روزہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے مکان میں بالکل تنہا ہے۔ ٹھنڈا پانی اس کے پاس مہیا ہے۔ پیاس کی سخت شدت محسوس کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ روزہ نہیں توڑتا۔ ایک ایک منٹ شمار کرتا ہے کہ افطار کا وقت آئے تو وہ روزہ افطار کرے۔ وہ پانی اس لئے نہیں پیتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ روزہ توڑنا گناہ ہے۔ حالانکہ کوئی حکومت اس کی نگرانی نہیں کر رہی ہے لیکن اللہ و رسول کی اطاعت اسے نافرمانی کرنے سے دور کئے ہوئے ہے، یہی شخص دفتر جاتا ہے تو وہاں غلط کام سرانجام دیتا ہے۔ اگر راشی ہے تو رشوت سے اجتناب نہیں کرتا اگر یہ شخص تاجر ہے تو ہر طرح کا انکم ٹیکس چوری کرنے کا بندوبست کرتا ہے، کیونکہ اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس کے ذہن نشین یہ بات ہو کہ اسلامی حکومت کی نافرمانی، اللہ و رسول کی نافرمانی ہے تو وہ جس طرح روزہ توڑنے سے اجتناب کرتا ہے اسی طرح وہ حکومت اسلامی کی خلاف ورزی کو بھی اللہ اور رسول کی نافرمانی سمجھ کر اس سے مجتنب رہے گا یہی وہ جذبہ ہے جو اسلامی حکومت کی اساس محکم ہے۔ جو شخص زکوۃ دیتا ہے، وہ ہی شخص لازماً حکومت کے (Revenue) ادا

کرے گا۔بس صرف زاویہ نگاہ کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔اسلامی حکومت کے(Revenue) ہی زکوٰۃ ہوتے ہیں۔حکومت کے واجبات اور زکوٰۃ کو الگ الگ دو مدّات شمار کرنا، درست نہیں ہے۔لوگ زکوٰۃ کو مذہبی فریضہ سمجھ کر خود بخود ادا کر دیتے ہیں۔لیکن حکومت کے واجبات روک رکھنا برا نہیں سمجھتے، اس کی وجہ صرف وہی ثنویت ہے جو حکومت اور مسجد کو الگ الگ شمار کیا گیا ہے، جس کو ختم کرنے کے لئے اسلامی حکومت قائم ہوتی ہے۔

جو حجاج صاحبان، حج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں وہ نہایت نیک نیتی سے حج کے سارے ارکان ادا کرتے ہیں۔اس میں کسی قسم کے دھوکہ جھوٹ کو ملوث نہیں ہونے دیتے، لیکن جب حج کے سلسلہ میں قرعہ اندازی ہوتی ہے، اور حج پر جانے کے لئے نام نکلوانے ہوتے ہیں تو وہ ہی حجاج اس میں دھوکہ اور جھوٹ سے پرہیز نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ حکومت سے کر رہے ہیں اللہ اور رسول سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔اور حج کے ارکان، اللہ اور رسول کی خوشنودی کی خاطر کر رہے ہیں اس لئے اس میں کسی قسم کی نافرمانی نہیں ہونے دیتے۔

دنیا کا باطنی اضطراب اور فطرت کے تقاضے انسانیت کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ انسان کے خود ساختہ گزشتہ نظامہائے حکومت کو ترک کرے اور ایسا نظام اختیار کرے جس سے دنیا کو سکون اور امن حاصل ہو سکے۔جن اقوام کے پاس قرآن کریم نہیں ہے اور جو وحی الٰہی کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں۔ان کے پاس تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انہیں نظاموں میں کچھ ردوبدل کر کے، ان کو ہی جاری رکھیں، لیکن ہم مسلمانوں کی پوزیشن مختلف ہے۔

ہمارے سامنے اصولی طور پر دو امور بہت اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر کام کرنا ضروری ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ عقلی طور پر یہ بات ثابت کی جائے کہ عقل انسانی اپنے مسائل خود حل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ وحی الٰہی کے نور سے مستنیر نہ ہو۔انسانیت ہزار جتن کر لے، لیکن وہ کوئی قابل ستائش نظام بنا ہی نہیں سکتی۔یہ بات خود مسلمانوں کے ذہن نشین بھی کرائی جائے اور غیر مسلم اقوام کے سامنے بھی۔اور دوسری بات یہ ہے کہ عالم انسانیت جن مسائل اور مصائب سے آج دوچار ہے

ان کی نشاندہی کرکے، ان کا حل قرآن کریم سے پیش کیا جائے۔ جو بہت واضح اور قابل عمل ہو۔ قرآن کریم اپنے کمال اور کفایت کا مدعی ہے۔اس نہج پر کام کرنے سے ان دعاوی کے دلائل فراہم ہوتے ہیں۔اور ان دعاوی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ کام بہت مشکل اور ہمت طلب ہے اور ان ہی لوگوں کے بس کا ہے جنہیں موجودہ علوم پر مہارت تامہ ہو۔ موجودہ دور کے مسائل و مصائب سے بخوبی واقف ہوں۔ جو شخص موجودہ دور کے مسائل سے آگاہ ہوگا وہی ان کا حل قرآن کریم سے تلاش کر سکے گا جسے آج مسائل اور انسانیت کی مشکلات کا ہی علم نہیں ہو وہ ان کا حل قرآن کریم سے تلاش نہیں کر سکتا۔

نیست ایں کارِ فقیہان اے پسر

عملی طور پر اس کی مثال ربوٰ کی حرمت ہے۔ ربوٰ کی حرمت پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ان کرنے کا کام یہ ہے کہ ربوٰ کے نظام سے جو تباہیاں انسانیت کو ہوئیں۔ان کو واضح کیا جائے اور اس کے بغیر معاشی نظام چلانے کا نقشہ پیش کیا جائے، جب تک عملاً کوئی معاشی نظام ربوٰ کے بغیر پیش نہیں کیا جائے گا، قرآن کریم کے دعوے کی تصدیق نہیں ہوگی۔

زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہوکر مسلمانوں کے تقریباً بیشتر ممالک میں اسلامی نظام قائم کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں جو بہت خوش آئند بات ہے۔قرآن کریم نے جو دعاوی کئے ہیں وہ دعاوی عملاً اسی نظام میں پورے ہوتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق قائم کیا جائے۔ اسی نظام کی وابستگی سے امت کی فلاح و نجات وابستہ ہے۔لیکن اس کے قائم کرنے میں چند دشواریاں جو پیش آرہی ہیں۔ان میں سب سے پہلی دشواری یہی ہے کہ ہم مسلمانوں کے سامنے اس کا تصور قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔جس جس جگہ یہ نظام قائم کرنے کی کوشش ہورہی ہے اس میں ملوکیت سے متاثر شدہ تصور کے مطابق یہ نظام قائم کیا جارہا ہے۔اور اللہ اور رسول کی اطاعتیں دو شمار کرکے، قرآن و حدیث کی اطاعتوں کو پیش نظر رکھا جارہا ہے۔ یہی صورت حال، ایران، سوڈان، الجیریا، میں ہے اور یہی صورت حال پاکستان میں ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت کے لئے

قرآن کریم کی اطاعت کر لی جائے اور رسول کی اطاعت کے لئے احادیث کی اطاعت کر لی جائے اور اس طرح عملاً رسول کا ترجمہ احادیث قرار پاتا ہے۔ حدیث کا موضوع بہت جذباتی ہے۔ لیکن اس موقف پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔

اولاً یہ بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ہم جن کتب کو احادیث کا مجموعہ قرار دیتے ہیں وہ حقیقتاً احادیث کے مجموعے ہیں ہی نہیں۔ وہ روایات ہیں بالمعنیٰ نقل کی گئی ہیں، ان کے شروع میں روی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اور آخر میں او کما قال علیہ اسلام اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ وہ روایات ہیں اور وہ بھی روایت باللفظ نہیں بلکہ بالمعنیٰ ہے۔ ان کا نام احادیث رکھنا محض ان کا تقدس بڑھانے کے لئے ہے۔ نیز یہ کہ یہ سب مجموعے حضورؐ سے ڈھائی سو سال بعد وجود میں آئے اور ان مجموعوں سے پیشتر بھی اطاعت رسول ہو رہی تھی۔ اور یہ مجموعے مختلف فرقوں کے مختلف ہیں۔ اس لئے مختلف فرقوں کی اطاعت رسول بھی مختلف ہے۔ جس سے آپس میں اختلاف ہوتا ہے اور فرقہ بندی تک نوبت آتی ہے۔ جو قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ اس لئے رسول کی اطاعت کا ترجمہ روایات کی اطاعت کرنا درست نہیں ہے۔ جس سے دو اطاعتیں وجود میں آتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس لئے جب بھی قرآنی نظام قائم کرنا ہوگا اس کا وہی صحیح تصور پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا جو سابقہ صفحات میں ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اسلامی حکومت کے حاکم اعلیٰ (مرکزی اتھارٹی) کی ہی اطاعت ہے۔

اسلامی نظام کو قائم کرنے میں دوسری دشواری فقہ کا تعین اور اس کا اجراء ہے۔ ایران میں فقہ جعفری نافذ کیا گیا ہے اور ہمارے ہاں پاکستان میں فقہ حنفی جاری کرنے کا مطالبہ ہے۔ ہم مسلمانوں میں یہ دونوں فقہیں آج سے ایک ہزار سال پیشتر بنی عباس کے دور میں مرتب کی گئی تھیں۔ بنی عباس کا دور ملوکیت، پیشوائیت، آمریت، کا دور تھا۔ جب یہ قوانین مرتب کئے گئے تو یہ قوانین بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور ان قوانین میں ملوکیت، پیشوائیت، کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔ جب کہ عورتوں، اقلیتوں، مزدوروں مغریب طبقہ، کسانوں، بچوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔

عقل انسانی ایک ہزار سال پیشتر جو سوچ سکتی تھی اس کے مطابق ہی قوانین وضع کئے گئے۔آج سے ایک ہزار سال پیشتر جو قوانین مغرب میں بنائے گئے تھے وہ بھی بربریت پر مشتمل تھے۔لیکن جوں جوں علوم میں اضافہ ہوا اور رواداری بڑھی، اسی قدر قوانین بھی مبنی بر عدل اور لچک دار ہوتے چلے گئے۔ ہمارے فقہ بھی انسانوں کے ہی تیار کردہ ہیں۔ظاہر ہے وہ بھی اسی دور سے متاثر ہیں۔اس لئے ان کا نفاذ اس موجودہ دور میں مشکل معلوم ہوتا ہے۔وحی چونکہ علم الٰہی ہوتی ہے۔اس لئے وہ تو زمانہ کے اثرات سے بالکل محفوظ ہوتی ہے لیکن عقل انسانی کی یہ صورت نہیں ہے۔وہ اپنے دور سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔خواہ کتنا ہی بڑا عالم ہو وہ اپنے دور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہمارے قوانین اسی وجہ سے اُن ادوار سے متاثر ہیں اور اُن ہی ادوار کے لئے بنائے گئے تھے۔آج انسانیت جن مسائل سے دوچار ہے وہ مسائل اس دور میں تھے ہی نہیں۔آج کے مسائل کا حل عقل انسانی، وحی الٰہی کی حدود میں رہ کر خود تلاش کر سکتی ہے۔

مثال کے طور پر عرض ہے کہ ترکی کی حکومت مسلم سٹیٹ ہے کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن وہ اسلامی سٹیٹ نہیں ہے۔اسی طرح بنو عباس کی حکومت بھی مسلم سٹیٹ تھی وہ اسلامی حکومت نہیں تھی۔بادشاہت کا ہونا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ غیر اسلامی حکومت تھی۔غیر اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی قوانین ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہماری موجودہ فقہیں اسلامی فقہیں نہیں ہیں۔ بلکہ ملوکیت کے تیار کردہ قوانین کے مجموعے ہیں۔اس لئے اسلامی حکومت میں انہیں جاری کرنا ضروری نہیں۔لیکن چونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت جب ہی قائم ہوگی جب وہ قوانین جاری ہوں، وہ قوانین آج کے دور کے مطابق نہیں،اس لئے اسلامی حکومت کا قیام مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

صحیح صورت حال یہ ہے کہ قرآن کریم نے کچھ قوانین خود عنایت فرمائے ہیں۔ان کو من وعن جاری کرنا لازم ہوگا۔اس کے علاوہ قرآن کریم نے اصول عطا فرمائے ہیں۔ان کی روشنی میں ہر دور کے مطابق قوانین وضع کرنے ہوں گے۔اور ہر دور کے مطابق جزئیات طے کرنا ہوں

گی ۔اسی طرح ہر دور کی اسلامی حکومت وہ قوانین قرآن کریم کی حدود میں رہ کر مستنبط کر کے ان کو جاری کرے گی اور ان کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے مترادف ہوگی۔

اس کے علاوہ جو دشواری اسلامی حکومت قائم کرنے میں ہوتی ہے وہ روز مرہ کی معاشرت اور قرآنی قوانین میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔قرآن کریم ایک خاص مقام، اور ایک خاص عہد میں نازل ہوا اور اسی مقام پر اس کے احکامات وقوانین کے مطابق اسلامی حکومت قائم ہوئی۔عرب ہی اس کے اولین مخاطب تھے۔ اور انہیں ہی بطور خمیر (Nucleus)استعمال کیا گیا تھا۔عربوں کی سوسائٹی بہت سادہ اور(Primitive Stage)پرتھی۔قرآن کریم کے قوانین وہاں رائج ہوئے۔عربوں کے جو دستور، عادات، رسوم ورواج قرآن کریم کے خلاف تھے انہیں قرآن کریم نے ختم کرادیا۔باقی رسوم عربوں میں قائم رہیں ۔لیکن وہ رسوم دین کا حصہ نہیں تھیں۔وہ ایک خاص وضع کا لباس استعمال کرتے تھے۔خاص وضع کا کھانا کھاتے تھے۔ان کے طور طریقے ان کی آب وہوا اور حالات کے مطابق تھے۔چونکہ حضوؐر انہیں میں پیدا ہوئے اس لئے ظاہر ہے کہ وہی طرز زندگی آپؐ نے اختیار فرمائی۔وہی وضع قطع، وہی لباس، وہی خور ونوش کے طور طریقے آپؐ نے اختیار فرمائے۔لیکن ان تمام چیزوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔حضوؐر کے ذاتی میلانات، رُجحانات، ترجیحات، اور روز مرّہ کے معمولات کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے۔ہم مسلمان ان کے اتباع کے مکلف ہیں حضوؐر نے جو امور دین کی ترویج، توسیع، استحکام اور دین کے اتباع میں اختیار فرمائے تھے۔ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔لیکن حضوؐر کے ذاتی معمولات کا اتباع ہم پر لازم نہیں، دین کے اتباع میں حضوؐر نے جہاد فرمایا۔زکوٰۃ قائم فرمائی، روزہ رکھا، یہ اور دیگر امور جو دینی تھے اور حضوؐر نے سرانجام دیئے ان کا اتباع ہم پر لازمی ہے ۔لیکن حضوؐر کے ذاتی معمولات اور امور کا اتباع لازمی نہیں، حضوؐر اگر کسی دن چاول تناول فرماتے تو یہ ضروری نہیں تھا کہ مدینہ شریف میں سب صحابہ اس دن چاول تناول فرماتے ۔ یہ حضوؐر کا ذاتی رجحان تھا۔اسی طرح روایات میں ہے کہ حضوؐر اپنے نواسوں سے بہت محبت فرماتے تھے اور نماز کا

سجدہ بھی ان کے لئے طویل فرمایا۔لیکن اور مسلمانوں کے اپنے نواسوں سے محبت کرنا،اور ان کے لئے نماز کا سجدہ طویل کرنا،ضروری نہیں،ان امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں اور نہ ہی یہ سنت کے زمرہ میں ہیں۔

سنت حضورؐ کے دینی امور پر مشتمل ہے۔سورہ الممتحنہ میں حضورؐ کو عورتوں کے متعلق حکم ہوا کہ اگر وہ چوری، زنا،قتل اولاد وغیرہ کے جرم کی مرتکب نہ ہوں، نیز فرمایا معروف میں حضورؐ کی نافرمانی نہ کریں تو حضورؐ ان کو بیعت کرلیں۔ یہاں حکم صرف معروف میں اطاعت کرنے کا آیا ہے اسلامی حکومت کے وہ احکام جو وہ وقتاً فوقتاً جاری کرتی رہتی ہے۔معروف کہلاتے ہیں۔مثلاً اگر حکومت اعلان کرے کہ دفاتر کے اوقات صبح 9 سے شام 4 بجے تک ہوا کریں گے یہ معروف کہلائیں گے۔حکومت نے اعلان کیا کہ اس سال جہاز یا ریل کے کرایہ میں اتنا فیصد اضافہ ہوا ہے اور ہر شخص اس شرح سے ٹکٹ خریدا کرے،تو یہ معروف شمار ہوگا۔سورہ محمد کی اس آیت میں یہ حکم ہوا کہ حضورؐ جو احکامات، یعنی معروف جاری فرمارہے ہیں، اگر ان کا اتباع خواتین کریں تو حضورؐ ان کو بیعت فرمالیں، اور حضورؐ کے ذاتی معمولات کا اتباع ضروری قرار نہیں دیا۔اسی طرح سورہ احزاب میں حضرت زیدؓ کے واقعہ کے ضمن میں حضرت زیدؓ نے حضورؐ کی مرضی کے خلاف حضرت زینبؓ کو طلاق دی لیکن قرآن کریم نے اس کے باوجود ان کے لئے أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (33/37) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس سے واضح ہے کہ حضورؐ کی ذاتی اطاعت ان کے لئے فرض نہیں تھی۔قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف،سنت کے مفہوم میں توسیع کرنے سے دقت یہ ہوتی ہے کہ اُس دور کے حالات طور طریقے، عادات، لباس وغیرہ اپنانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ سوسائٹی نہ صرف جامد ہوجاتی ہے بلکہ اسی طرح کی سادی اور اتنے عرصہ پیچھے چلی جاتی ہے جو اس دور میں اپنانی مشکل ہوجاتی ہے اور اسلامی حکومت قائم کرنے میں بڑی رکاوٹ واقع ہوتی ہے۔ قرآنی اقدار کے اندر رہ کر، لچکدار، ترقی پسند، وسیع النظر،تنوع پذیر Flexible،معاشرہ قائم کرنا زیادہ آسان اور زیادہ ممکن ہوگا۔اس لئے ضروری ہے کہ سنت کی وہی تعبیر کی جائے جو قرآن کریم کی

رو سے واضح ہے۔

یہاں تک جو گزارشات کی گئی ہیں ان کا ملخصیہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال اور بدحالی کا واحد علاج صرف قرآنی نظام کے قیام سے وابستہ ہے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیا جائے۔ اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اسلامی نظام کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت شمار کی جائے اور معاشرے کو قرآن کریم کی اقدار کے اندر رہتے ہوئے، وسعت پذیر، لچکدار، آزاد، ہمہ گیر اور Adoptable رکھا جائے تا کہ اس کے قائم کرنے میں سہولت ہو۔

ماہ اکتوبر 2004ء

القول السدید (حصہ اول)

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اگر ان لوگوں سے دریافت کرو کہ کائنات کو کس نے خلق کیا ہے اور کون اس کو چلا رہا ہے تو یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے، وہ کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام ونسق تک تو اللہ تعالیٰ کے اقتدار کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن انسانی دنیا میں اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے منکر تھے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اس وحی کو نہیں مانتے تھے جو انسانی معاملات کو نظم ونسق میں رکھے، آج بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے جو کائناتی اللہ کے وجود کے تو قائل ہیں لیکن دنیاوی معاملات میں اس کے اقتدار کے قائل نہیں۔ کائنات کے اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنے کے نظریہ کی قرآن کریم نے تصویب وتائید کرتے ہوئے فرمایا۔

o وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ o(45/37)o

یعنی ساری کائنات میں کبریائی (اقتدار) صرف اللہ کو حاصل ہے جو قوت وحکمت پر مبنی ہے o خالق کائنات کی مثال کو دلیل کی اساس قرار دے کر اس نے انہی لوگوں سے فرمایا کہ جب تم خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی تسلیم کرتے ہو تو اسی طرح اس دنیا میں اس کو حاکم اور الٰہ تسلیم کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو o وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (43/84) یاد رکھو خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ ہے اور انسانی دنیا میں بھی وہی الٰہ ہے۔ جس طرح ساری کائنات اس کے احکام کے تابع چل رہی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی حکومت اسی کے احکام کے ماتحت چلنی چاہیے۔ حق حکومت سوائے اس کی ذات کے کسی اور کو حاصل نہیں۔ حکومت کی کوئی بھی شکل ہو قرآن کریم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون سازی کے اختیارات کسی ایک انسان یا انسانوں کے

کسی گروہ کے ہاتھوں میں ہوں۔ اور اس طرح دوسرے انسان لامحالہ ان کی مرضی کے تابع زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں ۔ یہ انسان کی انتہائی تحقیر اور تذلیل ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی مرضی کے تابع چلے۔ اس سے انسان شرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے اس کے شرف وتکریم کا راز ہی اس میں مضمر ہے کہ وہ کسی انسان کا محکوم محتاج نہ ہو۔

قرآن کریم کی یہ دلیل اتنی واضح ، اور مسکت ہے کہ جس طرح یہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر درست تھی اسی طرح آج بھی درست ہے اور آج کے تعلیم یافتہ ذہن کو اسی طرح متاثر کرتی ہے۔ جس اللہ تعالیٰ کے قوانین اتنی بڑی کائنات کو اس نظم وضبط سے چلا رہے ہیں ، اسی اللہ تعالیٰ کے قوانین جو وحی کی شکل میں انسانیت کو عطا کیے گئے ہیں۔ اگر ہمارے معاشروں میں نافذ کر دیئے جائیں تو یہ قوانین بھی ان معاشروں کو اسی طرح نظام وضبط پر قائم رکھیں گے، اور یہ معاشرے نہ صرف عدل وانصاف پر مبنی ہوں گے بلکہ ان معاشروں میں پوری انسانیت سے بالکل یکساں برتاؤ اور سلوک ہوگا۔ اور پوری انسانیت کی عزت وتکریم ان معاشروں کے مدنظر ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے جو قوانین انسانیت کی رہنمائی کے لئے وحی کی وساطت سے عنایت فرمائے ہیں انہیں الحق کے نام سے موسوم کرتے ہوئے فرمایا کہ صرف الحق ، یعنی قوانین الٰہی ہی درست ہیں ، اور صرف ان پر ہی عمل کرنے سے درست اور تعمیری نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ اگر الحق کے ماتحت زندگی بسر کی جائے گی تو ان پر مبنی معاشرے سکون ، اطمینان کے حامل ہوں گے۔ لیکن جن معاشروں میں الحق کا نفاذ نہیں ہوگا وہ معاشرے ظلم وفساد کے حامل ہوں گے ٥ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (23/71) اگر الحق خالصۃً حق نہ رہے اور الحق لوگوں کے جذبات کے تابع ہو جائے ، اور معاشروں کے قوانین انسان کے جذبات کے مطابق تشکیل ہونے لگیں تو ساری دنیا میں افراتفری پیدا ہو جائے گی اور دنیا سے امن وسکون رخصت ہو جائے گا۔ اس سے محفوظ رہنے کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ وہ قوانین جن کے ماتحت انسان کو زندگی گذارنی ہے، اس میں انسان کی کوئی دخل اندازی نہ ہو اور صرف الحق یعنی قوانین الٰہی کی

حکومت اور عمل داری ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے ماتحت زندگی گزارنے سے ایسا نظام وجود پذیر ہوتا ہے جس میں انسانیت شرف ومجد کی زندگی بسر کرتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انسان اس نظام سے اعراض کرتا ہے اور محض اپنی مفاد پرستی کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے عنایت کردہ قوانین کے بجائے اپنے خودساختہ قوانین معاشرے میں نافذ کرتا ہے۔

جس دور میں انسانیت ذہنی طور پر بالکل پست سطح پر تھی انسانی حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور طاقتور انسانوں نے مجبور اور مقہور انسانوں کو ذلیل بنا رکھا تھا اور ان کی حیثیت بالکل غلاموں جیسی رکھی تھی، دنیا، آزادی، مساوات، حریت، احترام انسانیت، جیسے بنیادی تصورات سے قطعی ناواقف تھی اس وقت قرآن کریم نے انسانیت کو آزادی کے تصور سے روشناس کرایا اور نہایت واشگاف انداز میں اور بہت مؤثر طریقہ پر اعلان فرمایا کہ انسان کی حکومت انسان پر قطعی حرام ہے اور حق حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (6/57) حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا (6/62) نیز سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o (5/44) جو لوگ قانون الٰہی کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ کافر ہیں o اللہ تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا o (18/26) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ کردہ ضابطہ حیات صرف اور صرف اسلام ہے اور اگر کوئی شخص اس ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا اور کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کرنا پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے o وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (3/85) کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضابطہ حیات صرف الاسلام ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جسے جو قوم بھی اپنائے گی وہ فلاح پا جائے گی یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے کرام کو ملتا رہا ہے اور جو بالآخر قرآن کریم میں آ کر مکمل ہوا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسانی کے لئے منتخب کیا ہے (5/3)

یہ ضابطہ حیات نہ کسی قوم سے مخصوص ہے نہ کسی خطہ سے مختص، نہ کسی دور سے مخصوص ہے

نہ کسی ملک سے متعلق۔جس قوم نے جس جگہ اس کو اختیار کیا،فلاح حاصل کرے گی۔اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشروں کواصولی طور پر دو قسموں پر منقسم کیا ہے ہر وہ معاشرہ جو قانون الٰہی پر متفرع ہواور اس کی اساس وحی الٰہی پر مبنی ہوتو قرآن کریم کی اصطلاح میں اس کا نام الدین ہے،الدین میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اوراس کا یہ اقتدار اعلیٰ عملاً اس کی کتاب قرآن کریم کے قوانین کے نفاذ کے ذریعے بروئے کار لایا جاتا ہے۔اس کے برعکس ہر وہ معاشرہ جو انسانی خودساختہ قوانین پر موقوف ہواس کو قرآن کریم طاغوت کہہ کر پکارتا ہے۔یعنی ہر غیر الٰہی قانون اور نظام،ہر وہ قانونی قوت جو اللہ تعالیٰ کے قانون سے سرکشی اختیار کرے،طاغوت ہے۔یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ (4/60) یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں،یہ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ طاغوت سے مراد ذہنی تصورات یا بت یا مزارات وغیرہ نہیں ہیں بلکہ طاغوت کے معنی وہ تمام عدالتی،نظام،حکام۔ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے بجائے انسانوں کے خودساختہ قوانین کے مطابق معاملات کے فیصلے کریں۔ان کے فیصلے حاصل کرنا اوران پر عمل درآمد کرنا اللہ تعالیٰ کے قوانین سے انکار اور طاغوت کی اطاعت ہے اور یہ طاغوت اپنی اصل اور کیفیت میں الدین کے بالکل متضاد اور متناقص ہے۔قرآن کریم نے انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد الدین کا قیام اور طاغوت سے اجتناب قرار دیا ہے۔یہی وجہ تھی کہ انبیائے کرام جس جگہ بھی مبعوث ہوئے انہوں نے اپنے معاشروں اور حکومتوں کے خلاف جو طاغوت پر مبنی ہوتی تھیں بغاوت کی اور انہیں درست کرنے کی کوشش کی۔لیکن اگر وہ اس جگہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے اور مخالف قوتوں نے انہیں اپنا معاشرہ متشکل نہیں کرنے دیا تو انہوں نے اس مقام سے ہجرت کی اور اپنے لئے منتخب شدہ مقام پر دین کا قیام عمل میں لائے سب سے آخر میں حضورؐ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا۔مکہ کا نظام کلی طور پر ایک استحصالی اور انسانی قوانین پر مبنی ایک طاغوتی نظام تھا جس میں انسانیت نہایت کسمپرسی اور ذلت آمیز زندگی بسر کررہی تھی حضورؐ کی انتہائی کوشش رہی کہ مکہ سے ہی وحی کے نظام کی ابتداء ہو اور طاغوت کے بجائے الدین کا نظام اس جگہ سے ہی عملاً متشکل ہولیکن روسائے مکہ کی شدید مخالفت

کے باعث حضورؐ کو مکہ چھوڑنا پڑا اور اس طرح حضورؐ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ میں الدین کو عملاً متشکل فرمایا۔ مدینہ میں جب دین کا قیام ہو چکا تو قرآن کریم کے مطابق مکہ کے مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے فوراً مدینہ منتقل ہو جائیں۔ کیونکہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ طاغوت کے نظام سے اجتناب کرے۔ یا تو وہ اس نظام کو بدل کر وحی کے مطابق اس کو الدین میں تبدیل کردے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس جگہ سے ہجرت کر کے فوراً اسلامی معاشرے میں منتقل ہو جائے۔

اسی لئے اب بھی ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہر مسلمان جس جگہ بھی ہے وہ اپنے اپنے معاشروں کو جو کہ طاغوت پر مبنی ہوں بدلنے کی کوشش کرے اور ان کو اسلامی معاشروں میں تبدیل کریں جہاں وحی الٰہی کے مطابق حکومت ہو کیونکہ مسلمان صرف اس جگہ آزاد ہے جہاں وحی الٰہی کے قوانین کا نفاذ ہو۔ ورنہ مسلمان غلام ہی ہیں خواہ وہ قوانین غیر مسلم حکومتوں میں جاری ہوں یا مسلمانوں کی اپنی حکومتوں میں، آج بھی مسلمانوں کے لئے زندگی حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اس نظام کا قیام عمل میں لایا جائے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔o یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (8/24)o ایمان والو، اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں پکاریں تاکہ تمہیں زندگی حاصل ہو۔ اللہ اور رسول کے نظام میں تو اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ مردہ قوم کو زندگی عنایت فرمادے، انسان کے خودساختہ قوانین نہ صرف مردہ قوم کو زندہ نہیں کرسکتے بلکہ کوئی بھی اطمینان بخش اور پرسکون معاشرہ مستقل طور پر قائم نہیں کرسکتے۔

مسلمانوں کی یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اس کے نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے اعراض برتا اور اپنے خودساختہ قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی قرآن کریم تو مسلمانوں کو دیگر اقوام کا نگران بناتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگر مسلمان قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرلیں تو وہ تمام دنیا کے نگران ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ کے وعدے اس کے نظام پر عمل پیرا ہونے سے پورے ہوتے ہیں جب اس نے فرمایا کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِیَّاهُمْ (6/151) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ یہ وعدہ اس کا جب ہی پورا

ہوگا جب اس کے تجویز کردہ معاشی نظام کو ہم اپنے معاشرے میں جاری کریں۔ اگر ہم اپنے معاشروں میں اپنا وضع کردہ معاشی نظام جاری کریں تو ہمیں قرآن کریم کے معاشی نظام کے نتائج حاصل ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کے وعدے، جو اس نے مومنین سے استوار کئے ہیں، صرف اسی صورت میں پورے ہوسکتے ہیں جب ہم اس کے نظام کا اجراء اپنے معاشروں میں کریں۔ قرآنی نظام کے قیام کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس میں حکومت اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) کی ہوتی ہے۔ اس حکومت میں تمام امور کے فیصلے قانون الٰہی کی رو سے ہوتے ہیں سورۃ بقرہ میں انبیائے کرام کی بعثت کے سلسلہ میں فرمایا وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (2/213) ان انبیاء کے ساتھ اللہ نے کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کے فیصلے کیا کریں۔ خود حضورؐ سے فرمایا فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (5/48) لوگوں کے امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔ اس کتاب کے ساتھ اور کوئی ضابطہ قوانین شامل نہیں کیا جاسکتا وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا o(18/26) اللہ تعالیٰ اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا o ہر طرح کا اختلاف اسی کتاب کی رو سے رفع کیا جائے گا۔ o وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)o جن معاملات میں بھی تم اختلاف کرتے ہو ان کے فیصلے کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا کرو۔

ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے خود مسلمانوں کی ایسی مملکت میں ہی ہوسکتے ہیں جو آزاد اور بااختیار ہو اور جو قرآن کریم کے احکام نافذ کرسکتی ہو۔ سب سے پہلی اسلامی حکومت صدر اول میں حضورؐ نے مدینہ شریف میں قائم فرمائی۔ چونکہ مجرد احکام کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی محسوس شخصیت ان احکام کو صادر نہ کرے اور حضورؐ خود محسوس شخصیت تھے جن کے ذریعے کتاب اللہ کے احکام جاری ہو رہے تھے اس لئے ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت کے مرادف قرار پائی۔ یہ بات اسلامی نظام کے سلسلہ میں بہت غور طلب ہے کیونکہ اس نکتہ کے ہی صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سی قباحتیں واقع ہوئی ہیں کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے دو الگ الگ

مطاعوں کی اطاعت مقصود نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ تو نظریہ ہی قرآن کریم کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ بھی کسی کی بذاتہ اطاعت ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ رسول کے متعلق بھی واضح الفاظ میں فرمادیا گیا کہ اسے بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی ذاتی اطاعت کرائے۔

o مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (4/80)o جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اصل مقصود اطاعت الٰہی ہے۔رسول کا ایک مرئی ذریعہ ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جاتی ہے لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد اسلامی حکومت کا وہ مرکزی مقام ہے جہاں سے قرآنی احکام جاری ہوں۔ یہ بات کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مراد اسلامی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہے قرآن کریم نے خوب وضاحت سے بیان فرمائی ہے جو درج ذیل ہے

۔

(1) جنگ احد میں مسلمان فتحیاب ہورہے تھے کہ چند مسلمان جو ایک درہ پر مقرر تھے اپنے مقام سے ہٹ گئے اور لوٹ مار میں مصروف ہوگئے کفار نے اس خالی مقام کو دیکھ کر دوبارہ پشت کی طرف سے حملہ کردیا۔اس سے مسلمان پھر گھیرے میں آگئے اور ہر سمت خوف پھیل گیا اور خوف کی وجہ سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور جب رسول اللہ بالکل تنہا رہ گئے تو آپؐ نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا اور انہیں آواز دی حضورؐ کی اس آواز پر وہ پھر جمع ہوگئے۔ بظاہر یہ آواز حضورؐ نے دی تھی۔ لیکن چونکہ یہ پکار حضورؐ کی ذاتی پکار نہیں تھی بلکہ آپؐ نے بہ حیثیت اسلامی حکومت کے سربراہ کے یہ آواز دی تھی، اس لئے اس آواز کو قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی آواز قرار دیا۔فرمایا۔o اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيْمٌ o(3/172)o جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی آواز کا جواب دیا حالانکہ وہ زخمی ہوچکے تھے لیکن ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں بیشک ان کے لئے بہت بڑا اجر عظیم ہےo

(2) نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ اور رسول کے خلاف بغاوت کرتے ہیں یہاں اللہ اور رسول سے مراد اسلامی نظام واضح ہورہا ہے۔o إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ

یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا (5/33)o جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں۔

(3) یہودی عموماً عہد کر کے توڑتے رہتے تھے۔حضورؐ نے ان سے کوئی معاہدہ کیا اور جب انہوں نے وہ معاہدہ توڑا ہے تو اس عہد شکنی کو قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی مخالفت سے تعبیر کیا ہے اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی یہاں اسلامی نظام اور اللہ اور رسول کے الفاظ ایک معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔o ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ شَآقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ o(8/13)o یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرے تو اللہ سخت عذاب دینے والا ہےo۔

(4) اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًاo(33/57) اس آیت میں اگر اللہ تعالیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ اور رسول سے مراد حضورؐ کی ذات مقدس لی جائے تو معنے بالکل بے ربط ہو جاتے ہیں۔کیونکہ حضورؐ کو تو تکلیف دی جا سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا اس لئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اذیت دینے سے مراد نظام الٰہی کو نقصان پہنچانا ہے۔

(5) oوَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ (9/3)o اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی ان سے دست بردار ہے۔

(6) پھر اس چند آیات بعد ارشاد ہے۔o کَیْفَ یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَھْدٌ عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَھُمْ (9/7)o بھلا مشرکوں کے لئے (جنہوں نے عہد توڑا) اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیونکر (قائم) رہ سکتا ہے۔ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد کیا ہے اگر وہ

قائم رہیں تو تم بھی قائم رہو۔ یہ تمام معاہدات اسلامی حکومت کے ساتھ تھے اور اسی حکومت کے نمائندہ کی طرف سے یہ اعلانات ہو رہے تھے لیکن انہیں اللہ اور رسول کے فرامین قرار دیا گیا ہے۔ ان تمام آیات کے تحریر کرنے سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگرچہ یہ تمام احکامات حضورؐ کی طرف سے جاری ہو رہے تھے۔ لیکن درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کے احکام تھے۔ اس لئے یہ حکومت الٰہی کے مرکز کی طرف سے نافذ ہو رہے تھے۔

(7) اللہ تعالیٰ نے دین کے غلبہ واقتدار کے متعلق بہت سے مقامات پر وعدے فرمائے ہیں اس غلبہ کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ اور رسول کی کامیابی ہے۔ o كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (58/21) ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اسلامی حکومت کا ہی غلبہ وتسلط تھا ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ غالب ہے لہٰذا اللہ اور رسول کے غلبہ سے مراد اسلامی نظام کے غلبہ ہی سے ہو سکتی ہے۔

(8) مسلمانوں کی جب حکومت قائم ہوگئی تو اس حکومت کی آمدنی کو قرآن کریم نے اللہ اور رسول کی دولت کہہ کر پکارا ہے۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ (8/1) تم سے مال غنیمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ غنیمت اللہ اور رسول کا مال ہے، ان تمام مقامات سے واضح ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد اسلامی مملکت ہے۔ لیکن ایک آیت اس بارے میں اس درجہ واضح ہے کہ وہ حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے اور جس سے اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم متبادر ہو ہی نہیں سکتا۔

(9) ارشاد ہوا وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ (4/100) اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ثابت ہو گیا (ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی) یہاں اللہ اور رسول کے معنی اسلامی حکومت کے علاوہ اور کوئی صحیح نہیں ہو سکتے۔

(10) o يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ

تَسۡمَعُوۡنَ o(8/20)o اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی مت کرو درانحالانکہ تم سن رہے ہو o یہاں اللہ اور رسول دو مطاعوں (جن کی اطاعت کی جائے) کا ذکر ہے لیکن ان دونوں کے لئے ضمیر واحد استعمال کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اطاعت ایک ہے اور وہ اسلامی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہے۔

سابقہ دس آیات کریمات سے بخوبی واضح ہے کہ قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے الفاظ اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کئے ہیں اور جس سے مراد اسلامی حکومت ہے اللہ تعالیٰ کا عنایت کردہ دین جس کو حضوؐر نے عملاً نافذ فرمایا تھا اس کی اطاعت اللہ رسول کی اطاعت تھی اور اب بھی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے خواہش مند ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین اور نظام قائم کریں اور اس کی اطاعت کریں تاکہ اللہ اور رسول کی اطاعت کی بجا آوری ہو سکے کیونکہ اللہ رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اطاعت ہے اللہ رسول کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان میں دین اور دنیا چرچ اور سٹیٹ کی ہمیشہ واضح تفریق رہی ہے۔

ماہ نومبر 2004ء

القول السدید (حصہ دوم و آخر)

اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کے نظام کی اطاعت ہے اللہ رسول کی اطاعت انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان میں دین اور دنیا چرچ اور سٹیٹ کی ہمیشہ واضح تفریق رہی ہے۔ عبادات مقرر کر لیں، جن کی ادائیگی سے وہ سکون قلب حاصل کرتے ہیں اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے بھی کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو مختص کر لیا ہے کہ وہ دنیاوی معاملات سے بالکل الگ تھلگ رہیں اور اپنا سارا وقت مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے وقف کر دیں۔ یہ گروہ دینوی دھندوں سے بالکل الگ رہتا ہے اور دوسروں کی کمائی پر گذارا کرتا ہے۔ قرآن کریم وہ واحد دین ہے جس نے مذہب کی اسٹیج سے نوع انسانی کو مخاطب کیا اور دنیا کے تمام مسائل کا حل پیش کیا، یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے دین و دنیا کی ثنویت اس طرح ختم کی کہ اس نے جو نظام دنیا کے تمام مسائل حل کرنے اور بہترین معاشرہ قائم کرنے کے لئے عطا کیا، اس کے قائم کرنے، اور اس کی اطاعت کو ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا۔ وہ نظام چونکہ انسانیت کے درپیش مسائل و مشکلات حل کرتا ہے اس نظام کو جس قدر خوش اسلوبی صحیح انداز، اور درست طریقے سے جاری کیا جائے گا، اسی نسبت سے انسانیت کے مسائل و مشکلات دور ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اسی قدر اطاعت الٰہی سے انسانیت مشرف ہوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ اس نظام کی اطاعت میں ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت مضمر ہے۔ مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے اسی نظام سے وابستہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا نظام قائم ہے، اور اس کے نتائج و ثمرات حاصل ہو رہے ہیں تو مسلمانوں کو بھی عروج حاصل ہے۔ اور اگر مسلمانوں نے وہ نظام ترک کر دیا تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے ثمرات سے محروم ہوں گے۔ آج

مسلمانوں کی یہی حالت ہے کہ وہ اس نظام کو ترک کر کے، ایں سو راندہ و آں سو درماندہ، زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ضروری ہے وہ اس دنیا میں نظام الٰہی کے لئے پوری پوری کوشش کریں وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہوں وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دیں۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی زمانہ سے مخصوص نہیں ہے۔ ان کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا قانون جاری کر دیں۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں تو وہ خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ اپنے نماز، روزہ، اور دیگر دعاوی کے باوجود، اللہ تعالیٰ کے باغی، غدار، اور نافرمان ہیں۔

قرآن کریم اپنے تمام قوانین کی حکمت بیان کرتا چلتا ہے تا کہ ہم ان قوانین پر عمل کرنے کے بعد یہ اندازہ کرسکیں کہ ہمارے عمل درآمد کرنے کے بعد ان قوانین کے نتائج اس حکمت وغایت کے مطابق برآمد ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے صحیح نتائج برآمد ہو رہے ہیں تو اس کے عمل کرنے والوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے کہ ہم اپنی منزل مقصود تک صحیح جا رہے ہیں۔ اور اگر صحیح نتائج برآمد نہ ہوں تو ہر باشعور آدمی کا فرض ہے کہ وہ اس مقام پر رک کر غور کرے کہ قرآن کریم کے موعودہ نتائج کیوں برآمد نہیں ہو رہے ہیں اور پھر غور و فکر کے بعد صحیح طریقہ پر عمل درآمد شروع کرے قرآن کریم نے صوم وحج کی حکمت لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (22/37-2/185) قرار دی ہے۔ اور اس آیت کریمہ کا ترجمہ ''تم اس کو بزرگی سے یاد کرو'' کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بقرعید کی نماز میں چھ تکبیرات ادا کی جاتی ہیں لیکن یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے کبریائی کے معنی اقتدار اعلیٰ بیان فرمائے ہیں۔ سورہ یونس میں فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے متعلق کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری خواہش کیا ہے تم چاہتے ہو کہ وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْأَرْضِ (10/78) یہاں عام ترجمہ ''تا کہ ملک میں تمہاری دونوں کی سرداری ہو جائے'' کیا جاتا ہے جس سے واضح ہے کہ اَلْكِبْرِيَآءُ کے معنی اقتدار کے ہیں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

وَلَـهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (45/37)o ارض وسماء میں اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ یہاں بھی الْكِبْرِيَاءُ کے معنی بالکل واضح طور پر اقتدار و غلبہ کے ہیں۔ لفظ الْكِبْرِيَاءُ کی تشریح کی روشنی میں صوم و حج کی حکمت مندرجہ بالا آیت نمبر (2/185-22/37) کے مطابق قانون الٰہی کو غالب کرنے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے حج عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو ہر سال مکہ مکرمہ میں اس غرض سے منعقد کیا جاتا ہے کہ تمام دنیا کی اسلامی مملکتوں کے نمائندے، اور عمائدین سال بہ سال وہاں جمع ہو کر امت کی مجموعی مشکلات اور مصائب کا حل تلاش کریں اور باہمی مشاورت سے آئندہ سال کے لئے مشترکہ لائحہ عمل متعین کریں۔ اور اس طرح قوانین الٰہی کو انسانی خود ساختہ قوانین پر غالب کرنے کی پوری پوری سعی و جد و جہد کریں۔ لیکن اگر حج کا یہ مقصد پیش نگاہ نہ ہو اور ملت اسلامیہ غلبہ و اقتدار حاصل نہیں کرتی، اور قوانین الٰہی غالب نہیں ہوتے تو قرآن کریم کے مطابق حج کی حکمت و غایت پوری نہیں ہوئی۔ اور حج کا مقصد ادا نہیں ہو رہا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق انسانیت میں ظلم و فساد، اضطراب و بے چینی کا سبب قوانین الٰہی کی جگہ انسانی خود ساختہ قوانین کا اجراء ہے اور ہر معاشرے کے چند افراد جو اس ملک میں لیڈر یا حاکم ہوتے ہیں وہ اس ظلم و فساد کا باعث ہوتے ہیں o وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ o(27/48)o اور شہر میں نو شخص تھے جو ملک میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے o غلط قوانین کا اجراء یہی افراد جو ملک کے لیڈر یا حکمران ہوتے ہیں، کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ان کا مفاد پنہاں ہوتا ہے۔ چونکہ وہ خود قانون سازی کر سکتے ہیں اس لئے وہ ایسے قوانین بناتے ہیں جو ان کے مفاد پورے کرتے ہوں۔ نیز ان کے اجراء میں بھی ہر قسم کی تمیز کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ان کے اطلاق سے مستثنیٰ بھی قرار دے لیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی مملکت میں نہ تو کوئی فرد خود قوانین وضع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے اطلاق سے اپنے تئیں مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر شخص پر قانون کا اطلاق مساوی طور پر ہوتا ہے اس لئے وہ معاشرہ قانون کا پابند ہونے کی وجہ سے پرسکون معاشرہ ہوتا ہے حضورؐ نے اپنے متعلق فرمایا کہ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا

مَا يُوحَى إِلَيَّ (6/50) میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں (شاہ اشرف علی) دوسری جگہ ارشاد ہوا o وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ o(43/44)o اور قرآن آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بے شک بڑے شرف کی چیز ہے اور عنقریب تم سب پوچھے جاؤ گے o اس آیت کریمہ میں لَکَ کی ضمیر کا خاص طور پر اضافہ کر کے حضورؐ کو مسئولیت میں شامل کرلیا ہے۔ ایک جگہ مزید فرمایا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ (24/54) رسول کے ذمہ وہی ہے جس کا ان پر بار رکھا گیا ہے اور تمہارے ذمہ وہ ہے جس کا تم پر بار رکھا گیا ہے۔

ان مقامات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی حکومت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں نہ تو کسی انسان کو قانون سازی کا حق ہوگا اور نہ ہی کوئی حاکم یا لیڈران قوانین کے اطلاق سے مستثنیٰ ہوسکتا ہے۔ حکمران طبقہ یا V.I.Ps کو کسی قسم کی کوئی مراعات Privileges حاصل نہیں ہوسکتیں کیونکہ یہی مراعات (Privileges) معاشرے کے فساد کا اصل سبب ہوتی ہیں۔ ان مراعات کی وجہ سے ہی V.I.Ps غریب طبقہ کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے حکمران طبقہ کو بالکل کوئی فوقیت عوام پر نہیں دی، اور سب حاکم ومحکوم کو اپنے قوانین کا پابند قرار دیا ہے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت سے ثواب اور اس کی قانون شکنی سے گناہ ہوتا ہے۔ اس لئے حکمران طبقہ عوام سے زیادہ ان قوانین کا احترام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں حکمرانوں کے لئے کوئی مراعات نہیں ہوتیں بلکہ ان کی ذمہ داریاں عوام سے زیادہ ہوتی ہیں۔ جو ذمہ داریاں پوری قوم حکمرانوں کے سپرد کرتی ہے قرآن کریم انہیں ''امانات'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ ان امانات کے متعلق ان سے ہر فرد ہر موقع پر باز پرس کرسکتا ہے۔ اور ان ہی امانات کے متعلق ان کو قیامت میں جوابدہ ہونا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر دجلہ کے کنارے کتیا بھی بھوک سے مرگئی تو میری اس سلسلہ میں باز پرس ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تنخواہ مدینہ کے مزدور کی تنخواہ کے برابر رکھی تھی اور یہ فرمایا کہ چونکہ

میری تنخواہ ہمیشہ ایک مزدور کی تنخواہ کے برابر ہوگی اس لئے میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کروں گا کہ مزدور کی تنخواہ میں اضافہ ہو۔ تاکہ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو سکے اگر حکمران قوانین کی اطاعت اور ان پر عمل درآمد کرنے کے پابند نہیں ہوں گے تو کسی بھی صورت میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلامی حکومت کی یہ وہ خصوصیات ہیں۔ جب مسلمانوں نے ایک طرف ایران اور دوسری طرف یروشلم کو فتح کیا ہے تو وہاں کے عوام نے اس حکومت کے ثمرات دیکھ کر خود بخود حلقہ بگوش اسلام ہونا شروع کر دیا۔ برصغیر ہندوپاک میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک حکومت کی ہے، لیکن ان کا طرز حکومت اسلامی نہیں تھا اور ان کی حکومتیں بھی اسلامی حکومتیں نہیں تھیں۔ اسی وجہ سے یہاں کے عوام مسلمان نہیں ہوئے صوفیائے کرام کی ذاتی کوششوں اور جدوجہد سے یہاں کے لوگ مسلمان ہوئے۔ اگر برصغیر ہندوپاک میں ابتداء سے ہی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جاتا، تو یہاں کی پوری آبادی، اس حکومت کی خوبیوں اور اس کے ثمرات ونتائج کی وجہ سے مسلمان ہو جاتی۔ لیکن یہاں اسلام چونکہ صوفیائے کرام کی معرفت آیا تھا اور بادشاہوں نے کوئی کوشش نہیں کی اس لئے یہاں پوری آبادی مسلمان نہیں ہوسکی صرف وہ لوگ مسلمان ہوئے جو صوفیائے کرام سے متاثر ہوئے۔

قرآن کریم کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی بہترین معاشرہ کا قیام اور انسانیت کی فوز وفلاح ہے اس سلسلہ میں صحیح معاشرہ کے نمایاں خدوخال اور اس کے قیام پر اصرار کے ساتھ ساتھ قرآن کریم نے انسانوں کے فرداً فرداً حقوق کا ذمہ دار بھی اسلامی حکومت کو ٹھہرایا ہے۔ حقوق انسانی کا موضوع آج بھی بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس پر مفصل گفتگو کا یہ مقام نہیں۔ اس کے لئے الگ مضمون کی ضرورت ہے جو کچھ اس مختصر مضمون میں تحریر کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ انسانی فہم وادراک نے حقوق انسانی کا تصور سترویں صدی کے قریب مغرب میں شروع کیا جو آہستہ آہستہ مزید واضح ہوتا چلا گیا۔ لیکن قرآن کریم نے اس کا تصور شروع سے ہی نہ صرف واضح دیا بلکہ مغرب کے تصور کے بالکل برعکس دیا۔ مغربی تصور حیات کے مطابق فکر انسانی خود اپنے حقوق متعین کرتی ہے۔ اور لوگ حکومتوں

سے وہ حقوق تسلیم کراتے ہیں۔حکومت اگر مبنی بر عدل ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے اور عوام بیدار ہیں اور اپنے حقوق سے واقف ہیں، تو وہ لوگ حکومت سے اپنے حقوق با آسانی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اگر حکومت جابر لوگوں پر مشتمل ہے اور لوگوں کی اکثریت ہی ناخواندہ ہے تو ایسی حکومت لوگوں کے حقوق غصب کر لیتی ہے اور عوام اس حکومت کو مجبور کر کے اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کی تاریخ اس پر شاہد ہے، لیکن اس کے برخلاف اسلامی حکومت میں انسانی حقوق کی پوزیشن یہ ہے کہ اسلامی حکومت انسانی حقوق کی حفاظت کرنے اور اس کو جاری کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے۔نیز یہ کہ وہ حقوق فہم انسانی کے متعین کردہ نہیں ہوتے بلکہ وحی الٰہی ان کا تعین کرتی ہے۔ قرآن کریم نے انسانی حقوق کے لئے ''معروف'' کی جامع اصطلاح استعمال فرمائی ہے سورہ حج میں اسلامی حکومت کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ معروف کا حکم دیتی ہے یعنی انسانی حقوق کو قائم کرتی ہے ۔عقل انسانی افراط وتفریط سے کام لیتی رہی، بعض اوقات، جنسی آزادی، ہم جنس پرستی جیسے افعال بھی انسانی حقوق میں شامل کر لیتی ہیں۔قرآن کریم اس قسم کے حقوق کو نہ صرف نظر انداز کرتا ہے بلکہ ان کو بالکل روک دیتا ہے۔

اسلامی حکومت میں ہر فرد کے حقوق وفرائض ساتھ ساتھ قائم ہوتے ہیں ایک کا جو فرض ہے وہ دوسرے کا حق ہوتا ہے عملی مثال کے ذریعے یہ بات زیادہ صاف ہو سکتی ہے۔اسلامی مملکت میں ہر ماں کا فرض ہے کہ وہ بچے کو دو سال تک دودھ پلائے، اسی وجہ سے ہر بچے کا حق ہے کہ اپنی ماں سے دو سال تک دودھ پیئے۔اسلامی مملکت کے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ سچی گواہی دے اور گواہی سے اجتناب نہ کرے۔اسی بناء پر ہر شہری کا حق ہے کہ وہ توقع کرے کہ موقع کے گواہ اس کے حق میں گواہی دینے سے اجتناب نہ کریں۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے گھر میں اجازت حاصل کئے بغیر داخل نہ ہو۔اسی بناء پر ہر شہری کا حق ہے کہ اس کے گھر میں کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہو۔اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے رزق کی ذمہ دار بنے، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6/151) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6) اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ چونکہ حکومت کا فرض رزق کی فراہمی ہے اس لئے شہری کا حق ہے کہ وہ حکومت سے رزق حاصل کرے اسلامی حکومت میں حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری خود حکومت پر ہوتی ہے سورہ حج کی آیت کے مطابق اس کی وجہ جواز ہی ان حقوق کی ادائیگی ہے۔ اس کے برخلاف غیر اسلامی حکومتوں میں حقوق ان کی صوابدید سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ عوام مجبور کر کے وہ حقوق حکومتوں سے حاصل کرتے ہیں۔ یو، این، او (U.N.O) اور دیگر بین الاقوامی ادارے ان پر نگاہ رکھتے ہیں کہ وہ حکومتیں اپنے شہریوں کے حقوق ادا کر رہی ہیں یا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نام انسانی حقوق ہی درست نہیں ہے وہ صرف قانونی حقوق ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلامی مملکت کے قائم کردہ حقوق وحی کے ذریعے عطا کردہ ہوتے ہیں اور حکومت کا اولین فرض ان کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔

اس دور میں قرآن کریم کا نظام کسی ملک میں قائم کرنے کے لئے دلی اخلاص، لگن، تڑپ، سعیٔ مسلسل اور مستقل جدوجہد کی ضرورت کے علاوہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس قوم کو قرآن کریم کے نظام پر علی وجہ البصیرت یہ یقین واعتماد ہو کہ اس سے بہتر کوئی نظام عقل انسانی نے وضع نہیں کیا اور یہ کہ جو دعاوی ومواعید قرآن کریم نے فرمائے ہیں وہ صرف اس نظام کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس نظام کے ذریعے ہی وہ پورے ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کا وعدہ ہے جس ملک میں اس کا نظام جاری ہوگا اس ملک میں کوئی بھوکا ننگا نہیں ہوگا۔ اس لئے قرآن کریم کا نظام جاری کرنے والوں کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کا یہ وعدہ درست ہے اور جب بھی یہ نظام جاری ہوگا واقعتاً کوئی ننگا بھوکا نہیں رہے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کا وعدہ ہے کہ جو قوم اسے بحیثیت نظام جاری کرے گی۔ اس معاشرہ میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں رہے گا اور ہر شخص سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرے گا۔ قرآن کریم کے نظام کی انفرادیت اور بے مثال ہونے پر یقین ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس نظام کو جاری کرنے میں چند خود ساختہ ایسی رکاوٹیں درپیش آرہی ہیں جو اس

کے قیام کو مشکل تر بنا رہی ہیں جب تک وہ موانعات دور نہیں ہوں گی قرآنی نظام کے قیام کا امکان بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

قرآنی نظام کی تشکیل میں پہلی رکاوٹ قانون سازی کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ چونکہ قرآن کریم کی راہنمائی پوری انسانیت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے، اور کسی خاص دور اور کسی خاص خطہ سے مختص نہیں ہے، اس لئے قرآن کریم نے ابدی اصول وقوانین عنایت فرمائے ہیں تا کہ وہ تمام آئندہ ادوار کا ساتھ دے سکیں اور جزئیات کا تعین ہر دور کے لوگوں پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے دور میں اپنے حالات وضروریات کے مطابق ان قوانین کی جزئیات مقرر کر لیں۔ کیونکہ حالات کی تبدیلی اور معاشروں کی ترقی کی وجہ سے جزئیات کا بدلنا ضروری ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے جزئیات خود مقرر نہیں فرمائیں اور ان کو ہر دور کے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ قرآن کریم نے روزے کے سلسلہ میں مسافر کو سہولت دی لیکن سفر کو خود نہیں بتایا کہ سفر کی کتنی مسافت ہونی ضروری ہے اسی طرح قرآن کریم نے روزے کو رات تک مکمل کرنے کا حکم دیا ہے لیکن رات کا تعین نہیں فرمایا، قرآن کریم نے زانی کو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے لیکن کوڑوں کی شدت مقرر نہیں کی، حالات کے مطابق کوڑے نرم بھی ہو سکتے ہیں اور اگر یہ جرم عام ہو گیا تو کوڑے سخت سے سخت تر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن سو کی تعداد میں کمی یا اضافہ نہیں ہو سکتا اسی طرح قرآن کریم نے چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم تو دیا ہے، لیکن چور کی وضاحت نہیں فرمائی کہ کتنا مال چوری کرنے والا چور ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے اگر کسی نے آپ کا قلم چوری کر لیا، جس کی قیمت چند روپے ہے۔ تو اس کی سزا قطع ید نہیں ہو سکتی چور کی تعریف کسی دور میں باعتبار مال مقرر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روپے کی قیمت کم ہوتی جا رہی ہے اسی طرح قرآن کریم نے مہر نکاح کے لئے شرط قرار دیا ہے، لیکن مہر کی مقدار مقرر نہیں فرمائی قرآن کریم کی رو سے نکاح کے لئے بلوغت شرط ہے لیکن قرآن کریم نے بلوغت کے لئے خود کسی عمر کا تعین نہیں فرمایا۔ لیکن ہمارے ہاں عملاً یہ صورت نہیں ہے بلکہ عام عقیدہ یہی ہے کہ جو جزئیات فقہ میں آج سے ایک ہزار سال پیشتر مقرر کر دی گئی تھیں وہ ہی من وعن جاری کی جائیں گی اور ان میں کوئی رد و بدل

نہیں کی جاسکتی۔

جزئیات کے تعین کے علاوہ جو دوسری رکاوٹ قرآنی نظام کے جاری کرنے میں درپیش ہے وہ یہ نظریہ ہے کہ جب کہیں قرآنی حکومت قائم ہو اس میں وہ سابقہ فقہ نافذ کرنی ضروری سمجھی جاتی ہے جو آج سے ایک ہزار سال پیشتر بنی عباس کے دور میں مدون کی گئی تھی آج سے ایک ہزار سال پیشتر نہ تو عقل انسانی نے اتنی ترقی کی تھی، جس قدر وہ آج ترقی کر چکی ہے اور نہ ہی معاشرہ اس قدر پیچیدہ ہوا تھا، جس قدر آج ہے۔ اس لئے وہ قوانین بالکل ابتدائی دور اور سادہ سوسائٹی کو پیش نظر رکھ کر تشکیل دیئے گئے تھے۔ آج کے پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرے میں وہ ساتھ نہیں دے سکتے، نیز یہ کہ وہ دور ملوکیت، پیشوائیت، سرمایہ داری، اور جاگیردارانہ نظام کا دور تھا۔ اس وقت تک مختلف طبقات کے حقوق کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ آج کل کے تجارتی، مالیاتی، ادارے اس وقت وجود نہیں آئے تھے۔ نیز جو قوانین بنائے گئے ان میں ملوکیت پیشوائیت کو، کہ جن کا وجود ہی خلاف قرآن تھا نہ صرف بحال رکھا گیا بلکہ اس کے بارے میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ بادشاہوں کو ظل اللہ (اللہ کا سایہ) قرار دیا گیا۔ اور پھر مواخذہ الٰہی کے سلسلے میں انہیں حضورؐ سے بھی بلند مقام دیا گیا۔ حضورؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ o(10/15) ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو میں اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا o لیکن اس کے برخلاف بادشاہوں کے متعلق کہا گیا کہ اگر بادشاہ وقت سے ظلم وجوار اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ کے افعال کا صدور ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں (احکام القرآن جصاص جلد دوم صفحہ 134) نیز یہ نظریہ بھی ہے کہ امیر قتل کے سوا جو جرم کرے تو اس پر حد نہیں ہے (ہدایہ اولین مجیدی صفحہ 493۔ یہ دونوں حوالہ جات ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی سے ماخوذ'' ہیں) اسی طرح پیشوائیت کے جواز میں مختلف احادیث بیان کی گئیں مثلاً العلماء ورثۃ الانبیاء۔ علماء انبیا کے وارث ہوتے ہیں۔ ان احادیث کے پیش نظر علماء کے حقوق محفوظ کئے گئے جبکہ عورتوں، بچوں، اقلیتوں، مزدوروں، کسانوں اور دیگر طبقات کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا فکر و خیال،

تقریر وتحریر کی آزادی سلب کی گئی اور ماحول بہت تنگ اور جامد بنادیا گیا خصوصاً مذہب کے سلسلہ میں نہ تو کسی طرح کی آزادی رائے کی اجازت دی گئی اور نہ ہی تبدیلی مذہب جائز قرار دی گئی۔ بلکہ ارتداد کی سزا موت مقرر کی گئی جبکہ قرآن کریم کی رو سے ارتداد کوئی جرم نہیں ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ ایک ہزار سال پیشتر کے بنائے ہوئے قوانین (فقہ) اس وقت نافذ نہیں ہو سکتے بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت قائم کی جائے وہ حکومت خود اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے قوانین (فقہ) خود وضع کرے۔ اسلامی حکومت کے قوانین ہی فقہ اور شریعت ہوتے ہیں سابقہ حکومتوں کے قوانین (فقہ وشریعت) ان حکومتوں کی ضروریات کے مطابق تھے اور آج کی اسلامی حکومت کے قوانین (فقہ وشریعت) آج کی ضرورت کے مطابق بنانے ہوں گے۔ سابقہ قوانین (فقہ) کو اگر جاری کرنے کی کوشش کی گئی تو اسلامی حکومت کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

اسلامی حکومت کے قیام میں تیسری رکاوٹ فرقہ بندی کی ہے فرقہ بندی کی وجہ سے اسلامی نظام کا قیام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جب تک فرقوں کا وجود قائم ہے اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن فرقہ بندی بھی قرآنی نظام کے نہ ہونے ہی سے وجود میں آتی ہے اگر ایک مرتبہ اسلامی نظام قائم ہو جائے تو فرقہ بندی خود بخود ختم ہوتی چلی جائے گی نظام کی عدم موجودگی کا لازمی نتیجہ فرقہ بندی ہے اسلامی نظام میں جملہ امور کے فیصلہ خود حکومت کی مرکزی اتھارٹی کرتی ہے اور فیصلے حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں اسلامی نظام نہ ہونے کی صورت میں ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیاوی امور کے فیصلے حکومت کرتی ہے اور دینی امور کے فیصلے علماء کرام کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ اسلامی نظام میں یہ ثنویت باقی نہیں رہتی۔ ہر طرح کے فیصلے اسلامی حکومت خود کرتی ہے۔ اور انہیں نافذ کرتی ہے۔ ان فیصلوں کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت مومنین کو امت واحدہ قرار دیا ہے۔ تفرقہ انگیزی اور فرقہ بندی کو کفر اور شرک اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی اور رسواکن عذاب بیان کیا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے ○ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ

تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ o(3/105)o دیکھنا ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرلیا، یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے o۔ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔o إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159)o بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا کردیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔اس آیت کریمہ کی رو سے بتایا گیا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا رسول اللہ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہےo وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (3/103)o اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نااتفاقی مت کرو۔اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جب تک مسلمان اللہ کی رسی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے پکڑے رہیں گے فرقہ نہیں بن سکتے۔فرقہ صرف اس صورت میں بنتا ہے کہ جب اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا جائے سابقہ دونوں آیات کریمات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فرقہ بندی کرنے سے نہ رسول اللہ سے کوئی تعلق رہتا ہے اور نہ ہی قرآن کریم سے کوئی واسطہ اس سلسلہ میں تاکید مزید کے طور پر فرمایا وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ oمِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ o(30/31.32) اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو o جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرلیا اور بہت سے گروہ ہوگئے ہر گروہ اپنے طریقہ پر نازاں ہے o یہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔جس سے اجتناب ہر مسلمان کا فرض ہے۔

فرقہ بندی کی ممانعت کے سلسلہ میں اور بھی آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن اس جگہ ان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔لیکن غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ فرقہ بنتا کیسے ہے تاکہ فرقہ بندی کا تدارک صحیح طریقہ پر کیا جاسکے اگر قرآن کریم کا نظام بحیثیت دین کے جاری ہو تو فرقہ وجود میں نہیں آسکتا۔کیونکہ اسلامی حکومت کے قوانین ہی اس دور کی شریعت اور فقہ ہوتے ہیں البتہ جب اسلامی

نظام قائم نہ ہو اور حکومت سیکولر ہو تو مجبوراً سابقہ حکومتوں کے قوانین جو شریعت اور فقہ کے نام سے موسوم ہیں ان پر عمل کیا جاتا ہے اور مختلف فقہ ہونے کی وجہ سے مختلف فرقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ اگر اسلامی حکومت موجود ہو اور اس کا قانون ہی فقہ تسلیم کر لیا جائے تو مختلف فرقے پیدا نہیں ہو سکتے صدر اول میں چونکہ اسلام بحیثیت دین یا نظام کے رائج تھا اس لئے اس وقت کوئی فرقہ نہیں تھا سب مسلمان اسلامی حکومت کی اطاعت کرتے تھے اور وہی اللہ و رسول کی اطاعت شمار ہوتی تھی۔ لیکن جب اسلامی نظام درہم برہم ہو گیا اور ثنویت قائم ہوئی اور دین و دنیا کے قوانین الگ الگ ہو گئے تو مذہبی قوانین مرتب ہونے شروع ہو گئے چونکہ وہ مذہبی قوانین یا فقہ، مختلف حضرات کے مدون کردہ ہیں اس لئے یہ بات لازمی تھی کہ ان میں فکری اختلاف موجود ہو۔ اس طرح مختلف فقہ وجود میں آ گئے اور مختلف لوگوں نے مختلف فقہ کی پیروی شروع کر دی اور اس طرح فرقہ بندی شروع ہو گئی۔ لیکن یہ سب قوانین (فقہ) انسانوں کے خود ساختہ تھے اور اپنے اپنے ادوار کے لئے مدون کئے گئے تھے لیکن چونکہ ہمارے ہاں اسلامی نظام جاری نہیں رہا اسی لئے ان ہی قوانین پر اب تک عمل جاری ہے اور اسی وجہ سے فرقہ بندی قائم ہے۔ اگر آج پھر اسلامی نظام قائم کر دیا جائے اور حکومت وقت قرآن کریم کی روشنی میں موجودہ دور کے مطابق قوانین تشکیل دے دے تو وہی اس دور کی فقہ و شریعت ہو گی اور اسلامی حکومت کے ہر شہری کا فرض ہو گا کہ وہ اس پر عمل کرے اس طرح اسلامی حکومت کے قیام سے فرقہ بندی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے زوال و ادبار کی وجوہات میں سے فرقہ بندی و تفرقہ اندازی بھی ایک بنیادی وجہ ہے جس کے باعث مسلمانوں میں ہمیشہ ایک دوسرے سے منافرت و معاندت رہی حالانکہ مسلمانوں کے بنیادی عقائد ایک ہیں۔ اللہ، رسول، آخرت، کتب، اور ملائکہ، جو قرآن کریم کے مطابق ایمان لانے کے اجزاء ہیں، ان سب باتوں پر جو مسلمان ایمان لاتا ہے اختلافات صرف فقہ کی وجہ سے ہیں۔ مختلف فقہ پر عمل کرنے کے باعث مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے فرقہ تو صرف فقہ کی وجہ سے بنتا ہے جب تک مسلمان فرقہ بندی نہیں

چھوڑتے اور قرآن کریم کا نظام رائج نہیں کرتے کسی طریقہ سے بھی زندہ اقوام میں شامل نہیں ہو سکتے۔

اسلامی نظام کے قیام میں چوتھی رکاوٹ قرآن کریم کے احکام اور نزول قرآن کے وقت کی روزمرہ کی معاشرت میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے قرآن کریم کے احکام منزل من اللہ ہیں اور ہم سب مسلمان اس بات کے مکلف ہیں کہ ہم ان احکام پر ایمان لائیں اور ان پر عمل کریں لیکن اس وقت کی رسم ورواج کی نہ تو کوئی دینی حیثیت ہے اور نہ ہم ان کو اپنانے کے پابند ہیں۔ وہ ایک خاص دور کی معاشرت تھی اور چونکہ حضوؐر اس دور اور اس معاشرے میں تولد ہوئے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ حضوؐر نے وہی معاشرت اختیار فرمائی لیکن حضوؐر کے وہ معمولات جو حضوؐر نے اپنے گردو پیش سے اپنی معاشرت کے طور پر اختیار فرمائے وہ نہ تو دین کا حصہ ہیں اور نہ ہی ان کی کوئی دینی حیثیت ہے حضوؐر اپنی معاشرت سے متاثر ہو کر ایک خاص وضع کا لباس زیب تن فرماتے تھے ایک خاص طرح کی غذا تناول فرماتے تھے اور ایک خاص طریقہ کے مطابق زندگی بسر فرماتے تھے یہ حضوؐر کی شخصی عادات اور ذاتی معمولات شمار کی جائیں گی۔ ان کو سنت قرار دینا اور ان کو دین کا جز بنانا درست نہیں ہے سنت کا غلط مفہوم اختیار کرنے سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے حضوؐر کے وہ افعال جو حضوؐر نے دین کی ترویج واشاعت وتوسیع میں سرانجام دیئے وہ حضوؐر کی سنت ہیں قرآن کریم کے جن احکام پر حضوؐر نے عمل فرمایا وہ سب حضوؐر کی سنت میں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضوؐر دین کی دعوت عقل وبصیرت اور دلائل کے ساتھ دیتے تھے۔ یہ حضوؐر کی سنت ہے اب جو مسلمان بھی کسی کو دین کی دعوت دے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضوؐر کی سنت کے مطابق اپنی گفتگو دلائل کے ساتھ کرے۔ اس طرح حضوؐر کو حکم تھا کہ ٥ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ٥ (26/215) ٥ اور ان لوگوں کے ساتھ فروتنی سے پیش آیئے جو مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلیں ٥۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ حضوؐر کی سنت اختیار کرتے ہوئے مومنین کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے اسی طرح کے سب امور حضوؐر کی سنت شمار ہوں گے لیکن حضوؐر کے ذاتی

اعمال جو حضورؐ نے بطور عادت کیے وہ سنت میں شامل نہیں ہیں۔ اس دور کی معاشرت چونکہ بالکل سادہ اور ابتدائی دور کی معاشرت تھی اس لئے اس کو اس زمانہ میں اپنانا مشکل بھی ہے اور معاشرے کو چودہ سو سال پیشتر لے جانا بھی ہے۔ ہمارے ہاں عام دستور ہے کہ جو لوگ اتباع سنت پر زور دیتے ہیں وہ ہی معاشرت اختیار کرنے پر بھی اصرار کرتے ہیں اس سے معاشرہ بہت جامد اور تنگ ہو جاتا ہے۔ معاشرہ جس قدر لچکدار، آزاد، وسیع النظر، وسعت پذیر ہوگا اسی قدر اس کو قائم کرنا آسان ہوگا آج کل مسلمانوں کے اکثر ممالک میں عموماً اور ایران، ترکی، الجریا، لیبیا، اور سوڈان میں خاص طور پر اسلامی نظام کے احیاء کی کوششیں جاری ہیں لیکن تقریباً ہر جگہ یہی صورت اختیار کی جارہی ہے کہ اس زمانہ کی وضع قطع اختیار کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بھی لوگ مذہب کی طرف مائل ہوتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ عربوں کی اس وقت کی معاشرت اختیار کرنا ضروری ہے چنانچہ خاص وضع کا لباس پہننا، ڈاڑھی رکھنا، سر منڈوانا، مسواک کرنا یا پاجامے اونچے پہننا بوجہ اتباع سنت ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب امور حضورؐ کے بحیثیت عادات کے تھے، نہ کہ سنت کے۔ مسلمانوں کی ترقی و عروج کا واحد ذریعہ اسلامی نظام کا قیام ہے قرآن کریم کے نظام سے مسلمانوں کا عروج و زوال وابستہ ہے اس ایک اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جس جگہ بھی ہو اس نظام کو قائم کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ اور انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے باطل کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دے جب تک اللہ تعالیٰ کا عطا شدہ نظام دنیا میں قائم نہیں ہوگا دنیا اسی اضطراب و بے چینی میں مبتلا رہے گی اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کا نظام جاری رہنا ضروری ہے اس نظام کے قیام میں جو مشکلات و موانعات ہیں ان کو رفع کر دیا جائے تو اسلامی نظام کے قائم کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ایک تو نظام کو پورے کا پورا جاری کرنا ہوگا۔ اس کے حصے بخرے کرنے سے وہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ دوسرے اسے ہر شعبے میں تدریجاً جاری کرنا ہوگا۔ پورا نظام ایک ہی دن میں جاری نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کو جاری کرنا ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر

کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ ورسول کے باغی، غدار اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ زبان سے کتنا ہی اپنے مسلمان ہونے کے مدعی ہوں۔ ہمارا مقصد دعوت الی القرآن اور قرآن خالص پیش کرنا ہے۔ حتی الامکان اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی بات ایسی نہ تحریر کی جائے جس سے کسی صاحب کی دل شکنی ہو۔ اس کے باوجود اگر کسی صاحب کو کوئی بات ناگوار خاطر گزرے تو ہم اس کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔

ماہ دسمبر 2004ء

دین میں حدیث کا مقام، ایک وضاحت

ٹی وی کی 'جیو' چینلز پر جو علمی و مذہبی پروگرام ''الف'' نام سے ہوتا ہے اس کے ایک Telecast میں ''دین میں حدیث کا مقام'' کے عنوان سے ایک پروگرام ہوا تھا چونکہ اس پروگرام میں معروف علماء کرام نے حصہ لیا تھا اس لئے یہ علمی و مذہبی حلقوں میں غور سے سنا گیا اور کافی عرصہ زیر بحث بھی رہا۔ اس پروگرام میں علماء کرام نے حدیث کے متعلق جو موقف اختیار کیا وہ وہی تھا جو تمام علماء کرام میں متداول ہے۔ لیکن جو بدقسمتی سے قرآن کریم کے خلاف ہے۔ موقر و معروف رسالہ صوت الحق چونکہ قرآن کریم کا داعی اور قرآن خالص کی آواز بلند کرتا ہے۔ اس لئے اس موقر قرآنی رسالہ میں اس پروگرام پر کمترین کا تبصرہ دو اقساط میں شائع ہوا جن میں علماء کرام نے جو موقف اختیار کیا تھا اس کی تردید کی گئی تھی۔ اگرچہ اس مضمون میں حتی الامکان مقام حدیث سے متعلق تمام جہتوں سے بحث کی گئی تھی۔ تاہم چند حضرات کی طرف کمترین کو خطوط اور ای میل موصول ہوئے ہیں، جن میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا قرآن کریم کی رُو سے قول رسول حجت ہے یا نہیں؟۔ اس مختصر سے خط میں صرف اسی نکتہ کی وضاحت درکار ہے تاکہ سابقہ مضمون کسی بھی طرح سے تشنہ نہ رہے۔ برادر مکرم حسین امیر فرہاد سے درخواست ہے کہ وہ اس خط کو اشاعت رواں میں طبع فرمادیں۔ کیونکہ اس وقت سارے پاکستان میں صوت الحق ہی وہ رسالہ ہے جو طاغوتی آندھیوں میں روشنی کا ایک مینار ہے اور قرآن کریم کے شیدائیوں کے لئے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برادر مکرم جناب حسین امیر فرہاد صاحب کی عمر دراز فرمائے تاکہ وہ تادیر اس رسالہ کو جاری رکھیں۔ اور قرآن کریم کی خدمت کرتے رہیں۔ اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف مراجعت

کی جاتی ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست وحی ملتی تھی جو قرآن کریم کے دفتین میں محفوظ ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال جو وحی تھے وہ حجت ہوتے تھے اور اب بھی حجت ہیں۔ ان کا اتباع، ان کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان میں کسی قسم کے چون وچرا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مدینہ شریف میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت قائم فرمائی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم خود اس کے اولین سربراہ تھے۔ حکومت اسلامی کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول حجت تھا۔ کسی کو ان میں دم مارنے کا یارا نہیں تھا۔ ٥وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (33/36)٥ اور نہ کسی ایمان دار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ ہی کسی ایمان دار عورت کو کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے کام کا اختیار ہو۔ قرآن کریم اللہ و رسول کے الفاظ نظام الٰہی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ جس کی متعدد مثالیں اسی ماہ کے رسالہ کے مضمون ''اساس محکم'' میں مرقوم کی گئی ہیں۔ وہاں سے ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں، ان کا یہاں دوبارہ دہرانا قارئین ذوی الاحترام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ ان تمام آیات کے پیش نظر یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ یہ اطاعت نظام الٰہی کی اطاعت ہے۔ اگرچہ اس نظام کے فیصلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوتے تھے۔ لیکن اس سے رسول کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں ہوتی تھی (3/78)۔ رسول کی ذاتی رائے اور مشورہ سے اختلاف کا حق سب کو حاصل تھا اور اس اختلاف کا نام معصیت رسول صلے اللہ علیہ وسلم نہیں تھا۔ اسی سلسلہ میں حضرت زیدؓ کا واقعہ ایک واضح مثال ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی پہلی قسم وحی الٰہی تھی جو قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وہ اقوال تھے جو بہ حیثیت سربراہ مملکت آپؐ ارشاد فرماتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے اقوال حجت ہوتے تھے۔ ان سے مجال سرتابی کسی مومن کو نہیں تھی۔ البتہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی تیسری قسم وہ تھی جو حضورؐ کے ذاتی، بشری، اقوال

ہوتے تھے۔ وہ اقوال نہ اس وقت حجت تھے اور نہ آج۔ اس کی ایک مثال تو حضرت زیدؓ کی اوپر پیش کی گئی ہے۔

اس کی دوسری مثال حضرت خویلہؓ بنت ثعلبہ اور ان کے شوہر حضرت اوسؓ بن صامت کا واقعہ ہے جس کا ذکر سورہ مجادلہ کی پہلی آیت کریمہ میں موجود ہے کہ اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اے رسول اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑا کر رہی تھی۔ اللہ تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ (58/1) اس آیت کریمہ میں بھی حضرت خویلہؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں مانا، اور ظہار کو طلاق تسلیم نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں ایک مزید گذارش یہ ہے کہ جس طرح عام مومنین کو حکم ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42/38) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم تھا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3/159) معاملات میں مومنین سے مشورہ کیا کرو۔ اب ظاہر ہے کہ مشورہ جب ہی ہو سکتا تھا جب کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے قول کو حجت نہیں گردانتے تھے۔ بعض امور میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دو دو تین تین مرتبہ مشورہ فرمایا تھا۔ جنگ خندق کا واقعہ اسی سلسلہ میں بہت مشہور ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے جنگ خندق کھودی گئی تھی۔

مشہور و معروف تفسیر، تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے اس آیت کریمہ کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے کہ جنگ کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ ہر حال میں جن چیزوں کا تعلق مشورہ سے ہو اور اللہ کی طرف سے تم کو کوئی خاص ہدایت نہ ملی ہو تو ان کی رائے طلب کرو تا کہ تم کو ان کے مشورے سے قوت حاصل ہو۔ اور ان کے دل بھی خوش ہو جائیں اور امت کے لئے بھی باہمی مشاورت کا ایک دستور مقرر ہو جائے۔ بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والا میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ نیز اسی آیت کریمہ کے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ آیت

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3/159) میں حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ سے مشورہ لینے کا حکم ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دونوں (کسی) مشورہ میں متفق الرائے ہو جاؤ، تو میں مخالفت نہیں کروں گا"۔ اقتباس ختم ہوا۔ غور فرمائیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنی رائے اور اپنے قول کو ان دونوں حضرات کی رائے کے ماتحت و تابع رکھ رہے ہیں تو پھر حضوؐر کا قول حجت کیسے ہو سکتا تھا۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات مفسرین و محدثین کی مستند کتب سے نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن ان سے مضمون کی طوالت ہی ہوتی جاتی ہے۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مومنین کی طرح دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا قول حجت ہو ہی نہیں سکتا۔

اوپر مضمون میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی تین واضح اقسام تحریر کی گئیں ہیں۔ جن میں (عمداً) التباس کرنے کی وجہ سے بات واضح نہیں رہتی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دو طرح کے اقوال (1) جو حضوؐر نے بہ حیثیت سربراہ مملکت دیئے۔ (2) جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ذاتی، بشری، اور بعض اوقات مشورہ کے بعد دیئے، وہ اس وقت بجنسہ موجود نہیں۔ ان کی صرف روایت Narration موجود ہیں۔ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں نہیں البتہ تیسری قسم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال جو وحی الٰہی تھے، وہ قرآن کریم کے دفتین میں موجود ہیں۔ اور صرف یہ ہی ہم سب مسلمانوں کے لئے حجت ہیں اور ان کے علاوہ باقی سب بہتان آذری۔

ماہ جنوری 2005ء

العروۃ الوثقیٰ

قرآن کریم نے جو بنیادی انقلابی تصورات عنایت فرمائے ہیں ان میں ایک تصور یہ ہے کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے اور حق حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کو نہیں ہے۔ قرآن کریم نے جس دور میں آزادی، مساوات، اخوت، اور حقوق انسانی کے بلند نصب العین عنایت فرمائے تھے اس وقت عقل انسانی ان تصورات کا خیال تک نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وحی الٰہی کی ہی خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ عقل انسانی سے آگے رہتی ہیں اور جن تصورات اور علوم کا ادراک عقل انسانی نہیں کر سکتی وحی الٰہی ان تصورات اور علوم کا ادراک کرا دیتی ہے۔ جس قدر عقل انسانی ترقی کرے گی وحی الٰہی اس سے آگے آگے اس کی راہنمائی کرتی چلی جائے گی۔ انسانی تہذیب وتمدن کا ہر انقلاب رفتہ رفتہ عقل انسانی کو قرآن کریم کے قریب سے قریب تر لاتا چلا جائے گا اور تاریخ انسانی کا ہر انقلاب قرآن کریم کی پیش کردہ قدروں کی صداقت کے دلائل فراہم کرتا چلا جائے گا تا آنکہ انسان اس حقیقت کو سمجھ جائے گا کہ عقل انسانی معاشرہ کی صحیح اقدار فراہم کرنے سے عاجز تھی اور ہے اور صحیح اقدار وحی اور صرف وحی کے توسط سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں اور وحی کی یہ قدر کہ انسان کی حکومت انسان پر مطلقاً حرام ہے، اور حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے مبرہن ہو جائے گی۔ علامہ اقبال نے اس قدر کو کہ حق حکومت صرف باری اللہ تعالیٰ کو ہی سزاوار ہے بڑے پرزور الفاظ میں اردو اور فارسی اشعار میں بیان کیا ہے ان کا اس سلسلہ میں اردو کا یہ شعر مشہور ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آزاری

اوران کی ہی ایک مشہور رباعی فارسی میں ہے جو انہوں نے آج سے تقریباً ۸۰ سال پیشتر اس وقت کہی تھی جب کہ انگریزی حکومت کا سورج غروب نہیں ہوا تھا اور ہندوستان میں بھی انگریزی حکومت تھی۔ اور مغرب میں قائم کردہ جمہوری حکومت کے اوصاف اور خوبیاں ہر مفکر اور دانشور کے ورد زبان تھیں۔ علامہ اقبال بھی مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ اور وہاں سے ہی علوم حاصل کردہ تھے۔ لیکن چونکہ قرآن کریم ان کے سامنے تھا اس لئے ان کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو ہی زیب دیتی ہے۔ علامہ اقبال کہ یہ رباعی کہنے کے تقریباً ۷۰ سال بعد، اور آج سے چند سال پیشتر ایرانی حکومت کے اس وقت کے سربراہ آیت اللہ خامنہ ای سرکاری دورہ پاکستان پر تشریف لائے۔ اور ان کا استقبال شالامار باغ لاہور میں کیا گیا، انہوں نے اپنی تقریر علامہ موصوف کی اس رباعی سے شروع کی۔ چونکہ ایران میں انقلاب آچکا تھا اس لئے آیت اللہ خامنہ ای بھی اس نظریہ کے حامی اور موعید تھے۔ رباعی حسب ذیل ہے،

آدم از بے صبری بندگیِ آدم کرد

گوہرے داشت، ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی در خوئے غلامی ز سگاں بتر است

من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یہ رباعی جو علامہ نے آج سے ۸۰ سال پیشتر موزوں کی تھی۔ آیت اللہ خامنہ ای نے چند سال پیشتر اس کو اپنی تقریر کا عنوان بنا کر اس کے مفہوم کی تصویب اور تائید کردی کہ اسلام کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ یہی ہے اور ہمیشہ یہی رہے گا۔ انبیاء کرام کی بعثت اور نزول وحی کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے ایک بڑا احسان قرار دیا ہے۔ جبکہ فرمایا۔ o لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ (3/164) o حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی جنس سے ایک پیغمبر کو بھیجا۔ انبیاء کرام کی معرفت اگر وحی نہ ملتی تو انسان آج تک ان اقدار کو حاصل نہ کرسکتا۔ انبیاء کرام کے فرائض میں سے دو فرائض بنیادی حیثیت رکھتے ہیں! ایک تو یہ جو بھی

وحی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے اس کو فوراً انسانیت کو پہنچا دیں اگرچلتی ہوئی تلواریں اور لڑائی کے دوران بھی وحی کا نزول ہو تو نبی کا فریضہ ہے وہ اسے فوری طور پر انسانوں کو پہنچا دے۔ o یا اَیُّھا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنزِلَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ (5/67) کیونکہ وحی ساری انسانیت کے مفاد کے لئے نازل ہوتی تھی ہر شخص اس سے بہرہ مند ہو سکتا تھا دوسری ذمہ داری رسول کی یہ ہوتی تھی کہ وحی کے مطابق معاشرہ قائم کرے اور اس کے احکامات معاشرے میں جاری کرائے۔

رسول حد درجہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جس جگہ وہ ہے اسی جگہ کے مطابق معاشرے کی تشکیل کرے لیکن اگر وہاں مخالفت حد سے زیادہ ہو اور معاشرہ قائم نہ ہو سکتا ہو، تو رسول اپنا گھر بار عزیز و اقارب چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے اور اس نئے مقام پر وحی کے مطابق معاشرہ قائم کرتا ہے۔ جس میں وحی کے قوانین نافذ ہوں۔ اکثر انبیاء بنی اسرائیل ایسا کیا حضرت ابراہیمؑ نے أر (موجودہ عراق) سے ہجرت فرمائی اور مکے میں قیام پذیر ہوئے اور اپنی اولاد کو اس جگہ اس لئے چھوڑا کہ وہ عرب میں وحی کے مطابق معاشرہ تعمیر کریں۔ سب سے آخر میں حضورؐ نے حد درجہ کوشش کی کہ مکہ میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے لیکن چونکہ روساء مکہ کے مفادات کو زد پڑتی تھی اس لئے انہوں نے مخالفت کی اور حضورؐ کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ بالآخر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہجرت فرمائی اور مدینہ شریف میں آ کر حکومت اسلامی کا قیام فرمایا۔ صرف دس سال کے عرصے میں ایسا معاشرہ قائم کر دیا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے پیشتر کبھی ایسا معاشرہ نہ دیکھا تھا اور وہ آج تک ایسا معاشرہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔

قرآن کریم کا اصل موضوع بہترین معاشرے کا قیام اور اسلامی حکومت کا متمکن کرنا ہے سورہ نور کی مشہور آیت کریمہ جو آیت استخلاف کے نام سے مشہور ہے اس بارے میں بہت واضح ہے اور حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ o وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوا مِنکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُم فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِن قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُم مِّن بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْناً یَعْبُدُوْنَنِی لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئاً (24/55) o

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بہ امن کر دے گا تا کہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اس آیت کریمہ میں بطور اصول بیان کیا گیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اقتدار ہے۔ جو قوم بھی قرآن کریم پر ایمان لائے گی اور اس کے مطابق عمل کرے گی اس کو اس زمین پر خلافت حاصل ہوگی یہ صرف دعویٰ ہی نہیں ہے بلکہ گذشتہ اقوام میں سے جس قوم نے بھی اپنے نبی کی دی ہوئی وحی کے مطابق عمل کیا اس کو اس زمین پر اقتدار حاصل ہوا ۔اس دعویٰ کے بعد آیت کا دوسرا حصہ پہلے حصہ کی وضاحت کرتا ہے اور خلافت کی تشریح کرتا ہے یعنی ان کے دین کو اس زمین پر متمکن کردے گا خلافت کو قرآن کریم نے تمکن فی الارض سے Define کیا ہے۔ اگر کسی قوم یا فرد کو زمین پر تمکن حاصل نہیں تو وہ قوم یا فرد خلافت کا حامل نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں میں یہ ایک غلط عقیدہ رواج پذیر ہو گیا ہے کہ خلیفہ بغیر اقتدار یا تمکن فی الارض کے بھی ہو سکتا ہے۔ پھر تمکن فی الارض کو مزید واضح فرمایا کہ اس معاشرے میں خوف امن سے دل جائے گا۔ یعنی اس معاشرہ میں امن ہی امن ہوگا اور قرآن قوانین کا اجراء ہوگا اور صورا اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت گی یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ تا کہ وہ میری اطاعت کریں۔ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا یعنی میرے حکم میں کسی کے حکم کو شریک نہ کریں۔ ایمان و اعمال صالحہ اور اس کے نتائج میں اطمینان بخش معاشرہ اسی لئے قائم کیا جاتا ہے کہ اس میں قوانین الٰہی جاری ہوں اور حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو اور یہی وہ العروۃ الوثقیٰ ہے جس کے گرد قرآن کریم کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے۔

قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے اور ان کو اپنی متعین کردہ مفاہیم میں استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ وہی روزمرہ کے عربی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن اصطلاحات کو اپنی مخصوص مفہوم و منطق کے لئے استعمال کرتا ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، خمس و صدقات، جہاد اور اسی طرح کے

بیشتر الفاظ نزول قرآن کے وقت عام گفتگو میں مستعمل تھے۔لیکن قرآن کریم نے ان کو اپنے خاص معنی پہنا کران کو استعمال کیا ہے۔ان الفاظ میں سے دو الفاظ، مضمون ہذا سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں طاغوت کا لفظ آیا ہے۔اس لفظ کا مادہ طغیٰ ہے۔یعنی حد سے باہر ہو جانے کو کہتے ہیں۔اسی لئے دریا وغیرہ کے پانی کا بڑھ کر مقررہ انداز سے زیادہ ہو جانے کو یا ساحل سے باہر آجانے کو طغیان کہتے ہیں۔اور طغوی کے معنی سرکشی کے ہیں۔قرآن کریم اسی لفظ کو اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتا ہے۔معاشرہ دو ہی طرح مرتب ہو سکتا ہے۔یا وہ انسانی خود ساختہ قوانین پر متفرع ہوگا اور یا وہ معاشرہ وحی الٰہی پر متشکل ہوگا۔ ہر وہ معاشرہ جو انسانی وضع کردہ قوانین (Man Made Law) پر مبنی ہوگا قرآن کریم کی اصطلاح میں وہ طاغوت ہوگا۔اور ہر وہ معاشرہ جو وحی الٰہی پر قائم ہوگا وہ قرآن کریم کی اصطلاح کے مطابق ''دین'' ہوگا۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ (4/60) یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں۔کہہ کر واضح کر دیا کہ طاغوت محض ذہنی تصور نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام وہ عدالتیں وہ حاکم، وہ حکومتیں، وہ نظام، جو اللہ تعالیٰ کے قانون (قرآن کریم) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں۔ان کی طرف رجوع کرنا، اللہ تعالیٰ سے انکار اور طاغوت کی اطاعت ہے، جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (4/76) یعنی غیر الٰہی اقتدار کے رفقائے کار ہیں۔

اسی طرح دین کا لفظ قرآن کریم نے متعدد موقع پر استعمال کیا ہے۔یہ لفظ بہت معنی میں استعمال ہوتا ہے۔غلبہ، اقتدار حکومت، آئین، اطاعت و فرمانبرداری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔سورہ توبہ میں ہے وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (9/29) وہ نظام خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔سورۃ یوسف میں دِیْنِ الْمَلِکِ (12/76) کے معنی بادشاہ کا قانون ہے غلبہ اقتدار کے معنی کے اعتبار سے قرآن کریم نے یوم الدین کے معنی خود وضع کر دیے ہیں جہاں فرمایا کہ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ o(82/18) ''تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے'' جواب میں فرمایا کہ o یَوْمَ لَا

تَملِكُ نَفسٌ لِّنَفسٍ شَيئاً وَالاَمرُ يَومَئِذٍ لِّلّٰہo(82/19)جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے کے لئے کچھ اقتدار واختیار نہیں رکھے گا اور تمام معاملات قانون الٰہی کے مطابق فیصل ہوں گے۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں کسی کو حق قانون سازی نہیں ہوگا اور حکومت قانون خداوندی کی ہوگی اور معاشرہ وحی الٰہی پر مبنی ہوگا۔قرآن کریم نے طاغوت اور دین کے مفاہیم کو واضح کردینے کے بعد انبیاءکرام کی بعثت کی وجہ ارشاد فرمائی کہ o وَلَقَد بَعَثنَا فِی کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُولًا اَنِ اعبُدُوا اللّٰہَ وَاجتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (16/36)o فرمایا کہ ہم نے ہر امت اور ہر قریہ میں رسول معبوث کئے تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت کریں کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور طاغوت سے بچیں۔کل انبیاء کرام کی وجہ بعثت یہ تھی کہ وہ غیر الٰہی معاشرہ کو جڑ سے اکھاڑ دیں اور ایسے معاشرے قائم کریں جن میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور قرآنی اور اسلامی حکومت متشکل ہو اسی مضمون کو سورہ النساء کی آیت (60) میں حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ نے کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جو گمان تو یہ کرتے ہیں کہ قرآن کریم اور اس سے مقابل صحف پر ایمان لے آئے ہیں۔مگر ان کی حالت یہ ہے کہ فیصلے طاغوت سے کراتے ہیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ یہ طاغوت سے فیصلہ نہ کرائیں۔اس آیت کریمہ کی رو سے کسی بھی طاغوت یا غیر اسلامی حکومت میں زندگی بسر کرنا بالکل حرام ہے۔اور قرآن کریم کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ اس قسم کے معاشروں کو اول تو اسلامی حکومتوں میں تبدیل کرو۔لیکن اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو مسلمانوں پر لازم اور فرض ہے کہ ان معاشروں سے ہجرت کر کے فوراً کسی اسلامی حکومت کے ماتحت آجائیں۔آیت نمبر (4/97) میں اس حکم کے لئے تاکید فرمائی کہ کیا اللہ کی زمین تنگ تھی کہ تم نے طاغوتی نظام سے اسلامی حکومت کی طرف ہجرت نہیں کی۔ان تمام آیات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے قرآن کریم اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کس قدر اصرار اور تاکید کرتا ہے۔

قرآن کریم نے اسلامی حکومت کے قیام پر سخت تاکید اور اصرار کرنے کے بعد اس حکومت کے اصولوں اور اس کی اقدار (Broad Principles) کو بھی اپنی کتاب میں واضح

فرمادیا ہے۔قرآن کریم چونکہ ایک تابندہ اور پائندہ کتاب ہے اور تا قیامت اس کے احکام اور اصول دنیا کی رہنمائی کریں گے اس لئے اس کا انداز یہ ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں اصول عنایت فرماتا ہے۔ اور جزئیات کے تعین کو ہر زمانہ کی حکومت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے حالات اور گردوپیش کے مطابق اپنی حکومت کی جزئیات مقرر کرلیں۔معاشرہ کیونکہ ہمیشہ ایک حال میں نہیں رہ سکتا اور انسانی معاشرے برابر ترقی کرتے چلے جارہے ہیں۔اگر قرآن کریم جزئیات بھی خود متعین فرمادیتا تو اس سے معاشرہ کی نشوونما اور ترقی رک جاتی اور معاشرہ بالکل جامد (Static) ہوجاتا۔سیاسی شعبہ میں قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے کہ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور عملاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت قرآن کریم کی ہوگی۔قرآن کریم کی رو سے حکومت ایک ایسی ایجنسی یا ادارہ کا نام ہے جو خود بھی احکام قرآنی کی اطاعت کرتی ہے اور دوسروں سے بھی اس کی اطاعت کراتی ہے۔اس حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں حکمران حاکم ہوتے ہیں۔خود قوانین وضع کرتے ہیں اور لوگوں سے ان کی اطاعت کراتے ہیں۔ان کی اپنی خواہش اور مرضی کا نام قانون ہوتا ہے۔وہ خود ان قوانین کو حسب منشا اور مرضی کے مطابق کرلیتے ہیں۔پہلے یہ قوانین ایک شخص بناتا تھا ،اب یہ قوانین لوگوں کے نام نہاد نمائندہ بنالیتے ہیں جن کی اکثریت جب بھی چاہتی ہے ہر طرح کی ترمیم کرکے اپنی مرضی کو قانون بنوالیتی ہے۔اور اپنے مفاد کا تحفظ کرتی ہے۔اس وجہ سے اور صرف اسی وجہ سے معاشروں میں خرابی ہوتی ہے۔قرآن کریم کا تو نظریہ ہی یہ ہے کہ ملک میں فساد صرف لیڈر اور حکمران ٹولہ ہی کراتا ہے۔اگر ان کو کسی قانون کا پابند کردیا جائے تو ملک میں فساد نہیں ہوسکتا ارشاد ہوتا ہےO وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَO(27/48)

O اور شہر میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے یہ وہ نو افراد تھے جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی O ہر قوم ، ہر ملک ،حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں فساد پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں باقی ملک ان ہی لیڈروں کے ہاتھوں

تباہ و برباد ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ عام آدمی کے پاس تو کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جس سے وہ ملک میں امن وامان یا فساد کا باعث ہو سکے۔لیڈر یا حکمران ہی قوم کو درست یا برباد کرتے ہیں۔اور اس کے بعد بین الاقوامی سطح پر بھی چند اقوام ہوتی ہیں جو ساز باز کر کے ساری دنیا کی تباہی اور بربادی کا باعث بنتی ہیں۔قرآن کریم ان ہی لوگوں کے اختیار سلب کرتا ہے۔انہیں بھی اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ کسی قانون کے ماتحت زندگی بسر کریں۔انہیں من مانی کاروائی کا اختیار نہیں ہے۔بلکہ قاعدہ اور ضابطہ مقرر ہے اس کے مطابق زندگی گزاریں۔خود اس قانون کی اطاعت کریں اور دوسروں سے اس کی اطاعت کرائیں۔حاکم کا کوئی تصور نہیں ہے۔حاکم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور سب اس کے محکوم اور تابع فرمان ہیں۔اگر عملاً اس اصول کو قائم کر دیا جائے تو چند سالوں میں معاشرے کی حالت بدل جاتی ہے۔حضورؐ نے جب اسلامی حکومت قائم فرمائی اور اس کے سربراہ کی حیثیت سے جب انتظام مملکت اپنے دست مبارک میں لیا تو واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ (6/50) میں صرف اس چیز کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔پھر فرمایا انا اول المسلمین سب سے زیادہ اتباع قرآنی کرنے والا میں ہوں اس میں تقدم زمانی کے ساتھ ساتھ تقدم کیفی بھی ہے کہ سب سے زیادہ اطاعت گزار اور فرمانبردار قرآنی احکام کا میں ہوں۔حضورؐ اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ قرآنی قوانین سے سرمو بھی انحراف فرمائیں۔اس طرح عملاً حکومت اللہ تعالیٰ کے قانون کی ہوئی۔آج بھی اس بات پر ماہرین قانون کا اتفاق ہے کہ بہترین معاشرہ وہ ہی ہے جس میں قانون کی بالادستی ہو اور افراد کا کم سے کم دخل ہو۔زندہ اقوام اور ان کے معاشروں میں قانون کی گرفت مضبوط ہوتی ہے اور کوئی فرد اس سے مستثنیٰ یا بالاتر نہیں ہوتا۔اگر کوئی فرد یا ادارہ کسی وجہ سے قانون کی گرفت سے نکل رہا ہے تو قانون بردار معاشروں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس قانون کو (Retrospective Effect) دیتے ہیں اور کسی شخص کو اس کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتے۔بہترین معاشرہ ہی وہ ہے جو قانون کا پابند ہو۔قرآن کریم بھی اپنے معاشرہ میں حاکم ومحکوم کی تمیز نہیں کرتا۔اور سب کو مساوی درجہ دیتا ہے اور ہر شخص کو قانون کے احترام اور اطاعت پر آمادہ

کرتا ہے۔

دوسری خصوصیات اسلامی حکومت کی اس کا نظام مشاورات ہے۔ کسی سابقہ حکم کا اسی طرح جاری کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ لیکن ان احکام کو اپنے اپنے زمانے اور حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبادل اصولوں کی جزئیات کو پیش نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا بڑا مشکل اور بصیرت طلب کام ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے حضورؐ کو خود اور امت مسلمہ کو تاکید کی ہے کہ وہ آپس میں مشورہ کر لیا کریں۔ قرآن کریم نے مشورہ کے طریقے کو متعین نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس میں ذرائع کے تبدیل ہونے کا امکان تھا۔ کوئی بھی طریقہ مشاورت کا اختیار کیا جا سکتا ہے اصول صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ ہر کام مشاورت سے کرے۔

عام غیر اسلامی حکومت (سیکولر سٹیٹ) اور قرآنی حکومت میں واضح فرق یہ ہے کہ امت مسلمہ صرف ان امور میں مشاورت کر سکتی ہے جو قرآن کریم کے اصول یا حکم کے خلاف نہ ہو۔ جو مستقل اقدار و قوانین قرآن کریم نے عنایت فرما دی ہیں ان میں مشاورت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ صرف قرآنی اصولوں کے اختلاف (Application) میں جو مشکلات پیش آئیں یا جو نئے قوانین ان اصولوں کے ذیل میں مرتب کرنے ہوں ان میں مشکلات پیش آئیں یا جو نئے قوانین ان اصولوں کے ذیل میں مرتب کرنے ہوں ان میں مشاورت کی جائے۔ مثلاً اگر خارجہ پالیسی متعین کرنی ہے اور ایک حکومت نے پاکستان کو دولت مشترکہ سے نکال لیا ہے۔ لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ خیال ہوا کہ دولت مشترکہ میں دوبارہ شمولیت ضروری ہے تو اس میں باہمی مشورہ سے یہ بات طے کی جا سکتی ہے کہ ملک دولت مشترکہ میں رہے یا نہیں۔ اس مشورہ کے لئے حکومت کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔

اسمبلی میں مشاورت ہو سکتی ہے، ریفرنڈم کرایا جا سکتا ہے۔ جو صورت بھی مشاورت کی ہو سکتی ہے اختیار کی جا سکتی ہے۔ اور بعد از مشورہ کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب قرآن کریم نے بدچلنی کو حرام قرار دیا ہے تو صد فی صد ووٹ بھی اس کو جائز قرار نہیں دے سکتے یہ تو بہت

(Extreme) کی مثال ہے۔قرآن کریم نے غیبت کو منع کیا ہے، پوری امت مسلمہ اگر سوفی صد ووٹ دے کر اس کو مباح قرار دینا چاہے تو نہیں کرسکتی۔اس کے برخلاف حکومت انگلستان نے (Paederasty)(لواطت) جیسا شنیع وقبیح فعل ووٹ کی اکثریت کی بنا پر جائز قرار دے دیا ہے اسی طرح ربوٰ یعنی سود کا مسئلہ ہے۔ربوٰ کو چونکہ آج کل رواج عام حاصل ہے اور تمام ممالک کی معیشت کا انحصار اس پر ہے اسی لئے اس کی کراہت وشناعت بالکل نظرانداز ہو کر رہ گئی ہے لیکن اگر اس کو موجودہ تناظر(Perspective) سے بالکل الگ (Detach) کر کے اس کی ماہیت پر غور کیا جائے تو یہ انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے۔محض دولت اور سرمایہ کے زور پر عوام کا خون نچوڑ لیا جاتا ہے۔محض چند متمول آدمی مل کر، انسانیت کے بیشتر حصہ کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں لیکن آج کل ووٹ کی اکثریت کی بنا پر یہ جائز ہے اور سود سے کمایا ہوا مال شیر مادر کی طرح حلال قرار دیا گیا ہے۔لیکن دنیا جو بھی حالات پیدا کرے قرآن کریم نے سود کو واضح طور پر حرام قرار دیا ہے اور کوئی اسلامی حکومت مشاورت کے زور پر اس کو حلال نہیں کرسکتی۔

عام سیکولر حکومتوں اور اسلامی حکومت میں یہ امتیاز ہے کہ اسلامی حکومت صرف قرآنی اقدار کے اندر رہ کر مشاورت کرسکتی ہے جبکہ سیکولر سٹیٹ ہر طرح کے قوانین میں تبدیلی کرنے کی مجاز ہے۔کیونکہ اسلامی حکومت اپنے تمام قوانین کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حدود کے اندر رہ کر وضع کرتی ہے اور اس حکومت کو ان حدود سے تجاوز کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا عملاً حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب کو حاصل ہوتی ہے۔فرمان باری تعالیٰ ہے۔اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ(12/40) حق تعالیٰ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ایک جگہ اس مضمون کو بہت تاکید اور پرزور اور موثر الفاظ میں بیان فرمایا وَّلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًاo(18/26) دوسری جگہ اس مضمون کو بہت تاکید اور پر زور اور موثر الفاظ میں بیان فرمایا۔

oمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ

تَدْرُسُوْنَ o(3/79)o کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت سے سرفراز فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے قانون کے بجائے میرے قانون کی اطاعت کرو بلکہ اس کی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب الٰہی کی اطاعت کرو۔ جس کی تم دوسروں کو تعلیم بھی دیتے ہو اور اس پر خود بھی عمل کرتے رہو یعنی ربانی بن جاؤo۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی یعنی اس کی کتاب صرف نبی کو ہی ملتی تھی۔ غیر از نبی کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل نہیں کرسکتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب نبی کی وساطت سے عام لوگوں کو بھی مل جاتی ہے اس کے بعد امت اس کی وارث ہوتی ہے۔ اور امت پر فرض ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مطابق حکومت قائم کرے اور یہی کفر اور اسلام کا فرق ہے ارشاد الٰہی ہے وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o(5/44) جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے اور اس کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیںo۔

جہاں تک کتاب کا تعلق ہے اس کی بھی وضاحت کتاب میں ہی موجود ہے کہ وہ کتاب صاف اور واضح ہے قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ o(5/15) "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی آگئی ہے۔ یعنی ایسی کتاب جو بالکل واضح ہےo یہ کتاب آسان ہے اور اس سے راہ نمائی حاصل کرنا آسان ہے۔o وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ (54/32) مزید یہ کہ اس کتاب میں کوئی تضاد یا تناقص نہیں ہے جو بات ایک جگہ ہے وہی ہر جگہ بیان ہوئی ہے کسی مسئلہ میں تضاد نہیں وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًاo(4/82) نیز یہ کہ کتاب محفوظ ہے ہر شخص کے پاس دستیاب ہے اور اس میں کوئی خدشہ نہیں کہ اس کے مختلف نسخوں میں کوئی فرق ہو۔ کہ ایک شخص کو کوئی حکم نکلتا ہو اور دوسرا شخص کوئی اور حکم۔ ضمناً عرض ہے کہ اگر پاکستان میں شروع سے ہی قرآن کریم کو ضابطہ حیات قوانین تسلیم کرلیا ہوتا تو اس میں مارشل لاء نافذ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر اس کے قوانین کو منسوخ کرتے تو مسلمان من حیث المجموع مسلمان ہی نہیں رہتے۔ اس کتاب کو آئین قرار دینے سے یہ فائدہ ہوتا کہ کوئی حاکم اس کو منسوخ نہیں کرسکتا اور اس

کے قوانین ہر حال میں بحال رہتے۔

اسلامی حکومت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پوری کی پوری امت غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی ہوتی ہے۔اس کے اندر پارٹیوں کا وجود خواہ وہ مذہبی پارٹیوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی شکل میں بالکل حرام ہے۔قرآن کریم چونکہ مذہب اور سیاست میں تفریق نہیں کرتا اس لئے مذہبی اور سیاسی دونوں پارٹیاں ممنوع ہیں ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ o (30/31.32) مومن ہونے کے بعد مشرک نہ ہو جانا o یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اس طرح خود بھی ایک پارٹی بن گئے اور پھر ہر فرقہ اپنے مسلک پر خوش رہتا ہے o اسی مضمون کی کئی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں جن میں پارٹی بنانے کی سخت ممانعت آئی ہے۔

اسلامی حکومت کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت اس کی حریت و مساوات ہے۔اسلامی حکومت جمہوری ہے اور اسلامی جمہوریت، حریت اور مساوات انسانی کے بنیادی اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔جو اقتدار اعلیٰ کے اسلامی نظریہ کا لازمی نتیجہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے مقتدر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان پر انسان کا اقتدار اعلیٰ ختم ہو گیا اور اس اقتدار کا خاتمہ ہی حریت، مساوات انسانی کی اساس ہے۔حقیقی حریت وہی ہے جو انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرائے اور اس کی اس آزادی کو بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری پابندیاں عائد کرے اور حقیقی مساوات صرف وہی تصور پیدا کر سکتا جو رنگ، نسل، وطن، لسان اور جاہ و دولت کے امتیازات کو مٹا کر نوع انسانی کو مساوی قرار دے۔إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (12/40) حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں دوسری جگہ ارشاد ہوا کل لہ قانتون اور سب اس کے حکم بردار ہیں۔

یہ دو آیات درحقیقت حریت انسانی کا ایک مکمل تصور ہیں۔جو ایک طرف تو انسان کو انسان کی مطلق العنانی، استعمار، جبر اور انسانی اقتدار کی دوسری شکلوں سے نجات دلا کر انسانی آزادی

کا تحفظ کرتا ہے اور دوسری طرف ایسی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو آزادی کو بے راہ روی سے روک سکیں۔ یہ پابندی حکم الٰہی کے تحت رہنے کی پابندی ہے۔ فرد، جماعت اور حکومت سب ان احکام الٰہی کے پابند ہیں جن پر انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ یہ پابندیاں ایسی ہیں جو معاشرہ میں عدل وانصاف اور امن وامان قائم رکھنے اور لوگوں کو برائیوں سے روکنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان کی نظر میں تمام انسان مساوی ہیں اور ان کا ماخذ انسانی اقتدار سے ماورا ہے اور اس طرح یہ پابندیاں بھی صحیح معنوں میں حریت اور مساوات قائم کرتی ہیں۔ حریت و مساوات کا کوئی نظریہ اس وقت تک عملی حقیقت نہیں بن سکتا جب تک کہ انسان پر انسان کا تسلط اور انسانوں میں بلند و پست کی تفریق پیدا کرنے والے امتیازات کو ختم نہ کر دیا جائے۔ اسلام نے انسان پر انسان کا اقتدار ختم کرنے کے ساتھ ہی پست و بلند کی تفریق پیدا کرنے والے اصولوں کو بھی مٹا دیا اور نوع انسانی کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے اور رنگ و نسل، جاہ و دولت کے امتیازات کو مٹا کر مساوات پیدا کرنے والے اصولوں کی تعلیم دی چنانچہ حکم الٰہی وارشاد ربانی ہے o یَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ o (49/13) o اے لوگوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری برادری اور کنبہ بنا دیئے تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کر سکو تم میں سب سے زیادہ مکرم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے o اس لئے اسلامی حکومت میں معیار مدارج کا تعین سیرت و کردار کی پختگی پر ہوگا۔ لِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا (6/132) ہر ایک کے مدارج ان کی حسن کارکردگی کی بنا پر متعین ہوں گے اور امور نظام و نسق ان لوگوں کے سپرد کئے جائیں گے جو انہیں سرانجام دینے کے اہل ہوں گے۔ o إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (4/58) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ قوم کی امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہوں۔

نظام عدلیہ ہر حکومت کا ایک اہم ترین شعبہ ہوتا ہے اور عدلیہ کی آزادی اور انصاف

رسائی قرآنی حکومت کا ایک لازمی اور بنیادی اصول ہے۔ اسلامی حکومت نے یہ اصول (یعنی عدل) مکمل شکل میں موجود ہوتا ہے۔ عدل کے سلسلہ میں ایک بنیادی حقیقت کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ دنیا کے اہم تصور کے مطابق عدالت کے منصف کو ملک کے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی فیصلہ ملک کے قانون کے مطابق کر دیا گیا تو وہ درست فیصلہ ہوگا لیکن اگر وہ قانون ہی عدل ہی پر مبنی نہ ہو اور وہ قانون ہی غیر عادلانہ ہو تو وہ تمام فیصلے عادلانہ نہیں ہوں گے، قرآن کریم بہت واضح طور پر کہتا ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین مبنی بر عدل نہیں ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے اپنے قانون کو مبنی بر عدل شمار کرتا ہے۔ اگر قرآن کریم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو مبنی بر عدل قرار دے تو اس کی اپنی امتیازی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے اس لئے وہ عدل کرنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ یَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ o (7/159) یعنی وہ حق کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کے مطابق عدل کرتے ہیں o الحقّ (قرآن) کے مطابق عدل ہی درحقیقت عدل ہے۔ اگر قانون ہی الحقّ یعنی قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے تو اس قانون کے مطابق عدل، حق کے مطابق نہیں ہوگا۔ یہ ایک نمایاں خصوصیت اسلامی حکومت کی ہے۔ اور یہی مابہ الا امتیاز فرق اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت کا ہے۔

خواتین تمام معاشروں میں محکوم اور حقوق سے محروم تھیں۔ مردوں کو عورتوں پر مالکانہ اقتدار حاصل تھا۔ بعض معاشروں میں عورتوں کے وجود تک کو منحوس تصور کیا جاتا تھا اور خود اہل عرب بھی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اسلام نے نوع انسانی کے اس نصف حصہ کو ذلت اور مصیبت سے نکال کر انسانی حقوق عطا فرمائے۔ اور ان سے حسن سلوک کا حکم دیا۔ عورتوں کے معاشرتی رتبہ کا تعین کرتے ہوئے قرآن کریم نے فرمایا ولهن مثل الذي عليهن بالمعروف عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر دوسری جگہ فرمایا هن لباس لكم و انتم لباس لهن یعنی مرد و عورت، دونوں ایک دوسرے کا لباس ہیں یعنی ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے راز دار ہیں عورتوں کی محکومی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ معاشی

اعتبار سے عورتیں مردوں کی دست نگر تھیں چنانچہ قرآن کریم نے ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے پر توجہ دی۔ اسلامی حکومت کے قوانین کے مطابق ترکہ میں عورتوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اور ان کی کمائی ہوئی دولت انہی کا حصہ شمار ہوگی۔ مرد جو کماتے ہیں وہ مردوں کا ہے عورتیں جو کماتی ہیں وہ عورتوں کا ہے(4/32) اسلامی حکومت میں عورتوں کا حق ملکیت تسلیم کیا گیا ہے۔ جائیداد خریدنے، فروخت کرنے، ہبہ کرنے کے جملہ حقوق عورتیں، استعمال کرسکتی ہیں۔ تجارت اور کاروبار کرنے کی اجازت ہے۔ شادی کے بعد اپنی املاک کا علیحدہ انتظام کرنے اور حسب مرضی اپنا نمائندہ مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت میں عورتوں کے سیاسی حقوق بھی مردوں کی طرح ہیں۔ انہیں حق رائے دہندگی حاصل ہے اور قانون مساوات ان کے حقوق کا ذمہ دار ہے۔ عورتوں کا حصول تعلیم کا حق ہوتا ہے تاکہ وہ ترقی کے میدان میں مردوں سے کم نہ رہیں اور اپنے حقوق اور مراتب کا بخوبی تحفظ کرسکیں۔ انہیں مذہب کی آزادی ہے جو مذہب بہتر سمجھیں وہ اختیار کرسکتی ہیں۔ شادی بیاہ اپنی مرضی سے کرسکتی ہیں۔ نکاح طلاق کے وہی اختیارات عورتوں کو حاصل ہیں جو مردوں کو ہیں۔ عورتیں بھی طلاق حاصل کرسکتی ہیں۔ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اسلامی حکومت میں عورتوں کو وہ حقوق دیئے ہیں جن کے لئے آج کے ترقی یافتہ ممالک کی عورتوں کو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کوشش کرنی پڑی تھی۔ نیز بعض ممالک کی عورتیں آج بھی ان کے لئے کوشاں ہیں اسلامی حکومت کا اقتصادی نظام بھی عدل، معاشرتی توازن، فلاح و بہبود عامہ کے اسلامی مقاصد پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلام انصاف نواز اور عدل پسند ہے۔ وہ نہ تو مغربی ممالک جیسی سرمایہ داری کا حامی ہے اور نہ روس جیسی اشتمالیت کا۔ مغربی سرمایہ داری جائز و ناجائز کا لحاظ کئے بغیر دولت پیدا کرتی ہے اور کثیر دولت کو ایک چھوٹے سے طبقہ میں محدود کرادیتی ہے۔ روسی اشتمالیت خود ہی زمنہ کے ہاتھوں دم توڑ گئی جو اجتماعی مفاد کے نام پر فرد سے بے انصافی کرتی تھی۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت فرد کے مفاد کو اجتماعی مفاد کی خاطر نظر انداز نہیں کرتی۔ وہاں دولت بجائے خود ایک مقصد نہیں ہے بلکہ حصول مقاصد کا ذریعہ ہے اسی لئے قرآن کریم چاہتا ہے کہ مقاصد اعلیٰ ہوں اور دولت کو جو حصول

مقاصد کے لئے بہت بڑی اور موثر قوت ہے اس طرح کام میں لایا جائے کہ وہ اسلامی حکومت کے لئے نقصان رساں نہ ہو سکے۔

معاشیات کے شعبہ میں اسلامی حکومت کے خدوخال بہت واضح اور نمایاں ہیں سب سے بڑا اور انقلاب آفریں اصول تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں کسی کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ خصوصاً زمین جو کہ وسائل پیداوار کا ذریعہ ہے وہ کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے وہ اسلامی حکومت کی تحویل میں ہوتی ہے۔ حکومت خود کاشتکاروں کو زمین مہیا کرتی ہے اور جو شخص جس قدر رقبہ کاشت کرتا ہے وہ اس کے پاس رہتا ہے۔ حکومت سال بہ سال یا مناسب اوقات پر زمین کی شرح آمدنی مقرر کرتی ہے۔ ہر کسان زمین کی کاشت کی آمدنی کا ایک حصہ براہ راست حکومت کو ٹیکس کے طور پر ادا کرتا ہے۔ اس طرح سے غیر حاضر زمین دار (Absentee Landlord) درمیان سے نکل جاتا ہے۔ اور زمین کی آمدنی صرف کاشتکار اور حکومت کے درمیان تقسیم ہوتی ہے۔ اس سے حکومت کو وہ پوری دولت حاصل ہوتی ہے جو درمیان کے لوگ یعنی جاگیردار محض اس لئے رکھ لیتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نے کسی طریقہ سے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ حالانکہ کسی چیز پر قبضہ کرنا اس کی ملکیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ قرآن کریم کی رو سے زمین اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ o(55/10) لوگوں کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے o اور سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ o(41/10) ہر شخص کے لئے برابر کے حقوق ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ اور پانی، ہوا، دھوپ کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب انسانیت کو فراہم کردہ ہے نا کہ چند افراد کے لئے۔

اسلامی حکومت ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ ہر شخص کی کفالت کرے اور کوئی شخص بھی پوری مملکت میں رزق سے محروم نہ رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے o وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6) یعنی کوئی ذی حیات زمین میں ایسا نہیں کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں تمام افراد معاشرہ کے وظیفے مقرر فرما رکھے

تھے اور کوئی آدمی اس دور میں بھوکا نہیں رہ سکتا تھا اس کے باوجود حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دجلہ پر بھی کوئی کتیا بھوکی مرگئی تو عمرؓ پر اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اس سلسلہ میں اسلامی حکومت افراد معاشرہ کو اس بات کی گارنٹی دیتی ہے کہ وہ ان کی اور ان کی اولاد کے رزق کی بھی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کئے ہوئے وعدے پورے ہوتے ہیں اس لئے جو رزق کی فراہمی کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے وہ اسلامی حکومت کے ذریعے پورا ہوگا۔ اور اس میں کوئی شخص ننگا بھوکا اور بے گھر نہیں رہے گا۔ انك لاتجوع فيها ولاتعرى (20/118) کا مفہوم یہی ہے۔

اسلامی حکومت میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا۔ o وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ o(53/39) جو جتنی محنت کرے گا اتنا ہی کھا سکے گا۔ دولت کے زور پر دولت، اور پھر مزید دولت کے زور پر مزید دولت کمانے کی اجازت اسلامی حکومت میں نہیں ہوسکتی۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے اسلامی حکومت میں ربوٰ بالکل حرام ہوگا۔ ربوٰ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اس میں روپیہ بغیر محنت کے حاصل کیا جاتا ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے اور دولت کوئی کماتا ہے۔ محض دولت کی بناء پر روپیہ کمانا جائز نہیں ہے، اسلامی حکومت میں معاوضہ محنت کا ہوگا۔ اور محنت کی ہی عزت ہوگی۔ ربوٰ یعنی سود کھانے سے محنت کی عادت جاتی رہتی ہے اور قوم بہ حیثیت مجموعی آرام طلب ہوجاتی ہے لیکن سود کی حرمت پر عمل اسلامی حکومت میں ہی ہوسکتا ہے جہاں پورا معاشی نظام اسلام کے اصولوں پر قائم ہوگا۔ غیر اسلامی نظام میں سود کی حرمت پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ سود ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے پورے معاشرے میں انقلاب لایا جائے گا۔ پوری (Economics) کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے پھر سود کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ طاغوت کے نظام میں سود حرام کر کے معاشی نظام چلانا ممکن نہیں ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ نام تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نام تو سروس چارجز رکھا جاسکتا ہے لیکن نام کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔

مضمون کے آخر میں ایک اہم اعتراض کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی

حکومت کی اتنی خوبیاں اور اس کی اتنی ما بہ الامتیاز خصوصیت ہونے کے باوجود اسلامی حکومت اور اس کا نظام صدر اول میں چند سال رہنے کے بعد اتنی جلدی کیوں ختم ہوگیا۔ اگر اسلامی حکومت اتنی اوصاف کی حامل ہے تو کیا وجہ ہے کہ وہ حکومت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکی اور صرف چند سالوں کے بعد ہی ختم ہوگئی۔ بادی النظر میں یہ سوال بڑا دقیع معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ذرا بھی اس کی گہرائی میں جائیں تو اس کا جواب با آسانی مل جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کے جو بنیادی تصورات اور نظریات تھے۔ مثلاً مساوات، حریت، اخوت، معاشی عدل، قانون کی برتری، معاشرتی مساوات، ذات پات کی تردید، نسل پرستی کی مذمت، یہ وہ سب اصول ہیں جن پر اسلامی حکومت کار بند ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک اصول بھی ایسا نہیں ہے جس کو آج کی مہذب دنیا پسند نہ کرے۔ اسلامی حکومت کے تمام بنیادی تصورات اور اصول آج بھی قابل تعریف ہیں۔ ان میں سے کوئی اصول ناپسندیدہ نہیں ہے۔ جس دور میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی اس دور میں دنیا ان اصولوں سے بالکل ناواقف تھی۔ یہ قرآن کریم اور اس کی عملی شکل میں اسلامی حکومت کا ہی طفیل ہے کہ یہ نظریات آہستہ آہستہ فروغ پذیر ہوئے۔ اسلامی حکومت کے سارے اصول آج بھی قابل ستائش ہیں اور ان میں سے کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو آج کی دنیا کا ساتھ نہ دے سکے۔

اسلامی حکومت کا عملاً وجود اس وجہ سے ختم نہیں ہوا کہ اس کے اصول قابل عمل نہیں تھے یا وہ زمانہ کے ساتھ نہیں دے سکتے تھے بلکہ اسلامی حکومت کا وجود اس لئے ختم ہوا کہ صدر اول کے فوراً بعد ملوکیت نے غلبہ حاصل کرلیا۔ بادشاہوں نے اسلامی حکومت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ اگر مسلمانوں میں ملوکیت نہ در آتی تو اسلامی حکومت برابر چلتی رہتی۔ اتنی سرعت کے ساتھ جو فتوحات ہوئیں انہوں نے اسلامی حکومت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ۲۲ لاکھ مربع میل رقبہ اسلامی مملکت کے زیر حکومت تھا اس قدر جلدی فتوحات ہوئیں کہ وہ (Consolidate) نہیں ہوسکیں اور نو مسلم آبادی اسلامی مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوسکی۔

اسلامی حکومت یا قرآنی نظام نہ کسی دور سے مخصوص ہے اور نہ کسی قوم سے مختص جس قوم

نے، جس جگہ، جب بھی اسلامی حکومت قائم کی، انسانیت فلاح پاجائے گی، اور انسانیت کی آخری پناہ گاہ وہی حکومت اور وہی مقام ہوگا۔ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (3/97) جو اس میں داخل ہوا وہ امن سے ہوگیا۔ انسانیت کا باطنی اضطراب اور عالمی بے چینی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے خود ساختہ نظام ہائے حیات انسان کو سکون مہیا نہیں کر سکے اور وہ دن دور نہیں جب بالآخر انسانیت اپنے خود تراشیدہ نظام ہائے حیات سے تنگ آ کر قرآن کریم کا نظام اختیار کرے اور کسی خطہ زمین میں اسلامی حکومت قائم کرے گی۔ وہ دن انسانیت کے لئے سعید ترین دن ہوگا اور واشرقت الارض بنور ربہا اور زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگ جگمگ کرنے لگے گی۔

ماہ مارچ 2005ء

امام کعبہ، کا مایوس کن خطبہ

ہر سال ذی الحج کے مہینے میں مکہ مکرمہ میں حج کا اجتماع ہوتا ہے جس میں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان نہایت خلوص وخشوع کے ساتھ شرکت کرتے ہیں حجاج کرام اپنے خلوص قلب کی بنا پر ہی ایک خطیر رقم اس مد پر خرچ کرتے ہیں اور سفر کی اور وہاں کے قیام کے دوران کی صعوبات برداشت کرتے ہیں ان کے اعزا اور اقربا بھی ان کی اس خوشی میں شریک ہوتے ہیں لیکن حج سے پیشتر اور حج کے بعد مسلمان قوم کی وہی حالت رہتی ہے جو چلی آ رہی ہے تاہم کوئی شخص یہ نہیں سوچتا کہ حج سے خود حجاج کرام یا مسلمان قوم کو کیا حاصل ہوا۔ ہمارا مذہبی طبقہ تو بالکل مطمئن ہے کہ اس سے حجاج کرام کی آخرت وعاقبت سنور گئی کیونکہ وہ حج کا کوئی تعلق اس دنیاوی زندگی سے وابستہ نہیں کرتے۔ اخبارات بھی ہر سال حج کے موقع پر اداریہ لکھتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح فرسودہ قسم کے ہوتے ہیں جن میں کوئی چیز قابل تذکرہ نہیں ہوتی۔ انگریزی اخبارات وجرائد بھی اسی طرح کے مضامین اور اداریے تحریر کر دیتے ہیں۔ البتہ اس سال مشہور اخبار (DAILY TIMES) نے امام صاحب کے خطبہ سے متعلق ایک اداریہ (Editorial) تحریر کیا جس میں امام صاحب کے خطبہ پر بھرپور تبصرہ کیا ہے بظاہر تو یہ کام ہمارے مذہبی طبقہ کا تھا کہ وہ ہر سال خطبہ کے مندرجات پر تبصرہ تحریر کرتے لیکن اس حلقہ میں تو کوئی حرارت باقی ہی نہیں ہے۔ خوشی اور تحیر کی بات ہے کہ انگریزی اخبار، اور انگریزی اخبار بھی وہ جس کی شہرت (Leftist) ہونے کی ہے اس نے جرات کی اور بہت دوٹوک تبصرہ تحریر کیا۔ اس اخبار کے اداریوں (Editouals) کی زبان بہت (Terse) بامعنی اور مجز ہوتی ہے۔ جن کا لفظی ترجمہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ کمترین راقم سطور نے اس کی

(Rendering) کی ہے جس میں اس اداریہ کا پورا پورا مفہوم آگیا ہے۔ آپ اس اداریہ کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اتنا واضح ہے کہ اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک مختصر سا نوٹ حج کے بارے میں بھی شامل کردیا گیا ہے۔ اسے بھی ملاحظہ سے گزار دیں۔ پہلے اداریہ کا ترجمہ (Rendering) ملاحظہ فرمائیں۔

حج کے موقع پر امام صاحب کا مایوس کن خطبہ

حج کا سالانہ اجتماع جو عید الاضحیٰ سے ایک روز پیشتر منعقد ہوتا ہے وہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت اہمیت ہے۔ مناسک حج میں خطبہ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے کیونکہ یہ روحانی اور علمی مباحث پر مشتمل ہوتا ہے خطبہ کے مشمولات کا زوال مسلمانوں کے مجموعی زوال کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ خطبہ صرف معمولی علمی سطح رکھنے والوں کو ہی پسند آسکتا ہے۔ آج جبکہ مسلمان کسی نئی فکر کی اشد ضرورت محسوس کر رہے ہیں لیکن اس سال کا خطبہ بھی بالکل فرسودہ تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس سال کا خطبہ گزشتہ سالوں سے بھی زیادہ فرسودہ تھا۔ اب اس حقیقت پر غور فرمائیں۔ جب مسلمان اپنے عروج پر تھے ان میں تجسس کی لگن تھی وہ نئے ممالک فتح کر رہے تھے اور سائنس اور فلسفہ کے مسائل کو بھی حل کر رہے تھے ان میں ابن خلدون، ابن رشد، ابن عربی، ابن سینا، جابر بن حیان، الغزالی، اور اُن جیسی علمی شخصیات پیدا ہوئیں۔ ان سب شخصیات کے نظریات نہ صرف یہ کہ ایک ہی جیسے نہیں تھے بلکہ اُن میں تنوع تھا اور اسی تنوع کا نتیجہ تھا جس نے اسلام کو علمی و عقلی تحریک دی۔ اور اسی کے سبب معتزلہ اور اشاعرہ کے معرکے ہوئے۔ جس میں معتزلہ عقل و استدلال کو بہت اہمیت دیتے تھے جبکہ اشاعرہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ تاہم اس دور کی قابل غور بات یہ ہے کہ اس دور میں عقلی تحریک جاری تھی اور اسی تحریک نے مسلمانوں کو زندہ بھی رکھا اور اس قابل بنایا کہ انہوں نے زوال بغداد کے بعد بھی۔ کہ جس کو ہلاکو خاں نے تباہ کردیا تھا۔ نئی حکومتوں کی داغ بیل ڈالی اور نئے علمی مراکز قائم کئے۔

اگرچہ یورپ کو مزید کئی صدیاں مسلمانوں جتنی عسکری قوت حاصل کرنے میں لگ گئیں

لیکن اسی دوران مسلمانوں کی عقلی اور ذہنی صلاحیتوں میں زوال ہو چکا تھا۔ عقلی استدلال کو حقیر سمجھنے اور فقہ کی اندھی پیروی کرنے سے مسلمانوں میں وہ زوال آیا جس کا تدارک وہ آج تک نہ کر سکے انیسویں صدی تک مسلمانوں کے زیادہ تر ممالک فتح کئے جا چکے تھے۔ مسلمانوں کی بقاء کی جتنی بھی تحریکیں اُبھریں انہوں نے اصل اسباب معلوم کئے بغیر، بس یہی سمجھ لیا کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث ان کے ایمان کی کمزوری ہے۔ ان کے نزدیک ایمان ہی وہ جادو کی چھڑی تھی کہ جس کے باعث وہ دوبارہ عروج حاصل کر سکتے تھے خواہ اس کے علاوہ اُنہیں کچھ بھی میسّر نہ ہو۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو دو سو سال بعد بھی عروج حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت اُس دور سے بھی زیادہ بُری ہے جب کہ وہ یورپی اقتدار کے ماتحت تھے اسی دور میں چند مسلمانوں نے عقل و استدلال کی طرف رجوع بھی کیا اور ان میں سر سیّد کا ایک اہم مقام تھا۔

یہ بات بڑی دل سوز اور جگر خراش ہے کہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ نے اس سال مکہ شریف میں حج کے موقع پر جہاں 20 لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا، اپنے خطبہ میں (مسلمانوں کے زوال سے متعلق) کوئی بات نہیں کی بلکہ اُسی پرانی فرسودہ بات کا اعادہ کیا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہیں۔ اُن کی اب بھی یہی خواہش ہے کہ مسلمان عورتوں کو لحافوں میں لپیٹ کر گھر کے اندر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ یہی ان کا موزوں ترین دائرۂ کار ہے۔

وہ اب بھی اسلامی معاشی نظام پر عمل درآمد کرنا چاہتے ہیں جبکہ ساری دنیا میں سرمایہ داری کا نظام جاری ہے۔ وہ (امام صاحب) مسلمانوں کے لئے یہی پسند کرتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب سے بچے رہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ تہذیب نوجوان مسلمانوں کے لئے ہلاکت آفریں ہے۔ وہ مغرب کے اس الزام کی بھی تردید کرتے ہیں کہ مسلمان علماء تشدد کی نصیحت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تقریباً تمام باتیں انہوں نے غلط ہی کہیں۔

مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن یہ کس طرح

حاصل ہو یہ مشکل ہے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے والوں نے کبھی اس قسم کا فارمولا پیش نہیں کیا جس سے تمام مسلم ممالک ایک ہو سکیں۔ اگر بالفرض یہ تمام مسلم ممالک آپس میں ایک بھی ہو جائیں تو اس سے ان میں روشنی کے بجائے تاریکی میں ہی اضافہ ہوگا۔ مسلمان تو اپنی قومی حکومتوں کو بھی پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ حقیقت یہ کہ آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کے لئے پہلے اپنی اپنی قومی حکومتوں کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ اب تک اسلامی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور اب بھی مسلمانوں کی کوئی مملکت بھی اچھی مملکت کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔

دوسرا موضوع جس پر امام کعبہ نے لب کشائی فرمائی وہ اسلامی معاشی نظام ہے حالانکہ یہ موضوع بھی ایک چلا ہوا کارتوس ہی ہے۔ تاہم ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ خود مسلمانوں کے درمیان اسلامی معاشی نظام کی اساسات پر اتفاق نہیں ہے۔ جن میں زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ تاہم اگر معاشی نظام کے لئے اقدامات کئے جائیں تو اس میں اجتہاد کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن اگر اجتہاد کرنا بھی پڑے تو ربا کے کیس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ اجتہاد بھی کوئی آسان چیز نہیں ہے۔ اس لئے ہم مسلمان اسی بات پر اکتفاء کرتے ہیں کہ فقہ کے دائرہ کے اندر ہی رہیں۔ اب تک کی شہادتیں یہی ہیں کہ اس سلسلہ میں بنکوں اور مالیاتی اداروں کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں رہی۔ خود پاکستان میں ہم نے دیکھ لیا ''مضاربے'' اور ''مشارکے'' بالکل ناکام ہو گئے۔ ایک پاکستان پر ہی موقوف نہیں، جہاں کہیں بھی اسلامی نظام کو جاری کرنا چاہا، یہ ازمنہ وسطیٰ کے دور کی اساسات پر ہی قائم رہا۔

عورتوں کے اختیارات وحقوق کے متعلق امام صاحب کی دلیل وہی ہے جو عام طور پر علماء میں متداول ہے۔ وہ انہیں گھروں کی چار دیواری میں مقید رکھنا چاہتے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام مردوں اور عورتوں کے مسائل کے سلسلے میں بہترین حل پیش کرتا ہے۔ بائبل کی یہ تعلیم کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں مغرب نے تو مسترد کر دی، لیکن مسلمان عورت کے پست مقام کے اب تک قائل ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ یہ تعلیم (خود) تو قرآن کریم کے بالکل

خلاف ہے۔ آخری بات جو امام صاحب کے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب سے مجتنب رہیں۔ غالباً امام صاحب اور عام مسلمانوں کے نزدیک مغربی تہذیب فحاشی اور زوال کا باعث ہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ مغربی تہذیب جیسا کہ Hunting Ton نے اپنے مشہور مقالہ میں لکھا ہے۔

Magna Mac سے متعلق نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق Magna Carta سے ہے۔ Magna Carta کو دیکھنے سے ہمیں زیادہ تکلیف اور رنج اس وجہ سے ہوتا ہے۔ کہ ہم اب تک بھی کوئی سیاسی نظام یا جانشینی کا طریقہ وضع نہیں کر سکے۔ آج مسلم ممالک میں سے کوئی ملک بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں اندرونی استحکام ہے۔ اور اس کا انتظام وانصرام مسلمانوں کی فوز وفلاح کو پیش نظر رکھتا ہے۔ امام صاحب نے جو مغرب کی تاریکی کا حوالہ دیا ہے تو اصل یہ ہے کہ وہ تاریکی ہمارے درمیان موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد مغربی باشندے ہونا اور وہاں کے حقوق حاصل کرنا پسند کرتی ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس ''روشنی'' کو پسند کریں جو ان کی مملکتوں میں ہے۔

(مسلمانوں) یہ بیدار ہونے کا وقت ہے۔ یہ فرسودہ نظریات ترک کرنے کا دور ہے یہ دور وہ ہے کہ ہم اپنا احتساب کریں اور بغور دیکھیں کہ ہم نے کہاں لغزش کھائی ہے یہ وہ اہم وقت ہے کہ ہم تمام چیزوں کو درست تناظر میں رکھیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ ہم قسمت وتقدیر کا رونا بند کریں اور اپنے اعمال وافعال کا ذمہ دار خود کو بنائیں، اس وقت ہمیں یہ خوب اچھی طرح محسوس کر لینا چاہئے کہ ہمارے زوال کا سبب اسلام پر عمل کی کمی نہیں ہے، بلکہ اصل سبب لکیر کا فقیر ہونا ہے جو ہمیں ازمنۂ وسطی سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔

اخبار ڈیلی ٹائمز کے اداریہ کا ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا اصل یہ ہے کہ مسلمان کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین اور مطمح نگاہ ہوتا ہے۔ یعنی دین خداوندی کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنا۔ مسلمان کی ساری زندگی اسی نصب العین کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی ساری زندگی اسی

نصب العین کے لئے وقف ہوتی ہے۔ہم مسلمانوں کی جو عبادات ہیں وہ دراصل اسی پروگرام یعنی دین خداوندی کو غالب کرنے کی کڑیاں ہیں۔ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي o(20/14) صلوٰۃ قائم کر کہ اس میں میرا قانون نافذ ہو o۔ روزہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مہینہ بھر کے اس تربیتی کورس کا مقصد بھی دین کو غالب کرنا ہوتا ہے۔کوئی بھی نظام اس وقت قائم ہوتا ہے جب اس نظام کے اصول دوسرے نظام کے اصولوں سے مختلف ہوں۔ ہر نظام کا عروہ الوثقی اس کے اصول ہوتے ہیں۔ یہ اصول اس نظام کا فکری مرکز ومحور قرار پاتے ہیں۔وحدت افکار کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔امت مسلمہ کے نظام کا فکری مرکز قرآن کریم ہے اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ہر نظام کا ایک محسوس مرکز بھی ہوتا ہے۔امت مسلمہ کا یہ محسوس مرکز کعبہ ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے مبارک ہاتھوں سے کرائی گئی تھی اور آج تک یہ مرکز مسلمان کے دل کی دھڑکن ہے۔

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہو گا

یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے کعبہ کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مختص نہیں کیا ہے بلکہ قرآن کریم میں جب بھی کعبہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اُسے ساری انسانیت سے منسوب کیا گیا ہے۔کسی خاص قوم، فرقہ، یا مسلک سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ پوری نوع انسانی کی ہدایت کا مقام ہے۔

(1) oجَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (5/97)o اللہ نے کعبہ کو محترم مقام بنایا اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پوری انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل بن جائے۔

(2) جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (22/25)، یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے آنے والے، اس کے دروازے تمام انسانیت کے لئے وا ہیں۔

(3) وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (3/97)، جس قوم نے بھی یہاں سے جاری کردہ نظام کو

اختیار کر لیا وہ قوم امن میں آ گئی۔

(4) إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (3/96) وہ پہلا گھر جسے تمام انسانیت کے لئے بنایا گیا، مکہ مبارک میں ہے اور یہ تمام نوع انسانی کے لئے ہدایت کا مقام ہے۔

کعبہ کی اصل وجہ فضیلت نظام ربوبیت اور دین خداوندی کا قیام تھا اور اُسے عملاً عالمی مرکز بنا کر رکھنا تھا کہ یہ عملاً قیاماً للناس، مثابة للناس اور ھدی للعلمین ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیم نے یہ کام سرانجام دیا تھا اور اسی جہت سے وہ ساری انسانیت کے رہبر مقرر کیے گئے۔ مقام ابراہیم ساری انسانیت کی رہبری ہے اسی وجہ سے پوری ملتِ اسلامیہ کو بھی حکم ہے کہ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (2/125)، مقام ابراہیم (انسانیت کی رہبری) کے پیچھے پیچھے اس طرح چلو کہ اس مقام کو کبھی نہیں چھوڑو اور ہمیشہ انسانیت کی رہبری اور امامت کا مقام ہی تمہارا مقام و مرتبہ رہے۔ تمہاری سعی و کاوش کی غایت، جدوجہد حیات کا مقصد، مقام ابراہیمی کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی پوری انسانیت کی امامت۔ اب اس آیت کریمہ سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ کعبہ میں جو مقام ابراہیم بتایا جاتا ہے، اس پر ہر حاجی دو رکعت نماز نفل ادا کرے، لیکن افسوس کہ اس آیت کا اصل مفہوم آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں غور کرنے سے حج کے تین، مقاصد نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں ایک تو یہ کہ حج کا تعلق ساری انسانیت سے ہے۔

اگر چہ اس کا انتظام واہتمام امت مسلمہ کے ذمہ ہوگا۔ اس میں صرف امت مسلمہ کے نمائندگان ہی حصہ لیں گے۔ لیکن ان کا مقصد صرف مسلمانوں کی فوز و فلاح ہی نہیں ہوگا، بلکہ وہ ساری انسانیت کے مسائل اور ان کی منفعت کی تدابیر پر غور کریں گے۔ اسی لئے فرمایا۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/27.28) اور لوگوں کو حج کی خبر کر دو کہ لوگ تمہارے پاس پیادہ اور ہر طرح کی دبلی

سواریوں پر، جو دور دراز کی راہ طے کر کے آتی ہوں، ان پر چڑھ کے آ پہنچیں o تا کہ اپنے فائدوں کو (خود) دیکھ لیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (3/97)، جو لوگ بھی اس مقام تک پہنچنے کی راہ پائیں وہ یہاں جمع ہوں بشرطیکہ اُن کا یہاں جمع ہونا خالص اللہ کے لئے ہو۔ اس آیت کریمہ میں لِلّٰهِ سے یہی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ مقصد کے حصول کے لئے۔ اس آیت میں بھی اس اجتماع میں شرکت کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس سے مقصد پوری انسانیت کی بہبود و فلاح ہو۔ کسی کی مخالفت یا دشمنی نہیں ہے۔ حج کا اجتماع پوری کی پوری انسانیت کے لئے ہے کہ جس میں پوری انسانیت کے منافع و فوائد حاصل کرنے کے طریقے وضع کیے جائیں۔ جس میں مسلمان بحیثیت ارکان کے حصہ لیں گے اور باقی ساری انسانیت اس میں بطور مبصرین کے شرکت کرے۔

حج کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ (2/185)، تا کہ تم اللہ کے اس ضابطہ حیات کو، جس کے ذریعے اس نے تمہاری راہ نمائی کی ہے، دنیا کے تمام قوانین و ضابطہ ہائے حیات پر غالب کردو۔ اور یہی وہ اصل مقصد ہے جس کی وجہ سے حج کا انعقاد ہوتا ہے اور اسی کے حصول کے بعد، حج کا پہلا مقصد یعنی پوری انسانیت کی خدمت بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر مسلمان قانون خداوندی کو غالب نہ کر سکیں، اور اقتدار حاصل نہ کر سکیں اور خود ہی مجبور و مغلوب ہوں، جیسا کہ آج ہیں، تو وہ خود کس طرح انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لئے حج کا اصل مقصد تو قوانین خداوندی کو غالب کرنا، اور خود مسلمانوں کا اقتدار حاصل کرنا ہے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو حج کا ثواب نہ اس دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں، اس کے بغیر حج کی صحیح پوزیشن صرف مذہبی رسم کی رہ جاتی ہے۔

حج کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ کعبہ کو روشنی کا ایسا مینار بنا دے جس سے عالمگیر انسانیت کے سامنے زندگی کا درست راستہ آ سکے۔ اور یہ وہ مقام بلند ہو کہ یہاں سے ساری دنیا کے لئے پورے سال ہدایات جاری ہوتی رہیں۔ جب کہ حج کے موقع پر ایک تفصیلی اعلامیہ جاری ہو جس میں گذشتہ

سال کے واقعات پر تبصرہ ہو۔ اور آئندہ سال کے لئے ہدایات جاری ہوں یہ وہ اعلامیہ ہے جو اب امام کعبہ ہر سال جاری کرتا ہے، (اس سال کے اعلامیہ پر D.T کا تبصرہ آپ نے ملاحظہ فرمایا) لیکن جس کا اصل مقام وہ تھا جو ابھی واضح کیا گیا ہے۔ اب نہ اس خطبہ میں موجودہ حالات پر تبصرہ ہوتا ہے۔ نہ مسلمانوں کی مشکلات و مصائب کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ بس صرف ایک رسم ہے جو ادا کر دی جاتی ہے۔ بھلا اس خطبہ کی اس اعلامیہ سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے؟ جس طرح مسلمان قوم کو زوال ہوا، اسی نسبت سے اس خطبہ کے مشمولات بھی زوال پذیر ہوئے کف افسوس ملنے کے علاوہ، خطبہ اور امام صاحب کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اپریل 2005ء

آمد مہدی اور نزول مسیح کا عقیدہ خلاف قرآن ہے

آج دنیا جس اضطراب اور پریشانی سے دوچار ہے۔ضرورت تھی کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی زندہ و پائندہ کتاب کا وارث بنایا تھا وہ اس دور میں پوری انسانیت کو اس اضطراب سے نکلنے کا طریقہ بتاتی اور انسانیت کی امامت و رہنمائی کرتی۔لیکن دوسروں کو جگانے والے جب خود ہی سو جائیں تو وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کرسکتے ہیں۔خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔لیکن جس قوم یا جس شخص کے سامنے قرآن کریم کی روشن قندیل ہوگی وہ ان حالات سے پریشان نہیں ہوگا۔اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ اپنی بساط کے مطابق قرآن کریم کے نظریات کی اشاعت و تبلیغ کرتا رہے،اور یہ کہ اس نظریہ کی تردید کرتا رہے جو قرآن کریم کے خلاف ہو۔خواہ اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کی جائے۔ قرآن کریم کا یہی حکم ہے کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی (34/46) قرآن کی تعلیم عام کرنے کے لئے ایک ایک دو دو ہی کھڑے ہو جاؤ مگر ہمت مت نہ ہارو۔لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (39/53) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

ہمارے ملک خصوصاً شہر کراچی میں بے شمار جرائد ہر ماہ طبع ہوتے ہیں لیکن افسوس،صد ہزار افسوس کہ ان جرائد میں سے ایک بھی قرآن خالص کی تعلیم عام نہیں کرتا اتنے بڑے شہر میں صرف یہ جریدہ ''صوت الحق'' ہی ہے جو قرآن کریم کی تعلیم عام کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ اسی طرح قبل پاکستان 1924ء سے 1926ء تک صرف بلاغ القرآن شائع ہوتا تھا جس نے اس وقت اپنے مقدور کے مطابق قرآن کریم کی خدمت کی۔اگرچہ وہ دور علماء اہل قرآن پر بڑی سختی کا دور تھا لیکن علماء اہل قرآن،قرآن خالص کا دامن تھام چکے تھے اور قرآن کریم کے سامنے آنے کے

بعد ان کی یہ حالت تھی کہ ۔

ایک دن وہ مل گئے تھے سرِ راہ گذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

تاہم ہمارے موجودہ دور میں قرآن کریم کی تبلیغ کے مواقع زیادہ آسان ہیں ۔ رسل ورسائل بھی عام ہے ۔ ہمارے وہ علماء کرام جو لاہور سے رائیونڈ تک جانے کا کرایہ فراہم نہیں کر سکتے تھے وہ آج تبلیغی مشن پر امریکہ اور لندن کے مسلسل چکر لگا رہے ہیں ۔ لیکن افسوس کہ وہ خلافِ قرآن تاریک و دہشت گردی کے نظریات کی تبلیغ میں منہمک ہیں جن سے اسلام کی مزید رسوائی ہوتی ہے ۔

کسے خبر تھی کہ لیکر چراغ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہی

اخبار و جرائد بھی ایک حد تک لوگوں کو متاثر کرتے ہیں ۔ لیکن Electronic Media (الیکٹرانک میڈیا) خصوصاً T.V کا اثر عوام پر با آسانی اور تیزی کے ساتھ ہوتا ہے کس قدر افسوس و دکھ کی بات ہے کہ ہمارے T.V کے مختلف چینلز مسلسل خلاف قرآن نظریات کی اشاعت کر رہے ہیں اور کوئی کھڑا ہو کر یہ نہیں سوچتا کہ ان خلافِ قرآن نظریات کی تبلیغ سے قوم کس قدر قرآن کریم سے دور ہوتی جا رہی ہے ۔ ''الف'' بولتے ستارے، استخارہ، روحانی CLINIC، سب اسی طرح کے خلافِ قرآن نظریات کی ترویج کر رہے ہیں ۔

کافی عرصے سے اور آج کل بھی، مختلف چینلز پر آمد مہدی اور نزول مسیح کے متعلق برابر مذاکرے ہو رہے ہیں ۔ ان دونوں موضوعات پر قرآن کریم کا محاکمہ، کمترین کی طرف سے ماہنامہ طلوعِ اسلام میں طبع ہو چکا ہے ۔ لیکن موضوعات کی اہمیت کے پیشِ نظر ان موضوعات پر پھر تبصرہ پیشِ خدمت کیا جاتا ہے کہ جس سے مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ سب نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم بھی حضورؐ کو ملتا تھا وہ صرف وحی کے ذریعے ہوتا تھا جو الفاظ سمیت نازل ہوتی تھیں۔ ہم مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ حضورؐ کو بغیر الفاظ بھی علم ملتا تھا اور صرف القاء کر دیا جاتا تھا یہ قرآن کریم کے تو خلاف ہے ہی لیکن Psychologically بھی یہ ممکن نہیں ہے۔ بغیر الفاظ کے خیال دل میں ڈالا (القاء) ہی نہیں جا سکتا۔ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا کہ o وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (14/4) o ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر بولی بولتا تھا اپنی قوم کی (موضح قرآن) ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں، اسی قوم کے الفاظ کے ساتھ وحی ہوتی تھی۔ o لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ o (75/16) o وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو o اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضورؐ الفاظ یاد فرماتے تھے۔ نیز ارشاد ہوا وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِن قَبْلِ أَن يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ (20/114) اے رسول قرآن (کے پڑھنے) میں اس سے پہلے کہ تم پر وحی پوری کر دی جائے جلدی نہ کیا کرو۔ پھر دوسرے مقام پر ارشاد ہوا o فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ o (75/18) o پھر جب ہم پڑھنے لگیں، تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے o (موضح القرآن)

یہ تمام آیات کریمات اس بات پر دال ہیں کہ وحی اپنے الفاظ سمیت نازل ہوتی تھی۔ صرف خیال القا نہیں ہوتا تھا سورۃ جن کی بالکل آخری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ o عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا o إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا o لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا o (72/26.27.28) o وہی غیب دان ہے اور اپنی غیب کی باتیں ظاہر نہیں کرتا o مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اس کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر کر دیتا ہے o تا کہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ سب پر حاوی ہے اور اس نے تو ایک ایک چیز گن رکھی ہے o یعنی رسول کی تحویل میں وہ جو امانت وحی کی دیتا ہے۔ اس کو پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھتا ہے ایک ایک چیز (حرف) کو گنے ہوئے ہوتا ہے مجال نہیں کہ کوئی

ایک حرف بھی اس کے شمار سے رہ جائے۔قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ یہ محافظ اس لئے مقرر کئے جاتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ ان رسولوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغامات بحفاظت لوگوں تک پہنچا دیئے۔اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی الفاظ میں ہوتی تھی اور ان الفاظ کی حفاظت کا اہتمام یہ تھا کہ پیغمبروں کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر تھے۔ تاکہ وہ وحی خالص اور منزہ شکل میں رہے۔لیکن ہمارے ہاں جن روایات کو وحی شمار کیا جاتا ہے ان کی حالت یہ ہے کہ وہ کئی کئی رُواۃ کی زبان سے منتقل ہوتی ہیں اور وہ بھی روایت بالمعنی ہوتی ہے۔لیکن اس کے باوجود ان روایات کو جو اڑھائی صدی کے بعد جمع کی گئیں وحی قرار دیا جاتا ہے۔اور یہی واحد سبب مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ حضورؐ پر وحی الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی اور جو صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔اس موضوع پر اتنا کچھ تحریر کر دیا ہے کہ اس کو بار بار تحریر کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔موقرہ جریدہ 'صوت الحق' اور طلوع اسلام ان مضامین سے بھرے پڑے ہیں ۔تاہم اس خیال کے پیش نظر کہ جن حضرات نے وہ مضامین مطالعہ نہیں فرمائے ان کی سہولت کے لئے چند آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

(1) o وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ o (36/69)

o اور ہم نے اس پیغمبر کو نہ تو شعر کی تعلیم دی اور نہ ہی شاعری اس کی شان کے لائق ہے یہ (کتاب) تو بس نصیحت اور صاف صاف قرآن ہے o

اس آیت کریمہ میں نفی و اثبات کے حصر کے ساتھ نہایت پُرزور طور پر، باصرار بتا دیا کہ حضورؐ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی وہ صرف ذکر یعنی قرآن کریم ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کی نفی کر دی گئی ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

(2) o وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ (13/36)

o اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو اترا تیری طرف (موضح

القرآن)

اس آیت کریمہ میں مَـا اُنـزِلَ کی وضاحت کتاب سے کردی گئی کیونکہ یہ آپس میں ایک دوسرے کا بدل اور بـدل منہ ہیں کہ مَـا اُنزِلَ صرف قرآن ہے راویات اس میں شامل نہیں دوسرے مقام پر سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

(3) ٥وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ(5/48)

٥اور (اے رسول) ہم نے تم پر بھی برحق کتاب نازل کی جو کتاب (اس کے پہلے سے) اس کے وقت میں موجود ہے۔ یہ اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان (بھی) ہے۔ تو جو کچھ تم پر اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم بھی فیصلے کرو۔

اس آیت کریمہ نے پھر کتاب کی تصریح بِمَا أَنزَلَ سے کردی کہ بِمَا أَنزَلَ اللهُ صرف قرآن کریم ہے۔

یہاں تک مضمون میں ایک اصولی بات ثابت کردی گئی ہے کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی علم ملا ہے وہ صرف قرآن کریم ہے اور قرآن کریم کے ذریعے ہی حضورؐ کو گذشتہ اور آئندہ کی اطلاعات دی گئی ہیں رسول اللہ قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی غیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔ (72/26-12/102-11/49-7/188-6/50-3/179-3/44) آمد مہدی اور نزول مسیح کے سلسلہ میں جو مذاکرہ جیو کے چینل پر مورخہ 4/2/5 کو ہوا، اس کی ابتداء میں علماء کرام نے اس بات کا اعتراف کیا کہ قرآن کریم میں آمد مہدی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ" صحیحین" یعنی بخاری شریف اور مسلم شریف میں بھی آمد مہدی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ بعد کی کتب خصوصاً ابن ماجہ وغیرہ میں یہ عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔

اصولی بات تو یہ ہے کہ جب قرآن کریم میں اس عقیدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور حضورؐ کے

پاس قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آئندہ کی معلومات کا نہیں تھا۔ تو حضورؑ نے اس آئندہ واقع ہونے والی بات کی کیسے اطلاع دے دی۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ بات حضورؑ نے بالکل بیان نہیں فرمائی ہوگی کیونکہ یہ علم خارج از قرآن ہے۔ دوسرے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جب ''صحیحین'' میں یہ عقیدہ بیان نہیں کیا گیا جو خود اڑھائی سو سال بعد جمع کی گئیں تو اس کے بعد وہ کون سا ذریعہ تھا جس کی معرفت محدثین کو اس آمد مہدی کی اطلاع ملی۔ اگر واقعی حضرت امام مہدی کو تشریف لانا تھا تو ''صحیحین'' میں بھی یہ بات لازماً درج ہوتی۔ جب کہ قرآن کریم اور ''صحیحین'' میں اس نظریہ کا دور دور تک اشارہ نہیں ملتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ یہ نظریہ بالکل بے بنیاد اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔

جن روایات میں آمد مہدی کا تذکرہ ہے ان میں امام مہدی کی علامات بھی درج کی گئی ہیں۔ لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ وہ علامات عمداً جان بوجھ کر، بالکل مبہم (Vague) رکھی گئی ہیں کہ ان سے کوئی واضح فیصلہ کسی کے مہدی ہونے یا نہ ہونے کا کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد لوگ امام مہدی ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ علامات اس قدر واضح ہوتیں کہ ان کو دیکھ کر کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ رہتی اور کوئی شخص ان علامات کی وجہ سے جھوٹا دعویٰ بھی نہ کر سکتا۔ لیکن افسوس کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ وہ علامات اتنی غیر واضح ہیں کہ لوگ مسلسل جھوٹا دعویٰ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مہدی جونپوری نے دعویٰ کیا ان کے متبعین ہمارے دور تک چلے آ رہے تھے۔ حیدر آباد دکن کے مشہور (Orator) خطیب بہادر یار جنگ، اور سرسید کے دست راست وقار الملک اسی فرقہ کے تھے۔ ہمارے دور میں بہاء اللہ اور مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا جن کے پیروں کی تعداد لاکھوں افراد پر مشتمل ہے۔ علامات کے ابہام کی یہ انتہا ہے کہ بیک وقت یہ دو آدمی مہدی ہونے کے مدعی تھے اور ان کے پیروں (Follower) متبعین یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ ان میں کون سا جھوٹا مدعی ہے اور کون سا سچا۔

سوڈان کے مہدی سوڈانی کے لئے مشہور ہے کہ وہ انگریزوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ

کر رہے تھے لیکن وہاں کے عوام ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، کیونکہ وہاں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ امام مہدی ظاہر ہونے والے ہیں (جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں پاکستان میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی) اس لئے لوگ امام مہدی کے منتظر تھے اور مہدی سوڈانی کا ساتھ نہیں دے رہے تھے یہ مشہور عالم دین، علامہ جمال الدین افغانی نے اُنہیں مشورہ دیا کہ وہ خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کردیں تاکہ لوگ ان کا ساتھ دیں چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور سوڈان کے عوام ان کے ساتھ ہو گئے اور مسلسل انگریزوں کو شکست دیتے رہے لیکن آخر میں جنرل گورڈن General Gordon نے حملہ کیا اگرچہ مہدی سوڈانی کے ساتھی بڑی بے جگری سے لڑے لیکن حملہ کی تاب نہ لا سکے اس لڑائی میں دس ہزار درویش کام آئے جبکہ جنرل گورڈن کے صرف 40 آدمی مارے گئے کیونکہ مہدی سوڈانی کے ساتھیوں کے پاس تلواریں تھیں اور ان کے پاس توپیں اور بندوقیں۔ یہ دو ہزار درویش صرف امام مہدی کے مفروضہ عقیدہ کی نذر ہو گئے ورنہ وہاں کے حالات انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

یہ رسالہ چونکہ خالص قرآنی تعلیم کا داعی ہے اور قرآن کریم کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے اس لئے اس رسالہ کا بھی کوئی تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے۔ لیکن بعض مرتبہ موضوع کی مناسبت سے ایسی بات سامنے آجاتی ہے جس کا تحریر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں وہ گروہ جو شیعہ نام سے موسوم ہے ان کے ہاں امامت کے لئے غلبہ واقتدار شرط نہیں ہے۔ جبکہ جمہور مسلمان جو سنی نام سے موسوم ہوتے ہیں ان کے نزدیک خلافت کے لئے اقتدار ضروری ہے۔ نیز ارشاد الٰہی ہے o یَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (38/26)o اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ قرار دیا تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا کرو۔ اقتدار اور غلبہ کے بغیر کوئی شخص خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شیعہ حضرات کے ہاں اقتدار شرط نہیں ہے، اسی لئے بارہ اماموں میں سے کسی کو اقتدار نہیں ملا سوائے اس کے کہ حضرت علی المرتضیٰ چار سال خلیفہ رہے۔ اور شیعوں میں جہاد بھی ساقط ہے۔ چونکہ امام کے لئے اقتدار شرط نہیں ہے۔ اس لئے شیعوں میں اسلامی حکومت کا

بھی کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ جو آپ ایران کا اسلامی انقلاب دیکھ رہے ہیں تو یہ مستند مروجہ تشیع کے عقاید کے بالکل خلاف ہے اور امام خمینی کو امام کہنا بھی شیعت کے خلاف ہے۔ یہ موقع ایرانی انقلاب پر تبصرہ کرنے کا نہیں ہے ورنہ یہ بتایا جاتا کہ ایران کا انقلاب نہ اسلامی ہے نہ شیعت کے مطابق، یہاں تو مقصود صرف یہ بات بتانی ہے کہ جب حکومت امامت کی شرط نہیں ہے اور گذشتہ گیارہ اماموں کے لئے یہ شرط بھی نہیں رہی تو حیرت ہے کہ حضرت امام مہدی کے لئے حکومت کے قیام کا عقیدہ خود اپنے ہی سابقہ عقیدہ کے خلاف کیسے تراش لیا گیا کہ وہ اسلامی حکومت قائم فرمائیں۔ T.V چینل میں ایک شیعہ عالم بھی موجود تھے جنہوں نے عمومی طور پر تمام گفتگو سے اتفاق فرمایا لیکن انہوں نے عمداً ''رجعت'' کے عقیدہ کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا کیونکہ اس عقیدہ کا کھلے بندوں ذکر کرنا مناسب نہیں تھا لیکن اصل یہ ہے کہ قیام حکومت کا عقیدہ ''رجعت'' کے عقیدہ کی وجہ سے ہی بنایا گیا ہے۔

آمد مہدی کے ساتھ ساتھ دوسرا عقیدہ حضرت مسیح کے نزول کا ہے آمد مہدی کے لئے تو خود چینل کے علماء نے شروع میں ہی اعتراف کرلیا تھا کہ ان کی آمد کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، ہاں البتہ نزول مسیح کے سلسلہ میں ہمارے علمائے کرام ایک آیت کریمہ کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لئے اس مضمون میں ضروری ہے کہ اس آیت کا درست مفہوم بیان کردیا جائے تاکہ کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے ارشاد ہوتا ہے o وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ (4/159)o اور کوئی بھی اہل کتاب میں سے ایسا شخص نہیں کہ اپنے مرنے سے پیشتر عیسیٰ پر ایمان نہ لے آئے (تفسیر مظہری) اس آیت کریمہ کے ذیل میں علماء کرام کا ارشاد ہے ''اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے تمام یہودی ان پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن اب تک چونکہ ایسا نہیں ہوا، لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ کی موت واقع نہیں ہوئی۔ نہ ان کو سولی دی گئی نہ ان کو قتل کیا گیا۔ جب ظہور امام مہدی کے وقت وہ آسمان سے اتریں گے اس وقت تمام یہودی جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ایمان لے آئیں گے۔ (تفسیر القرآن ۶۵ حصہ مولانا ظفر حسن صاحب)، یہی

مفہوم ہمارے ہاں علماء کرام نے اس آیت کا لیا ہے اور صرف یہی وہ آیت ہے جس سے نزول مسیح ثابت کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ مفہوم سب علماء کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، شروع سے ہی اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ سلف میں سے عکرمہ نے پہلی ضمیر کا مرجع حضورؐ کی ذات کو ٹھہرایا ہے اور دوسری ضمیر کا مرجع قرآن کریم کو بنایا ہے۔ چنانچہ ان ضمائر کے مختلف مراجع ہونے کی وجہ سے مفہوم بالکل مختلف ہو جاتا ہے اور اس آیت کریمہ کا کوئی تعلق حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے نہیں رہتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ''تدبر قرآن''، (مولانا امین احسن صلاحی مرحوم) نے جو تحریر کیا ہے اس کو بجنسہ Verbatim نقل کیا جاتا ہے۔ تحریر ہوتا ہے۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ اور قَبْلَ مَوْتِهِ میں پہلی ضمیر کا مرجع ہمارے نزدیک قرآن مجید ہے اور دوسری کا مرجع آنحضرتؐ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن کریم اور نبی کی صداقت تسلیم کرنے کے لئے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن کریم فی الواقع اللہ کی کتاب ہے اور محمدؐ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اس حیلے سے وہ ان تمام عقلی، نقلی، فطری، اور تاریخی دلائل کو نظر انداز کر رہے ہیں جو قرآن کریم اور پیغمبر کی صداقت کے ثبوت میں موجود ہے۔ لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ یہود و نصاریٰ قرآن کریم اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن کریم ان کے لئے جس رسوائی اور نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اُٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائے کہ اس کو جھٹلانا اُن کے لئے ممکن نہیں رہے گا اگرچہ ایمان کی سعادت ان کو یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوگی'' اقتباس ختم ہوا۔ (جلد دوئم، صفحہ 423)

آیت کریمہ کو پوری طرح سمجھنے میں چند معمولی سی عربی قواعد کا پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ حد درجہ کوشش کی گئی ہے آیت کریمہ کو نہایت آسان کر کے بیان کیا جائے۔ آیت کریمہ اس طرح ہے o وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ 1 قَبْلَ مَوْتِهِ 2 (4/159) اس میں بِہٖ کی

دو ضمیریں ہیں جن پر ایک اور دو کے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔ موضوع احادیث کے زیر اثر اور نزول مسیح کے عقیدہ کی رعایت رکھتے ہوئے۔ ہمارے علمائے کرام نے بِـــہٖ کی دونوں ضمیروں کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع کیا ہے اور ترجمہ یہ کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جو حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آیا ہو۔ لیکن سیاق کلام میں زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلی ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف اور دوسری ضمیر خود اہل کتاب کی طرف راجع ہے کہ ہر اہل کتاب اپنی موت سے پیشتر حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر ایمان لاتا ہے۔

سابقہ آیات میں یہ مضمون چلا آ رہا ہے کہ نہ تو حضرت عیسیٰؑ کو قتل کیا گیا اور نہ ہی صلیب دی گئی بلکہ معاملہ مشتبہ ہو گیا تھا مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (4/157) لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مرنے سے پیشتر ان کے مصلوب ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہر عیسائی اپنی موت سے پیشتر Confession کرتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی صلیب کا قرار کرتا ہے۔ اگر موضوع احادیث کا اثر قبول نہ کیا جائے تو سیاق کلام سے یہ مفہوم بالکل درست ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور بھی نہایت لطیف مفہوم اس آیت کریمہ کا بیان کیا گیا ہے۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ علامہ اقبال کو اس آیت کے مفہوم کے بارے میں سخت تردد تھا کیونکہ اس دور میں احمدی حضرات سے مناظروں میں یہ آیت بہت ہی زیر بحث آتی تھی اور اس آیت کے غلط مفہوم کی وجہ سے لوگ احمدیت سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اس آیت کا درست مفہوم سمجھنے کے لئے علامہ خواجہ احمد الدین امرتسری مرحوم سے رجوع کیا کیونکہ وہ ایسے حالات میں ہمیشہ ان سے ہی راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ قَبْلَ مَوْتِهِ قرآن کریم کا ایک محاورہ ہے جس کے معنی واقعتاً یہ نہیں ہے کہ موت سے ایک دو دن پیشتر بلکہ قَبْلَ مَوْتِهِ کے معنی تمام عمر کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے o وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (63/10) o اور ہم نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے قبل اس کے خرچ کر ڈالو کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے یہاں ظاہر ہے کہ مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ سے

مراد یہ نہیں کہ مرنے سے دو دن پیشتر خرچ کرنے لگو بلکہ مراد ساری زندگی ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ مرنے سے چندروز پیشتر انفاق شروع کیا جائے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ o(2/132) پس ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہی ہو کر o اسی طرح کی آیات میں قَبْلَ مَوْتِهِ کی اصطلاح قرآن کریم ساری زندگی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ پس زیر بحث آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ حضرت عیسیٰ کے قتل وصلیب کے واقعہ میں کوئی بات واضح نہیں ہے اور صرف ظن وتخمین کا ہی اتباع ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود یہ عیسائی اپنی ساری زندگی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے اور اس کا کفارہ ادا کرنے کے قائل رہتے ہیں اس آیت کریمہ سے کسی طرح بھی نزول مسیح کا عقیدہ ثابت نہیں ہوتا ہے۔

آمد مہدی اور نزول مسیح کا عقیدہ بالکل خلاف قرآن ہے۔ معلوم نہیں اس زمانہ میں جب کہ مسلمان ہر طرف سے مصائب میں گھرے ہوئے ہیں، ان عقائد پر بحث کرنے سے مسلمانوں کا کون سا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ مسلمان قرآن کریم کی تعلیم کے ان نکات کو واضح کریں جن میں مسلمانوں کے مسائل کا حل موجود ہو۔ قرآن کریم کی روشنی میں اپنے زوال کے اسباب کا سراغ تلاش کریں اور پھر اسی کی روشنی میں ان اسباب کو دور کریں اور دنیا میں ایک زندہ قوم کی طرح زندگی بسر کریں۔ ان فرسودہ عقائد پر گفتگو کرنے سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ ان سے جتنا اجتناب کریں، اسی قدر بہتر ہوگا۔ یہ مسائل مولوی صاحبان کے پیدا کردہ ہیں اور ان پر بحث وتمحیص ان ہی کے شایان شان ہے۔ کیونکہ ان کے پاس بے کار وقت بھی بہت افراط سے ہوتا ہے، اور ان کے علم کی سطح بھی ان ہی مسائل تک ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ، مہذب، دانشوروں کے لئے ہرگز ہرگز مناسب نہیں کہ اس قسم کے فرسودہ مسائل کو زیر بحث لا کر، اپنا وقت اور توانائیاں ضائع کریں۔ اور مسلمان قوم کو بھی ان لاینحل مسائل میں الجھا رکھیں۔ o أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ (29/51) o ان سے کہو کہ کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ اللہ نے میری وساطت سے تمہاری طرف کتاب (ضابطہ حیات) نازل کی؟

ماہ جون 2005ء

حصول انصاف میں سائنسی ایجادات کا استعمال

پاکستانی عدالتوں نے زنا کے واقعات کی تفتیش کے سلسلہ میں DNA رپورٹ کے متعلق مختلف رویئے اختیار کئے ہیں۔ جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ روزنامہ ''دی نیوز'' کے ایڈیشن مورخہ 26 مئی 05ء میں ایک نہایت مفید وجامع سب اڈیٹوریل شائع ہوا ہے۔ یہ اداریہ انگریزی زبان میں ہے۔ اگرچہ صوت الحق کے قارئین کا حلقہ نہایت اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل ہے، جو براہ راست انگریزی زبان کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ تاہم جو حضرات انگریزی پڑھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں ان کی سہولت کے لئے اداریہ کا ترجمہ پیش خدمت عالیہ کیا جاتا ہے۔ یہ آزاد ترجمہ (Rendering) ہے اور حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ اداریہ کا نقطۂ نگاہ سامنے آجائے۔ (Science In Justice) پاکستان کا عدلیہ آج کل ایک نہایت اہم مسئلہ سے دوچار ہے۔ سوال یہ ہے کہ انصاف فراہم کرنے کے سلسلہ میں عدالتیں کس حد تک سائنس کی ایجادات پر بھروسہ کرسکتی ہیں۔ عدالتوں کا رویہ اس بارے میں تذبذبانہ ہے لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس جناب علی نواز چوہان نے جمعہ کے روز فرمایا کہ زنا کے کیس کے سلسلہ میں DNA ٹیسٹ رپورٹ ایک درست شہادت نہیں ہے۔ حالانکہ گزشتہ ماہ اسی عدالت کے ایک جج نے ایک بچہ کی ولدیت کا فیصلہ DNA ٹیسٹ کی بنیاد پر جاری فرمایا تھا۔

محترم جناب جسٹس چوہان نے فرمایا کہ DNA ٹیسٹ رپورٹ زنا کے کیس کو ثابت کرنے کے لئے، استشہاداً پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن صرف اس کو بنیاد بنا کر کوئی کیس درج نہیں کیا جاسکتا۔ حدود آرڈیننس کے ماتحت درج شدہ واقعات کو یکسر الگ قرار دیتے ہوئے جج صاحب

موصوف نے فرمایا کہ حدود آرڈیننس میں شہادت کا جو طریقہ مقرر کر دیا گیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ایک کیس کے بارے میں جو ایک پاکستانی نژاد امریکن نے اپنی بیوی کے بارے میں درج کیا تھا جسٹس چوہان نے فرمایا کہ DNA رپورٹ کی شہادت قتل، چوری، ڈاکہ اور ولدیت میں قابل قبول ہوسکتی ہے۔

ایک عدالتی سسٹم جو کہ مشتبہات سے بھرپور ہے جس میں سیکولر اور مذہبی تقسیم کی باہمی چپقلش کیوجہ سے توازن قائم کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے اس صورت حال میں کہ موجود فیصلہ مزید ابتری اور انتشار کا باعث ہوگا ایک انصاف پسند سوسائٹی کے لئے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے تمام افراد پر صرف ایک قانون کا اطلاق ہو مختلف قسم کے جرائم کے لئے مختلف بنیادوں پر انصاف فراہم کرنے سے عوام میں محرومیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

لیکن سب سے اہم بات جس کا عدالتوں کو فیصلہ کرنا از حد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کیا سائنس کی ایجادات سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے یا ہمیں اپنی فرسودہ طریقوں کو استعمال کرتے رہنا چاہیے جو کہ ہر مرتبہ بہت ہی کم فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔اب یہ ضروری ہے کہ پاکستان میں عدالتی نظام کی اصلاح ہو، نہ صرف یہ کہ قوانین کے اجرا کی بنیاد واساس ایک ہو، بلکہ یہ کہ یہ نظام نہ صرف دنیا کے ساتھ شانہ بشانہ چلے، بلکہ سائنس کی دنیا سے بھی قدم ملا کر چلے۔آپ نے اداریہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمایا۔اس میں صاحب اداریہ نے تین نکات اٹھائے ہیں۔

(1) زنا کے واقعات میں شہادت کے سلسلہ میں سائنس کی ایجادات سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟

(2) عدالتی نظام کی اساس صرف ایک ضابطہ قانون پر ہونا چاہیے جس کا اطلاق سب شہریوں پر یکساں ہو۔شہادت کے سابقہ طریقوں پر اکتفاء کیا جائے یا سائنسی معلومات سے فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟ جہاں تک پاکستان میں صرف ایک ضابطہ قانون کے جاری کرنے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے یہاں قرآن کریم کا ہی قانون نافذ

ہوگا۔قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہوگا۔اگرچہ مسلمان ہونے کی جہت سے اس پر ہمارا ایمان ہے،تاہم مزید تاکید کے لئے صرف چند آیات تائید میں لئے پیش کی جاتی ہیں۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا o(18/26) اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا o۔ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (5/48) جو کچھ تم پر اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو۔o وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)o اور تم لوگ جس چیز میں باہم اختلاف رکھتے ہو تو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے حوالے ہے۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o(5/44) جو اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکم نہ دے وہ کافر ہیں o۔

چونکہ اس بارے میں دو نظریات نہیں ہو سکتے اس لئے اس سلسلہ میں صرف انہی آیات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

جہاں تک شہادات میں سائنسی ٹیکنولوجی کا معاملہ ہے تو وہ لازماً استعمال کرنی چاہیے۔ اصل مقصد معاملہ کی تہ تک پہونچ کر انصاف کا حصول ہے یہ مقصد جس طرح بھی حاصل ہوا سے حاصل کرنا چاہیے۔قرآن کریم نے شہادت کا کوئی نصاب مقرر نہیں فرمایا ہے۔قاضی کو معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے کوئی حتمی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔اس کے سامنے دس گواہ پیش ہو جائیں اور اسے اطمینان نہ ہو تو آپ اسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ گواہوں کے بیان کے مطابق فیصلہ دیدے۔کیونکہ دس گواہ بھی جھوٹے ہو سکتے ہیں۔اگر اسے ایک گواہ کے بیان پر اطمینان ہو جائے تو وہ اس پر فیصلہ دے سکتا ہے۔اگر ایک طرف دس گواہ بیان دے رہے ہوں کہ فلاں آدمی نے فلاں لڑکی کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا ہے اور ہم عینی شاہد ہیں۔تمام گواہوں کا بیان یکساں ہے ان کے بیان میں ذرا سا اختلاف بھی نہیں ہے۔لیکن محض ایک لیڈی ڈاکٹر جو پوری طرح کوالیفائڈ قابل اعتماد نیک اور دیندار ہے،وہ لڑکی کا معائنہ کرنے کے بعد میڈیکل رپورٹ دیتی ہے کہ لڑکی کنواری ہے قطعاً ایسے کوئی آثار نہیں ہیں کہ اس کے ساتھ زنا کیا گیا ہو۔تو قاضی لامحالہ دس گواہوں کے بیانات رد کرنے پر مجبور ہوگا اور اسے صرف ایک عورت کی شہادت پر فیصلہ کرنا ہوگا۔اس طرح فیصلہ صرف میڈیکل

رپورٹ پر بھی ہو سکتا ہے۔

ہمارے ہاں سائنسی ٹیکنولوجی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے قرآن کریم سے ایک نصاب مقرر کرلیا گیا ہے جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور جس کی اساس سورۃ نساء کی آیت15-16 قرار دی جاتی ہے۔نصاب یہ ہے کہ چار مسلمان مرد زنا کا ارتکاب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں آپ خود فرمائیں کہ شادی شدہ جوڑے کے لئے ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں مگر اس کے باجود کوئی شادی شدہ جوڑا لوگوں کی موجودگی میں مقاربت نہیں کرے گا۔ چہ جائیکہ کوئی شخص لوگوں کی موجودگی میں زنا کا ارتکاب کرے اور خود کو سزا کا مستوجب قرار دے۔جن دو آیات کریمات سے زنا کا نصاب مقرر کیا گیا ہے ان آیات کا زنا کے فعل سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے ان آیات کی غلط تفسیر پر ساری عمارت استوار کی گئی ہے۔لیکن اگر آیات کا درست مفہوم پیش نگاہ ہو تو یہ ساری عمارت خود بہ خود زمیں بوس ہو جاتی ہے۔شرط صرف ان آیات کی درست تفسیر ہے۔ چونکہ انہی پر زنا کے مقدمات کا انحصار ہے اس لئے ان آیات کی تفسیر پیش خدمت ہے۔یہ آیات کریمات خود ہی واضح ہیں اور اس مضمون میں ان کو اس قدر واضح کیا گیا ہے کہ ہر قاری خود ان کو بسہولت سمجھ سکتا ہے یہ سورۃ نساء کی آیت15-16 میں ہے۔ان کا اردو ترجمہ اور ان سے متعلق اقتباسات دو تین مختلف تفاسیر سے پیش خدمت کئے جاتے ہیں۔تا کہ قارئین کرام کو سابقہ مفسرین کا نظریہ بخوبی معلوم ہو جائے۔پھر ان آیات کا درست مفہوم اور سابقہ مفسرین کرام کی لغزش کی نشان دہی کی جائے گی۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے۔o وَاللاَّتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُواْ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُواْ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىَ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّهُ لَهُنَّ سَبِيلاً o وَاللَّذَانَ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِن تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُواْ عَنْهُمَا إِنَّ اللّهَ كَانَ تَوَّاباً رَّحِيماً o(4/15.16)o اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں تو ان کی بدکاری پر اپنے لوگوں میں سے چار گواہ لو اگر وہ چاروں اس کی تصدیق

کریں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو حتیٰ کہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکالے o۔ اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو پیٹو پھر اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دو بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے o۔

(1) شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دیو بندی رقمطراز ہیں۔ ''اگر کسی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو اس کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل بالغ، آزاد قائم ہونا چاہئیں۔ اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہیے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا ملانا انتظاماً بالکل روک دینا چاہیے۔ یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی اور حکم یا سزا مقرر فرمائے۔ اس وقت زانیہ کے لئے کوئی اور سزا مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کا وعدہ کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد سورۂ نور میں اس کی حد نازل فرما دی۔ کہ باکرہ کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ (جو عورت کنواری نہ ہو اور اس کا شوہر زندہ ہو یا وفات پایا ہو) کے واسطے سنگسار کرنا ہے۔

(2) مشہور معروف تفسیر فصل الخطاب میں اس آیہ کریمہ کے ذیل میں تحریر ہے کہ ''ہر دعوے کا ثبوت دو گواہوں سے ہوتا ہے مگر یہ ناموس کا معاملہ ہے۔ بدچلنی کا الزام اتنا سخت ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ثابت نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ اس عورت کی بدچلنی اور بے باکی کی حد ہی نہیں اور وہ سماج کے لئے کیسی زہر قاتل ہے جو ایسے جرم کا ارتکاب اتنے آدمیوں کے سامنے کرے۔ کہ چار چشم دید گواہ اور وہ بھی عادل اس کے جرم کے ثبوت میں پیش ہو سکیں۔ ایسی عورت کو بداخلاقی سے روکنے یا کم سے کم سماج کو اس کے اثرات سے بچانے کے لئے اگر یہ سختی کی جائے تو کیا وہ بے محل سمجھی جا سکتی ہے؟ (جلد دوم صفحہ 165)

(3) اہلحدیث حضرات کی مشہور مستند تفسیر ثنائی میں اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں رقم ہے۔ بس جو تمہاری عورتوں میں سے زنا کریں ان پر اپنے لوگوں (مسلمانوں) میں سے بدکاری دیکھنے والوں میں سے چار گواہ مقرر کر لو پھر اگر وہ قاضی کے سامنے گواہی دے دیں تو بالفعل ان کی یہ سزا ہے کہ ان کو اپنے گھروں میں بند رکھو بالکل کہیں بھی جانے نہ دو یہاں تک کہ مر جائیں یا اللہ ان کے

لئے کوئی حکم بتلادیں جو متعلق سزا ہو جسے بھگت کر وہ چھوٹ جائیں۔ چونکہ صرف عورتوں کے رکنے سے زنا رک نہیں سکتا بلکہ ایک اور ذریعہ بھی زانیوں کے لئے موجود ہے کہ لڑکوں سے زنا کریں سو اس کی بات بھی سنو کہ جو دو مرد تم میں سے وہی لوطیوں کا کام کریں اور ان کا زنا بالشہادت بھی ثابت ہو جائے تو ان کو تکلیف پہنچاؤ اور زبانی بھی لعن طعن کرو کہ تم نے بہت بے جا کیا جس سے تمہارے اعتبار اور نیک بختی میں فرق آگیا ہے جب ہر طرف سے ان کو برا سننا ہوگا تو خود ہی اس فعل شنیع سے باز آجائیں گے۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنے اعمال کو درست کریں تو ان کا پیچھا چھوڑ دو اللہ بھی ان کو معاف کرلے گا۔ اس لئے کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ (جلد اول صفحہ 288)

(4) ملت جعفریہ ''خیرالبریہ'' کی مشہور تفسیر رقم کردہ حضرت ادیب اعظم جناب مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہی میں تحریر ہے'' بدکار عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا کہ انہیں کہیں نہ نکلنے دو یہاں تک کہ وہ مر جائیں لیکن کچھ دن بات یہ حکم منسوخ ہوگیا اور یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کوئی بے شوہر والی عورت زنا کرائے تو عورت اور مرد دونوں کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اور اگر شوہر دار عورت زنا کرائے تو سنگسار کی جائے۔

(5) تفسیر شہیر تدبر قرآن میں مرقوم ہے'' اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے اندر سے چار گواہ طلب کرو پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر محبوس کر دو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر لے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکالے اور جو دونوں تم میں سے بدکاری کا ارتکاب کرے تو ان کو ایذاء پہنچاؤ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے''

آپ نے مختلف فرقوں کی پانچ مستند تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ فرمالئے سب نے اس آیت کریمہ میں فاحشہ سے مراد زنا لیا ہے اور اس کے لئے چار عادل گواہ شرط قرار دیئے ہیں۔ اسی آیہ کریمہ کو بنیاد بنا کر ہماری فقہ میں بھی یہی قانون بنایا گیا ہے، اور اسی آیت کو اساس قرار دے کر حدود آرڈیننس میں بھی سزا کے لئے چار گواہوں کی گواہی شرط قرار دی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اس آیت کریمہ کا ارتکاب زنا سے کوئی تعلق ہی نہیں اس لئے ہمارے فقہ کا قانون ہی غلط ہے اس آیت کریمہ کو زنا کی سزا اور چار گواہوں کی شرط کی بنیاد بنانا غلط ہے اس آیت کا کوئی تعلق زنا کے فعل سے نہیں ہے۔اس کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) کسی بھی جرم کی ایک ہی سزا ہوسکتی ہے ایک ہی جرم کی دو مختلف سزائیں نہیں ہوسکتیں قرآن کریم نے سورۂ نور میں زنا کی سزا سو کوڑے فرمادی ہے لیکن یہاں فاحشہ کی سزا ''پابند مسکن'' کرنا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ زنا کا جرم نہیں ہوسکتا کیونکہ ایک جرم کی دو مختلف سزائیں یعنی کہیں کوڑے کہیں پابند مسکن نہیں ہوسکتیں۔بعض مفسرین نے اس آیت کو سورۂ نور میں زنا کی آیت سے منسوخ قرار دیا ہے۔لیکن نسخ کا عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے اس کے لئے ماہنامہ صوت الحق کے شمارے ملاحظہ فرمائیں یہ موضوع اس مضمون کی حدود سے باہر ہے اور اس قدر طویل ہے کہ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔لیکن حیرانی اس بات کی ہے کہ جو حضرات اس آیت کو سورۂ نور کی آیت سے منسوخ قرار دیتے ہیں وہ صرف سزا کو منسوخ کرتے ہیں لیکن چار گواہوں کی شرط کو منسوخ نہیں کرتے چنانچہ تدبر قرآن میں مرقوم ہے اگر چہ یہ تعزیرات سورۂ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہوگئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا (جلد 2 صفحہ 265) اسی طرح تفسیر حسینی میں بھی تحریر ہے ''پس بحکم ایں حدیث امساک بیوت منسوخ شد و اشہاد و استشہاد باقی ماند''

لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اول تو نسخ کا عقیدہ ہی خلاف قرآن ہے اور یہ کونسی تک ہے کہ آیت تو منسوخ ہوگئی لیکن اس کا ایک حصہ باقی رکھا سزا منسوخ اور گواہی کی شرط کو قائم رکھا شہادت کا ضابطہ منسوخ نہیں ہوا یاللعجب

(2) زنا کے ارتکاب کے لئے مرد اور عورت دونوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس آیت کریمہ میں صرف عورتوں کا ذکر ہے مرد کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔یہ کیسی زنا ہے جس میں مرد موجود نہیں اس کی وضاحت صرف ہمارے علما کرام ہی فرما سکتے ہیں۔حالانکہ اس سے بخوبی واضح ہے کہ

یہ فعل زنا کا ہو ہی نہیں سکتا۔

(3) أَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلاً سے جو یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ یہ وہ وعدہ ہے کہ جس کے مطابق سورۂ نور میں زنا کی سزا نازل کی گئی ہے۔تو یہ بات درست نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ سزا کا ذکر نہیں ہو سکتا اگر سزا کا ذکر ہوتا تو لہن کی جگہ علیھن آنا چاہیے تھا۔اس سے معلوم ہوا کہ سبیل بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ ان پر اعتبار قائم ہو جائے اور پھر ان کے باہر آنے جانے میں کوئی حرج باقی نہ رہے۔یہی بات قاعدے کی ہے۔

(4) اصل یہ ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے الفاحشہ کے لفظ سے لغزش کھائی ہے۔ اس آیت کریمہ میں الفاحشہ کا جو لفظ آیا ہے ہمارے علما نے زبردستی اس کا مفہوم زنا لیا ہے۔فاحشہ کے معنی صرف زنا نہیں ہوتے ہر بے حیائی کی بات اور ہر گناہ کو فاحشہ کہتے ہیں۔چنانچہ o وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ (3/135)o وہ لوگ کہ ان سے جب گناہ ہو جاتا ہے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد رکھ لیتے ہیں اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔فاحشہ کے معنی یہاں زنا نہیں ہے بلکہ محض گناہ کے ہیں جس کی تفسیر خود ذُنُوبِهِمْ کے لفظ نے کر دی ہے۔اسی طرح آیت نمبر (7/80) اور (27/54) میں یہ لفظ لواطت کے لئے آیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔o إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ o(7/81)o تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت پرستی میں مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو مگر تم لوگ (نطفہ کو) سرف کرنے والے ہو o۔اس آیت کریمہ کے الفاظ مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ نے خود وضاحت کر دی کہ یہاں اس کے معنی لواطت کے ہیں زنا کے ہو ہی نہیں سکتے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے فتح الرحمٰن میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ہر آئینہ شما مید وید بشہوت بسوی مردمان بجز زنانان بلکہ شما گروہ مسرفانید (صفحہ 339) نیز ارشاد ہوتا ہے۔o أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ (27/55)o کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کی طرف آتے ہو۔ان دو آیات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ فاحشہ کا اطلاق صرف زنا پر نہیں ہوتا بلکہ

فاحشہ کے معنی عام بے حیائی اور لواطت کے بھی ہیں۔

قرآن کریم میں فواحش کا لفظ بطور جمع بھی آیا ہے جو خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشہ صرف ایک زنا ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے بے حیائی کے کام فاحشہ کے ذیل میں آسکتے ہیں جب ہی تو اس کی جمع فواحش استعمال کی گئی ہے۔ اگر آپ اس زیر غور آیہ کریمہ 15 سے بالکل متصل اگلی آیت نمبر 16 سے ملا کر ملاحظہ فرمائیں تو بات سورج کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ یہاں فاحشہ سے مراد سحاقت (چپٹی باز عورت) ہے کیونکہ اس متصلاً آیت نمبر 16 میں لواطت کا بیان ہو رہا ہے اور اس کی سزا کا تذکرہ ہے یہ دونوں متصلاً آیت نمبر 15 اور 16 ہم جنس پرستی کے متعلق ہیں۔ پہلی آیت 15 میں سحاقت کا بیان ہے اور دوسری آیت 16 میں لواطت کا بیان ہے دونوں آیت کا تعلق ہم جنس پرستی سے ہے۔ متصلاً آیت کریمہ یہ ہے۔

o وَالَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِن تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا o(4/16)o اور تم لوگوں میں جن سے بدکاری سرزد ہوئی ہو ان کو مارو پیٹو پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو چھوڑ دو بے شک اللہ تواب ورحیم ہے o۔ اس آیت کا یہ بامحاورہ ترجمہ نقل کیا گیا ہے لیکن شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ جو مستند ترین ترجمہ اور تحت اللفظ ہے وہ اس بارے میں بڑا معنی خیز اور فیصلہ کن ہے۔ وہ فرماتے ہیں" اور جو دو کرنے والے کریں تم میں سے وہی کام تو ان کو ستاؤ پھر اگر وہ توبہ کریں اور سنوار پکڑیں تو پھر ان کا خیال چھوڑ دو اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے" شاہ صاحب محترم نے جو الَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ کا ترجمہ" وہی کام" فرمایا ہے اس سے بات بالکل واضح کر دی کیونکہ آپ نے هَا کا مرجع الفاحشہ قرار دیا ہے۔ چونکہ اس آیت نمبر 16 میں ذکر ہم جنس پرستی کا ہو رہا ہے اس لئے وہی کام کا مطلب زیر غور آیت 15 میں بھی ذکر ہم جنس پرستی کا ہوگا۔ زنا کا نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں بیان مردوں کی ہم جنس پرستی کا ہے اور سابقہ آیت میں عورتوں کی ہم جنس پرستی کا ہے۔ ان دونوں آیت میں کام کی نوعیت کا ایک جیسے ہونا لازمی ہے۔ جب ہی تو وہی کام کی شرط پوری ہوگی اور وہ ایک ہی نوعیت کا کام ہم جنس پرستی

ہے۔ یہ دونوں آیت۔ لواطت اور سحاقت سے متعلق ہیں اس کا زنا یا اس کی سزا سے کوئی تعلق نہیں ہے آیت کا مفہوم آپ نے ملاحظہ فرمایا حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ قاری کو با آسانی ان آیات کا مفہوم سمجھ میں آجائے کیونکہ آیات نہ تو کچھ پیچیدہ ہیں اور نہ ہی عربی قواعد اس میں زیادہ ہوتے ہیں وہ تمام اعتراضات جو علماء کی تفاسیر میں واقع ہوئے ہیں وہ اس مفہوم میں از خود رفع ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد آپ خود غور فرمالیں گے ہمارے فقہا کرام نے صرف ایک لفظ کی غلط تعبیر سے لغزش کھائی ہے اور لطف یہ ہے کہ سب فرقوں کا اس پر اتفاق ہے اور سب فرقوں کے فقہ میں یہی قوانین رائج ہیں۔ اس ایک کیس سے آپ اندازہ لگائیں کہ ہماری فقہ کا کتنا حصہ قرآن کریم کے خلاف ہوگا۔

جولائی 2005ء

ایک علمی سوال کا جواب

محترم المقام جناب عبدالخالق کھوکھر صاحب نے لندن سے رسالہ ''البلاغ'' کا ایک تراشہ ارسال فرمایا ہے۔ یہ رسالہ ساؤتھ افریقہ سے انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔تراشہ ذرا طویل ہے۔اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک محترمہ مسز زینب اسماعیل خان صاحبہ نے ڈربن سے یہ سوال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کا ہر کام عدل پر مبنی ہوتا ہے۔لیکن اس کے برخلاف عملی زندگی میں ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ یہاں ظالم آدمی عیش کر رہے ہیں بش اور شارون جو کہ برابر مظالم کا ارتکاب کر کے دنیا میں دندناتے پھر رہے ہیں لیکن بے گناہ لوگ سونامی کے حادثہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ان کا سوال یہ ہے کہ کیا سونامی کا واقعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجود میں آیا ہے؟

یہ سوال کوئی نیا نہیں بلکہ ہر غور و فکر کرنے والے شخص کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے جس کی ایک عجیب مثال مضمون کے آخری حصہ میں تحریر کی جائے گی۔

جو خوشیاں و تکالیف یا حوادث انسانوں کو پیش آتے ہیں آپ سمجھنے کی خاطر ان کو دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ایک تو وہ خوش بختیاں اور بد بختیاں ہیں جو معاشروں کے حق و باطل نظریات پر قائم ہیں۔دوسرے وہ قدرتی حادثات ہیں جن میں بے قصور لوگ مارے جاتے ہیں۔جہاں تک لوگوں کے ان مصائب و پریشانیوں کا تعلق ہے جن کا انحصار معاشروں پر ہوتا ہے اور جو اپنے ہی خود کردہ اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ان میں انسان آزاد ہوتا ہے اور ان کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔اس کا سارا دارومدار مکافات عمل پر ہوتا ہے۔جیسے اعمال اسی طرح کا نتیجہ۔اس میں کسی شخص کی استثنا نہیں

ہے۔ جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح بالکل سامنے تھی لیکن پہاڑی کے ناکے پر مقرر کردہ مجاہدین کے غلط فیصلے سے فتح مبدل بہ شکست ہوگئی۔۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ موقع پر موجود اس میں شامل تھے۔ خود حضورؐ کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔

o مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (4/79) o تجھے جب کوئی فائدہ پہنچے تو اللہ کی طرف سے ہے اور تجھے جب کوئی تکلیف پہنچے تو وہ خود تیری اپنی وجہ سے ہے۔ اس سے واضح اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ ایک شخص جب تعلیم حاصل کرتا ہے تو اسے اچھے معاشرے میں فوراً ملازمت مل جاتی ہے لیکن اگر معاشرہ خراب ہے تو سالہا سال غربت میں زندگی بسر کرنے کے بعد بھی مشکل سے ہی کوئی معقول ملازمت ہاتھ لگے گی۔ یہ مصیبت اسے صرف معاشرے کی خرابی کی وجہ سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔

برصغیر میں جب انگریز یہاں آئے اس وقت مسلمان بالکل زوال پذیر ہو چکے تھے جو انگریز یہاں آئے وہ کلایو کے ساتھ صرف دو سو کی تعداد میں تھے انہوں نے رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں کو آپس میں لڑا کر ہی ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ ہمارے ہاں عموماً یہ بات مروج ہے کہ یہ زوال ہندوستانیوں کے برے اعمال کی وجہ سے ہوا۔ برے اعمال سے مراد عموماً نماز نہ پڑھنا، روزے نہ رکھنا، اور بدچلنی سے ہوتی ہے۔ حالانکہ جو انگریز یہاں آئے تھے ان میں کوئی نماز کا پابند نہیں تھا اور سب اس قدر بدچلن تھے کہ یہاں کی ملازم عورتوں سے بدچلنی کرتے تھے۔ اصل وجہ ان کا اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ۔ ان کا ڈسپلن اور اس وقت کے جدید سے جدید اسلحہ سے لیس ہونا تھا۔

اسی طرح سوڈان میں وہاں کے باشندوں نے ایک عرصہ تک انگریز سے مقابلہ کیا اور جب مہدی سوڈانی کو کافی غلبہ حاصل ہوگیا تو ان کو ہٹانے کے لئے جنرل گارڈن اپنی فوج کے ساتھ آیا سخت معرکہ ہوا مہدی سوڈانی کے درویشوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن اس کے باوجود ہار گئے کیونکہ ان کے پاس صرف تلواریں اور نیزے تھے، جبکہ جنرل گارڈن کے پاس بندوقیں اور توپیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہدی سوڈانی کے دس ہزار درویش کام آئے اور جنرل گارڈن کے

کل (40) آدمی مارے گئے وجہ پھر وہی جدید ترین اسلحہ تھا۔

اس دنیا کا نظام سب قانون سے وابستہ ہے۔اللہ تعالیٰ کا جاری کردہ قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا۔قوانین الٰہی کے مطابق کام کرنا ہی تائید ایزدی کہلاتی ہے۔اللہ تعالیٰ براہ راست دنیاوی کاموں میں مداخلت نہیں کرتا، وہ جو بھی مداخلت کرتا ہے انسانوں کی معرفت ہی کرتا ہے۔ اس کی دو واضح مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔تاکہ بات واضح ہو جائے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (17/31) ہم تمھارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمھارے اولاد کے بھی۔دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔o وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6)o زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔لیکن ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ لاکھوں آدمی رات کو بھوکے سو جاتے ہیں۔جب کبھی بھی کوئی قحط پڑتا ہے تو لاکھوں آدمی اس میں مارے جاتے ہیں۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اپنا موجودہ وضع کردہ معاشی نظام جو لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا ہے وہ جاری کرتے ہیں اور توقعات یہ کرتے ہیں کہ اس باطل پر مبنی معاشی نظام سے وہ نتائج برآمد ہوں جو اللہ تعالیٰ کے معاشی نظام سے برآمد ہوتے ہیں اور جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔سورۃ یاسین میں ارشاد ہوتا ہے ۔o وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ (36/47)o جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اس کو غریبوں پر خرچ کرو تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگر اللہ ایسا ہی چاہتا ہے تو وہ انہیں خود کھلائے۔ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ (36/47) اس بات پر قرآن کریم اپنا محاکمہ فرماتا ہے۔إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ o(36/47) تم کس قدر گمراہی میں ہو o۔

اللہ خود براہ راست نہیں کھلایا کرتا۔یہ سب انتظام خود انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے۔یہ ساری ذمہ داریاں معاشرہ کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔اگر معاشرہ ضابطہ الٰہی کے مطابق متشکل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی یہ تمام ذمہ داریاں پوری ہو جاتی ہیں اور اس طرح انسان اپنے خود پیدا کردہ

مصائب ومشکلات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

دوسری مثال مکہ کے مظلومین کی دعا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی تھی کہ ان کے لئے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا o(4/75) تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی مددگار پیدا کر دے اور ہمارا کوئی ناصر و حامی بنا دےo۔ ان مظلومین کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ کی جماعت مومنین سے فرمایاo وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (4/75)o تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو (کفار کے پنجے سے چھڑانے) کے لئے جہاد نہیں کرتے جو (حالت مجبوری میں) اللہ سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال دے۔ چنانچہ ان مظلومین کی دعا کی قبولیت اس طرح ہوئی کہ انہیں مدینے کے مومنوں (انسانوں) کی معرفت ہی مکہ سے نکلوایا گیا۔

ان دو مثالوں سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے معاملات میں خود دخل اندازی نہیں کرتا کہ کسی کی جانبداری اور کسی سے بے رخی کرے۔ جو شخص قانون الٰہی کے مطابق کام کرے گا اس کو اس کے مطابق صلہ ملے گا دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (6/132) یہ جو قرآن کریم میں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (3/26) تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے تو یہ بھی بغیر قانون الٰہی کے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ تیرے قانون کے مطابق عزت اور غلبہ حاصل ہوتا ہے اور تیرے قانون کے مطابق ذلت اور رسوائی ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی ہر شخص پر لازم ہے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق کام کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ وہ نتائج حاصل کریں جو اللہ تعالیٰ کے قوانین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

قوانین الٰہی کے مطابق عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے جو کشتی دریا کے

بہاؤ کے ساتھ چلتی ہے چونکہ وہ قوانین کے مطابق نشیب کی طرف جاری ہے اس لئے اسے تائید ایزدی حاصل ہوتی ہے۔ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔ o وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (45/22) o اللہ تعالیٰ نے سارے آسمان اور زمینوں کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس لئے یہاں وہی معاشرہ پائیداری کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے جو حق پر قائم ہوگا۔ ہر وہ معاشرہ جو باطل پر استوار ہوگا وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ باطل پر قائم شدہ معاشرہ کی مثال اس کشتی کے مطابق ہے جو دریا کے بہاؤ کے خلاف جارہی ہو۔ کائنات حق کے مطابق چل رہی ہے اس لئے یہاں باطل پر مبنی نظام چل ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک اس دنیا میں طبعی آفات وحوادث کا تعلق ہے تو یہ کسی قانون الٰہی کے مطابق ہی آتے ہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس قانون کی لم اور وجہ معلوم کر لی جائے۔ تو ان کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے نیز یہ کہ سائنس کی ترقی سے اب انسان ان حوادث پر قابو پا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے نقصانات سے تو یقیناً کافی حد تک محفوظ رہ سکتا ہے زلزلہ وطوفان کے واقع ہونے سے پیشتر اگر ان کا علم ہو جائے تو ان کے نقصانات سے محفوظ ہونے کی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان حادثات کا سبب صرف قدرتی اور Natural ہوتا ہے۔ نہ تو یہ کسی کے دم درود سے آتے ہیں نہ ان سے انسان کے اعمال کا تعلق ہوتا ہے Tsunami کا حادثہ بھی ایک طبعی حادثہ تھا اس کا انسانوں کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ ایسے حادثات بھی ہوتے ہیں جن میں قدرت کا کوئی دخل نہیں ہوتا وہ صرف انسانوں کے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ تو اس صورت میں یقیناً انسان ہی اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر دریا کے بند باندھے ہوتے۔ سیمنٹ کی جگہ ریت استعمال کی جائے یا راوی کا پُل بناتے ہوئے سستا میٹریل استعمال کیا جائے تو ظاہر ہے کہ سیلاب کی وجہ سے پُل ٹوٹ جائے گا اور اس کی ذمہ داری اس بد دیانت لوگوں پر ہوگی جنہوں نے غلط میٹریل استعمال کیا۔ اس طرح کے نقصانات اور مصائب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کے اپنے خود کردہ اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ یہ مصائب باہر سے نہیں آئے ہوتے۔ بلکہ خود پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ سوال کے

آخر میں جو آیت کریمہ نقل کی گئی ہے۔o مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (64/11) اس کا ترجمہ تحریر کیا گیا ہے۔

No Calamity Befalls But By Allah's Permission

تو ہمارے ہاں عموماً یہی ترجمہ کیا جاتا ہے اس میں اذن کا ترجمہ حکم یا اجازت دیا ہوا ہے اذن کے معنی حکم اور اجازت بھی ہے اور قانون بھی۔ قرآن کریم نے اذن کا لفظ قانون کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔o وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (7/58)o اور جو عمدہ زمین ہے اس کی نباتات اللہ کے اذن (یعنی قانون) کے ساتھ عمدہ اور تندرست پیدا ہوتی ہے اور جو خبیث یعنی ناقص زمین ہے اس میں سے اللہ کے اذن یعنی قانون سے ناقص پیداوار ہوتی ہے۔

ان آیت کریمات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے عمدہ زمین سے عمدہ پیداوار نکلی اور ناقص زمین سے ناقص پیداوار ہوتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون جاریہ ہے جس کے لئے اذن کا لفظ لایا گیا ہے۔ بس ثابت ہوا کہ خود قرآنی لغت کی رو سے اذن بمعنی قانون بھی آتا ہے۔ اس طرح سورۂ حج میں ارشاد ہوتا ہے وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَن تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (22/65) وہ بادلوں اور بارشوں کو تھامے رکھتا ہے کہ اس اذن کے بغیر زمین پر نہ گرے۔ یہاں بھی اذن سے مراد قانون الٰہی ہے۔ جس کے مطابق مینہ برستا ہے۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے o وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (3/145)o اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہر ذی حیات کی موت اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ آیت کریمہ جو مستفسرہ محترمہ مسز زینب اسماعیل خان صاحب نے اپنے خیال کی تائید میں تحریر فرمائی ہے وہ اس سلسلہ میں درست نہیں ہے۔ اس آیت کریمہ سے تو یہ مستفاد ہوتا ہے کہ جو مصیبت بھی کسی شخص کو پیش آتی ہے وہ قانون الٰہی کے مطابق ہوتی ہے وہ مصیبت کسی

قانون کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے بغیر کسی قانون کے کوئی مصیبت درپیش نہیں ہو سکتی۔ شروع میں تحریر کیا گیا تھا کہ یہ عام اعتراض کہ اللہ تعالیٰ عادل بھی ہے اور رحیم بھی ہے لیکن اس کے باوجود دنیا میں اس قدر مصائب انسانوں کو درپیش ہیں۔ یہ ایسا عام اعتراض ہے کہ اس کی مثال مضمون کے آخیر میں دی جائے گی۔ اس موعودہ مثال کے سلسلہ میں کہ راقم سطور کمترین نے جب بی اے کیا تو اس کے بعد گورنمنٹ کالج سے ایم اے فلسفہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اس وقت کے استاد پروفیسر سی اے قادر نے مجھے ایک نوجوان شخص سے متعارف کرایا۔ اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ مجھے داخلہ ملنے سے قبل فلسفہ کی مزید تیاری کرادیں۔ ان صاحب کا نام مجھے یاد نہیں ان کا سرنیم نیازی تھا مجھ سے تقریباً چند سال بڑے تقریباً ۲۵ سال کے ہوں گے۔ بہت خوش اخلاق تھے انہوں نے اسی سال ایم اے کیا تھا۔ نظریاتی طور پر اللہ و رسول کے منکر اور اس انکار کی وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے عادل اور رحیم ہونے کے باوجود انسان اس قدر مصائب میں گھرا ہوا ہے اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں نے اگرچہ ان کو جواب تو نہیں دیا لیکن میں اس بات پر بڑا حیران ہوا کہ اس قدر تعلیم یافتہ شخص صرف اتنی سی دینی لغزش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور رسول کا منکر ہو گیا ہے؟ اگر ان صاحب کے سامنے ذرا سی بھی قرآنی تعلیم ہوتی، یا قرآن کا کوئی طالب علم ان کو اتنی سی بات سمجھا دیتا جو اس کمترین نے اس مضمون میں درج کی ہے تو وہ گمراہی کے راستے پر نہ جاتے۔ میں تو کسی وجہ سے فلسفہ کے شعبہ میں داخلہ نہیں لے سکا لیکن مجھے اس بات کا آج تک ملال ہے کہ میں نے ان کو یہ بات خود کیوں نہ سمجھا دی جبکہ یہ بات میرے ذہن میں اس وقت بھی تھی۔ میں ان کی خوش اخلاقی سے اس درجہ متاثر تھا اور کچھ وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے اس لئے یہ ادب مانع رہا۔ لیکن میرے ذہن پر اب تک اس واقعہ کا تاثر ہے۔ افسوس کہ میری ملاقات ان سے پھر کبھی نہ ہو سکی۔ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (10/10)

ماہ اگست 2005ء

اخبار ڈیلی ٹائمز کے تراشہ پر تبصرہ

روزنامہ ڈیلی ٹائمز انگریزی کا مشہور اخبار ہے اس میں ایک مضمون Red Alert Across The West کے نام سے 10 جولائی کی اشاعت میں طبع ہوا ہے جو محترم خالد حسن صاحب کا تحریر کردہ ہے خالد حسن صاحب معروف جرنلسٹ ہیں ۔عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں اور وہاں سے ہی مضمون تحریر فرماتے ہیں ۔ان کا ای میل اڈریس ہے Khasan2@cox.net۔

مورخہ 7 جولائی کو لندن میں بم دھماکے ہوئے تھے۔ یہ مضمون ان بم دھماکوں سے متاثر ہو کر ہی تحریر کیا گیا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے ان دھماکوں کی مذمت کی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کو اس کی مذمت کرنی چاہئے۔خالد حسن صاحب نے مسلمانوں کے لئے جو علاج تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ صوفی ہو جائیں کیونکہ صوفی امن پسند ہوتے ہیں اور اس طرح سے مسلمانوں میں تشدد کا رجحان کم ہو جائے گا۔مضمون میں اور باتیں بھی شامل ہیں لیکن اصل بات اور ملخص یہی ہے۔اس بارے میں جو پیراگراف انہوں نے تحریر فرمائے ہیں صرف ان کا آزاد ترجمہ Rendering ملاحظہ فرمائیں اور غور فرمائیں کہ انسان خواہ کسی درجہ بھی عالم فاضل ہو جائے وہ وقتی حادثات سے کس طرح متاثر ہوتا ہے اور اس کے بعد مضمون ''تصوف کا دین میں مقام'' ملاحظہ فرمائیں۔

ترجمہ: مسلمانوں کو آج صوفیوں کے اسلام پر عمل کرنا چاہئے جس کی اساس رواداری اور عالمگیر برادری پر ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کرام کی یہی تحریکات تھیں جنہوں نے اسلام کو عوام تک

پہنچایا تھا۔ جن میں نمایاں چشتی اور قادری سلسلے تھے۔ ان سلسلوں نے نہ صرف عدل ومحبت کو ترقی دی بلکہ انہوں نے آرٹ اور زبان کے مراکز کو بھی مضبوط کیا۔

صوفی طریقہ کو اس کے مخالفین کفر (کا طریقہ) سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر خواجہ فرید کا عقیدہ تھا کہ آدمؑ ہندو تھے۔ ان کے متبعین میں ایک فرقہ تھا جس کا نام Chajoos تھا جو حضرت محمدؐ اور کرشنا کو دونوں کو رسول مانتے تھے بہت سے صوفی یقین رکھتے ہیں کہ افلاطون اور ارسطو (Seer) غیب دان اور عالم تھے۔ جن کو آخرت میں بہترین اجر ملیں گے۔

تصوف کا دین میں مقام: ہمارے ہاں بھی کوئی علمی یا مذہبی گفتگو ہوتی ہے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز اسلام کے مطابق ہے یا فلاں چیز اسلام کے خلاف ہے اور اس کے بعد گفتگو چلتی رہتی ہے مثال کے طور پر عموماً کچھ حضرات کہتے ہیں کہ اسلام میں موسیقی جائز ہے اور کچھ حضرات اس کے برخلاف یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں موسیقی ناجائز ہے۔ اس طرح ایک طویل گفتگو چلتی رہتی ہے کیونکہ اسلام خود Defined نہیں ہے اور ہر شخص کے اسلام کا تصور مختلف ہے۔ اس کے لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ہر شخص کو واضح طور پر یہ بات کہنی چاہئے کہ موسیقی قرآن کریم کی رُو سے جائز ہے یا ناجائز ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ موسیقی ناجائز ہے۔ اس سے سننے والا یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنی رائے کے لئے قرآن کریم کی آیت بطور سند پیش کرے۔ قرآن کریم کے نسخے سب کے پاس موجود ہیں۔ یہی 6666 آیات سب کے سامنے ہیں۔ جو شخص کسی چیز کے لئے حرام یا حلال کا نقطہ نظر بیان کرتا ہے اس چاہئے کہ اپنے نقطہ نظر کی تائید وسند میں آیت کریمہ پیش کردے اس ہر بات کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ موسیقی کا مسئلہ صرف مثال کے طور پر تحریر کیا گیا ہے ورنہ اگر تمام امور میں یہ رویہ اختیار کیا جائے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

جہاں تک تصوف کا معاملہ ہے۔ اس کے متعلق بھی ہمارا یہی رویہ رہا ہے کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ تصوف اسلام کے خلاف ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ تصوف اسلام کے عین مطابق ہے۔ تصوف کے بارے میں دو چند دقت پیش آتی ہے کیونکہ دوسرے مسائل میں تو صرف اسلام کا تصور

ہی مختلف تھا اس میں دونوں چیزیں مبہم ہیں۔تصوف خود ایک مبہم لفظ ہے اور اس کی بے شمار تعریفیں (Definitions) ہیں۔اس لئے بات اور بھی اُلجھ جاتی ہے کہ آیا تصوف اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔اس کا علاج یہی ہے کہ تصوف کو قرآن کریم کی میزان میں تولا جائے کہ تصوف قرآن کریم کے نقطہ نگاہ سے کہاں کھڑا ہے اور تصوف کی مختلف تعریفات کو نظر انداز کر کے اس کے بنیادی نظریات کو ہی پیش نظر رکھا جائے اور ان کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔

تصوف کی فکری و علمی اساسات یہ ہیں:

(1) کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ سب دھوکا اور سراب ہے۔

(2) حواس خمسہ کے ذریعہ جو علوم انسان حاصل کرتا ہے وہ نا قابل بھروسہ ہے۔قابل بھروسہ صرف وہ علم ہے جو ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست حاصل ہو سکتا ہے۔

(3) تصوف میں تمام عبادات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو سکے۔

تمام صوفی مفکرین اور خصوصاً شعراء نے یہی پیغام عام کیا کہ کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔وہ خارجی یا محسوس کائنات کو فریب نظر یا دھوکا قرار دیتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ دنیائے محسوسات در حقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ حقیقی دنیا عالم امثال World Of Ideas کی ہے۔جو کہیں عالم بالا میں واقع ہے اور یہ ہماری خارجی کائنات اس دنیا کا محض ایک سایہ ہے۔اس نقطہ نظر کے مطابق کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا کائنات کے متعلق بالکل منفیانہ انداز نگاہ بن جاتا ہے۔یہی تصوف کی بنیاد ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔وہ یہی سمجھتے ہیں کہ چونکہ اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔اس لئے یہ محض فریب ہے تخیل ہے سراب ہے سایہ ہے وہم و گمان ہے اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی در حقیقت علم نہیں ہے ظن و گمان ہے۔اس طرح کے نظریات کے حامل لوگ جب ایسے منفیانہ نظریات رکھیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ تسخیر کائنات میں بھی عملاً کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ان کے ہاں سائنس کی معلومات اور سائنس کی کامیابیوں

Achivements کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ حد درجہ اس سے منکر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کوہ پیما اور رسٹ کی چوٹیوں پر گئے یا جب چاند تک سائنس دان پہنچ گئے تو ہمارے ہاں ان کی تعریف کرنے کے بجائے مذہبی حضرات نے اس کوشک وظن کی نگاہ سے ہی دیکھا تھا اور کسی قسم کی کوئی تحسین وتبریک نہیں کی۔ یہ سب کچھ کائنات کے وجود کو حقیقی وجود نہ ماننے کی وجہ سے ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم سائنس کی ترقی میں سب سے پیچھے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا ارشاد عالی ہےo وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (38/27)o ہم نے آسمان زمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان واقع ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ فی الحقیقت موجود ہیں اور ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا (38/27) یہ عقیدہ کہ یہ کائنات باطل ہے یہ کافروں کا عقیدہ ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِo (38/27) جو لوگ دوزخ کے منکر ہیں ان پر افسوس ہےo۔

اس آیت کریمہ میں یہ بات غور طلب ہے کہ ان لوگوں کو جو کائنات کو باطل قرار دیتے ہوں اور اس کے بارے میں اس درجہ منفیانہ نقطہ نظر رکھتے ہوں قرآن کریم ان کو کافر کہہ کر پکارتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کفر و ایمان کی حدیں کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں۔ یہ بات کہ کائنات کا حقیقی وجود ہے اور یہ محض سراب نہیں ہے اس بات کو قرآن کریم اب مثبت انداز میں اس طرح بیان فرماتا ہے۔o خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ o(29/44)o اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس انکشاف حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے مومنین کے لئے بڑی نشانی ہےo۔ ان دونوں آیات کریمات کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ سابقہ آیت نمبر (38/27) میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا ہے اور آیت زیر غور نمبر (29/44) میں اسے برحق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح تصریف آیات سے قرآن کریم نے اپنے نقطہ نگاہ کو خوب خوب واضح کر دیا ہے کہ یہ کائنات حقیقت میں وجود رکھتی ہے۔

تصوف کا دوسرا اساسی و متفق علیہ نقطہ نگاہ یہ ہے کہ حواس خمسہ کے ذریعہ جو علوم انسان حاصل کرتا ہے وہ قطعاً ناقابل اعتماد ہیں۔ ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اصل یہ ہے کہ تصوف کے نزدیک اس کائنات کا جو ہمیں اس طرح محسوس دکھائی دے رہی ہے اپنا وجود ہی نہیں ہے اور وہ حقیقی کائنات عالم امثال کو شمار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کائنات کے متعلق جو علم حواس کے ذریعے ہوتا ہے اس کو بھی قابل اعتماد نہیں گردانتا۔ اس (تصوف) کے نزدیک یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں بند کر کے مراقبوں و مکاشفوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا روم کے اشعار حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود　　　پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

گر با استدلال کار دین بدے　　　فخر رازی راز دار دین بدے

لیکن اس کے برعکس ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ علم حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسائل حاضرہ پر غور خوض کیا جاتا ہے۔ دوسروں کے افکار و نظریات کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ کتابوں کے ذریعے بھی اور بالمواجہ بھی۔ فطرت کا مشاہدہ تجربات کے ذریعے حقائق کی تہہ تک پہنچنا سابقہ اقوام کے تجربات جو تاریخ کی کتب میں مرقوم ہیں۔ یہی وہ وسائط و ذرائع ہیں جن کی رو سے فراہم کردہ معلومات پر انسان غور و فکر کر کے نئے نئے نتائج حاصل کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کر کے بھی علوم میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ جو شخص جس قدر محنت کرے گا اسی قدر علوم اس کو حاصل ہوں گے۔ قرآن کریم نے بھی اس کی تائید فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے o وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَـٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا o (17/36) o اور جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو (خواہ مخواہ) اس کے پیچھے نہ پڑا کرو کیونکہ کان آنکھ اور دل ان سب سے یقیناً باز پرس ہوتی ہے o قرآن کریم نے اس آیت کریمہ میں خود ہی علم کی تعریف Definition کردی ہے کہ علم وہ نہیں ہے جو مراقبوں اور مکاشفوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ علم وہ ہے جو سماعت بصارت اور فواد سے حاصل ہوتا ہے۔ انسانی حواس معلومات

فراہم کرتے ہیں اور فواد (Mind) ان حاصل کردہ معلومات سے نتائج نکالتا ہے قرآن کریم نے علم کی جو تعریف کی ہے اس میں سمع وبصر اور فواد کی شہادت لازمی قرار دی گئی ہے۔ کسی اور طریقہ سے حاصل کردہ علم جس میں یہ تینوں شہادات موجود نہ ہوں۔ قرآن کریم کی تعریف کے مطابق وہ علم ہی نہیں ہوتا۔ اس بات سے آپ خود اندازہ فرمالیں کہ قرآن کریم علم حاصل کرنے کے لئے ان حواس کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دوسری اہم چیز ہے جو تصوف کے خلاف جاتی ہے۔ تصوف کہتا ہے کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ قرآن کریم اس کے بالکل برخلاف یہ کہتا ہے کہ جس بات کی شہادت سمع وبصر وفواد نہ دیں وہ بات علم پر مبنی نہیں ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ تصوف میں ساری عبادات اور محنت شاقہ کا ماحصل یہ ہے کہ اس طرح انسان اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوسکتا ہے۔

یہ نظریہ بھی قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کا سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہر قریہ اور ہر ہر بستی میں انبیاء کرام تشریف لاتے رہے اور انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے مالا مال کرتے رہے تا آنکہ یہ سلسلہ حضور صلی علیہ السلام پر ختم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آنی تھی وہ حضورؐ پر ختم کر دی گئی اسی کے معنی ختم نبوت کے ہیں۔ اس آخری وحی کو قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ سبحانہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ o وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ o(6/115)o اور سچائی اور انصاف میں تو تمہارے پروردگار کی بات پوری ہوگئی، کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں اور وہی بڑا سننے والا واقف کار ہے o۔ ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی کھلی تردید وتغلیط ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل ہونے کا نام وحی ہے۔ اور وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے اس لئے تصوف کا یہ عقیدہ کہ اب ختم نبوت کے بعد بھی اولیاء اللہ یا عبادت گذاروں کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم ملتا ہے سراسر قرآن کریم کے

خلاف ہے۔

اولیاء اللہ کا لفظ قرآن کریم میں بے شک متعدد بار آیا ہے۔ لیکن جس طرح تصوف میں اس کا تصور ہے وہ بالکل قرآن کریم کے خلاف ہے۔ تصوف کی رُو سے اولیاء اللہ کا ایک الگ گروہ مانا جاتا ہے جن کی پہچان یہ ہے کہ یہ دنیا سے الگ رہتے ہیں۔ یہ دنیا دنیاداروں کی ہے اور اولیاء اللہ کی دنیا روحانی دنیا ہے۔ اللہ والے اس دنیا میں غریب محتاج بیکس خستہ خراب رہتے ہیں۔ پھٹے کپڑے شکستہ مکان ایک کشکول ان کی زندگی کا سارا متاع۔ بعض لوگ ان کو بڑا پہنچا ہوا بھی کہتے ہیں اور اس سے غالباً مراد یہ کہ ان حضرات کی رسائی اور پہنچ اللہ تعالیٰ تک ہے۔

بعض احادیث میں ہے کہ اولیاء اللہ وہ ہیں کہ جن کی خاموشی ذکر عبرت گویائی حکمت اور رفتار برکت ہے۔ اگر ان کی موت کا معین وقت نہ ہوتا تو عذاب کے اور ثواب کے شوق میں ان کی روح ان کے بدن سے نکل جاتی۔ وہ فرائض کے پابند، سنتوں کے عامل، حرام سے پرہیزگار اللہ تعالیٰ کی اچھی چیزوں کے راغب ہیں۔ حلال روزی حاصل کرتے ہیں۔ فخر کے پاس نہیں جاتے۔ مال کو اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ رات کی بے خوابی سے ان کی آنکھوں سے پانی ٹپکتا ہے اور عبرت سے ان کے چہرے زرد ہیں۔ بھوک سے ان کی آنکھیں خشک ہوگئی ہیں۔ پیاس سے ان کے لب سوکھ کر سیاہ ہوگئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کے رُتبے دیکھ کر انبیاء اور شہدا رشک کریں گے (حاشیہ ترجمہ قرآن کریم مولوی فرمان علی بحوالہ زیرغور آیت)

لیکن قرآن کریم کی رُو سے سب مومنین ہی اولیاء اللہ ہیں۔ اولیاء اللہ مومنین و متقین کا ہی دوسرا نام ہے۔ اور اس کی وضاحت خود آیت کریمہ نے کردی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔o اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ o(10/62.63)o آگاہ رہو اس میں شک نہیں کہ دوستان اللہ پر نہ خوف ہوگا اور نہ حزن o یہ وہ لوگ ہے ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا o۔ آیت کے دوسرے حصہ نے پہلے حصہ کی وضاحت کردی کہ ہر وہ شخص جو ایمان اور اس نے تقویٰ اختیار کیا وہی ولی اللہ ہے

پھر سورۃ ممتحنہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لا تَتَّخِذُوا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ أَوْلِیَاءَ (60/1) اے ایمان والوں میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔o وَأَعِدُّوا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ (8/60)o اے ایمان والو کفار (کے مقابلہ) کے لئے جہاں تک تم سے ہو سکے زور اور بندھے ہوئے گھوڑے مہیا کرو اور اس قوت کے ذریعہ اپنے اور اللہ کے دشمن کو ڈراؤ۔ ان دونوں آیات کریمات میں اللہ تعالیٰ کے دشمن کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کو زمین پر نافذ نہ ہونے دیں۔ جو اسلامی حکومت کو اول تو قائم ہی نہ ہونے دیں اور اگر ان کے علی الرغم یہ حکومت قائم ہو جائے تو اس کے خلاف ریشہ دوانیاں اور رخنہ اندازی کرتے رہیں۔ عدو کا جب مفہوم واضح ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ولی اللہ وہ شخص ہو گا جو اسلامی حکومت کے قیام کے لئے حد درجہ کوشش کرے اور اس کی مضبوطی و سلامتی کے لئے پوری جدوجہد کرتا رہے گا۔ قرآن کریم کی رو سے اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کے دست و باز بنے رہیں اور اسلامی حکومت کو سب خطرات سے محفوظ رکھیں۔

ہمارے ہاں عموماً یہی تصور ہے کہ ہندوستان میں جو اسلام کی اس درجہ نشر و اشاعت ہوئی ہے اس میں صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے دور میں صوفیاء کرام کا بہت اقتدار تھا اور ان کا بادشاہوں پر بہت اثر تھا۔ بادشاہ چونکہ توہم پرست ہوتے تھے اس لئے وہ بھی صوفیاء کرام سے ہر وقت دعا و درود کے طلب گار رہتے تھے۔ بادشاہ جب بھی کسی جنگی محاذ پر روانہ ہوتے تھے تو ان ہی حضرات سے جنگ میں کامیاب ہونے کی دعائیں لے کر روانہ ہوتے تھے۔ مگر ان صوفیاء حضرات کا یہ کردار تھا کہ انہوں نے بادشاہوں پر اس قدر اثر رکھنے کے باوجود کبھی کسی بادشاہ کو یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے پر آمادہ نہیں کیا۔ اگر ہندوستان میں اس دور کے بادشاہ اسلامی حکومت قائم کر دیتے تو یہاں کے تمام لوگ اس نظام کی برکات اپنی آنکھوں سے

دیکھ کر خود مسلمان ہو جاتے۔لیکن صوفیائے کرام یہ کچھ اس وجہ سے نہیں کر سکے کہ ان کے سامنے تو خود دین کا تصور نہیں تھا۔وہ تو خود ہی مذہب میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اُن کا مقام اور ان کی اہمیت کو پیش نظر رکھیں۔پھر ان کی تصانیف و کتب ملاحظہ فرمائیں۔ پڑھنے والا تحیر واستعجاب کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے کہ کیا کہے۔کیونکہ کتابوں سے ہی مصنف کی علمی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ کہ وہ اس بلند مقام پر ہونے کے بعد دنیاوی امور کو کیا اہمیت دیتے تھے اس بات کا اس واقعہ سے اندازہ فرمائیں جو اخبار الاخبار میں درج ہے۔اس میں تحریر ہے کہ پانی پت کے مشہور بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر ایک روز ایک دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اُنہیں معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاء ان سے ملنے کے لئے شیر پر بیٹھے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔قلندر صاحب جس دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اسی کو حکم دیا کہ وہ دیوار بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے استقبال کے لئے چلے اس حکم کو سنتے ہی وہ دیوار کچھ دور قلندر صاحب کو لے کر حضرت نظام الدین کے استقبال کو آگے بڑھی۔دونوں حضرات کی ملاقات ہوئی۔کچھ دیر دونوں حضرات ساتھ رہے اور جس اہم ''مسئلہ'' پر گفتگو ہوئی اس کے لئے اخبار الاخبار میں تحریر ہے کہ حضرت نظام الدین نے قلندر صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ اُن کی داڑھی زیادہ لمبی اور غیر تراشیدہ ہے۔اُنہیں چاہئے کہ وہ اس کو ایک قبضہ کی کر دیں تاکہ ان کی داڑھی شرع شریف کے مطابق ہو جائے۔اور اس ''اہم مشورہ'' کے بعد حضرت نظام الدین واپس دہلی تشریف لے آئے وہ دیوار اب بھی پانی پت میں موجود ہے۔ان کے عقیدت مند حضرات باہر سے آنے والے زائرین کو وہ دیوار دکھایا کرتے تھے۔راقم سطور کمترین کو بھی یہ 'فضیلت' حاصل ہے کہ ان گناہ گار آنکھوں نے اس دیوار کی زیارت کی تھی۔

جن حضرات کا یہ مبلغ علم ہو اور امور پیش نظر ہوں اور مذہب میں سرتاپا غرق ہوں وہ اسلامی حکومت یا دین کا کیا مشورہ دے سکتے تھے۔حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کا فارسی دیوان طبع شدہ ہے۔جو غالباً اب نایاب ہے۔اس فارسی دیوان میں ان کے یہ مشہور اشعار بھی درج ہیں۔

جس نظم کا مطلع ہے۔

حیدر یم قلندر مستم بندۂ مرتضیٰ علی ہستم

اس ہی نظم میں چند شعر بعد ایک یہ شعر بھی درج ہے۔

من غیراز علی نہ دانستم ـــــ علی اللہ از ازل گفتم

(العیاذ باللہ) آپ خود غور فرمائیں کہ جب وہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو ہی اللہ گردانتے ہیں تو ان سے اسلامی حکومت کے قیام کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ مرتبہ و مقام میں ان سے کچھ فروتر حضرت شمس تبریزی تھے ان صاحب کی بھی ایک بہت مشہور اور بہت طویل نظم ہے جس کی ردیف ''مقصود علی بود'' ہے۔ اس نظم کے چند اشعار برف خانہ گوالمنڈی لاہور کی ایک مسجد کے باہر ایک دیوار سے چسپاں سیاہ تختہ پر تحریر تھے۔ ان میں ایک شعر یہ بھی شامل ہے اس کو پڑھیے اور سر دھنیے۔

جبرئیل چونکہ آمد ز پس خالق بے چوں در پیش محمد شد و مقصود علی بود

(استغفراللہ) اصل یہ ہے کہ تصوف کا سارا لٹریچر تمثیلات تشبیہات محاکات الفاظ کے گورکھ دھندے سے بھرا پڑا ہے۔ ساری عمر اس کے مطالعہ میں بسر کردیں تب بھی ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ بیشتر صوفیاء کرام وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ جس کے داعی فارسی کے بیشتر شعراء اور ہمارے ہاں غالب اور بیدل ہیں۔ عربی میں ابن الفارض کا دیوان ان ہی اشعار پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی وحدت الشہود کے قائل تھے۔ ان دونوں کی تطبیق شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمائی آپ یہ سارا لٹریچر ملاحظہ فرمائیں اس دنیا سے متعلق اور اس دنیا کے مسائل سے متعلق اس میں ایک بات بھی نہیں ہے مسلمانوں کو تھپکیاں دے دے کر سلانے والا لٹریچر۔ قرآن کریم کی تعلیم سے دور کا بھی سروکار نہیں۔ یہ سارا لٹریچر اس شخص پر رعب ڈالتا ہے جس نے اس کا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ اگر تھوڑی سی محنت کر کے اور یہ سمجھ کر کہ اس کے مطالعہ سے صرف وقت ضائع کرنا ہے اس کا مطالعہ کرلیا جائے تو اس سارے لٹریچر کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اس میں تو ایک بات بھی کام کی نہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب فلسفہ کی دنیا میں معروف شخصیت تھے ان کی ایک مشہور

کتاب ''فلسفہ تصوف'' ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدرآباد میں شعبہ فلسفہ کے چیئر مین Chairman بہت عرصہ رہے ہیں چونکہ یہ کتاب بہت مشہور سمجھی جاتی تھی راقم السطور کمترین نے یہ کتاب محترم پرویز صاحب مرحوم کو فراہم کی۔ انہوں نے اس کا مطالعہ فرمایا اور اس کا ایک باب اس درجہ بے معنی تھا اور اس میں کچھ نقوش بنے ہوئے تھے کہ وہ باب ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ چونکہ بہت بڑے عالم تھے اور انہیں خود پر بھروسہ تھا انہوں نے وہ پورا باب طلوع اسلام میں شائع کیا اور یہ تحریر فرمایا کہ یہ باب ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا اگر کوئی صاحب اس کا مطلب سمجھ سکتے ہوں تو طلوع اسلام کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں۔ لیکن کسی صاحب نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ پرویز صاحب خود عالم تھے اور انہیں اپنے آپ پر بھروسہ تھا اس لئے انہوں نے یہ جرات کی۔ کم تعلیم یافتہ آدمی یہ نہ کرتا اور یہی سمجھتا کہ وہ خود اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ تصوف کے بیشتر لٹریچر کا یہی حال ہے ڈاکٹر ولی الدین معمولی شخصیت نہیں تھے۔ فلسفہ میں ڈاکٹر، تصوف سے ساری عمر شغل شعبہ فلسفہ کے انچارج، اور تحریر میں یہ اغلام وابہام اور بے معنویت، گزشتہ دور میں ہمارے ہاں جو علماء تصوف کے خلاف گذرے ہیں انہوں نے بھی اسی طرح کے دلائل تصوف کے خلاف پیش کئے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے ایک کتاب فی الابطال وحدۃ الوجود تحریر فرمائی تھی۔ ان کے ہی عظیم شاگرد امام ابن قیم اور محمد بن عبدالوہاب نے بھی وحدت الوجود کے خلاف کافی تحریر کیا ہے۔ لیکن تصوف کے خلاف اب تک ایک ہزار سال میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے یہ سب کچھ مذہب کی سطح پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو دلیل قاطعہ تصوف کے بت کو پاش پاش کرتی ہے وہ قرآن کریم کو بطور دین اختیار کرنے کا عقیدہ ہے۔ جس کے سامنے تصوف ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

نزول قرآن سے پیشتر بھی اور اس کے بعد آج تک پوری انسانیت میں عبادت واطاعت الٰہی کا تصور انفرادی رہا ہے۔ ہر شخص فرداً فرداً براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرسکتا ہے یہ قرآن کریم واحد تنہا، بے مثل کتاب اسی وجہ سے ہے کہ یہ پہلی اور آخری کتاب ہے جس نے

اطاعت الٰہی کے طریقے کو بالکل بدل دیا اور اطاعت الٰہی کو اجتماعی قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس نظام کے ذریعے ہوتی ہے جس میں قرآن کریم کے احکامات نافذ ہوتے ہیں۔ اطاعت الٰہی کا واحد ذریعہ اس کا نظام ہے صرف اس کے نظام کی معرفت ہی اس کی اطاعت ہوتی ہے۔ صدر اول میں اطاعت الٰہی کا یہی طریقہ تھا اور اسی کے ذریعے سے انہوں نے اطاعت الٰہی کی تھی۔ افسوس کہ ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے وہ نظام ٹوٹ گیا۔ لیکن جو بات زیادہ افسوس ناک اور رنج و غم کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اطاعت الٰہی کے متعلق نظریہ ہی بدل گیا اور نظام کی جگہ انفرادی اطاعت نے لے لی۔ لیکن مسلمان ہزار بھی انفرادی اطاعت کریں قرآن کریم کا واضح اعلان ہے جو سونے کے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوتی اس کی اطاعت اس کے نظام کی معرفت ہوتی ہے۔ اس موضوع پر 'صوت الحق' میں کئی مرتبہ تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مو ضوع اس قدر اہم ہے کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کا انحصار اسی پر ہے اس لئے تجدید یاداشت کے لئے اس کو ایک نئے پیرا میں تحریر کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر بھی تنازعات یا اختلافات واقع ہوں ان سب کا فیصلہ قوانین الٰہی یعنی قرآن کریم کی رُو سے کیا جائے ارشاد ہوتا ہے o وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10) o تمہارے میں جو بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت کہ تمام متنازعہ امور کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق ہی ہو اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ کوئی ایسا مقام ہو جہاں سے یہ دونوں فریق اپنے معاملہ کا فیصلہ کرا سکیں۔ اس کے لئے کسی حَکَم کی ضرورت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ مذہب میں ہر شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے۔ لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اجتماعی طور پر کرائی جاتی ہے۔ اسی لئے مذہب میں اطاعت الٰہی کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہوتی ہے۔ جبکہ دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے کتاب کے علاوہ ایک زندہ اتھارٹی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام دین ہے۔ مذہب نہیں ہے اس لئے اس میں تنہا

کتاب کافی نہیں ہے۔اس کتاب کے مطابق اطاعت الٰہی کرانے والا بھی ضروری ہوتا ہے۔اپنے دور میں اللہ تعالیٰ کا رسول زندہ اتھارٹی ہوتا ہے۔اور اس کے بعد اس کے جانشین زندہ اتھارٹی ہوتے ہیں۔جس طرح رسول کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے رسول کے بعد اس کے جانشینوں کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔اور یہ سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے۔اس طرح انفرادی اطاعت کے تصور کی جڑ کٹ جاتی ہے اور یہ وہ منفرد نظریہ ہے جو صرف قرآن کریم ہی دیتا ہے۔قرآن کریم کے علاوہ ساری دنیا میں کہیں کسی جگہ یہ نظریہ نہیں پایا جاتا۔

جب انفرادی عبادت کی کوئی جگہ نہیں رہتی تو تصوف کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔اصل یہ ہے کہ تصوف تو دین کے اس نظریہ کے بالکل علی الرغم جاری کیا گیا تھا۔اور تصوف دین سے کھلی کھلی بغاوت پر مبنی ہے۔مذہب میں اس کی جگہ نکالی جا سکتی ہے دین میں اس کا کوئی مقام نہیں۔جب تک مسلمان مذہب میں اُلجھے اُلجھے رہیں گے تصوف پروان چڑھتا رہے گا جس دن مسلمان دین پر آ گئے اور دین یعنی نظام الٰہی کی معرفت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی شروع کر دی تصوف خود اپنی موت آپ مر جائے گا۔

اجتماعی اطاعت کا معمولی سا تصور ہمارے ہاں اب بھی موجود ضرور ہے۔ہم انفرادی نماز پر نماز باجماعت کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن ہم جسے اجتماعی نماز یا باجماعت نماز کہتے ہیں قرآن کریم کی رُو سے وہ بھی اجتماعی نماز نہیں ہے۔قرآن کریم میں سورہ حج میں ارشاد ہوتا ہے۔

o الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ o (22/41) اس کا رواں ترجمہ یہ ہے۔o یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دے دیں تو بھی یہ لوگ پابندی سے صلوٰۃ ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے اچھے کام کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے o۔اس آیہ کریمہ سے واضح ہے کہ مسلمان وہ ہیں کہ جب انہیں اقتدار حاصل ہو ان کا اپنا نظام قائم ہو اس نظام کے ذریعے وہ اطاعت الٰہی کر سکتے ہوں تو پھر وہ نظام صلوٰۃ قائم

کریں گے تاکہ تمام افراد معاشرہ قوانین الٰہی کا اتباع کرتے چلے جائیں ۔ یہ تمام نوع انسانی کو سامان نشوونما پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانون الٰہی صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ اور ہر معاملہ کا فیصلہ قانون الٰہی کے مطابق ہوگا۔

یہاں اقامت صلوۃ کے لئے اقتدار اور وہ نظام جس کے ذریعے اطاعت الٰہی ہوتی ہے شرط قرار دیا گیا ہے آیت اس قدر واضح ہے اور شرط (ان) سے مقید ہے کہ گریز کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ مندرجہ بالا ترجمہ میں خط کشیدہ الفاظ بھی اور پابندی ایجاد بندہ میں ۔ترجمہ ان دونوں الفاظ کے اضافہ کی کوئی اجازت نہیں دیتا۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ ’’وہ کہ اگر ہم ان کو مقدور دیں ملک میں کھڑی کریں نماز، اور دیں زکوۃ، حکم کریں بھلے کام کا، اور منع کریں بُرے سے۔ اور اللہ کے اختیار ہے آخر ہر کام کا‘‘۔

یہاں لفظی ترجمہ میں لفظ ’’اگر‘‘ نے واضح کردیا کہ اقامت صلوٰۃ کے لئے اقتدار یا نظام الٰہی شرط ہے۔ یہ آیہ کریمہ انفرادی اطاعت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس میں اطاعت اور اقامت صلوٰۃ کے لئے اقتدار اور نظام کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے مفسرین مذہب کے پابند ہیں دین ان کے پیش نظر نہیں تھا اس لئے وہ اس آیت کے ترجمہ میں عجیب مخمصہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ اس مخمصہ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ کچھ نے اپنی طرف سے لفظ بھی اور پابندی کا اضافہ کیا تاکہ ترجمہ رواں ہوسکے۔ کچھ مفسرین نے اس پھندے سے نکلنے کے لئے ارض سے صرف مکہ کی زمین مراد لے لی ہے۔ اور اس طرح نظام کے تصور سے جان چھڑالی۔ تفسیر مظہری میں اس کا ترجمہ تحریر ہے ’’وہ کہ جب ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے باز داشت کریں گے۔‘‘ اسی تفسیر میں یہ تحریر ہے کہ ’’بظاہر یہ جملہ شرطیہ ہے لیکن واقع میں شرط بمعنی خبر ہے اور جملہ خبریہ ہے‘‘ لیکن یہ سب حیل وترا کیب ان مفسرین کی خود تجویز کردہ ہیں کیونکہ ان کے

سامنے دین نہیں تھا۔حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست ہو ہی نہیں سکتی اور صلوۃ کے قیام کے لئے بھی اس نظام کا ہونا لابدی اور ایک Pre-Requisite ہے۔جب تک نظام قائم نہیں ہوتا نہ اقامت صلوۃ ہو سکتی ہے، نہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت۔

جہاں تک یا تشدد کا تعلق ہے جس کی طرف محترم خالد حسن صاحب نے اشارہ کیا ہے اور جس سے پریشان ہو کر انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ مسلمان تصوف کا رُخ کریں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بجائے تصوف کو اختیار کرنے کے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے عطا کردہ دین کے قیام کے لئے صد درجہ کوشش کریں کیونکہ دین کے قیام کا مقصد ہی دنیا میں امن وسلامتی قائم کرنا ہے۔ یہ وہ دین ہے جس کے لئے ارشاد ہوتا ہے o وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ o (10/25) o اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو شخص چاہتا ہے اسے سلامتی کی سیدھی راہ دکھاتا ہے o ۔ نیز ارشاد ہوتا ہے۔ o یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5/16) o اللہ اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو اللہ کی رضا کے تابع ہوں سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے۔قرآن کریم کی رُو سے انسان کی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر علی حد بشریت منعکس کرتا چلا جائے اس سے اس کی نفس میں اس قدر بالیدگی پیدا ہو جائے گی کہ وہ موت کے صدمہ کے بعد بھی ترقی کرتی چلی جائے گی۔اللہ تعالیٰ کے یہ الاسماء الحسنی ہی وہ صفات ہیں جو منعکس کرنی ہوتی ہیں اور یہی الاسماء الحسنی مستقل اقدار بھی ہیں جن کے مطابق مسلمان کو زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔اگر آپ ان مستقل اقدار یا صفات الٰہی یا اسماء حسنی کو سیاسی زبان میں Translate کریں تو یہی (Human Rights) بن جاتے ہیں۔حقیقت ان سب کی ایک ہی ہے ان اسماء حسنی یا صفات الٰہی میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات 'المومن' اور 'السلام' بھی ہیں۔جن کا ہر وقت پیش نگاہ رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور ان دونوں صفات کو اپنی ذات میں منعکس کرنا مقصد حیات ہے۔ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ جس شخص کا مقصد حیات یہ ہو وہ تشدد پسند کیسے ہو سکتا ہے۔قرآن کریم

کی رُو سے تو کسی ایک آدمی کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔مَن قَتَلَ نَفساً بِغَیرِ نَفسٍ أَوْ فَسَادٍ فِی الْأَرضِ فَکَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیعاً وَمَنْ أَحیَاھَا فَکَأَنَّمَا أَحیَا النَّاسَ جَمِیعاً (5/32) جو شخص کسی کو نہ تو جان کے بدلے نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (بلکہ ناحق)قتل کر دے گا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔اور جس نے ایک آدمی کو جلا دی تو گویا اس نے سب کو جلا لیا۔

تشدد اور Terrorism کے سلسلہ میں بعض حضرات جہاد کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔لیکن حق یہ ہے کہ اس سے جہاد کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔صرف اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ آج کل جو جہادی تنظیمیں کام کر رہی ہیں یہ قرآن کریم کے مطابق نہیں ہیں ۔اول تو جہاد کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ جہاد صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے۔انفرادی طور پر جہاد نہیں ہو سکتا قرآن کریم نے جہاد کے صرف پانچ مواقع گنائے ہیں جو سب دفاعی ہیں ۔ یہ الگ موضوع ہے جو اس مضمون میں نہیں آ سکتا اس کے لئے تو ایک مفصل مضمون کی ضرورت ہے۔اسلام تو سلامتی کا دین ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ہماری ملوکیت پیشوائیت اور تاریخ نے اس کو تشدد کا مذہب بنا دیا ہے۔اور یہ بات توجہ سے سُننے کی ہے ہمارے ہاں تاریخ بنو عباس کے دور میں تحریر کی گئی ہے۔ بنو عباس نے بنی اُمیّہ سے جبراً حکومت حاصل کی تھی ۔ ہر آنے والی حکومت سابقہ حکومت کو بُرا لکھتی چلی آئی تا کہ ان سے اقتدار چھین لینے کا جواز پیش کر سکیں ۔اسی لئے بنو عباس نے بھی حد درجہ بنو امیّہ کو بدنام کیا خصوصاً امیر معاویہ کی زیادہ کردار کشی کی ہے ۔ جنگ صفین ، جنگ جمل ، جنگ نہروان یہ سب تاریخ کے شاخسانے ہیں کیونکہ قرآن کریم نے تو فرمایا ہے کہ صحابہ آپس میں نہیں لڑتے ۔ (48/29-19/96) لیکن ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ صفین میں ستر ہزار آدمی قتل ہوئے۔ جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ ایک دوسرے کے آمنے سامنے دکھائے جاتے ہیں۔ حضرت زبیرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور مزید حیرت کی

بات یہ ہے کہ قاتل ومقتول دونوں عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بنو عباس کے دور میں ہر خلیفہ کی جانشینی پر خون خرابہ ہوتا تھا اور انہوں نے صرف اپنے خون خرابہ کو جائز قرار دینے کے لئے ان جنگوں کا شاخسانہ شروع کیا۔ اس طرح حضرت عمرؓ کو ہر وقت یہ دکھاتے ہیں کہ وہ دُرّے مارتے پھرتے تھے اس قسم کی تشدد کی مثالوں سے تشدد سے نفرت جاتی رہتی ہے اور انسان خود بھی تشدد پر رضامند ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ جب آپ کسی کے سینے پر پاؤں رکھ کر اس پر کھڑے ہونے کی کوشش کریں گے تو وہ شخص تو Retaliate ضرور کرے گا ۔ آج کل مسلمانوں کی صورت حال یہی ہوگئی ہے کہ ہر طرف سے ان پر ظلم ہو رہا ہے اور وہ ہر طرف سے محرومی سے دوچار ہیں تو اس ماحول میں اگر مسلمان تشدد پر آمادہ ہوں تو یہ ان کی مجبوری کی صورت حال ہے وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ o (10/10)

ماہ ستمبر 2005ء

25

جستجوئے حقیقت

ایک پرائیویٹ نشست میں تین احمدی حضرات تشریف لائے اور چند دیگر احباب بھی جمع ہوئے اور آپس میں علمی گفتگو ہوئی۔ احمدی حضرات نے اپنا موقف بہت مختصر طور پر بیان کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ ان میں اور عام مسلمانوں میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ، رسول، ملائکہ، اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ چند احادیث سے بھی انہوں نے اپنے نظریات کی وضاحت کی۔ لیکن یہ حضرات Professional Sense میں عالم یا مناظر نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مخاطبین بھی خالص قرآنی نظریات کے حامل لوگ تھے جو خلاف قرآن روایتی نظریات پر یقین نہیں رکھتے اور احمدی حضرات جن موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں یہ ان کو پہلے سے ہی تسلیم کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ آپس کا لحاظ ملاحظہ بھی اس بات کا مانع رہا کہ کوئی رنج دہ گفتگو ہو۔ اس لئے یہ گفتگو زیادہ دیر نہیں چل سکی اور نہ ہی نتیجہ خیز ہو سکی۔ لیکن اس نشست سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اس موضوع پر کچھ تحریر کر دیا جائے جس سے احمدی اور غیر احمدی نظریات کی وضاحت ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ جس وقت مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت تک ہر جگہ روایتی نظریات پھیلے ہوئے تھے۔ خالص قرآن کریم کی روشنی اس وقت تک پھیلنی شروع نہیں ہوئی تھی اور یہی وجہ مرزا صاحب کے نظریات کے نشر و اشاعت کی ہوئی ورنہ جہاں تک خالص قرآن کی روشنی کا تعلق ہے تو احمدیت، تصوف، تشیع کے نظریات اس روشنی میں چند قدم بھی نہیں چل سکتے۔ شرط صرف قرآن خالص کی ہے۔ چونکہ روایاتی مسلمانوں کے اپنے بیشتر نظریات قرآن کریم کے خلاف

ہیں ۔اس لئے احمدی حضرات اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اور ان نظریات کو Exploit کرتے ہیں اور مسلمانوں کو لاجواب کردیتے ہیں ۔ دسری وجہ احمدیت کی نشرواشاعت کی یہ ہوئی کہ مرزا صاحب اوران کے مخالف مسلم علماء کے پیش نظر قرآن کریم اوراسلام بحیثیت مذہب کے تھا۔ان دونوں گروہوں کے سامنے دین کا تصور نہیں تھا۔نہ تو مرزا صاحب ہی مذہب کی سطح سے بلند ہوئے اور نہ ہی ان کے مدمقابل علماء مذہب سے بلند ہونے ۔دین میں احمدیت کس مقام پر ٹھہرتی ہے اورکس طرح برہنہ ہوکر سامنے آتی ہے۔یہ مضمون کے آخر میں آئے گا فی الحال مذہب کی سطح پر بات کی جاتی ہے اورحتی الامکان مختصراور مہذب انداز سے۔مرزا صاحب کے بنیادی طور پر دودعاوی تھے جوان کے نام کے جزو بن گئے تھےان کومسیح موعوداور مہدی معہود کہا جاتا ہےان کے یہ دو بنیادی واساسی دعاوی ہیں جن پران کی نبوت کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔وہ اپنی نبوت کی اساس ان ہی دودعاوی پر رکھتے ہیں۔

(1) جہاں تک حضرت امام مہدی کی آمد یا شیعہ حضرات کے مطابق ان کے ظہور کا تعلق ہےتو اس کے متعلق عرض ہے کہ قرآن کریم میں دور دور تک اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔رسالہ ''صوت الحق'' خالص قرآنی رسالہ ہے، اس کا تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے،لیکن علمی انداز میں کسی بھی مسئلہ کا احاطہ کرنے کے لئے پورے حقائق کا سامنے لاناضروری ہوتا ہے۔اس لئے عرض ہے کہ سنی حضرات کے لئے آمد مہدی کی اتنی اہمیت نہیں ہےجس قدر اہمیت حضرات محترم اہل تشیع کے نزدیک ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں ظہور امام جزودین ہے۔ یہ قابل احترام حضرات ڈیڑھ ہزار سال سے اس موضوع پر تحریر فرماتے چلے آرہے ہیں ۔انہوں نے حضرت امامؑ کی سوانح حیات بھی تحریر فرمائی ہیں جس میں ''**الصراط السوی فی احوال المهدی** ''بہت نمایاں اوراہم کتاب ہے۔آپ اس طویل عرصہ کا پورا لٹریچر ملاحظہ فرمالیں وہ اس عقیدہ کی سند میں ایک آیت بھی نہیں پیش نہیں کرسکتے۔احمدی حضرات تو صرف سوسال سے اس عقیدہ کے قائل ہیں۔سنی علماء کرام بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت امام مہدی کی آمد کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔1952ء میں پنجاب

میں احمدی حضرات کے خلاف فسادات ہوئے تھے۔ یہ بڑے پیمانے پر ہوئے تھے اور اس کے بعد لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ یہ فسادات خالص سیاسی وجوہات پر ہوئے تھے۔ گورنمنٹ نے ان فسادات کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کردی تھی جو جسٹس منیر اور جسٹس کیانی پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کا نام منیر کمیٹی تھا۔ اس کمیٹی نے دس ایشوع قائم کئے تھے ان میں ایک ایشوع یہ بھی تھا کہ کیا امام مہدی کی آمد کا ذکر قرآن کریم میں ہے یا نہیں؟ اس کمیٹی کے سامنے اکتیس (31) علماء نے بیانات دیئے تھے ان بیانات میں محترم المقام مودودی صاحب مرحوم کا بیان بھی تھا جو انہوں نے تحریری طور پر دیا تھا اور جو بعد میں طبع ہو گیا تھا اور ہر شخص کی پہنچ میں ہے۔ اس بیان کے بالکل شروع میں جناب مودودی صاحب نے کھل کر اعتراف کیا تھا کہ امام موصوف کی آمد کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ سنی حضرات کے مطابق یہ عقیدہ نہ صرف قرآن میں نہیں ہے بلکہ ''صحیحین'' یعنی بخاری شریف اور مسلم شریف میں بھی آمد مہدی کا ذکر نہیں ہے۔ جب اس عقیدہ کا ذکر نہ تو قرآن کریم میں ہے اور نہ ہی ''صحیحین'' میں موجود ہے جو حضورؐ کی وفات کے بعد کا اڑھائی سو سال کا عرصہ COVER کر لیتی ہیں۔ گویا اڑھائی سو سال تک یہ عقیدہ رائج نہیں تھا کیونکہ اگر یہ عقیدہ ان کے دور میں ہوتا تو ضرور ''صحیحین'' میں اس کی احادیث موجود ہوتیں تو پھر اس کے بعد والے محدثین کے پاس وہ کونسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ ان کو اس عقیدہ کا علم ہوا۔ اس سے نظر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ آہستہ آہستہ کافی عرصہ کے بعد DEVELOP ہوا ہے۔ جو حضرات اس عقیدہ کی علمی انداز میں تردید کے خواہاں ہوں ان سے گذارش ہے کہ کمترین راقم سطور کا ''ایک مضمون جون 2005ء کے ''صوت الحق'' میں ''آمد مہدی ونزول مسیح کا عقیدہ خلاف قرآن ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا طلوع اسلام میں بعنوان ''حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ خلاف قرآن ہے'' بابت اگست 2004ء میں طبع ہوا ہے۔ ان دونوں مضامین میں اس عقیدہ کا علمی جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا گیا ہے، وہ ملاحظہ فرمالیں۔ ایک ہی موضوع پر دوبارہ، سہ بارہ، تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

(2) جہاں تک مرزا صاحب کے دوسرے دعویٰ یعنی مسیح ہونے کا تعلق ہے تو اس کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں نہیں ہے۔ قرآن کریم سے وفات مسیح کھل کر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام قرآن کریم کے خلاف حیات مسیح کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں ان کا دارومدار کلی طور پر احادیث پر ہے۔ مرزا صاحب وفات مسیح کے قائل تھے اور چونکہ یہ عقیدہ قرآنی آیات سے واضح ہے اس لئے یہاں ہمارے علماء ان سے مات کھا جاتے تھے اور لاجواب ہوجاتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے نزول مسیح کا عقیدہ بھی مروج ہے۔ اس عقیدے کو مرزا صاحب درست قرار دیتے تھے اور احادیث سے اس کو ثابت کرتے تھے۔ اور اس سے نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ کیونکہ نزول مسیح ہونا لازمی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ فوت ہوگئے ہیں اس لئے وہ تشریف نہیں لائیں گے بلکہ ان کا ایک نظیر اور مثیل آئے گا اور وہ میں ہوں۔ حالانکہ وفات مسیح کی وجہ سے صحیح نتیجہ انہیں یہ نکالنا چاہئے تھا کہ کیونکہ حضرت عیسیٰ فوت ہوگئے ہیں، اس لئے اب کوئی نہیں آئے گا، اور نزول مسیح کی احادیث سب ضوع ہیں۔ لیکن مرزا صاحب نے ایسا نہیں کیا اور نزول مسیح کے خلاف قرآنی عقیدہ سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن اس میں ایک مغالطہ (Flaw) ہے۔ اس بارے میں یہ حضرات ایک بات قرآن کریم سے ثابت کرتے ہیں اور ایک بات احادیث سے۔ وفات مسیح قرآن کریم سے ثابت کرتے ہیں اور نزول مسیح احادیث سے۔ اگر آپ ان حضرات سے یہ مطالبہ کریں کہ جس طرح آپ وفات مسیح قرآن کریم سے ثابت کرتے ہیں، اسی طرح نزول مسیح بھی قرآن کریم سے ثابت کریں تو یہ حضرات لاجواب ہوجاتے ہیں۔ اور ایسا وہ ہرگز نہیں کرسکتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ فوت ہوگئے اور ان کی وفات قرآن کریم سے ثابت ہے تو جس قدر احادیث نزول مسیح کا پتہ دیتی ہیں وہ قرآن کے خلاف ہے اور موضوع ہیں۔ اپنی وفات کے بعد وہ آ ہی نہیں سکتے۔

احادیث معاملہ کو کس قدر الجھا رہی ہیں ان کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ مرزا صاحب اور مولوی محمد عبداللہ صاحب چکڑالوی کے مابین ایک مناظرہ 1905ء میں سیالکوٹ میں منعقد ہوا۔

جس وقت صرف قرآن کریم سامنے رہا اور گفتگو کا مدار قرآن کریم پر رہا، مولوی محمد عبداللہ صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن جب گفتگو قرآن کریم سے سرک کر حدیث پر آ گئی تو پلہ مرزا صاحب کا بھاری ہو گیا اور مولوی عبداللہ صاحب کو اس مناظرہ میں شکست ہوئی اور مرزا صاحب مناظرہ جیت گئے۔ مولوی عبداللہ پہلے ہی حدیثوں سے بدظن تھے، اس کے بعد وہ بالکل منکر حدیث بن گئے اور کھل کر سامنے آ گئے۔

مرزا صاحب کی نبوت کے یہ دو اساسی عمود ہیں جن پر ان کی نبوت کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ یہ دونوں عمود کس قدر خلاف قرآن ہیں، اور کس درجہ کمزور اور Shaky ہیں۔ لیکن یہ دونوں عمود مسلمانوں کے خود فراہم کردہ ہیں۔ اور احادیث سے مستخرج ہیں۔ اگر آپ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ان دونوں عمودوں کو تسلیم نہ کریں تو مرزا صاحب کی نبوت کی عمارت خود بخود منہدم ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم خود ہی کرسیاں بچھاتے ہیں اور جب کوئی ان پر آ کر بیٹھتا ہے تو اس کو جوتیاں مارتے ہیں۔

اب اس مضمون میں ان خلاف قرآن نظریات کی نشاندہی کی جاتی ہے جس سے احمدی حضرات فائدہ اٹھاتے ہیں اور تمام مسلمان ان کو مانتے ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کا قرآن کریم کے خلاف یہ عقیدہ ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب لاتا ہے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہیں لاتا۔ مرزا صاحب نے اس سے فائدہ اٹھایا اور خود کو ایسا نبی بتایا جو شریعت یا کتاب ساتھ نہیں لایا۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ تمام انبیاء کو کتاب دی گئی ہے، وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (2/213) نیز یہی الفاظ رسولوں کے متعلق بھی آئے ہیں (27/25)، انبیاء کرام کی انہیں کتابوں کو وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ (2/136) کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کے اس غلط نظریہ سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اسی نظریہ کے خلاف کہ سب انبیاء و رسل کتابیں ساتھ لائے ہیں احمدی حضرات فرماتے ہیں کہ سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ o إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ (5/44)o بے شک

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے اسی کے ذریعے انبیاء بنی اسرائیل فیصلے کرتے تھے۔اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ تورات تو ایک کتاب ہے جو حضرت موسیٰؑ کو ملی تھی، لیکن اس سے بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء فیصلہ کرتے تھے اور یہ وہ نبی ہوتے تھے جو بغیر کتاب کے آئے تھے اور مرزا صاحب بھی ایسے ہی نبی ہیں۔لیکن اس بارے میں ان کو مغالطہ ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا نام تورات نہیں بتایا۔تورات کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد (3/64) اور حضرت عیسیٰؑ سے پہلے نازل ہوئی تھی (5/46) قرآن کریم کی رو سے تورات ان تمام کتابوں کا نام ہے جو انبیاء بنی اسرائیل پر حضرت عیسیٰؑ سے پیشتر نازل ہوئیں۔ اس مجموعے کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہتے ہیں۔اس میں انتالیس 39 صحیفے ہیں جو مختلف انبیائے کرام پر نازل ہوئے تھے۔اس لئے اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ کچھ نبی یا رسول بغیر کتاب کے آئے تھے، اور تورات سے فیصلہ کرتے تھے بالکل غلط ہے۔اور مرزا صاحب کا یہ موقف قرآن کریم کے خلاف ہے۔لیکن جمہور مسلمان خود اس کے قائل ہیں، اس لئے وہ اس عقیدہ پر گرفت نہیں کر سکتے تھے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم خاص خاص ہستیوں کو ملتا تھا اور اللہ تعالیٰ ہر شخص سے کلام کرنا پسند نہیں فرماتا تھا۔اس لئے انسانیت دو حصوں میں منقسم ہے یا تو کوئی شخص خود نبی ہوتا تھا، یا کسی نبی کا مخاطب اور اس کا امتی ہوتا تھا۔یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ خود نبی بھی ہو اور خود ہی امتی بھی۔یا وہ خود **مرسل** ہوتا تھا یا **مرسل الیہ** ہوتا تھا۔قرآن کریم نے فرمایا کہ ان سب کی، یعنی **مرسل الیھم** باز پرس ہوگی۔یہ سب زیر حساب اور تحت محاسبہ ہیں۔ارشاد ہوتا ہے o فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ o (7/6) o پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے سوال کریں گے اور اور خود رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے o۔ یہاں قرآن کریم نے **مرسل** اور **مرسل الیھم** کو نکھار کے الگ الگ دو گروہوں میں منقسم کر دیا ہے حضرت رسول کریمؐ ہماری طرف **مرسل** تھے اور ہم سب ان کے **مرسل الیھم** ہیں۔نہ کوئی **مرسل ، مرسل**

الیھم ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی **مرسل الیھم** ،**مرسل** ہوسکتا ہے۔ یہ بالکل دو الگ الگ گروہ ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مرزا صاحب **مرسل** ہونے کے بھی مدعی ہیں اور **مرسل الیھم** ہونے کے بھی۔ وہ اس لحاظ سے کہ خود کو حضورؐ کا امتی کہتے ہیں، حضورؐ کے **مرسل الیہ** ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود **مرسل** ہونے کے بھی مدعی ہیں اور یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ یہی پوزیشن اس وقت کے موجودہ احمدی حضرات کی ہے کہ وہ یا تو حضورؐ کے **مرسل الیھم** ہوسکتے ہیں یا مرزا صاحب کے، دونوں کے **مرسل الیھم** نہیں ہوسکتے **فتدبرو**۔ **وحی الھٰی** کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بھی رسول یا نبی مبعوث ہوتا تھا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب ہدایت سے نوازتا تھا۔ اس کی قوم اس کتاب کا اتباع کرتی تھی۔ رسول کی تشریف براری کے بعد بھی وہ اس کتاب کا اتباع کرتی رہتی لیکن مرورِ ایام کے ساتھ اس کتاب میں آمیزش ہو جاتی تھی اور جب وحی الٰہی میں ملاوٹ ہو جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ ایک نئے رسول کو اس کی کتاب کے ساتھ مبعوث فرماتا تھا پھر اس نئی کتاب پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتا تھا۔ ارشاد ہوتا ہےo وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ o(22/52)(مفہوم)o ہمارا فرستادہ نبی آتا لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا اس کے چلے جانے کے بعد اس امت کے لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر، اس نبی کی وحی میں ملاوٹ کر دیتے تھے۔ پھر اس وحی کو اس ملاوٹ سے صاف کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایک اور رسول مبعوث کرتا جو اس سابقہ وحی کی ملاوٹ کو دور کر کے، اسے منزہ شکل میں پیش کرتا اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے قوانین کو پھر محکم بنا دیتاo۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر کام کا علم ہوتا ہے اور وہ حکمت والا بھی ہے۔

اس آیۂ کریمہ کو اس سابقہ تحریر شدہ نظریہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے کہ سابقہ کتاب میں آمیزش ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا رسول مبعوث فرماتا تھا اور وہ رسول وحی کو منزہ شکل میں پیش فرماتا تھا۔ اس سنت الٰہی کے پیش نظر قرآن کریم کو محفوظ کر دیا گیا تاکہ اس میں ملاوٹ نہ ہو۔ قرآن

کریم کا محفوظ کر دینا اس بات کا حتمی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق اب نہ کوئی نئی کتاب (وحی) آئے گی اور نہ ہی کوئی رسول آئے گا۔ کیونکہ کتاب محفوظ ہے(15/9) اور جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی تھی وہ بند ہوگئی ہے۔o وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا (6/115) البتہ احمدی حضرات ایک آیت کریمہ سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ہمارے مفسرین کرام نے خود اس کی تفسیر بالکل غلط کی ہے ارشاد ہوتا ہے۔o وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ (4/159)o اہل کتاب میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس کے مرنے سے قبل ایمان نہ لے آئے اور اس سے مراد لی جاتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی موت سے پیشتر ان پر ایمان لے آئیں گے لیکن یہ مفہوم قطعاً غلط ہے کیونکہ جب حضرت عیسیٰ کے نزول کا کوئی تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے تو یہ غیر قرآنی عقیدہ اپنی طرف سے زیادہ کرکے آیات کا مفہوم اس کے مطابق کرنا، درست قرآن فہمی نہیں ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں دو ضمیریں (ہ ہ) آتی ہیں۔ موضوع احادیث کے زیر اثر نزول مسیح کے عقیدہ کی وجہ سے ہمارے مفسرین کرام سے اس میں تسامح ہوا ہے کہ انہوں نے بِهٖ کی دوسری ضمیر کو حضرت عیسیٰ کی طرف راجع کیا ہے۔ لیکن درست بات یہ ہے یہ ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ **من قبل موتہٖ** قرآن کریم کا ایک محاورہ ہے جس کے معنی واقعاً موت سے پیشتر نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ساری عمر کے ہیں۔ اس کے لئے آیات (2/132-63/10) ملاحظہ فرمائیں جس سے واضح ہوگا کہ **من قبل موتہٖ** کے معنی ساری زندگی اور ساری عمر ہے۔ آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ خود اہل کتاب کو بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ صلیب کا واقعہ کیا تھا اور جسے صلیب پر چڑھایا گیا وہ حضرت عیسیٰ ہی تھے یا کوئی اور آدمی تھا لیکن اس کے باوجود ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کہ فی الواقع حضرت عیسیٰ کو ہی صلیب دی گئی تھی ساری عمر اس پر یقین محکم رکھتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ سے دور دور بھی حضرت مرزا صاحب

کے آنے کا کوئی تعلق نہیں۔

یہاں تک تو گفتگو تھی اسلام کو مذہب کی سطح پر رکھنے کی۔لیکن قرآن کریم تو اپنے کو دین کہتا ہے۔مذہب کا تو لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔مذہب میں انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہوتا ہے۔یہ ایک پرائیویٹ عقیدہ ہوتا ہے اس کا دنیا کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔مذہب کے ہر ماننے والے کو کوئی نہ کوئی ضابطہ حیات اختیار کرنا ہوتا ہے جو خود انسانوں کا وضع کردہ ہوتا ہے۔اس کی مثال برطانیہ کے عیسائیوں کی ہے ان کے مذہب کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی اطاعت تو انفرادی طور پر کر لیتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں انہوں نے جمہوریت کو بطور دین اختیار کیا ہوا ہے مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اس کے بالکل برخلاف قرآن کریم اور اس کے پیش کردہ دین کا **عروۃ الوثقٰی** ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی۔اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی اطاعت کی جائے جو اس کے رسول نے قائم کیا ہوتا ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اس کا رسول جاری و نافذ کرتا ہے اس لئے ان احکامات کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے نظام کی اطاعت لازمی ہے اور اس نظام کی اطاعت کے لئے یہ دو امور لازمی ہیں۔

(1) نظام کی اطاعت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ نظام زندہ، جیتی جاگتی، اتھارٹی کی شکل میں موجود ہو، مومنین پہلے اس کے احکامات کو سنتے ہیں پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ان احکامات کی اطاعت کرنے سے پیشتر ان کو براہ راست ایک اتھارٹی سے سننا لازم ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔

(1) ٥یَـا أَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ آمَـنُـوْا أَطِیْـعُـوا اللّٰـهَ وَرَسُوْلَـهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْـهُ وَأَنْـتُمْ تَسْمَعُوْنَ٥(8/20)

٥اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اس سے روگردانی نہ کرو درحالانکہ تم سن رہے ہو٥۔

(2) ٥فَـاتَّـقُـوا اللّٰـهَ مَـا اسْتَـطَـعْـتُـمْ وَاسْمَـعُـوْا وَأَطِیْـعُـوْا وَأَنْفِقُوْا خَیْرًا

لِاَنفُسِکُمۡ(64/16)

o جہاں تک تم سے بن پڑے اللہ سے ڈرو، اور اس کے احکام سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔

(3) وَقَالُوا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا غُفۡرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُo(2/285)

اور کہنے لگے اے پروردگار ہم نے سنا اور مان لیا پروردگار ہمیں تیری مغفرت کی خواہش ہے اور تیری طرف پلٹ کے جانا ہےo

(4) o اِنَّمَا کَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذَا دُعُوۡا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَo(24/51)o

ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے حکم سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیںo۔

یہ چار آیات کریمات اس قدر واضح ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے دو مفہوم برآمد ہو سکتے ہیں ان چاروں آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ایک زندہ و پائندہ نظام کا ہونا لازمی ہے اور اس نظام کے احکامات مومنین کے سامنے جاری ہوتے ہیں جن کو مومنین پہلے سنتے ہیں پھر ان پر عمل کرتے ہیں۔

(2) دوسری بات جو اس نظام کی لازمی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ یہ اطاعت ایک ہوتی ہے، یہ دو مطاع ہیں۔ لیکن ان دو مطاعوں کی اطاعت کو قرآن کریم ایک اطاعت گردانتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ احکامات اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں لیکن ان کو جاری و نافذ رسول کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کی اطاعت صرف ایک اطاعت ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر بار بار تحریر کیا جا چکا ہے۔ گذشتہ ماہ کے صوت الحق میں پھر لکھا گیا ہے۔ دوبارہ یہاں تحریر کرنا اب مناسب نہیں ہے

البتہ آیات کے حوالہ جات دیئے جاتے ہیں آپ خود تکلیف فرما کر ان کو دیکھ لیں۔(58/21-99/24-24/54-49/4-3/172-58/5-58/20-33/36-59/8-8/20-9/74)

اس کے علاوہ اور بھی کافی حوالے ہیں۔ چونکہ اس نکتہ پر کہ قرآنی نظام کی اطاعت سے ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔قرآن کریم نے بہت زور دیا ہے،اس لئے اس کو مختلف پہلوؤں اور متنوع طریقوں سے اجاگر کیا جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(1) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا o(4/65)o پس اے رسول پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو مان لیںo۔دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

(2) فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ(5/48)

جو احکام اللہ نے نازل کئے ہیں تم ان کے مطابق فیصلہ کرو۔

(3) اور یہ آیت کریمہ تو حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہےo يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (4/59)o اے ایمان والوں اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبان حکومت ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں تنازعہ کرو پس اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم اپنے فیصلے اللہ اور رسول سے کراؤ۔اور جو کوئی اپنے فیصلے اللہ و رسول سے نہیں کراتا وہ اللہ اور روز آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان نہیں لاتا۔اس سے اگلی آیت کریمہ میں اس سے بھی زیادہ وضاحت کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(4) oأَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ o(4/60) (اے رسول) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جو یہ خیالی پلاؤ پکاتے ہیں کہ جو کتاب تجھ پر نازل کی گئی اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئیں سب پر ایمان لائے ہیں اور دلی تمنا یہ ہے کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ''طاغوت'' کو خود Define کردیا ہے۔

طاغوت وہ اتھارٹی، عدالت، یا ادارہ ہے جو فیصلہ جاری کرتا ہے اور جس سے فیصلے طلب کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم اس سے فیصلہ کرانا کفر قرار دیتا ہے۔ فیصلہ صرف اسلامی حکومت کی اتھارٹی کا سند ہوجاتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے معاشرہ دو ہی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک معاشرہ وہ ہے جو وحی کے احکامات پر قائم ہوتا ہے اور جس کو قرآن کریم اپنی اصطلاح میں دین کہتا ہے۔ دوسرا وہ معاشرہ ہوتا ہے جو انسانوں کے خودساختہ Law Manmade پر متفرع ہوتا ہے۔ قرآن کریم اس کو طاغوت کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنے والا مجرم، باغی، اور اللہ کا نافرن ہوتا ہے قرآنی نظام یعنی دین کے علاوہ ہر نظام طاغوت ہے، اور اس میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے دین سے وابستہ ہے۔ وہ اپنے ملک میں قرآن کریم کا نظام جاری کرتے ہیں اس کے بعد حد درجہ قوت حاصل کرتے ہیں (8/60)، اس قوت سے ان کے اور اللہ تعالیٰ کے دشمن لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ وہ عدل قائم کرتے ہیں (57/25)، وہ ایک ایسی امت ہوتے ہیں کہ جو تمام دنیا کی نگراں ہوتی ہے اور ان کا مرکز خود ان کا نگراں ہوتا ہے (2/143)، وہ ہی ساری دنیا میں سپر پاور اور اعلون ہوتے ہیں (3/139) اللہ تعالیٰ کافروں کو ان پر غالب نہیں آنے دیتا (4/121) وہ سب سے بالا ہوتے ہیں۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　　　غیرت او برنتابد ہم سرے

یہ ہے دین اور یہ ہے امت مسلمہ کا مقام دیگر اقوام میں۔ اور یہ ہے طریقہ اطاعت الٰہی کا قرآن کریم کے مطابق۔ دین کے اس آئینہ میں آپ احمدیت کو رکھیں تو بالکل عریاں اور برہنہ نظر آتی، جسے قرآن کریم سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب مذہب کی سطح تک ہی رہے۔ وہ مذہب کی سطح سے اوپر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔

اب جبکہ انسانیت اپنے خودساختہ نظامہائے حیات سے تنگ ہو رہی ہے اور خود مسلمان بھی ذلیل وخوار ہو کر دین کی طرف رجوع کر رہے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ ہے ہی نہیں (72/22-18/27) دین کا تصور روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے اور مذہب عقل کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ جس دن بھی کسی جگہ دین عملی شکل میں متمکن ہو گیا، احمدیت، تصوف، تشیع، یہاں تک جمہوریت اور سوشلزم کے باطل نظریات خود بخود اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ ان کا سکہ صرف مذہب کی دنیا میں رواں ہے، دین میں ان کا سکہ جنس کاسد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی بھی رسول یا نبی کی صداقت کی دلیل اس کی کتاب ہوتی ہے۔ چنانچہ غیر مسلم حضرات جب بھی حضورؐ کی رسالت ونبوت سے انکار کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ انہیں غلط فہمی ہوگئی تھی یا انہیں Hallucinations ہوتے تھے تو ہم ان کو یہی دلیل دیتے ہیں کہ حضورؐ یقیناً رسول تھے کیونکہ قرآن کریم جو ان پر نازل ہوا ہے وہ کسی انسانی فکر کی کاوش نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی آیات سے بھی یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے اور فکر انسانی اس کا سرچشمہ کسی صورت بھی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کے وحی ہونے کے ثبوت میں کمترین راقم سطور کا ایک مضمون ''اعجاز القرآن'' کے نام سے ''صوت الحق'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی قسم کی کوششوں سے ہم قرآن کریم کو وحی ثابت کرتے ہیں اور اس طرح حضورؐ کی رسالت ازخود ثابت ہو جاتی ہے۔

مرزا صاحب کے سلسلہ میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ انہوں نے کوئی کتاب پیش نہیں کی۔ وہ اپنی صداقت کی بنیاد پیش گوئیوں پر رکھتے رہے یا ان خلاف قرآن عقائد پر رکھتے رہے جو مضمون ہذا میں آپ کے سامنے پیش کر دئے گئے ہیں۔ اگر مرزا صاحب کی کوئی کتاب ہوتی تو اس کے

Contents سے بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ وہ وحی ہے یا نہیں کیونکہ ان کی طرف سے کوئی کتاب پیش نہیں کی جاتی، اس لئے مجبوراً ان کے عقائد و نظریات سے تعرض کیا گیا ہے، جو آپ کے سامنے پیش کر دئے گئے۔ حد درجہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی صاحب کی دل آزاری یا دل شکنی نہ ہو۔ کیونکہ

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس بات سے قطع نظر کہ مرزا صاحب مذہب ہی کی سطح پر رہے اور دین تک ان کی نگاہ نہیں گئی۔ مذہب میں بھی جو چیزیں قرآن کریم کے خلاف تھیں انہوں نے ان میں سے ایک کی بھی نہ نشاندہی کی اور نہ ہی ان کی مخالفت کی۔ عامۃ المسلمین کے جو کچھ نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں مرزا صاحب نے ان سب کو قبول کر لیا اور اپنے سارے دور میں ان میں سے کسی کے خلاف بھی لب کشائی نہیں فرمائی۔ ہماری ساری تفاسیر، اور فقہ بنو عباس کے دور میں وجود میں آئیں۔ ہمارے بیشتر عقائد پر ملوکیت کی چھاپ ہے اور چونکہ وہ مسلمانوں کا فکری لحاظ سے تاریک ترین دور تھا اس لئے ہمارے فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے ملوکیت نے اسلام کی وہ تعبیر پیش کی جو خالص سرمایہ دارانہ نظام پر مشتمل تھی۔ قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی ان اسباب و ذرائع کو بھی پیدا کیا جن پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ پانی، ہوا، حرارت، روشنی اور زمین جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے زمین کے متعلق فرمایاo وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ o(55/10) نیز فرمایا۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ o(41/10) اسی بناء پر قرآن کریم نے ملکیت زمین حرام قرار دی مگر مرزا صاحب ملکیت زمین کے قائل تھے۔

قرآن کریم اکتناز کو منع فرماتا ہے (9/34) اور اس آیۂ کریمہ میں ایسا واضح حکم ہے کہ کوئی گریز کی راہ نہیں نکلتی تھی لیکن ہمارے مفسرین نے اس آیۂ کریمہ کے ذیل میں نہایت افسانوی رنگ میں جو اس کا شان نزول بیان کیا ہے اور جس کے نتیجے میں یہ حکم حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا

ہے کہ اگر زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو جس قدر بھی چاہے آپ دولت جمع کر سکتے ہیں۔ صرف اڑھائی فیصد رقم دے کر سب دولت White Money ہو جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ o اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (22/41)o مومنین وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ، زکوٰۃ دینا ہے یعنی نوع انسان (یا افراد معاشرہ) کو سامان نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (Revenues) کو زکوٰۃ (سامان نشوونما) کہا جائے گا جسے وہ افراد معاشرہ بلکہ پوری پوری عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی لوگوں سے کس قدر لے گی اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے ہوگا۔ زکوٰۃ کسی ٹیکس (Tax) کا نام نہیں ہے اسلامی حکومت کی پوری آمدنی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ مرزا صاحب کی نگاہیں صرف اس طرف نہیں گئی بلکہ ان سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30/32)، اور فرمایا کہ جس نے دین میں فرقہ بندی کی اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (6/159)، چونکہ اس زمانہ کے مسلمانوں میں اور ہمارے علماء کرام میں فرقہ بندی جائز قرار دی ہوئی ہے مرزا صاحب نے بھی اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا کہ وہ اس کو قرآن کریم کی روشنی میں ملاحظہ فرماتے بلکہ اس کو مسلمہ کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ مسلمان الہام اور پیش گوئیوں کو درست گردانتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی کوئی سند قرآن کریم میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کی رو سے علم حاصل کرنے کے صرف دو سرچشمے ہیں۔ ایک وحی یعنی اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم ملنا جو انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے بعد اس کا سلسلہ بند ہو گیا۔ دوسرا عقل انسانی (Human Intellect) ، اس میں ہر انسان شریک ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ختم نبوت کے بعد اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئی ہیں ایک وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم یعنی قرآن کریم اور دوسرے عقل انسانی۔ بناء بریں الہام، کشف، مراقبہ، کا عقیدہ بالکل قرآن

کریم کے خلاف ہے اور یہی وہ چور دروازے ہیں جن کو کھول کر لوگ طرح طرح کے دعاوی کرتے ہیں۔ اور ان ہی سے مرزا صاحب نے فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ سب قرآن کریم کے خلاف ہیں مزید یہ کہ جو لوگ الہام کے قائل بھی ہیں وہ وحی اور الہام میں سورج کی روشنی اور شمع کی روشنی جیسا فرق ان دونوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور جسے وحی جیسی روشنی ملتی ہو، اس کو الہام کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن حیرت ہے کہ مرزا صاحب دونوں کے حاصل ہونے کے مدعی تھے۔

عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بھی ہماری فقہ نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے قرآن کریم کی رو سے اصولاً ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے۔ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (4/20) لیکن مرزا صاحب کئی کئی شادیوں کے قائل تھے۔ اور خود بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ قرآن کریم میں پردہ کا کوئی حکم نہیں ہے جس سے آدھی آبادی بالکل بے کار ہو جاتی ہے لیکن مرزا صاحب پردہ کے خود بھی قائل تھے اور اب بھی احمدی خواتین پردہ کرتی ہیں۔ یورپین ممالک میں رہنے کے باوجود بھی وہ پردہ کی پابند ہیں۔

ہماری فقہ نے یتیم پوتے پر سخت ظلم کیا ہے کہ چچا کی موجودگی میں اس کو وراثت سے بالکل محروم کر دیتے ہیں۔ فقہ کا یہ قانون بھی قرآن کریم کے خلاف ہے اور مرزا صاحب کے زمانہ میں بھی اس کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہو گئی تھی یہاں تک کہ اب عائلی قوانین میں اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے اس خلاف قرآن عقیدہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی طرح فقہ کے دیگر قوانین کا حال ہے۔ رجم، قتل مرتد، اور ایسے بیسوں مسائل قرآن کے خلاف تھے لیکن مرزا صاحب نے ان کو پیش نگاہ نہیں رکھا۔ مرزا صاحب نے صرف ان مسائل پر توجہ دی جن سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے ورنہ آمد مہدی اور نزول مسیح کے عقیدے اس درجہ اہم نہیں تھے کہ جن پر مسلمانوں کے ایمان و کفر یا ان کے عروج و زوال کا انحصار ہو۔ قرآن فہمی میں مرزا صاحب اپنے زمانے کے مولویوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں گئے۔ اور نہ ہی اپنے دور کے معاشرہ کی اصلاح میں انہوں نے کوئی دلچسپی لی۔ ان کی کسی ایک کتاب سے بھی ایک سطر ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو

کہ انہیں مسلمانوں کی بربادی یا تباہی کا معمولی سا بھی رنج ہوا ہو۔ وہ اور مولانا حالی ہم عصر تھے بلکہ دونوں ایک ہی سن کی پیدائش تھے۔ آپ مولانا حالی کی مسدس کا مطالعہ فرمائیں۔ ہر قاری اشکبار اور چشم نم ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے مصنف کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس دور کے اکثر بزرگوں کی تصانیف سے ان کی بے قراری نظر آتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے ہاں ذرا سی بھی ہمدردی یا رنج و غم کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ ساری عمر مباہلہ کی ہی دعوت دیتے رہے جو خود قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اور صرف مولویوں میں معروف ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

ماہ اکتوبر 2005ء

شبِ برات

شب برأت تو خصوصی طور پر شیعہ حضرات کا تہوار ہے۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق اس رات میں حضرت امام مہدی تولد ہوئے تھے۔ چونکہ اُن کا عقیدہ اس رات میں اُن کے تولد ہونے کا ہے تو بے شک اُن حضرات کا حق ہے کہ اس رات کو ہر طرح سے خوشیاں منائیں اور ہر طرح سے خوشی کا اظہار کریں۔ لیکن جمہور مسلمان اہل سنت حضرات کے نزدیک یہ رات اس وجہ سے محترم ومبارک نہیں ہے۔ بلکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ اس رات میں سارے سال کے امور کا فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ لوگوں کے رزق کی تقسیم، موت وحیات کے فیصلے، شادی ونکاح وولایت سے متعلق تمام امور کے فیصلے ہر سال اسی رات میں کردیئے جاتے ہیں۔ ان تمام نظریات وعقائد کا انحصار سورۃ دخان کی آیت کریمہ ٥فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ٥(44/4) پر ہے اور یہ تمام عقائد اس آیت کریمہ سے ہی مستخرج کئے جاتے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ وتفسیر مستند کتب تفاسیر سے پیش خدمت کی جاتی ہے۔

(1) اس میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (تفسیر) یعنی سال بھر کے متعلق قضا وقدر حکیمانہ اور اٹل فیصلے اسی عظیم الشان رات میں لوح محفوظ سے نقل کرکے ان فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں، جو شعبہ ہائے تکوین میں کام کرنے والے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبان کی پندرویں رات ہے۔ جسے شب براۃ کہتے ہیں ممکن ہے وہاں سے اس کام کی ابتداء اور شب قدر پر انتہا ہوتی ہو۔ واللہ اعلم (ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب اور تفسیر جناب مولانا شبیر احمد عثمانی)

(2) اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (تفسیر) جدا ہوتا ہے یعنی لوح محفوظ میں سے جدا

کر کے اس کام والوں کو لکھ دیتے ہیں۔(موضح القرآن شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ)

(3) اس رات میں تمام پُرحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔(تفسیر) یہ اسی شب مبارک کی تعریف ہے کہ اس میں تمام مبنی برحکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔اس آیت کو اگر سورۃ قدر کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کو زمین سے متعلق تمام امور کلیہ سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ ان سے زمین میں مامور ملائکہ کو آگاہ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے نقشہ کے مطابق اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں(تدبر القرآن جلد 7۔صفحہ 270)

(4) اس رات میں پُرحکمت یا محکم معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے(تفسیر) ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نصف شعبان کی رات میں اللہ سب فیصلے کر دیتا ہے۔اور شب قدر میں وہ فیصلے ان کارندوں کے سپرد کردیتا ہے(تفسیر مظہری)

(5) اس میں فیصلہ ہوتا ہے پُرحکیمانہ بات کا جو ہماری طرف کی بات ہوتی ہے(تفسیر فصل الخطاب)

(6) درآں شب مبارک فیصل کردہ میشود ہر کار استوار راو جمعے برآنند کہ لیلۂ مبارکہ شب برات است وآں شب نیمۂ شعبان است۔وبرکت اودر نزول ملائکہ واجابت دعوت وفصل اقضیہ و تقسیم نعم است **فیها** دریں شب **یفرق** جدا کردہ وفصل دادہ شود **کل امر حکیم** برامرے کہ حکم کردہ شدہ است در ہمہ سال ارزاق وآجال وشب برات از لیالی فاضلہ است کہ بدین امت دادہ اند (ترجمہ فتح الرحمان وتفسیر حسینی)

(7) اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے(تفسیر) اسی شب میں ہر محکم کام طے کیا جاتا ہے۔یعنی لوح محفوظ سے کاتب فرشتوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔تمام سال کے کل اہم کام عمر،روزی وغیرہ سب طے کئے جاتے ہیں۔(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر جلد 5 صفحہ نمبر 48)

آپ نے مختلف سات تفاسیر میں آیت کریمہ کا ترجمہ اور اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائی۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تمام تفاسیر میں صرف الفاظ کی تبدیلی ہوئی ہے مفہوم عام تفاسیر میں تقریباً ایک ہی

ہے۔ان تمام تفاسیر میں ملائکہ اور لوح محفوظ کے جن مفاہیم کو پیش کیا گیا ہے وہ قطعاً قرآن کریم کے مفاہیم کے خلاف ہیں۔قرآن کریم میں ملائکہ اور لوح محفوظ کا یہ مفہوم ہی نہیں ہے۔قرآن کریم میں لوح محفوظ کے الفاظ صرف ایک جگہ میں آئے ہیں جو مذکورہ صدر مفہوم ادا نہیں کرتے یہاں چونکہ ملائکہ و لوح محفوظ موضوع نہیں ہیں اس لئے ان سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

آپ نے ان مستند تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ فرمائے جن میں آیت کریمہ کا لفظی ترجمہ اور اس ترجمہ کی بنیاد پر تحریر کردہ تفاسیر دیکھیں۔لیکن اس بات پر شدید حیرت ہوتی ہے کہ ان تمام تفاسیر میں درج کردہ تراجم غلط ہیں اور عربی قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے اسی بنا پر اس آیت کریمہ کے متعلق جو تفاسیر بیان کی گئیں ہیں وہ ازخود غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔یہ تراجم کس وجہ سے غلط ہیں اور صحیح ترجمہ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے سے قبل ایک مختصری تمہید عرض کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس کو مطالعہ کرنے سے ترجمہ غلط ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔

قارئین کرام میں سے اکثر حضرات کو علم ہوگا کہ 1926ء میں ایک مسلمان خاتون نے ریاست بھاولپور میں ایک دعویٰ دائر کیا تھا کہ اس کا شوہر احمدی ہو گیا ہے اس لئے عدالت اس کا نکاح فسخ کرنے کا حکم جاری کرے۔یہ مقدمہ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بھاولنگر کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا۔ جج صاحب موصوف محمد اکبر اس فکر میں تھے کہ انہیں نبوت کی کوئی جامع و مانع تعریف (Definition) معلوم ہو جائے تو پھر وہ اس مقدمہ کا فیصلہ بہ آسانی کرسکیں گے۔ اس مقدمہ کے سلسلہ میں بڑے بڑے اکابر علمائے کرام جیسے مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، شیخ الجامع، جامع عباسیہ، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا میر مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، شیخ الکل فی الکل حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری شیخ الحدیث دیوبند وغیرھم پیش ہوئے مگر جج صاحب ان سب حضرات کی پیش کردہ نبوت کی (Definition) سے مطمئن نہیں ہوئے۔اسی دوران اتفاق سے انہیں محترم پرویز صاحب کا مضمون بعنوان میکانیکی اسلام مل گیا۔محترم پرویز

صاحب نے نبوت کی جو تعریف اپنے مضمون میں بیان فرمائی تھی جج صاحب موصوف اس تعریف سے مطمئن ہو گئے انہوں نے اس مقدمے کا فیصلہ 7 فروری 1935ء کو سنادیا۔ یہ مقدمہ قریباً نو سال تک زیر سماعت رہا اور اس طویل عرصہ میں اس درجہ بڑے بڑے علماء کرام جج صاحب کے سامنے نبوت کی جامع و مانع اور اطمینان بخش تعریف بیان نہیں کر سکے۔ جج صاحب مطمئن ہوئے بھی تو محترم پرویز صاحب کے ایک ایسے مضمون سے جس کا براہ راست اس موضوع سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ اس کی اصل وجہ کیا تھی وہ خود پرویز صاحب کی زبانی سنئے۔

"اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل جج حقیقت نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے مطمئن نہیں ہو سکے، وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قول فیصل ثابت ہوا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقام نبوت کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی، خارج از قرآن بحثوں کو اس میں داخل نہیں ہونے دیا تھا"

(اقبال اور قرآن جلد دوم ص 33)

بس یہی کلید و چابی ہے اس معمہ کو سمجھنے کی۔ ہمارے علماء کرام روایات کے زیر اثر نظریات اور معتقدات پہلے سے بنا لیتے ہیں۔ پھر ان ہی نظریات و معتقدات کو پیش نظر رکھ کر آیات کا وہ ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں جن سے ان کے وہ نظریات برقرار رہیں جو انہوں نے احادیث کے زیر اثر اختیار کئے تھے۔ مندرجہ بالا واقعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے جو خود پرویز صاحب نے بھی تحریر فرمائی ہے۔ کہ اگرچہ یہ علماء کرام نہایت قابل و عالم تھے لیکن پرویز صاحب کو ان پر صرف اس وجہ سے فوقیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے صرف قرآن خالص تھا۔ اور بس۔

ہماری تفاسیر میں غلط ترجمہ ہونے کی اصل وجہ ان حضرات کا احادیث سے متاثر ہونا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ ان کا علمی پایہ نہایت بلند تھا۔ ہم لوگ ان کی گرد راہ بھی نہیں بن سکتے۔ راقم سطور

ان کی کفش برداری کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اب آیت کریمہ کے مفہوم کی طرف مراجعت کی جاتی ہے۔ استدلال کتب کتب قواعدہ بجائے صرف قرآن کریم کی آیت سے کیا جائے گا تاکہ کسی صاحب کا کوئی اعتراض بھی باقی نہ رہے۔

ہمارے علماء کرام نے اپنے نظریہ کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے آیت کا ترجمہ زمانہ حال میں کیا ہے۔ ''اس رات میں تمام امور کی تقسیم ہوتی ہے'' حالانکہ اس کا ترجمہ ماضی میں ہونا چاہئے تھا۔ کہ اس رات میں تمام امور کی تقسیم ہوگئی تھی۔ کیونکہ یہاں **فعل** مضارع ماضی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کو عربی قواعد میں مضارع حکائی کہتے ہیں۔ ماضی کا قصہ بیان کرتے ہوئے ○ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ (12/56)

○ اور اس طرح ہم نے یوسف کو سرزمین مصر میں اقتدار عطا فرمایا کہ وہ جہاں چاہتا تھا قیام کرتا تھا۔ دیکھئے یہاں **یتبوا** اور **یشآء** دونوں **فعل** مضارع ہیں، لیکن چونکہ زمانہ ماضی کا قصہ یوسف بیان کر رہے ہیں، اس لئے ماضی کا فائدہ دے رہے ہیں۔ ایسے افعال مضارع کو مضارع حکائی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کا ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نے یہ کیا ہے۔

''اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس زمین میں جہاں چاہتا'' حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نے یہاں مضارع کا ترجمہ ماضی میں ہی کیا ہے۔ جو بالکل درست ہے لیکن تعجب ہے کہ جب یہ مضارع حکائی سورۃ دخان کی زیر بحث آیت میں آیا ہے تو وہاں صرف احادیث کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اس کا ترجمہ حال میں کرتے ہیں اس کو کہتے ہیں قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تحت رکھنا۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے سورۃ یوسف کی آیت (12/36) کا ترجمہ فرمایا ''وھم چنیں (یعنی بایں تقریب) منزلت دادیم یوسف را در آن زمین قرار میگرفت از آن زمین ہر جا کہ می خواست'' یہاں پھر شاہ صاحب نے **یتبوا** و **یشآء** کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے۔ اگر مولانا محمود الحسن صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تراجم یہاں پیش نہ بھی کئے جائیں تب بھی ہر

بات واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ سرزمین مصر میں جہاں چاہے جاتے تھے، یہ ماضی میں ہی تھا۔ اس وقت تو نہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں اور نہ وہ سرزمین مصر میں گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ سارا قصہ ماضی کا ہے لیکن استعمال مضارع کے صیغے میں ہو رہے ہیں۔

دوسری مثال۔ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ٥(12/102) اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے گئے اور اپنا کام، اور فریب کرنے لگے ٥۔ یہاں پھر مولانا محمود الحسن صاحب نے مضارع کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت تو فریب نہیں کر رہے ہیں ماضی میں ہی کر رہے تھے۔ تیسری مثال۔ سورۃ مجادلہ پہلی آیت قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ٥(58/1) سن لی اللہ نے اس عورت کی بات جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی اللہ کے آگے ٥۔ ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب۔ یہاں پھر مضارع حکائی کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ ماضی میں کیا ہے ہر آئینہ شنید خدائے تعالیٰ آں زن را کہ گفتگو میکرد با تو در باب شوہر خود و شکایت میکرد پیش خدا و خدا می شنید گفتگو کردن شما۔

قرآن کریم سے یہ تین مثالیں بطور استدلال مضارع حکائی کے متعلق آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ جن سے ثابت یہ کیا گیا ہے کہ مضارع حکائی کا ترجمہ ماضی میں کیا جاتا ہے۔ اس استدلال کے پیش نظر آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کو مبارک رات میں نازل کیا، ہم عذاب سے ڈرانے والے تھے، ایسی رات کو اس کتاب میں تمام حکمت کے کام فیصل کئے گئے تھے۔ **امراً من عندنا** یہ کتاب ہماری طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئی **رحمةً من ربك** یہ اللہ کی رحمت ہے اور رحمۃ نے پھر کتاب کی وضاحت کی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں لفظ قرآن کریم میں وحی کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

مقصد آیت کریمہ کا یہ ہے کہ قرآن کریم جس رات میں نازل ہوا تھا وہ بڑی بابرکت رات تھی اس رات میں حق و باطل، رشد و غوایت کے امتیازات نکھار کر بیان کر دیئے گئے تھے۔ قرآن

کریم نے اپنے نزول کی وجہ سے اس رات کو لیلۃ مبارکہ کہا ہے۔ وہ رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ بے شک وہ لیلۃ مبارک تھی۔ اس کے بعد نہ قرآن جیسی بابرکت کتاب نازل ہوئی اور نہ ہی کوئی دوسری رات لیلۃ مبارکہ ہوسکتی ہے۔ برکت والی رات صرف وہ رات تھی جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہ نظریہ کہ ہر سال شب قدر یا لیلۃ مبارکہ ہوتی ہے۔ حدیث بے خبراں سے زیادہ کچھ نہیں۔ آیت کریمہ کے وضاحت کے بعد شب برات کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

ماہ نومبر 2005ء

اذا زلزلت الارض

۸ اکتوبر ۲۰۰۵ کی صبح، اسلام آباد اور شمالی علاقہ جات میں جو زلزلہ آیا تھا، وہ بڑا ہی قیامت خیز اور تباہ کن تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پیشتر اس قسم کا زلزلہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس سے لاکھوں گھر ویران ہو گئے اور ہزاروں ناگہانی موت کے صدمے سے دوچار ہوئے۔ یہ حادثہ فاجعہ اور سانحہ داہیہ اس طرح اچانک واقع ہوا کہ اس کے وقوع سے پیشتر کسی قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اسکول میں معصوم بچے، جو نہایت سکون واطمینان سے اپنی تعلیم میں مصروف تھے، چند ہی منٹوں میں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اور افسوس کہ ماں باپ، اس قدر بے بس تھے، کہ وہ اپنے نونہالوں کو موت سے نہیں بچا سکے۔

زلزلہ کیا تھا قیامت تھی۔ لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہماری قوم کوئی مردہ یا بے بس قوم نہیں ہے۔ توقعات سے زیادہ عوام نے اس مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ پاکستان کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگرچہ فوج نے اپنا کردار بہت اچھی طرح ادا کیا، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ فوج کے آنے سے پیشتر ہی ہمارے عوام مرگلہ ٹاور پہنچ گئے انہوں نے بغیر کسی Equipment وآلہ جات کے اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو بچانا شروع کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ کام ہمارے میڈیا Media نے کیا۔ میڈیا کا تو ہر چینل اور ہر شخص اس کے لئے ہی وقف تھا۔ ہر طرح کے سابقہ پروگرام جو Entertainment کے ہو رہے تھے، سب منسوخ کر دئے گئے۔ بس ہر چینل پر زلزلہ کی خبریں ہی دی جا رہی تھیں۔ میڈیا کے لوگ تو فوج اور سرکاری اداروں کے لوگوں سے پیشتر ہی نہایت خطرناک اور دور افتادہ مقامات

تک پہنچ گئے تھے۔اس طرح میڈیا نے حکومت کو فوری اطلاعات فراہم کیں ،جس سے حکومت کو یہ آسانی ہوئی کہ اس نے ان اطلاعات کے مطابق فوری اقدامات لینے شروع کر دیئے۔

اس واقعہ سے قوم کی یہ ساری خوبیاں سامنے آئیں جو بڑی خوش آئند اور ہمت افزا ہیں البتہ ایک نہایت افسوس ناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ پر جو تبصرے ہمارے T.V چینلز پر کئے گئے ہیں، وہ سب نہایت سطحی ،طفلانہ، مضحکہ خیز، اور توہم پرستانہ تھے۔اور قرآن کریم کی تعلیم کے بالکل خلاف۔حیرت یہ ہے کہ اکثر حضرات دُنیاوی علوم وفنون میں نہایت بالغ نظر، پختہ فہم ہونے کے باوجود، جب مذہبی نظریات پر آتے ہیں تو وہ بچوں جیسی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ توہم پرستانہ نظریات واعتقادات اس طرح جاری و ساری، اور رچے بسے ہوئے ہیں کہ بچپن سے وہ اذہان میں مُرتسم ہو جاتے ہیں۔اور اکثر حضرات ساری عمر اُن سے باہر نہیں نکلتے۔اس واقعہ پر جو مختلف تبصرے ہمارے چینلز پر ہوئے ان میں یہ تین نکات نمایاں تھے جو تقریباً ہر چینل پر ہمارے علماء کرام اور دانشوروں نے بیان فرمائے۔

(1) یہ واقعہ ہمارے گناہوں اور برے اعمال کی وجہ پیش آیا۔

(2) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔

(3) یہ واقعہ ہماری آزمائش کے لئے ہوا ہے،اور ہمارے لئے ایک ابتلاء ہے۔

''دی نیوز'' اخبار کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔پاکستان کے اعلیٰ ترین اخبارات میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کی 15 اکتوبر کی اشاعت میں ایک مضمون میر خلیل الرحمٰن صاحب کا بعنوان' God Bless America ' شائع ہوا ہے۔اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ Rendering ہے۔امریکہ کے ایک شہری کا ایک خط اخبار میں طبع ہوا جس میں لکھا تھا کہ Katrina اور Rita کے واقعات کے بعد مسلمان یہ کہتے ہیں کہ امریکیوں نے جو کچھ عراق اور افغانستان میں کیا ہے ان کے ان اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ سزا دی ہے۔مراسلہ نگار اب حیران ہے کہ اب جو حادثہ پاکستان میں ہوا ہے تو

مسلمان اس کے بارے میں کیا توجیہ پیش کریں گے۔ لیکن مراسلہ نگار امریکن کو حیرانی ہوگی کہ یہاں کے اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا دی جارہی ہے۔ اس کی تائید مندرجہ ذیل بیانات کرتے ہیں۔

(1) عبدالستار ایدھی نے کہا کہ اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم نہ زکوۃ اور نہ ہی ٹیکس (TAX) ادا کرتے ہیں۔

(2) چوہدری شجاعت حسین صاحب، صدر مسلم لیگ کا یہ خیال ہے کہ زلزلہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اخلاق درست کرنے چاہئیں اور اللہ سے معافی طلب کرنی چاہیے۔

(3) مولانا فضل الرحمن صاحب نے فرمایا کہ زلزلہ ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نماز اور روزہ ترک کرنے سے ہم نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دی ہے۔ انہوں نے فرمایا کے آزاد خیالی کی وجہ سے شراب خوری، ناجائز شہوت پرستی، اور بدچلنی ایک فیشن بن گئی ہے۔ جو عذاب الٰہی کا سبب ہے۔

(4) حافظ محمد سعید صاحب، امیر الدعوۃ نے فرمایا کہ طبعی حوادث مسلمانوں کو ایک امتحان کے لئے پیش آتے ہیں۔ انہوں نے عوام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی طلب کریں اور درست راستہ پر چلیں۔ انہوں نے حکومت کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنی وہ پالیساں تبدیل کردے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہیں۔

(5) ملک ریاض، چیف آف بحریہ ٹاؤن، کا خیال ہے کہ نومنتخب شدہ ناظمین اور کونسلر نے جو 6 اکتوبر کو قرآن کریم پر جھوٹی قسمیں کھائی ہیں۔ یہ زلزلہ اس وجہ سے واقع ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ سب قرآن کریم کی بے حرمتی کرنے کے مجرم ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اب بھی معاف کرسکتا ہے اگر وہ سب منتخب نمائندے یہ قسم کھائیں کہ وہ آئندہ کبھی جھوٹی OATH نہیں لیں گے (دی نیوز 15 اکتوبر 2005ء)

یہ چند اقتباسات آپ نے ملاحظہ فرمائے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں جس قدر بھی بیانات اخبارات میں آئے اور جس قدر T.V چینلز پر نشر ہوئے تقریباً سب کے سب ان ہی نظریات کے حامل ہیں۔ خواہ دانشوروں کی طرف سے ہوں خواہ علماء کرام کی طرف سے ہر شخص کے دل میں یہ چور ہے کہ یہ زلزلہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے آیا ہے۔ ایسی چند جماعتوں نے اجتماعی دعا اور اجتماعی توبہ کے لئے اپیل کی ہے۔ فیصل مسجد اسلام آباد میں بھی نماز توبہ ادا کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ اس قسم کے حادثات اور کسوف وخسوف کے لئے نماز ادا کی جاتی ہے۔ ان بیانات پر تبصرہ کرنے سے پیشتر چار نظریات کی وضاحت ضروری ہے۔

(1) خدا کا صحیح تصور (2) ابتلاء کا نظریہ (3) فلسفہ عذاب (4) توبہ

انسان نے اپنی ابتدائی زندگی میں خدا، ملائکہ، دیوی دیوتا وغیرہ کا تصور ایسا ہی قائم کیا تھا جیسا کہ وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھ رہے تھے۔ چونکہ انسان کے سامنے بادشاہ سے بڑھ کر قوت کا مالک اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے خدا کو بھی بادشاہ کی طرح ہی اقتدار کا مالک بنایا۔ اس کے اردگرد مقربین، حاجب اور دربان کو جمع کیا۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے متعدد ہستیاں مقرر کیں۔ انسان اگر کوئی درخواست اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ کوئی نذرانہ بھی ادا کرے۔ کوئی سفارش کرنے والا اسے پہنچائے۔ ان درخواستوں کے فیصلے کسی قانون قاعدہ کے مطابق کے پابند نہیں ہوتے۔ اس تصور کی رو سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں، اپنی مرضی چلانے میں آزاد ہے، لہذا بندوں کی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ وہ خدا کو کس طرح راضی کرلیں۔ اس خوش رکھیں کیونکہ اس کے ناراض ہونے سے ایسے طبعی حادثات جیسے سیلاب، زلزلہ، آندھی، وغیرہ واقع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ تصور انسان کی ابتدائی زندگی، اپنے انسانی ذہن کا تراشیدہ تھا قرآن کریم کے خدا کا تصور قطعاً نہیں ہے۔ قرآن کریم کا اللہ نہ کسی سے خوش ہوتا ہے، اور نہ ہی کسی سے ناراض۔ قرآن کریم نے خدا کے متعلق یہ باطل تصور دور کیا اور اس کی جگہ یہ تصور پیش کیا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کردئیے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عالم اس نظم وضبط کے

ساتھ اور گرم عمل ہے۔ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلا (35/43) اللہ تعالیٰ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔انہیں **تقدیر اللہ** کہتے ہیں۔نظام کائنات فطرتوں کی اندھی قوتوں کی رو سے نہیں چل رہا ہے۔بلکہ غیر متبدل اور متعین قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔اسی لئے قرآن کریم نے مطالعۂ فطرت اور مشاہدہ کائنات پر بڑا زور دیا ہے مطالعہ فطرت سے قوانین خداوندی بے نقاب ہوکر انسان کے سامنے آجاتے ہیں۔جن کا تعلق نظم و نسق کائنات سے ہے۔زلزلہ یا دیگر تمام حادثات کائنات کے قوانین کے ماتحت واقع ہوتے ہیں۔اس میں نہ انسانوں کی بدعملیوں کا دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی خوشی و ناراضی کا کوئی دخل۔انسان کو اختیار و ارادہ کی نعمت سرفراز کیا گیا ہے۔اور اس کو بے پناہ قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے۔اس کے متعلق ارشاد ہوا۔

o وَسَخَّرَ لَکُم مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ جَمِیْعاً مِّنْهُ (45/13) o ارض وسموات میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمھارے لئے مسخر کردیا ہے۔کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور انسان میں اس بات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کو دریافت کرسکے،قرآن کریم میں خدا کا تصور یہ ہے کہ اس نے جو یہ قوانین جاری کردیئے ہیں وہ خود بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے مثلاً عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6/12) اس نے اپنے پر رحمت فرض کرلی ہے۔اگرچہ وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے لیکن وہ اپنے اصول وقوانین خود نہیں توڑتا اور کائنات میں اور انسانوں کی دنیا میں مداخلت نہیں کرتا۔یہ بات کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی دنیا میں مداخلت نہیں کرتا،اس کے متعلق کئی بار تحریر کیا جاچکا ہے۔اگر کوئی صاحب اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہوں تو وہ ماہنامہ 'صوت الحق' کے اگست 2005ء کے شمارے میں کمترین راقم سطور کا مضمون ملاحظہ فرمالیں۔

کائنات کی ہر چیز انسان کے زیرِ تسخیر ہے۔اس لئے جس قدر انسان سائنس میں ترقی کرتا چلا جائے گا،اسی قدر وہ ان حادثات کی وجہ،اس کا سبب اور اس کی لم معلوم کرتا چلا جائے گا۔

اوران حوادث کوواقع ہونے کو پہلے سے معلوم کرے گا۔اس طرح اس کے نقصانات سے ایک حد تک محفوظ ہوجائے گا۔اوراس بات کا بڑاقوی امکان ہے کہ وہ ان حادثات کا تدارک ان کے واقع ہونے سے پیشتر کرلے،اوران کوواقع ہی نہ ہونے دے۔خارجی کائنات کے یہ حوادث لوگوں کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے۔کیونکہ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص خطہ زمین کے انسانوں نے اخلاقی بدعملیاں شروع کیں اوران کو اس قسم کا حادثہ پیش آ گیا ہو،اس قسم کے حوادث دنیا کے ہر خطہ میں آتے رہتے ہیں۔اور نیک وبد ہر قسم کے لوگ اس سے تباہ ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی صرف بداعمال لوگ اس سے تباہ ہوتے ہیں البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جس قوم میں اجتماعی بدکرداری آجائے اور وہ قوم عیش وعشرت میں مشغول ہوجائے اور ملک کا نظم ونسق بالکل خراب ہوجائے گا تو اس قوم کو ایسے طبعی حادثہ سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔جیسا کہ ہمارے ہاں اس بارے میں ہوا۔اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ہمارے شہروں اور دیہات میں جو پُرانے مکانات اچھے میٹریل کے ساتھ بنائے گئے تھے،وہ قائم رہے،اور حالیہ دور کے تعمیر کردہ مکانات،جن میں بددیانتی کی وجہ سے گھٹیا میٹریل استعمال کیا گیا تھا وہ سب گر گئے۔یہ نقصان طبعی حادثہ سے نہیں ہوا،بلکہ یہ قوم کا اپنے نظم ونسق درست نہ رکھنے کی وجہ سے ہوا۔اسی طرح مارگلہ ٹاور کا حال ہے۔اخبارات کی اطلاعات کے مطابق اس میں بہت ناقص میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔مزید یہ کہ اس میں کافی عرصہ پیشتر سے CRACKS آچکے تھے،اس لئے یہ زلزلہ برداشت نہیں کرسکی جبکہ اس کے ساتھ کی تمام عمارات بدستور قائم ہیں۔اس کے گرنے کا سبب اس کے رہنے والوں کے بداعمال،یا ترکِ صوم وصلوٰۃ نہیں ہے،بلکہ ملک میں عام نظم ونسق کے خراب ہونے کے باعث،کرپشن عام ہوگئی،جس کی وجہ اس کے بنانے والوں نے بددیانتی کی اور بُرا میٹریل استعمال کیا۔اس لئے اس کے گرنے کے ذمہ دار اس کے بنانے والے ہیں نہ کہ رہنے والوں کی بداعمالیاں۔

ہمارے ہاں عام دستور یہی ہے کہ جب بھی طبعی حادثہ رونما ہوتا ہے تو لوگ اس کو عذاب

خداوندی سمجھنے لگتے ہیں۔ بارش نہ ہو تو عذاب، سیلاب یا زلزلہ آ جائے تو عذاب، یعنی دنیا میں کہیں اس قسم کے حوادث رونما ہوں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ حالانکہ اس قسم کے حوادث تو ہوتے ہی رہتے ہیں جو ممالک سائنٹفک علوم میں بیش از بیش تحقیقات کرتے رہتے ہیں وہ ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ان کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ جس قدر نوع انسانی سائنس میں ترقی کرے گی، اس قدر ان حوادث پر قابو پالیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ یہ کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان نہ صرف ارضی حادثات بلکہ کسوف وخسوف تک کو قابو میں نہ لے آئے۔ اس قسم کے کائناتی حوادث کے متعلق یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں عذاب دیتا ہے، درست نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں جو مشکل مقام اور Core Issue ہے۔ جو ہمارے دانشوروں اور علماء کرام کو Confuse کرتا ہے۔ وہ سابقہ اقوام کے وہ کوائف ہیں جو قرآن کریم نے مختلف اقوام کی تباہی و بربادی کے سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اس سلسلہ میں قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوطؑ، وغیرہ کے احوال بڑے غور وفکر کے متقاضی ہیں کہ ان تمام اقوام پر جو عذاب آیا، اس کی کیا وجہ تھی۔ ہمارے علماء روایات کا یہ نظریہ کہ انسانی اعمال اور فطری حوادث میں ایک ربط ہوتا ہے اور یہ فطری حوادث انسان کی بدعملیوں سے Related ہیں لیکن علمائے اہل قرآن اس طرف گئے ہیں کہ یہ حوادث ان کے اخلاقی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ ان کی تباہی کا ذریعہ بنا دیئے جاتے تھے۔ وہ طبعی حادثہ تو اپنے طبعی قوانین کے مطابق واقع ہونا ہی تھا، لیکن اس کا وقت اس قوم کی تباہی کے ساتھ Coincide اور Synchronize ، توافق یا تواقت کر جاتا تھا۔ اور وہ قوم تباہ ہو جاتی تھی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طبعی حادثہ کا علم، اس قوم کے رسول کو وحی کے ذریعے پہلے سے مل جاتا تھا، اور وہ قوم کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کر لیتا تھا یا وحی کے حکم کے مطابق وہ اس قوم کو لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتا تھا۔

حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم ملا۔ ان کی قوم ان کی کشتی بنانے پر مذاق اڑاتی رہی۔ لیکن وہ حکم خداوندی کے مطابق کشتی بناتے رہے۔ چنانچہ جس وقت سیلاب آیا، تو حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی مومنین تو اس کشتی کی وجہ سے محفوظ رہے باقی ساری قوم غرق ہوگئی اس میں اصل بات حضرت نوحؑ کو قبل از وقت خبر ملنا ہے۔ جب تک انبیاء کرام آتے رہے، وہ اس طرح اپنی قوم کو پہلے سے خبر دیتے رہے، اب یہ کام خود مسلمان دانشوروں اور سائنس دانوں کا ہے کہ وہ سائنس میں اس درجہ ترقی کریں کہ وہ اپنی (مسلمان) قوم کو اس طرح کے طبعی حوادث کی قبل از وقت اطلاع دیں۔ تاکہ حکومت اور قوم اس سے بچنے کا انتظام کرے۔ حضرت نوحؑ کے واقعات کے سلسلہ میں یہ بات غور طلب ہے کہ جو تباہی طبعی اسباب کے ذریعے آتی ہے (مثلاً سیلاب) اس کی حفاظت بھی طبعی اسباب (کشتی) کے ذریعے ہی ہوتی ہے، دعا، درود، یا ورد، وظائف یا کسی روحانی طریقے سے وہ دور نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک آزمائش کے تصور کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نہیں آزماتا۔ ہمارے عزیز و اقارب دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دیکھیں کہ وہ اپنے قول میں سچے ہیں یا نہیں۔ اس لئے ہم اپنی پریشانی میں ان سے استمداد کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر اپنے دعویٰ میں صادق القول ہیں۔ اس طرح ان کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اس طرح کی آزمائش کی کیا ضرورت۔ وہ تو خود علیم و خبیر ہے۔ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے۔ البتہ وہ ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے اور دیکھے کہ وہ کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں۔ اس قسم مصائب و آلام سے ہم اپنی خود آزمائش کر لیتے ہیں کہ ہم میں حوصلہ و ہمت کس قدر ہے اور ہم مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کس قدر طاقت رکھتے ہیں۔ یہ مصائب و مشکلات ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے کے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں جس ابتلاء کا ذکر آتا ہے، اس سے یہی مقصود ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی مقصد کے لئے ہماری آزمائش کرتا ہے۔ وہ ذاتِ بزرگ و برتر، اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ابتلاء در حقیقت محاسبہ خویش کا دسرا

نام ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ o وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ (2/124) o جب اس کے رب نے ابراہیم کے لئے مختلف قوانین کے ذریعے اس کی نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے۔ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی کے مختلف حوادث اس کے سامنے آئے تاکہ وہ دیکھ سکے کہ اس کی صلاحیتیں کس درجہ بیدار ہو چکی ہیں۔

ابتلاء کے اس قرآنی مفہوم کے مطابق آپ نے خود ملاحظہ فرمالیا کہ ہماری قوم اس موقع پر نہایت کامیاب رہی۔ اس حادثہ سے یہ اندازہ ہوا کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور اس قسم کے حوادثات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان کا کوئی شہری ایسا نہیں ہوگا کہ جس نے اس سلسلہ میں کوئی امدادی کام نہ کیا ہو۔ عموماً سب لوگوں نے عملاً اس میں حصہ لیا ہے۔ ہمدردی اور ایثار کا جذبہ اس درجہ بیدار ہوا کہ جوانوں نے اپنی زندگی داؤں پر لگا کر دوسروں کو بچایا۔ ہر شخص نے مالی امداد میں مسابقت کی۔ اور ہمارے میڈیا کے لوگ تو خصوصاً بڑی تعریف کے مستحق اور سزاوار ہیں۔ ان مواقع سے قوموں کے حوصلے، ہمت، ہمدردی، ایثار، اتفاق کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور یہی قرآنی ابتلاء کا مفہوم ہے۔

جہاں تک توبہ مانگنے کا تعلق ہے جسے اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لئے فیصل مسجد اسلام آباد میں لوگ جمع ہو رہے ہیں اور وہاں سب مل کر نماز پڑھنے کے بعد توبہ مانگیں گے۔ تو یہ بات بھی قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔ توبہ مانگنے کی چیز نہیں ہوتی توبہ تو ایک عملی قدم ہے۔ یعنی غلط کام کے نقصان رساں نتائج کے تدراک کے لئے صحیح کام کرنا۔ آپ نے کسی شخص سے ایک رقم لی، اور اس کے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ عرصے بعد، حالات کے اقتضاء کے مطابق، آپ نے شرمندگی محسوس کی۔ آپ نے اس کی وہ رقم ادا کر دی، اور آئندہ زندگی میں دیانتدار رہنے کا دلی عہد کیا۔ یہ آپ کی توبہ ہے۔ کسی شخص نے شراب پینا اپنا معمول بنایا پھر اس کو اندازہ ہو کہ اس سے اس کی صحت خراب ہو رہی ہے، وہ اپنے اس عمل پر نادم ہوا، اور آئندہ زندگی بھر شراب نہ پینے کا عزم کر لیا۔ یہ اس کی توبہ ہوئی۔

اس صورت میں توبہ یہ ہے کہ مارگلہ ٹاور کی تعمیر میں جس قدر لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس میں Involve ہوں۔ وہ سب اپنے دل سے نادم ہوں اور آئندہ عمارات کی تعمیر میں بددیانتی یعنی گھٹیا میٹریل لگانے سے اجتناب کریں۔ تو یہ ان کی توبہ ہے۔ توبہ کے لئے مسجد میں جانا اور نماز پڑھنا ضروری نہیں۔ اس موقع پر توبہ صرف ان لوگوں کو کرنی چاہئے جنہوں نے یہ ٹاور بنایا تھا۔ یا ان لوگوں کو بھی جنہوں نے کسی جگہ بھی کسی تعمیر میں بددیانتی کی۔ جن لوگوں نے کسی تعمیر میں حصہ نہیں لیا، جن کا کوئی تعلق تعمیر کے شعبہ سے نہیں انہیں توبہ کی کوئی ضرورت نہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صدر مضمون میں دو باتیں تحریر کی گئی تھیں۔ اول یہ کہ ابتلاء کا قرآنی مفہوم محاسبہ خویش ہے۔ اور دوسری یہ کہ مسلمان سائنس دانوں کو وقت سے بہت پہلے طبعی حوادث کا علم حاصل کر کے قوم کو قبل از وقت آگاہ کر دینا چاہئے۔ ان دونوں باتوں کی تائید میں مندرجہ ذیل اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

لندن کے مشہور قدیمی اخبار گارڈین مورخہ 18 اکتوبر 2005

میں ایک مضمون Un-Ending Disaster طبع ہوا ہے اس کا پہلا فقرہ مع ترجمہ کے تحریر ہے National Disasters are always a test of our Capacity to Empathise with other People's problems, and the massive earthquake that has devasted parts of Pakistan and India is no execption.

کا آزاد ترجمہ یہ ہے۔

طبعی حوادث ہمیشہ ہماری صلاحیت کا Test کرتے ہیں کہ ہم میں دوسروں کے مصائب میں شریک ہونے کی کتنی صلاحیت ہے اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور ہندوستان میں جو زبردست زلزلہ آیا ہے وہ اس Test سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرماسکتے ہیں کہ قرآن کریم نے ابتلاء کا جو مفہوم بتایا تھا، آج یہ اخبار کس طرح اس کو اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔

یہاں اخبار نے ابتلاء کے لئے Test یعنی محاسبہ خویش کا ہی لفظ استعمال کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ چونکہ انبیاء کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اس لئے مسلمان سائنسداں خود طبعی حادثہ کے واقع ہونے کی اطلاع قوم کو دیں۔اس بارے میں عرض ہے کہ ایک خط ''دی نیوز'' اخبار کی 18 اکتوبر 2005ء کی اشاعت میں طبع ہوا ہے جس کا آزاد ترجمہ پیش خدمت ہے۔

اسلام آباد اس سے بھی بڑے زلزلہ کی زد میں (ہے) 'دی نیوز' اخبار کی اگست 2001ء کی اشاعت میں واشنگٹن سے آمر متین صاحب کا ایک مضمون عنوان بالا کے ساتھ شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں ساری تفاصل نقشوں کی مدد سے اس طرح پیش کی گئی تھیں کہ وہ باآسانی سمجھ میں آسکیں۔

آمر متین صاحب نے ماہر سائنسدانوں کے حوالے سے لکھا تھا کہ اس خطہ میں زلزلہ اس وجہ سے آتا ہے کہ ہمالیہ کے نیچے جو Plates ہیں وہ سرکتی ہیں۔اگر ان Plates کے سرکنے میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو (زلزلہ کی) شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔چونکہ کافی عرصہ سے زلزلہ نہیں آیا تھا، اس لئے خدشہ تھا کہ آئندہ جو تباہی آئے گی وہ زیادہ شدید ہوگی۔نیویارک ٹائمز کا حوالہ دیتے ہوئے ،اس مضمون میں تحریر تھا'' جدید شہادت کی وجہ سے سائنس دانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ مزید تباہی آنی نہ صرف لابدی ہے۔بلکہ اس تباہی کے آنے میں دیر ہوگئی ہے''۔اس با ت کا اندازہ تو ہر شخص خود ہی کرسکتا ہے کہ محکمہ موسمیات نے اس انتباہ کو کیوں نظر انداز کردیا۔متین صاحب جو واشنگٹن میں رہتے ہیں، اور ماہر ارضی ہیں، اور وہ پاکستانی نژاد ہیں۔تو انھیں اس معاملہ کا پاکستانی حکومت سے تعاقب کرنا چاہئے تھا۔اس مضمون میں یہ بھی پیش گوئی تھی کہ 40 ہزار آدمی فوت ہوں گے اور ایک لاکھ زخمی (یہاں خط ختم ہوتا ہے)

آپ اس خط سے ملاحظہ فرماسکتے ہیں کہ نہ صرف اس حادثہ کا، بلکہ مزید حادثات کے واقع ہونے کے امکان کا، کس طرح 4 سال پیشتر (اگست 2001ء میں) سائنس دانوں کو علم تھا اور ختم نبوت کے بعد کس طرح، مسلمان سائنس دان، اپنی قوم کے ان افراد کو بچاسکتے ہیں جو ان کے

انتباہ کو اہمیت دیں گے۔ اور اب یہ حکومت پر فرض ہے کہ وہ اس انتباہ کو اہمیت دے ابھی سے حفظ ماتقدم کے طور پر، ان Anticipated حادثات سے بچنے یا ان کے نقصانات کو کم کرنے کی کوشش کرے۔

ماہ دسمبر 2005ء

28

اخبار ڈیلی ٹائمز کے ایک مضمون پر تبصرہ

روز نامہ ڈیلی ٹائمز کے مضامین عموماً بہت معلومات افزا ہوتے ہیں ۔ یہ اخبار Leftist رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔لیکن اس میں بسا اوقات اسلام،قرآن مسلمانوں سے متعلق مضامین طبع ہوتے رہتے ہیں جو معلومات افزا اور معنی خیز ہوتے ہیں۔اس اخبار کی مورخہ 8 اگست کی اشاعت میں ایک مضمون ’’قرآن (ایک) اخلاقی یا قانونی ضابطہ؟،، کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔یہ مضمون محترمہ فرزانہ حسن شاہد کا تحریر کردہ ہے جو کینیڈا کے شہر Toronto میں مقیم ہیں پاکستانی نژاد ہیں۔مضمون علمی اور سنجیدہ ہے۔کمترین راقم سطور نے اس کا آزاد ترجمہ کیا ہے جسے Rendering کہنا زیادہ مناسب ہے ترجمہ کرنا ایک بہت اکتانے والا کام ہوتا ہے۔حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اس کے وہ سارے نکات سامنے آجائیں جو تبصرہ کے متقاضی ہیں۔اس مضمون پر اگرچہ مختصر سا تبصرہ بھی تحریر کیا جارہا ہے تاہم مقصد اس کا اصل یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کو اس بات کا علم ہو جائے کہ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی پاکستانی مسلمان موجود ہیں، اپنی بساط کے مطابق قرآن کریم پر غور وفکر کر رہے ہیں ۔نیز یہ کہ اس مضمون سے ان کی فکر سے بھی آگاہی ہوگی ۔اصل مقصد مضمون کو پیش کرنا ہے۔تبصرہ صرف ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

﴿مضمون کا ترجمہ﴾

قرآن کریم ،اخلاقی یا قانونی ضابطہ؟

حال میں Quebec گورنمنٹ نے ایک فیصلہ جاری کیا ہے جس کے ذریعے

اسلامی عدالتوں کو جو کہ کینیڈا کی عدالتوں کے ساتھ کام کر رہی تھیں ختم کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی کچھ تعداد نے تو اس فیصلے کو سراہا ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں مذہبی امور کو آزادی سے ادا کرنے کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمان قرآن کریم کے احکامات پر عمل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور ان سے انحراف کو گناہ شمار کرتے ہیں۔

کچھ مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم کے عدل و انصاف پر مبنی اخلاقی اصولوں اور قانونی احکامات میں تضاد واقع ہو جائے تو اخلاقی ضوابط کو اختیار کر لینا چاہئے۔ شرعی قوانین کے اطلاق کے سلسلہ میں بہت سے امتیاز کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ شرعی قوانین کو Ontario اور دیگر مسلمان ممالک میں ختم کر دیا جائے اعداد و شمار سے اپنے موقف کی تائید کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل سبب و حکمت کے باعث اپنے موقف کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جن حالات میں قرآن کریم نازل ہوا، وہ حالات و ماحول قرآن کریم کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ مرد و عورت کے باہمی تعلقات، معاشرتی دباؤ، قبائلی اثرات، کئی کئی شادیوں کا رواج نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔ قرآن کریم نے اس زمانے کی معاشرتی رسوم کو کو درست تو کیا، لیکن ان کے منفی اثرات کو بالکلیہ ختم نہیں کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ قرآنی اصلاحات ایک بہترین معاشرہ تو قائم نہ کر سکیں البتہ اس دور کی ضروریات کو انہوں نے عمدہ طریقہ سے حل ضرور کر دیا۔ اگرچہ قرآن کریم نے ایک اچھی کمیونٹی تخلیق کر دی، جس میں اس دور کی ماڈرن سوسائٹی کی بنیادی باتیں بھی تھیں تاہم آج کل کی سوسائٹی، جس میں مرد و عورتوں کے باہمی تعلقات، مساوات، عدل و انصاف جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں، ان کو وجود میں لانے کے لئے بہت محنت و تدبر کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم کے زیادہ تر قانونی اقدامات وقتی اسباب کے باعث تھے۔ کچھ احکامات اس درجہ مخصوص تھے کہ ان کا تعلق صرف حضورؐ کے افراد خانہ سے تھا۔ ان قوانین کو نہ تو عالمگیر سمجھنا چاہئے اور نہ ہی وہ آج کی مشکلات کا حل ہیں۔ ان وقتی قوانین پر فی الفعل عمل کرنے سے، قرآن

زمانہ کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتا۔اور اس طرح اس کی یہ صلاحیت کہ ہر زمانہ کا ساتھ دے کم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں نے نسل بعد نسل ان احکامات میں قیاس کو استعمال کر کے، ان احکامات کو عالمگیر اور ابدی بنانے کی کوشش کی ہے۔قرآن کریم کے بنیادی قانونی ڈھانچہ سے، شریعت کا نظام تشکیل دیا گیا ہے۔لیکن چونکہ اس نظام میں قرآن کریم کے علاوہ ثانوی ذریعے سے بھی کام لیا گیا ہے۔اس لئے اس میں سقم باقی رہ گیا ہے۔قرآن کریم نے زنا کے قوانین بنائے۔لیکن زنا بالجبر کا قانون نہیں بنایا کہ وہ قیاس کے ذریعے بنایا جا سکتا تھا۔چنانچہ اس کی تشریح و تعبیر میں ایک سقم باقی رہ گیا کہ فقہا نے زنا بالرضا و زنا بالجبر کو ایک ہی جرم تصور کر لیا۔چنانچہ پاکستان میں ان کے لئے الفاظ تقریباً ایک جیسے ہیں۔کنواری یا شادی شدہ عورت سے بد چلنی کرنا۔اور زبردستی کسی سے بد چلنی کرنا بھی زنا بالجبر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ قوانین نہیں ہے بلکہ اس نے خاص حالات سے تعرض کیا ہے۔کیونکہ اس سوسائٹی میں زنا عام تھی اس لئے اس نے پردہ جاری کیا اور زنا کو جرم قرار دیا اس کے خلاف قرآن کریم میں زنا بالجبر، جنسی تشدد، اور لواطت کے احکامات نہیں ہیں۔قتل کے جرم میں بھی اختیار دیا گیا ہے متاثرہ کنبے کے لوگ چاہیں تو معاف کر دیں اور چاہیں تو دیت وصول کر لیں اسی طرح قبائلی قوانین میں بھی جہاں جدی رشتہ داروں کے حقوق تسلیم کئے جاتے تھے۔وہاں وراثت کے قوانین جاری کئے گئے جو عورتوں کے حقوق کے لئے زیادہ سازگار تھے۔چونکہ اس وقت سود سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا تھا، اسے منع کر دیا گیا۔چنانچہ قرآن کریم کے اپنے نزول کے دوران جو مسائل پیدا ہو رہے تھے۔قرآن کریم نے ان کا نوٹس لیا۔لیکن اس کے علاوہ دوسرے معاشروں کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کہ جن کے لئے قوانین عطا کئے جاتے۔

اگرچہ مسلمان قرآن کریم کو ایک ابدی قانون مانتے ہیں لیکن قدامت پسند اور مجددین کا اس بات میں اختلاف ہے کہ قانونی لحاظ سے اس ابدیت سے کیا مراد ہے۔مجددین کا خیال ہے کہ

قرآن کریم کے اصول تو ابدی ہیں لیکن نزول قرآن کریم کے وقت جس طریقہ سے ان کا اطلاق ہوا ہے وہ طریقہ ابدی نہیں ہے۔ان اصولوں کو نہایت دیانت داری سے ایسے قوانین کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے جو سب کے لئے انصاف فراہم کر سکتے ہیں۔خصوصاً غربا و مساکین کے لئے۔مسلم کینیڈین کانگریس اور کونسل کا خیال ہے کہ کینیڈین قوانین ان کی ضروریات کے لئے زیادہ بہتر ہیں۔انہیں اسلامی قوانین سے بدلنا مناسب نہیں ہے۔کیونکہ اس طرح مسلمان آبادی مقامی آبادی سے الگ ہو جاتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ کینیڈین قوانین قرآن کریم کے زیادہ قریب ہیں۔اس لئے وہ کیوبک Quebec گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو پسند کرتے ہیں۔اور توقع کرتے ہیں کہ Ontario گورنمنٹ بھی Arbitration Act پر نظر ثانی کرے۔اور آخر لامر اسلامی عدالتوں کو ختم کر دے گی کینیڈین مسلمان، پاکستان میں اور دیگر اسلامی ممالک میں حدود قوانین کو منسوخ کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔

ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن خود ملتفتی اور فیصلہ طلب نکات پر مشتمل ہے۔مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کینیڈا میں وہاں کی مقامی عدالتوں کے علاوہ کچھ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق بھی فیصلے کرتی تھیں جن کو محترمہ مصنفہ صاحبہ نے Islamic Courts کے نام موسوم کیا ہے۔یہ بات کہ وہاں اسلامی عدالتیں بھی تھیں یہاں کے عوام کے علم میں نہیں ہے۔کیوبک گورنمنٹ نے عدالتیں ختم کر دی ہیں جس کے ردعمل کے طور پر وہاں کے بزرگ حضرات اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔لیکن کچھ حضرات کا خیال ہے کہ عدل وانصاف پر مبنی اصولوں، اور قانونی احکامات میں اگر تصادم واقع ہو تو قانونی احکامات کے بجائے اخلاقی ضوابط کو اختیار کر لینا چاہئے۔مصنفہ نے یہ تحریر تو کیا ہے کہ جو حضرات اس کے حامی ہیں وہ اس کی مثالیں پیش کرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کرتے ہیں۔لیکن مضمون زیر نظر میں انہوں نے کوئی مثال تحریر نہیں کی ہے اور ہمارے خیال میں ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔کیونکہ قرآن کریم کے قوانین عدل وانصاف کے خلاف نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک اسلامی کورٹس کے کام کرنے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ایک اصولی بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔ اسلامی قوانین صرف اسلامی حکومت ہی جاری کر سکتی ہے۔ اگر کوئی غیر اسلامی حکومت اسلامی قوانین جاری کرتی ہے تو وہ قوانین اسلامی نہیں ہو جاتے۔ بھارت کی حکومت اگر کسی وجہ سے شراب کو ممنوع قرار دیدے تو اگر چہ یہ قانون قرآن کریم کے مطابق ہے لیکن یہ اسلامی قانون نہیں ہوگا۔ اگر بھارت کی حکومت زنا کے مجرم کو سو کوڑے لگانے لگے، تو یہ اسلامی قانون یا اسلامی سزا نہیں ہوگی۔ اسلامی قوانین صرف وہ ہوتے ہیں جو اسلامی حکومت نافذ کرتی ہے چنانچہ استشہاداً و تائیداً "تدبر قرآن، سے یہ چند جملے نقل کئے جاتے ہیں۔ حد کے اجراء و نفاذ کے لئے دارالسلام یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک یہ شرط لازمی ہے۔ یہ احکام نازل ہی اس وقت ہوتے ہیں جب اسلامی حکومت مدینہ میں استوار ہوگئی ہے،، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ جبکہ عام دنیاوی حکومتوں کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ سیکولر حکومتیں جب اسلامی قانون نافذ کرتی ہیں، تو ان کی اطاعت سے ان حکومتوں کی اطاعت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی اس وجہ وہ قوانین اسلامی شمار نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو اس کے دو نتائج ہوتے ہیں۔ ایک تو اس نے حکومت کی خلاف مرضی کی۔ اور دوسرے اس کے نفس پر غلط اثرات مرتب ہوگئے جو اس نفس کے اضمحلال کے باعث ہوئے۔ دنیاوی حکومت جب سزا دیتی ہے تو اسے دنیاوی بدنی سزا تو مل جاتی ہے۔ لیکن اس کے نفس پر غلط مرتب شدہ اثرات قائم رہتے ہیں ہاں اگر اسلامی حکومت کسی کو سزا دیتی ہے تو اس کی سزا دنیاوی بھی ہوتی ہے اور اس حکومت کی سزا پوری کرنے سے اس کی نفس پر مرتب شدہ اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے غیر اسلامی حکومتوں کے احکامات اسلامی نہیں ہوسکتے۔ اس اصولی بات کے ملاحظہ کے بعد آپ خود غور فرمائیں کہ کینیڈا کی اسلامی عدالتوں کی اسلام کے نزدیک کیا پوزیشن تھی۔ ہمارے نزدیک ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر تھا۔ صرف ایک تسلی خاطر ہی تھی۔

اگر کوئی قانون خلاف قرآن نہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ Law Of The Land کو ہی Follow کیا جائے۔مثال کے طور پر نکاح کے انعقاد کے لئے ،لڑکے اور لڑکی کا مسلمان ہونا، دونوں کی بلوغت، تراضی مابین ،اعلان، مہر، یہ سب امور لازمی ،اور نکاح کے شرائط میں شامل ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط ساقط ہو جائے تو نکاح درست نہیں ہوتا۔ لیکن نکاح کا طریقہ قرآن کریم نے مقرر نہیں فرمایا اگر یہ پانچوں شرائط موجود ہوں تو نکاح کا جو طریقہ لندن یا کینیڈا میں مروج ہے۔اس کے مطابق وہاں کے مسلمان بھی نکاح کر سکتے ہیں۔آج سے چند سال پیشتر لندن میں اس مسئلہ پر بہت بحث ہوئی پاکستان کے ایک معروف عالم وہاں یہ فتوی دے آئے تھے کہ لندن کے معروف طریقہ کے مطابق مسلمان اگر نکاح کر لیں تو جائز ہے۔ چنانچہ وہاں 'جنگ' کے دفتر میں ایک مشاورتی میٹنگ ہوئی جس میں وہاں کے وکلاء بیرسٹر حضرات، اور علمائے کرام نے شرکت فرمائی۔ وکلاء و بیرسٹر حضرات نے ان عالم دین کی رائے کی تائید کی مگر علمائے کرام اس پر متفق نہیں ہو سکے۔اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب علمائے کرام نکاح پڑھاتے ہیں تو ان کو ایک سو پاؤنڈ بطور نذرانہ کے ملتے ہیں۔اگر لندن کے مروجہ سرکاری طریقہ پر نکاح ہو تو وہ اس سے محروم رہتے ہیں اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

یہ خیال کرنا کہ قرآن کریم کی اصلاحات صرف اس دور سے متعلق جب کہ قرآن کریم نازل ہوا تھا اور وہ احکامات بھی اس معاشرے کی خرابیوں کے پیش نظر نازل ہوئے تھے جو اس وقت عام ہو رہی تھیں، درست نہیں ہے۔قرآن کریم کے قوانین و احکامات کوئی وقتی یا ہنگامی نہیں تھے بلکہ وہ دائمی ، عالمگیر اور ابدیت کنار تھے۔وہ نہ صرف چند اصلاحات پر مبنی تھے بلکہ قرآن کریم نے زندگی کے ہر ہر شعبے میں راہنمائی عنایت فرمائی عام اس سے کہ وہ سیاسی ،سماجی ،معاشرتی ،تمدنی ہو، یا اس کے اعمال کے نتائج کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہو۔اس نے زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت و اکائی قرار دے کر، اور حقیقت کا بالکلی ادراک کر کے یہ احکامات نازل فرمائے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس سے ملتا جلتا نظریہ آیات کے شان نزول کا مروج ہے کہ ہر آیت کسی نہ کسی واقعہ کے سبب

سے نازل ہوئی ہے۔لیکن یہ نظریہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔قرآنی آیات کا نزول انسانی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ہوا، اور وہ تقاضے ہی آیات کا شان نزول ہیں۔قرآن کریم ایک باقاعدہ تدبیر الٰہی کے ماتحت اور بہترین ترتیب کے مطابق نازل ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (25/32) مفہوم o اے رسول اس قرآن کو نجماً نجماً اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا جائے اور اس طرح اس کے خوشگوار نتائج تمہارے لئے تقویت اور ثبات قلب کا موجب بنتے جائیں۔اس کی تمام تعلیم، باہمدگر مربوط ہے اور ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ، سلسلہ درسلسلہ، آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ایک مسلسل پروگرام کو اسی ترتیب کے ساتھ سامنے آنا چاہئے تھا۔(مفہوم القرآن)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم خلا (Void) میں نازل نہیں ہوا تھا قرآن کریم جس معاشرے میں نازل ہوا وہ ایک قائم شدہ معاشرہ تھا جس میں عرصہ دراز سے رسوم وروایات چلی آرہی تھیں۔افراد معاشرہ ان رسوم کے پابند تھے۔ان کے ہاں بھی قدریں (Values) تھیں ان میں بُرے اور اچھے کی تمیز کی جاتی تھی۔شہرت، نیک نامی وبدنامی کے پیمانے مقرر تھے۔ لوگوں میں نیکی وبدی کے داعیات موجود تھے اور نیک عملی اور بدعملی ان کی وجہ شہرت بھی ہوتی تھی اس حالات میں قرآن کریم اپنی انقلاب انگیز قدروں کے ساتھ نازل ہوا۔معاشرے میں جو اچھی رسوم وروایات تھیں ان کو جاری رکھا، جو رسوم وروایات بُری تھیں، قرآن کریم نے ان کا سدباب کردیا۔ شادی بیاہ کی وہ رسوم جن سے معاشرہ میں لوچ ولچک پیدا ہوتی ہے، وہ برقرار رکھیں۔دعوت ولیمہ عربوں کی ہی رسم تھی اس کو جاری رکھا البتہ تعداد ازدواج، نکاح کے شرائط، عورتوں کی حفاظت کے لئے مہر کی رقم، کو رواج دیا گیا۔جہاں تک حضورؐ کی ازواج مطہرات کے متعلق محترمہ مصنفہ صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے کہ کچھ احکام خاص ازواج مطہرات کے متعلق تھے اور ان کا اطلاق عمومی نہیں ہے۔ حضورؐ کے اپنے لئے اور ازواج مطہرات کے لئے بھی جو احکام تھے قرآن کریم نے ان کی الگ نشاند

بتی کر دی ہے۔ حضور کے لئے تہجد، جہاد و نماز میں امامت کے فرائض انجام دینا، ازواج کے لئے پردہ کے احکامات، دوسری شادی کی ممانعت، نہایت ذمہ دار اور اہم مقام پر ہونے کی وجہ سے سزا کا دو چند ہونا، یہ اور شاید ایک دو اور حکم ہوں گے جو حضور عالی مقام اور ازواج مطہرات کے لئے مخصوص تھے۔ ان کی نشاندہی واضح طور پر کر دی گئی تھی باقی تمام امور میں حضور خود اور ازواج مطہرات قرآن کریم کے اتباع کے مکلف تھے۔

محترمہ مصنفہ کا یہ خیال کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے بلکہ صرف مخصوص حالات میں اس کے قوانین نافذ ہو سکتے ہیں، درست نہیں ہے۔ قرآن کریم تمام دنیا کے لئے اور تمام ادوار و ازمنہ کے لئے ضابطہ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز اصول ہوتے ہیں اور دوسری اس کی فروعات و جزئیات۔ قرآنی ضابطہ حیات کے اصول وہ مستقل اقدار ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ ان قوانین کی فروعات و جزئیات انسانی معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہیں گی۔ اور اس طرح وہ زندگی کے عملی مسائل کو حل کرتی چلی جائیں گی۔ قرآنی ضابطہ کے اصول وہ مستقل اقدار ہیں جو زمانہ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی زندگی مزید ارتقائی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ مستقل اقدار صفات الٰہیہ کا ہی دوسرا نام ہیں، اور سیاسی زندگی میں یہ مستقل اقدار انسانی حقوق کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہیں۔

جہاں تک زنا بالجبر اور زنا بالرضا کا تعلق ہے، بے شک قرآن کریم نے زنا بالجبر کے لئے الگ کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن Rape زنا کے تحت ہی آجاتی ہے۔ Rape میں عورت کو کوئی سزا نہیں دی جاتی، البتہ مرد کے لئے دوہری سزا ہوتی ہے۔ اسی طرح اغلام کی صورت ہے وہ لواطت کے ذیل میں آجاتی ہے، البتہ جہاں تک قتل کے متعلق مضمون میں تحریر ہے وہ درست نہیں ہے کہ مقتول کے ورثا کو اختیار ہے کہ وہ خون بہا لے کر قاتل کو چھوڑ دیں۔ قرآن کریم نے قتل بالعمد اور قتل بالخطاء میں فرق کیا ہے۔ قتل عمد میں خون بہا نہیں ہے۔ صرف قتل خطا میں خون بہا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں قانون ہی قرآن کریم کے خلاف جاری ہے اور

قتل عمد میں بھی خون بہا کی اجازت وگنجائش رکھ دی گئی ہے۔ مصنفہ محترمہ کو پاکستان میں جاری شدہ قانون سے مغالطہ ہوا ہے اس سے گذارش ہے کہ اس بارے میں قرآنی قانون، اور پاکستان میں جاری شدہ قانون میں فرق پیش نظر رکھیں۔

حدود دلاز کی بھی یہی صورت ہے کہ لاز قرآن کریم کے بالکل خلاف پاکستان میں جاری ہے۔ جس آیت کریمہ (4/15) کے تحت یہ بنائے گئے ہیں اس کا ارتکاب زنا سے دور دور کا تعلق نہیں ہے بلکہ وہ آیۂ کریمہ سحاقت Female Homosexuality کے بارے میں ہے۔ ان قوانین کے سلسلہ میں بھی قرآنی اور پاکستانی قوانین کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔

اخبار میں طبع شدہ مضمون پر مختصر سا تبصرہ ختم ہوا۔ بنیادی مقصد اصل مضمون کو قارئین کرام کی نظر سے گذارنا تھا تاکہ یہاں کے عوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ پاکستان کے باہر مسلمانوں کی سوچ کس طرح کی ہے۔ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ بخوبی اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ وہ مصائب و نوائب سے دوچار ہیں اور حد درجہ پستی وتذلل کا شکار ہیں۔ اس دور کے مسلمان ہوں یا سابقہ ادوار کے مسلمان ہوں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سبب اسلام پر صحیح عمل نہ کرنا ہے۔ قرآن کریم کی حقانیت اور اسلام کا بہترین ضابطہ عمل ہونے سے کوئی منکر نہیں ہے۔ بس یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کی تعلیم پر درست عمل نہیں کر رہے ہیں اور اس کا تدارک وہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے دور میں عقائد میں اصلاح کی۔ شیخ عبدالوھاب نے اپنے دور میں اصلاح کی۔ قبر پرستی، تعزیہ پرستی، ایصال ثواب، عرس، قوالی، اور بے شمار بدعات کو سختی سے روکا۔ ہمارے برصغیر میں شیخ سرہندی، مجدد الف ثانی نے اسی طرح کی اصلاح کی۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کثیر التعداد تصانیف کو مطالعہ فرمایئے، انہوں نے اپنی بساط وفہم کے مطابق مسلمانوں کو قرآن کریم کے قریب لانے کی کوشش کی۔ ہمارے ہاں ماضی قریب میں، سرسید مولوی چراغ علی، مولانا حالی، سرسید امیر علی، اور چند دیگر حضرات نے قرآن کریم پر نئے نئے انداز سے غور وفکر کیا۔ اور مسلمانوں کو نیا فکر دیا۔ انہوں نے مغرب کے فکری ریلے وسیلاب کا جم کے مقابلہ کیا۔ اور

مسلمانوں کے اُکھڑتے ہوئے قدموں کو جمایا مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی مرحوم، مولوی حشمت علی مرحوم، خواجہ احمد دین نے تفاسیر قرآن کے نئے شہ پارے پیش کئے ان تینوں حضرات کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے خالص قرآن کریم پیش کیا۔ حدیث کے وحی خفی ہونے اس کے حجیت ہونے سے انکار کیا اور قرآن فہمی کا بالکل نیا طریقہ تفسیر القرآن بآیات القرآن جاری کیا۔ جو اس سے پیشتر تیرہ سو سال میں کہیں نہیں دکھائی دیتا لیکن وہ بھی مسلمانوں کی بگڑی بنانے میں کامیاب نہیں ہوسکے، اور خود ایک الگ فرقہ بن گئے۔ یہ حضرات فرقہ اہل قرآن کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے پیش نظر بھی صرف فقہ تھا اور انہوں نے ملوکیت کے مدّون شدہ فقہ کو خالص قرآنی فقہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ ان اکابرین نے مسلمانوں کو زوال وپستی سے نکالنے کی حد درجہ کوشش مگر مسلمان اسی طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کے مانند گھومتے رہے۔

یہ سب اکابرین ہماری عزت وتعظیم کے مستحق ہیں۔ ان کی نیت، اخلاص، محنت وجدوجہد پر کوئی حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان میں سے کسی کی نگاہ دین و مذہب میں امتیاز نہیں کرسکی جو کہ مسلمانوں کے زوال کا اصلی سبب ہے۔ ان سب حضرات کی نگاہ بنو عباس کے دور تک جاکر رُک گئی، اور اسی دور کے علوم تک جاکر یہ رُک جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھ کہ ہم جس کی پیروی کر رہے ہیں وہ مذہب ہے، اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین نہیں ہے۔ مذہب جب از خود غلط ہے، تو آپ مذہب میں ہزار ہا اصلاح کرلیں، آپ وہاں کے وہاں ہی رہیں گے۔

زوال کے اس سبب کو صرف اقبال کی آنکھ نے بھانپا۔ اُنہوں نے واضح طور پر دین ومذہب میں کُھلا کُھلا فرق محسوس کیا۔ اور ہمارے مروجہ اسلام کی ہر چیز کو یہ کہہ کر رد کردیا کہ یہ سب غیر اسلامی یعنی عجمی تصورات کی آمیزش ہے۔

تمدن تصوف شریعت کلام　　　　بتانِ عجم کے پُجاری تمام

جب تک قرآن کریم کو بحیثیت دین کے جاری نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان کسی طرح

گرداب سے نہیں نکل سکتا انہوں نے نہایت بلیغ رباعی میں فرمایا کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے، اور حق حکومت بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد | گوہرداخت ولے نذر قباد رجم کرد
یعنی در خوئے غلامی زسگاں بدتر است | من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد

اس موضوع کو انہوں نے بے شمار اشعار میں باندھا ہے اور اپنے خطبات میں جگہ بہ جگہ بیان کیا ہے لیکن اس موضوع کے لئے انہوں نے کوئی جامع مضمون تحریر نہیں فرمایا لیکن ہماری خوش بختی کے کسی زمانے میں علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری، پروفیسر تاریخ اسلام، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، نے ''اسلامی نظام'' کے نام سے ایک پُر مغز اور جامع مقالہ تحریر فرمایا، جس کا ملخص یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی، اس کی اطاعت نظام کے ماتحت ہوسکتی ہے۔ اگر وہ نظام جاری ہے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہورہی ہے اور اگر وہ نظام باقی نہیں ہے تو ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت جیسے اہم فریضہ سے محروم ہیں۔ انہوں نے آیات کے حوالہ جات کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ مسلمانوں کی ترقی وعروج کا واحد حل اسلامی نظام کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے لہٰذا مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل، اور آخری ضابطہ حیات تسلیم کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کو جاری کردے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے دشمن، باغی، عادی، نافرمان، اور مجرم ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز روزوں کے پابند ہوں۔

اور خواہ کتنی ہی نمناک آنکھوں سے نعت خوانی کرتے ہیں۔

علامہ اقبال اور تحریک طلوع اسلام نے اس نظریہ کو بہت زور سے اٹھایا چنانچہ پاکستان کا ایک معتد بہ حصہ اس نظریہ کا قائل نظر آتا ہے کہ اسلام کو بحیثیت دین اور ضابطہ حیات کے اختیار کیا جائے۔ اگر ہم قرآن کریم کو بطور ضابطہ حیات اختیار کر لیں، تو قرآن کریم کے وہ تمام مواعید پورے ہو جائیں گے جو قرآن کریم نے مسلمانوں سے ان کے عروج و ترقی کے بارے میں کر رکھے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں اب ان جماعتوں اور تحاریک کی کمی نہیں ہے جو اسلامی حکومت کی داعی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے تو قائل ہیں لیکن اس نظریہ کے قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت صرف قرآنی نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان سب جماعتوں کے نزدیک اسلامی حکومت کی تعریف یہ ہے کہ اسلامی حکومت وہ ہے کہ جس میں قرآن و سنت کے قانون جاری ہوں اور کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت وہ ہے کہ جس کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہاں جس قدر تحاریک ہیں ان کا نظریہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی، نجی، پرائیویٹ طور پر بھی کرنے کے قائل ہیں۔ جبکہ قرآن کریم انفرادی عبادت واطاعت کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ قرآنی حکومت میں تو یہ سب حکومت کے ماتحت ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ فرداً فرداً نہیں ہو سکتی اور یہی صورت دیگر عبادات کی بھی ہے۔ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون راقم سطور کا ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا ہے۔ اس لئے اُسی بات کو دوبارہ تحریر کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ میں بنیادی تبدیلی لائیں دین و مذہب میں واضح طور پر امتیاز پیش نظر رکھیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر مذہب کا ترجمان ہے جو خود قرآن کریم کے خلاف ہے، اس سے قطعی طور پر صرف نظر کریں۔ قرآن کریم کو بحیثیت دین کے اختیار کریں اور اسی نقطہ نگاہ سے تفاسیر و فقہ تحریر کیا جائے۔ صرف قرآن خالص پیش نگاہ

رہے افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر جس قدر کام ہو رہا ہے، وہ سب احیاء مذہب کا ہو رہا ہے احیاء دین سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیا جائے کیونکہ یہی وہ واحد محرک Incentive ہے جس کی وجہ سے مسلمان اسلامی حکومت کو قائم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

ماہ اپریل 2006ء

لندن کے لارڈ میئر کے بیان پر تبصرہ

کمترین راقم سطور کو لندن سے جناب محمد شاکر فاروقی صاحب کا ایک ای میل E-Mail موصول ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ لندن کے لارڈ میئر جناب Ken Living Stone نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں نے پانچ سو سال سے دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ اس پر جناب فاروقی صاحب نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ کیونکہ جناب فاروقی صاحب نے کسی اخبار یا رسالہ کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں اس بیان کی تصدیق کر سکتا تاہم یہ ایک ایسا بیان ہے جو نہ صرف حقیقت پر مبنی ہے بلکہ ہم خود بھی اکثر اس بات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے جناب میئر صاحب کے بیان پر تبصرہ کرنے کے لئے اس کی تصدیق کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ جناب میئر صاحب نے مسلمانوں کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جبکہ ہم خود بھی اسلام اور مسلمانوں کو غلط ملط (Confuse) کرنے کے عادی ہیں۔ ہم ہمیشہ مسلمانوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے فلسفہ کو اسلامی فلسفہ، اور مسلمانوں کے خودساختہ قوانین کو اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ مسلمانوں نے 500 سال میں دنیا کو کچھ نہیں دیا لیکن اسلام کے متعلق یہ بات کبھی درست نہیں ہے۔ غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ آخر مسلمانوں نے ان 500 میں انسانیت کی ترقی میں کوئی بھی کام کیوں نہیں ادا کیا اور خود اسلام نے جو کچھ دیا ہم نے اس سے بھی کیوں فوائد حاصل نہیں کئے۔ زیر مطالعہ مضمون میں ان دو امور کے متعلق وضاحت پیش خدمت عالی کی جائے گی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ انسانیت یا دوسری اقوام کی خدمت وہی قوم کرسکتی ہے جو دیگر اقوام عالم میں ممتاز درجہ رکھتی ہو اور ان میں امامت یا پیشروی کے مقام پر فائز ہو۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے دور میں انسانیت کے رہبر و قائد تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے o وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ o (2/124) جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو ان میں پورے اترے اور تو اللہ نے فرمایا۔ میں تم کو (لوگوں) کا پیشوا بنانیوالا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی اور میری اولاد میں سے۔ فرمایا میرے اس عہدہ پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا o۔ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ ان کی اولاد بھی ان کی طرح انسانیت کی پیشوا ہوگی جس طرح خود اپنے دور میں حضرت ابراہیمؑ تھے۔ لیکن ان کی ذریت میں سے جو لوگ ظالم ہوں گے وہ کبھی بھی انسانیت کے رہبر و پیشوا نہیں بن سکتے۔ تصریف آیات پیش نظر رکھنے سے اس آیت کی وضاحت سورۂ بقرہ میں یوں ملتی ہے۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ o (2/229) جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں o ظالمین کی یہ بڑی جامع تعریف ہے اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین قوانین خداوندی کی رو سے ہی ہو سکتا ہے اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت غصب کرتا ہے۔ لہٰذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظالم ہے۔ جس معاشرے میں بھی ان قوانین کے علاوہ دیگر خود ساختہ قوانین کا اجراء ہوگا۔ قرآن کریم کی رو سے وہ ظالم قوم ہوگی۔ اسے دنیا کی امامت نہیں مل سکتی۔ دنیا میں امامت حاصل کرنے کا واحد طریقہ حدود اللہ کو جاری کرکے، قرآن کریم کا نظام جاری کرنا ہے یہ امامت خود حضرت ابراہیمؑ کو "کلمات" پورا کرنے پر ملی تھی۔ اور دیگر اقوام کو بھی ان "کلمات" کو پورا کرنے پر ہی مل سکتی ہے ہماری تفاسیر میں ان "کلمات" کی فہرست تفصیل سے لکھی ہے۔ وہ تفصیل آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ تفسیر حسینی میں وہ "کلمات" یہ ہیں۔

(یعنی شگافتن موئی سر دو نیم ساختن آں را کہ کسی موئی دارد۔ ومضمضہ واستنشاق، وچیدن

موئی لب وگرفتن ناخن، وبرکندن موئی زیربغل وحلق عانہ وختنہ واستنجابہ آب) یعنی سر کے بیچ میں مانگ نکالنا۔کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا مونچھیں کم کرنا ناخن کٹوانا۔زیربغل وزیرناف بال کاٹنا، ختنہ کرانا، استنجا کرنا دوسری تفاسیر میں جمعہ کا غسل کرنا۔اور مسواک کرنا بھی شامل ہے ہماری تفاسیر کی رو سے یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو مقام امامت ملا تھا، اور دیگر اقوام کو بھی ان امور کی سرانجام دہی کے بعد امامت مل سکتی ہے ان کے نزدیک مسلمانوں کا عروج قرآنی نظام سے وابستہ نہیں ہے مقام ابراہیم کے متعلق اگلی ہی آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (2/125) اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔تفسیر مظہری میں ہے''اور ہم نے حکم دیا ہے کہ بنالو ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ،یعنی اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ، اس نماز سے طواف کی دو رکعتیں مراد ہیں''۔شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رقمطراز ہیں''مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔اس میں حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہوکر انہوں نے حج کی دعوت دی تھی اور وہ (پتھر) جنت سے لایا گیا تھا جیسے حجراسود۔اب اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہے اور یہ حکم استحبابی ہے۔''تفسیر حسینی میں تحریر ہے کہ''ازمقام کہ منسوب است بابراہیم مصلی نمازگاہ وآن موضعی است کہ درآن حجرے وضع کردہ اند واثر قدمہائے مبارک آنحضرت بروست۔صفحہ 38

موجودہ دور کی بلاشبہ بہترین تفسیر''تدبر قرآن''میں تحریر ہے اور یہاں آیت میں مقام ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے۔مقام ابراہیمؑ سے کیا مراد ہے۔علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ایک گروہ کے نزدیک اس سے وہ پتھر مراد ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہوکر خانہ کعبہ میں تعمیر کی تھی۔دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن ومستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے''صفحہ 329،(اقتباس ختم ہوا) یعنی ان

سب حضرات کے نزدیک مقام سے مراد کوئی جگہ ہے۔ لیکن علمائے اہل قرآن کے نزدیک، اس سے مراد، رتبہ، مرتبہ، رفعت، منزلت ہے۔ مصلےٰ وہ مقام ہے جس کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے چلا جائے۔ آیہ کریمہ میں حکم دیا جارہا ہے کہ ابراہیمؑ کے مقام امامت کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے چلا جائے اور کسی حال میں بھی اس مرتبہ بلند کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ جب تک تم ابراہیمؑ کے اس رتبہ بلند کو تھامے رہو گے۔ اس وقت تک تم بھی پوری انسانیت کے امام ہی بنے رہو گے، لیکن جس وقت تم ابراہیمؑ کے اس مقام بلند، اعلیٰ رتبہ کو چھوڑ دو گے (اور اس سے مراد ایک خاص پتھر کو قرار دو گے) تو پھر تم انسانیت میں کسی مرتبہ و مقام پر بھی نہ رہو گے۔

آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ قرآن کریم کو اصرار اپنے مقرر کردہ نظام کی اقامت پر ہے، کہ اسی سے امت مسلمہ کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ اسی نظام کے قیام کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ o (10/87) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو اور قائم کرو نماز تو بشارت ہے مومنین کے لئے o لیکن یہ ظاہر ہے کہ گھروں کو قبلہ رو بنانے اور نمازیں پڑھنے سے کسی قوم کو نہ محکومی سے نجات مل سکتی ہے اور نہ ہی وہ قرآنی نظام قائم کرسکتی ہے۔ اصل سوال یہاں قبلہ کے مفہوم کا تعین ہے جس کے غلط تعین کی وجہ سے آیہ کریمہ کا مطلب دین کے نقطہ نگاہ کے بجائے بالکل مذہب پر کفالت کر جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب نظام ہی باقی نہ رہے اور قوم انفرادی زندگی، مذہب کی سطح پر گذار رہی ہو، لیکن اس قوم میں نظام قائم کرنے کی پیش از پیش آرزو و تمنا ہو، تو اس وقت قبلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور کس چیز کو اس وقت قبلہ بنایا جائے۔ یعنی اس وقت مذہب کی انفرادی زندگی ترک کر کے، دین کی اجتماعی زندگی کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم قوم بنی اسرائیل کو ہدایت فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اس کی ابتداء کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ

وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ (10/87) یعنی اپنے ہی گھروں کو اپنی

توجہات کا مرکز (قبلہ) بناؤ اور وہاں سے ہی نظام صلوٰۃ کی ابتداء کردو۔ یعنی یہ کہ اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے کرو، اور رفتہ رفتہ یہ نظام پوری قوم میں جاری ہو جائے گا اور پھر خود بخود سب کا ایک ہی قبلہ قائم ہو جائے گا۔ ان چند آیات کریمات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہماری تفاسیر نے کس طرح دین کا تصور محو کر کے، مسلمانوں کے زوال میں کیا کچھ کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف کا حال ہے۔ دین میں تو قرآن کریم کے قائم کردہ نظام کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت ہے۔ کیونکہ اس نظام میں قوانین اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں اور ان کو نافذ اللہ تعالیٰ کا رسول کرتا ہے، اس لئے اس نظام کی اطاعت از خود اللہ ورسول کی اطاعت ہو جاتی ہے، اور یہ ایک اطاعت ہوتی ہے، اس میں حدیث کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ کوئی مقام۔ لیکن صرف اور صرف حدیث شریف کے زیر اثر دین کا یہ تصور ہم میں ختم ہوا۔ اور حدیث شریف کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ حدیث شریف کی اہمیت و مقام بھی صرف مذہب ہے۔ دین میں حدیث شریف کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حدیث کا صحیح مقام صرف اس وقت متعین ہو گا جب ہم مسلمانوں میں دین کا تمکن ہوگا۔ حدیث شریف کے ذریعے حضور کی اطاعت کرنے کا عقیدہ دین کے قیام میں مانع ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ جب ہم اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہیں تو نظام قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اس طرح حدیث شریف عملاً دین کے قیام اور مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی میں سخت حارج ہوتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل کمترین کے مضمون ''دین میں حدیث کا مقام'' میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

اسی طرح ہم نے فقہ کو Sacred cow بنایا ہوا ہے لیکن اس کی صحیح پوزیشن واضح کرنے کے لئے راقم سطور کے مضمون ''اسلامی فقہ کی حقیقت'' کا ایک اقتباس پیش خدمت عالی ہے۔ اس سے آپ کو فقہ کی صحیح حقیقت معلوم ہوگی۔

''قرآن کریم کی رو سے سلطنت و بادشاہی کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے بلکہ یہ قطعاً اور مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کریم کی رو سے خلافت کا حق کسی فرد واحد کو نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری امت

اس میں شامل ہوتی ہے(22/78-24/55)لیکن قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود، ظالم جابر، فاسق، بدچلن، بادشاہ تلوار کے زور پر امت مسلمہ کی گردنوں پر سوار ہو گئے ان ظالم بادشاہوں نے جن کے حرم میں بیک وقت کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں، خلافت کے بجائے اپنی بادشاہی اور ملوکیت قائم کر لی اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت کو مستقل طور پر قائم کر دیا اس دور کے ائمہ کرام وفقہائے عظام، امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، نے ملوکیت کی سخت مخالفت کی اور شدید مذمت فرمائی اگرچہ ملوکیت نے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان حضرات باوقار کوہ تمثال نے تمام مصائب وآلام برداشت کئے لیکن ملوکیت وشہنشاہی کا ساتھ نہیں دیا۔ البتہ ان سے کم درجہ کے فقہا جو ان کے ہی شاگردوں میں شامل تھے انہوں نے ملوکیت کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ قوانین، جنہیں اسلامی قوانین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مدون کئے گئے لیکن حق یہ ہے کہ ان قوانین کا اسلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے تدوین کردہ قوانین ہیں اور بس ان کا فقہ ملوکیت یا شاہی فقہ زیادہ مناسب نام ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام قوانین اور فقہا سے حاصل کردہ فتاویٰ، بادشاہوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے بنوائے تھے۔ اس دور میں جتنی فقہ بھی تیار ہوئی وہ سب بادشاہوں کو سپریم اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے مرتب ہوئی تھی۔ جو کہ اسلام میں قطعاً حرام ہے فلہٰذا اس سارے قانون وفقہ کی بنیاد ہی خلاف قرآن ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اس دور کے فقہا زمین کی ملکیت کو بالکل حرام قرار دیتے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں نے زمین کی ملکیت جائز قرار دی اور دوسرے درجہ کے فقہا سے اس کی تصویب کرالی۔ قرآن کریم کی رو سے اوقاف کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن ان قوانین میں اوقاف کے ادارے قائم کرنے کو جائز شمار کیا۔ چنانچہ آج تمام مسلم ممالک میں اوقاف بھی ہیں اور وزارت ہائے اوقاف بھی قائم ہیں۔ ان قوانین میں عورتوں، بچوں، مزدوروں، کسانوں، اقلیتوں اور بین الاقوامی حقوق کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی۔

اس مضمون کا موضوع تفسیر، احادیث، وفقہ سے متعلق نہیں ہے ان تینوں ''اسلامی'' علوم

کا صرف اس درجہ تذکرہ کیا گیا ہے جس سے صرف یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کے زوال میں ان کا کیا کردار اور کتنا حصہ ہے۔ اور مسلمان کیوں اس قابل نہیں رہے کہ وہ انسانیت کو کچھ دے سکیں اس کی وجہ بدیہی اور واضح ہے کہ ہم مسلمانوں کے عقائد قرآن کریم کے خلاف ہیں اور وہی ہمارے زوال کا سبب ہیں اور کوئی بھی ترقی یافتہ قوم ان عقائد کو اپنا لے وہ زوال پذیر ہو جائے گی۔

ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ تباہ کن چیز تصوف ثابت ہوئی۔ یہ امت مسلمہ میں Termite کی طرح پھیلا اور ساری امت کو گھن کی طرح چاٹ گیا۔ اس کے سارے بنیادی و اساسی نظریات قرآن کریم کے خلاف اور ہماری تباہی و بربادی کے اسباب ہیں۔ اس کے نزدیک کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یہ سب دھوکا اور سراب ہے اور بقول ان کے **اوعکوس فی المرایاء ان ظلال** (یہ ساری دنیا، آئینہ میں عکس ہے یا سایہ ہے) جب کوئی قوم دنیا کا وجود ہی نہیں مانتی تو وہ اس میں Scientific Discoveries، کیوں اور کیسے کر سکتی ہے۔ تصوف کے نزدیک حواس خمسہ کے ذریعے جو علوم انسان حاصل کرتا ہے وہ بھروسہ کے قابل ہی نہیں ہیں اس کے نزدیک بھروسہ کے قابل صرف وہ علم ہے جو ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست مل سکتا ہے اور اس طرح یہ نظریہ علوم حاصل کرنے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ قرآنی نظام میں جب انفرادی عبادت کی کوئی جگہ نہیں رہتی تو تصوف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ تصوف تو دین کے اس نظریہ کے بالکل خلاف جاری کیا گیا تھا۔ اور تصوف دین سے کھلی کھلی بغاوت پر مبنی ہے۔ مذہب میں اس کی جگہ نکالی جا سکتی ہے لیکن معاف بفرمائید دین میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ جب تک مسلمان مذہب میں الجھے رہیں گے تصوف فروغ پاتا رہے گا، جس دن مسلمان دین پر آ گئے اور دین یعنی قرآنی نظام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی شروع کر دی، تصوف خود اپنی موت آپ مر جائے گا۔

ان نظریات کے برخلاف اگر مسلمان قرآن کریم کے مطابق نظریات رکھتے اور کائنات (ملائکہ) کو تسخیر کرنا اور دیگر علوم حاصل کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تو بے شک وہ اس قابل ہوتے کہ دنیا میں

کچھ Contribute کر سکتے۔ ارشاد ہوتا ہے وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ o(2/33) تو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو میں وہ سب کچھ جانتا ہوں o اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائناتی قوتوں یعنی ملائکہ کا ظاہران کے باطن سے مختلف ہے۔ اسی میں ملائکہ (کائناتی قوتوں) پر تحقیقات اور ریسرچ کرنے کا راز مضمر ہے کہ ان ملائکہ (کائناتی قوتوں) کا باطن تلاش کیا جائے۔" آپ اشیائے کائنات پر غور فرمائیں جب یہ کائنات عالم وجود میں آئی یہ تمام چیزیں اس میں موجود تھیں۔ جوں جوں انسان کی ترقی کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا ان اشیاء کی مضمر صلاحیتیں بے نقاب ہوتی چلی گئیں۔ ایتھر ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اب اسی ایتھر سے بہت طرح کے کام لئے جاتے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کی لہریں اس کے ذریعے منتشر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایٹم Atom ہے یہ تخلیق عالم کے وقت بھی موجود تھا لیکن اس کی ساری صلاحیتیں مخفی تھیں۔ محسوس طور پر وہ سامنے نہیں آئی تھیں اس دور میں یہ تحقیقات بعد میں سامنے آئیں۔ یہ ہے اشیاء کائنات کی وہ حالت جسے وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ o(2/33) سے تعبیر فرمایا اور اس کے بعد جب ان کی قوتیں استعمال میں آنے لگیں تو وہ ان کی وہ حالت ہے جو مَا تُبْدُونَ (2/33) میں بیان کی گئی ہے۔ سورۃ شوریٰ کی آیت 4 میں Ozone کی طرف واضح اشارہ ہے جب فرمایا کہ۔

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِن فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ o(42/5) قریب تھا کہ فضائے آسمانی پھٹ پڑتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کائناتی قوتیں (ملائکہ) ہر وقت سرگرم عمل میں اور اس طرح اہل زمین کو اپنے سامان حفاظت میں لئے ہوئے ہیں اگر کائنات کی قوتیں (ملائکہ) درمیان میں نہ ہوتیں تو فضائے آسمانی اب تک پھٹ چکی ہوتی۔ قرآن کریم نے ملائکہ کو أُولِي أَجْنِحَةٍ بھی کہا ہے یعنی کئی پروں والے ملائکہ فرمایا۔ أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (35/1) دو دو تین تین، چار چار پروں والے ملائکہ۔ یہ وہ ملائکہ یا کائناتی قوتیں ہیں جن کے اندر کئی صلاحیتیں مضمر و مخفی ہیں۔ جیسے

سورج سے خارج شدہ توانائی فصل بھی پکاتی ہے روشنی بھی مہیا کرتی ہے۔ سمندر سے بخارات بھی اٹھاتی ہے، اس لئے اس توانائی (ملک) کو کئی پروں والی بیان فرمایا ہے۔ اسی آیہ کریمہ کے آخری حصہ نے یہ بھی بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے ابھی ہمیں بالکل معلوم نہیں کہ ان میں کتنی کتنی اور کس قدر صلاحیتیں مخفی ہوں گی جن کو اب تک عقل انسانی دریافت نہیں کرسکی، نیز کہ ایک ملک (کائناتی قوت) میں زیادہ سے زیادہ چار صلاحیتیں ہوسکتی ہیں، اس سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ (اقتباس از ''ملائکہ کی حقیقت'' تحریر کردہ راقم سطور)

اس کے برعکس ہمارے ہاں تفسیر مظہری میں اسی آیہ کریمہ کے ذیل میں مرقوم ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ مِمَّا تُبْدُونَ سے مراد مضمون آیت أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا (2/30) ہے اور وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ سے مراد فرشتوں کا وہ قول ہے جو آپس میں چپکے چپکے کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ بزرگ کوئی خلق پیدا نہ کرے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ کا جسد جب مکہ و طائف کے درمیان پڑا تھا، ابلیس ادھر سے گذرا اور کہا کہ اس کو کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ پھر اس میں منہ کی راہ سے داخل ہوکر پیچھے کو نکل گیا اور کہا یہ مخلوق اپنے کو کسی شے سے بچا نہ سکے گی۔ کیونکہ یہ اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلا ہے پھر اور فرشتے جو اس کے ساتھ تھے اگر اس کو افضل بنایا گیا اور تم کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تم بولو کیا کرو گے؟ سب نے ایک زبان ہوکر کہا ہم اپنے رب جلیل کی اطاعت کریں گے ابلیس نے اپنے دل میں کہا خدا کی قسم اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے تباہ کر کے رہوں گا اور جو یہ مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں اس کی نہ مانوں گا اور سرکشی اور سرتابی کے سوا اور کچھ نہ کروں گا۔ اس پہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ o (2/33) یعنی فرشتوں نے جو ظاہر کی اسے ہم جانتے ہیں اور شیطان نے جو سرکشی اور معصیت اپنے جی میں رکھی اس سے بھی ہم واقف ہیں o تفسیر مظہری جلد اول صفحہ 82 حضرت ملا وعظ کاشفی اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔

''دمی اونم آنچہ شما ظاہری کنداز گفتار تجعل فیہا و آنچہ بود یدشما کہ بزعم خود بائی پوشیداز کر ایت معزول شدن خود باازحکومت زمین۔''

ہمارے ساتھ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ ابتداء میں کسی مفسر نے اپنی تفسیر میں جو کچھ لکھ دیا۔ آخر تک سب وہی لکھتے چلے جائیں گے اس آیت کے ذیل میں آپ جس قدر بھی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں گے۔ gist تقریباً ایک ہی ہوگا۔ دل پر پتھر رکھ کر، صرف نمونے کے طور پر چند اقتباسات تحریر کر دیے گئے ہیں، ان کو پڑھیئے اور سر پیٹیے۔

قرآن کریم نے جب یہ علم افروز دعویٰ فرمایا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (3/191) اے ہمارے پروردگار تو نے کائنات کی کسی چیز کو فضول پیدا نہیں کیا تو یہ بہت بڑا دعوے تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے اور نوع انسانی کے لئے اس میں کوئی نہ کوئی فائدہ و منفعت ضرور ہوگی۔ اب یہ ہمارا قرآن کریم پر ایمان لانے والوں کا کام ہے کہ یہ کائنات کی ایک ایک چیز پر غور و فکر کریں۔ اور مشاہدات و سائنسی تجربات سے یہ بات ثابت کریں کہ کائنات کی کونسی چیز کس فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح کائنات کی قوتوں یعنی ملائکہ کو تسخیر کر کے، خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور انسانیت کو بھی اس کا فائدہ دیں تاکہ پھر کسی کو یہ اعتراض نہ ہو سکے کہ مسلمانوں نے دنیا کو 5 سو سال سے کچھ نہیں دیا۔ سورۃ حج میں ہے o وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ o(15/21)o اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں۔ لیکن ہم نازل یعنی عطا اسی قدر کرتے ہیں جس قدر انسان تلاش کے بعد معلوم کرتا ہے o۔ بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ میں ایک اہم بات پوشیدہ ہے مثلاً زراعت کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کا علم جس قدر بڑھتا جائے گا وہ بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ہوتا جائے گا، اور اسی نسبت سے زمین کے خزانوں تک انسانی رسائی ہوتی چلی جائے گی۔ آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ آج سے دو سو سال پیشتر آج کی پیداوار کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہی زرعی قوانین کے ''معلوم'' ہونے کا نتیجہ ہے۔ جو قومیں اس زرعی علم یا دیگر سائنسی علوم کو زیادہ سے زیادہ حاصل کریں گی اور ان

کے مطابق زراعت کریں گی، ان کے ہاں اسی طرح رزق کی فراوانی ہو جائے گی۔ یہ قوم دوسری اقوام کو بھی رزق فراہم کر کے، انسانیت کی خدمت کرے گی اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہم مسلمانوں پر بھی فرض تھا کہ ہم ان عطایا کو حاصل کر کے، انسانیت کو اس سے نفع پہنچاتے۔ حج کا اجتماع انسانی نظام میں نہایت اہم رکن ہے قرآن کریم نے اس کے دو مقاصد بیان فرمائے ہیں ایک لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (22/37) تاکہ تم اللہ کے قانون کو غالب کرو اس بات کے بدلے کہ اللہ نے تمہاری ہدایت فرمائی اور دوسرا مقصد فرمایا کہ ٥ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ٥ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/27.28)

٥ اور ہم نے ابراہیم سے کہا وہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی تقریب میں یہاں آئیں دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے، ناپیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں وہ آئیں ٥ اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی یعنی انسانیت کے منافع کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ان دونوں مقاصد میں انسانیت کا فائدہ مضمر ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے سے بھی مقصد انسانیت کو نفع پہنچانا ہے اور حج کے اجتماع میں جو فیصلے اور اقدامات طے کئے جاتے ہیں، ان سے بھی مقصود انسانیت کو کچھ دینا ہی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ سے مراد قانون خداوندی کو غالب کرنے کے بجائے عید کی نماز میں چھ (6) تکبیرات لیا جانے لگا اور حج کا اجتماع جو خالص انسانی و سیاسی نوعیت کا تھا، اس کو محض عبادت اور مذہبی رسوم میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ اسلامی نظام، حج جس کا ایک رکن عظیم رکن تھا وہ تو مدتوں سے منقرض ہو چکا ہے، لیکن حج اسی اہتمام سے ہم کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اسلامی نظام کے بغیر حج کے فوائد حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔

یہاں تک مضمون میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اسلام کا اصل مقصد تو انسانیت کو فلاح پہنچانا تھا۔ لیکن ہم مسلمانوں نے ان نظریات کو کس طرح تبدیل کر دیا، اس میں اسلام کی کوئی خامی نہیں ہے بلکہ ہم مسلمانوں کا قصور ہے کہ ہم نے قرآن کریم کی تعلیم کو مسخ کر کے، وہ نتائج و فوائد

حاصل نہیں کئے۔ لیکن ہماری ہر طرح کی کوتاہی کے باوجود اسلام نے انسانیت کو مستقل طور پر کیا دیا وہ اب پیش کیا جاتا ہے اس میں پانچ سو سال یا کسی عرصے کی تشخیص نہیں ہے۔ اسلام کے یہ عطایا دائمی ہیں۔

(1) نزول قرآن کریم کے وقت بادشاہت کا نظام ہر جگہ جاری تھا۔ یہ نظام ساری انسانیت پر کابوس کی طرح اس درجہ حاوی تھا کہ اس نظام کے علاوہ اس دور میں کوئی اور نظام سمجھ میں آتا ہی نہیں تھا۔ اور یہ نظام Parasite کی مانند عوام کے خون پر پرورش پاتا تھا اس نے انسانیت کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے اس نظام کی سخت مذمت کی، اس کے برعکس اس نے جو نظام پیش کیا، اس سے قرآن کریم کی حقانیت کی دلیل بھی فراہم ہوتی ہے اور اس سے انسانیت کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ اس نظام سے قرآن کریم کی حقانیت کس طرح ثابت ہوتی ہے اور یہ نظام انسانیت کو کیا دیتا ہے، اس کا ذکر مضمون کے آخر میں آتا ہے۔

(2) قرآن کریم کے نزول کے وقت پیشوائیت کا تصور مسلمہ طور پر رائج تھا۔ پیشوائیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کچھ برگزیدہ حضرات ایسے ہوتے ہیں جو عام انسانوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس نظریہ کو چیلنج کیا اور کہا کہ ہر شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان سے، اور انسان کا اللہ تعالیٰ سے قرآن یا قرآن کریم کے نظام سے قائم ہوتا ہے۔ آپ حد درجہ غور فرمائیں، اس تعلق کے علاوہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے تعلق کا اور کوئی واسطہ بن ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم ہر شخص کے پاس ہے، اس پر غور و فکر، عمل کرے، ہر شخص اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنا ہے، اس میں پیشوائیت یا خاص برگزیدہ لوگوں کے ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(3) اس زمانہ میں سرمایہ داری، جاگیرداری، کو ضروری اور لائیفک قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح لوگ غلط ذرائع سے زمین کی ملکیت یا دولت حاصل کرتے تھے اور اس سے غریب لوگوں کو Exploit کرتے تھے۔ ساری دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی تھی۔ جو طاقتور ہوتا تھا وہ دولت پر قبضہ جما لیتا تھا۔ اور عام انسان سخت مصیبت کی زندگی بسر کرتے تھے اور یہ امیر طبقہ غریب

طبقے سے حد درجہ مفادات حاصل کرتا تھا اور ان پر ظلم بھی کرتا تھا قرآن کریم نے ملکیت زمین کو حرام قرار دے کر ملکیت زمین کا تصور ختم کیا اور ربو کو حرام قرار دے کر سرمایہ داری کی بیخ کنی کر دی۔

(4) نزول قرآن تک انسان قوموں اور قبیلوں میں منقسم تھا۔ نسلی، جغرافیائی حدود انسان اور انسان کے درمیان حائل بن رہی تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب خود ساختہ حد بندیوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ تمام انسان ایک نفس واحدہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کی زندگی کا Source ایک ہی ہے اس لئے تمام انسان نسب و وطن کے امتیاز کے بغیر ایک عالمی برادری کے اجزاء ہیں۔ گذشتہ صدی میں یورپ میں جو دو جنگیں ہوئیں، انہوں نے ساری دنیا کو ہلا کے رکھ دیا۔ یہ صرف حدود بندی کا نتیجہ تھیں۔ خود ہی زمین پر لکیریں کھینچا اور ان کے ذریعے آپس میں منافرت و معاندت پیدا کرنا، اور پھر جدال و قتال کرنا، یہ کون سی عقلمندی ہے۔ قرآن کریم نے ساری انسانیت کو ایک برادری قرار دیا۔

(5) قرآن کریم نے ایک ایسا اصول دیا ہے جو سونے کے حروف سے تحریر کرنے کے قابل ہے وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13/17) جو چیز ساری انسانیت کو فائدہ دے گی وہی دنیا میں باقی رہے گی۔ اس کی منفعت کسی خاص گروہ، کسی خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہو بلکہ منافع ساری انسانیت کے لئے یکساں طور پر فراہم ہو۔

(6) اس دور میں غلامی کا رواج عام تھا۔ غلامی کو برا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے شرف انسانیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اس لئے اس کے نزدیک کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کو غلام بنانا، نہایت مکروہ اور قبیح فعل ہے۔ اس لئے اسلام میں غلامی کا وجود تو ایک طرف اس کا تصور بھی دین کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم نے جنگی قیدیوں کے لئے نہایت واضح حکم دے دیا کہ انہیں ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔ خواہ فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (47/4) قرآن کریم نے غلامی کے سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ ملوکیت کے دوران ہمارے بادشاہوں کے ہاں جو غلام و لونڈیاں پائی جاتی تھیں تو یہ ان کا اپنا ذاتی کردار تھا۔ اسلام کو

اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ لونڈیاں غلام کو تو ایک طرف، اسلام میں ملوکیت ہی قطعاً حرام ہے

(7) قرآن کریم نے O یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاکُم مِّن ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی (49/13)O اے لوگوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے کہہ کر ذات پات اور نسل پرستی کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ یہ صرف توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہوتی ہے نہ کہ نسب و خاندان سے۔ ہمارے ہاں سادات و غیر سادات کی تفریق، صدقات کو سادات پر حرام قرار دینا، اور خمس کو سادات کے ساتھ مخصوص کر دینا سب نسل پرستی پر مبنی اور قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

(8) قرآن کریم نے تزکیہ نفس کو زندگی کا مقصود قرار دیا ہے، اور اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقرر کردہ قانون ہے کہ O اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی O(92/18)O تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے خرچ کرتا ہے O۔ قرآن کریم کے اس اصول کو پیش نظر رکھیں اور پھر اندازہ فرمائیں کہ اگر لوگ قرآن کریم کے اس عقیدہ کو تسلیم کر لیں، اور پھر اس کے مطابق عمل کریں تو اس سے انسانیت کو کس درجہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان صرف وہ کام کرتا ہے جس میں اس کا اپنا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ اگر عقل انسانی کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ دوسروں کی نشوونما کرنے سے اس کی اپنی نشوونما ہوتی ہے جو کہ مقصود حیات ہے، تو پھر ہر ذی ہوش انسان اپنا مال دوسروں پر صرف کرے، انسانیت کو بے حد نفع پہنچائے گا۔

اسلام نے انسانیت کو جو کچھ دیا، ان میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ کچھ اس وقت دیا تھا جب یورپ بالکل تاریکی اور اندھیرے میں تھا۔ لیکن جو اصل فائدہ اسلام انسانیت کو دیتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی وعدہ کیا گیا ہے، اس کا ذکر مضمون کے آخر میں آتا ہے۔ قرآن کریم کے یہ سنہری نظریات اپنے Momentum زور دروں، یا حالات کے تقاضوں کی وجہ سے عام ہوتے چلے گئے۔ آج ساری دنیا میں یہ نظریات مسلمات کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ قرآن نے جو یہ نظریات دیے ہیں فکر انسانی نے ان کے علاوہ ایک بھی قابل تعریف نظریہ آج تک نہیں دیا۔

لیکن جناب Mayor میئر صاحب کا یہ فرمان بے شک درست ہے کہ خود مسلمانوں نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا بلکہ وہ اسلام کی اشاعت و ترویج میں رکاوٹ بن کے کھڑے رہے برصغیر میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ صرف باغات اور مقبرے بناتے رہے اگر وہ بادشاہ یہاں دین کا نظام جاری کر دیتے تو یہاں کی پوری آبادی مسلمان ہو جاتی۔ آج جبکہ ساری دنیا اپنے نظامہائے باطل سے تنگ آ چکی ہے اب بھی ہم اپنے نظام کو دلائل و براہین سے دوسری اقوام کے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ مذہب کی سطح پر ہی اسلام کو پیش کرتے ہیں یا پھر Terror یا Voilence ہم نے اپنا شعار بنالیا ہے، اور اس طرح ہم اسلام کو بدنام کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ ہماری Values اس درجہ نفع بخش ہیں کہ اگر ان کو علمی طور پر پیش کیا جائے تو ممکن نہیں کہ دوسری اقوام ان کو Appreciate نہ کریں۔ وحی میں خود اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنی صداقت کی طرف کھینچتی ہے یہ ہماری اپنی خامی ہے کہ ہم اس کو درست طریقہ پر نہیں پہنچاتے تاہم یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جناب میئر Mayor صاحب کو یہ بھی ملاحظہ فرمانا چاہئے کہ انہوں نے اور ان کی قوم نے انسانیت کو کیا دے۔ انہوں نے جو کچھ دیا اس کی بالکل مختصر روداد پیش کی جاتی ہے کیونکہ یہ مضمون اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لگایا آئینہ یہ کہہ کے اس نے روزن در میں　　　کہ اپنا منہ تو
دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

آج سارا یورپ جو حقوق انسانی کا علمبردار بنا ہوا ہے، یہ وہی یورپ ہے جس نے ساری دنیا کو دو سو سال تک تگنی کا ناچ نچایا ہے، ساری دنیا کو قوت کے زور پر اپنا غلام بنانا کون سے حقوق کی پاسداری ہے۔ مفتوح ملک نے ان کے غالب آنے میں سخت مزاحمت کی۔ لیکن یہ مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ، ان ممالک کی آبادی کو آپس میں لڑا لڑا کر، ان پر غالب آ گئے۔ پھر اس کے بعد جس درجہ ان ممالک کی تذلیل و تحقیر کر سکتے تھے، اور جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ انہوں کیا ہمارے برصغیر میں انگریزوں کے جو کلب ہوتے تھے ان میں بہت نمایاں مقامات پر تحریر ہوتا تھا۔

پاکستان جب قیام میں آیا، اس وقت Dogs and Indians are not allowed
مال روڈ، لاہور پر لارنس کا مجسمہ نصب تھا اس کے نیچے تحریر تھا Do you want to be served by pen or sword

انگریزوں کی حکومت کے دوران سالانہ مالی بجٹ، Discuss نہیں ہوتا تھا جس قدر دولت وہ بھیج سکتے تھے وہ عوام کا خون چوس کر ساری رقم انگلینڈ ارسال کر دیتے تھے سارا خام مال، چمڑا، پٹ سن، معدنیات، سب انگلینڈ جاتا تھا۔ انگلینڈ کی ساری شاندار عمارات یہاں کے غریب عوام کے خون کے گارے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ لندن میں جو Tubes چلتی ہیں وہ جب ڈالی گئیں جب برصغیر کا پیسہ وہاں گیا اس وقت Brixton تک Tube پڑی تھی۔ اس کے بعد لندن میں بے حد وسعت ہوئی ہے، لیکن ان موجودہ آبادیوں تک Tube نہیں ڈالی جا سکیں کیونکہ یہاں کی دولت جانی بند ہوگئی تھی اور Tube ڈالنے پر خرچ بہت آتا ہے۔ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں بھی انہوں نے Tube نہیں ڈالی نہ ہی یہاں کی آبادی کے لئے کوئی فائدہ مند چیزیں بنائیں۔ ریل کا جو نظام انہوں نے قائم کیا وہ ان کی اپنی غرض سے تھا کہ اس سے فوج کی نقل وحرکت میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ انتظام ہماری وجہ سے نہیں تھا۔ افریقہ کی کالی آبادی پر جو ظلم یورپ نے کیا ان کا تذکرہ کسی ایک مضمون یا کتاب میں نہیں آ سکتا۔ جن حضرات کو ذرا سی بھی دلچسپی ہو وہ Roots کتاب پڑھیں یا اس نام کی فلم ملاحظہ فرمالیں۔ ان مظالم سے متعلق لٹریچر ہی الگ ہے اور یورپین ممالک کی لائبریریوں میں اس لٹریچر سے Shelves بھرے پڑے ہیں، جو بالکل الگ ہوتے ہیں اور صرف اس لٹریچر کے لئے مخصوص۔ ان کتابوں کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں راقم سطور طبعا رقیق القلب ہے، اور ہر مرتبہ اس لٹریچر کو پڑھ کر گریہ ضبط نہیں کر سکا۔ امریکہ میں بھی جو سول وار Civil War بظاہر کالوں کے حقوق دلوانے کے لئے ہوتی تھی۔ اس میں بھی کالوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ان کالوں کی زیادہ آبادی جنوب میں تھی، اور شمالی امریکہ میں مزدوروں کی سخت ضرورت تھی، اس لئے انہوں نے کالوں کو آزاد کرایا تاکہ انہیں سستی Labour فراہم ہو سکے۔ وہ

صرف Labour چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان کالوں کو Incest پر مجبور کرتے تھے تاکہ مزدوروں کی تعداد بڑھے یہ اس درجہ قبیح فعل ہے کہ ہمارے ہاں اردو میں اس کے لئے کوئی ایک لفظ نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ جو شخص یا قوم وحی کی پابندی نہیں کرتی، ان کی کوئی Values وہ بزعم خویش اپنے کو جس قدر مہذب خیال کریں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ Valueless ہوتی ہیں۔ اور انہیں انسانیت کا خیال ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خود ہی اپنی قدریں بنا لیتے ہیں۔ جو اقدار مستقل نہیں ہوتیں۔ جو قوم Homosexuality جیسے مکروہ فعل کو جائز قرار دیدے ان کو تہذیب سے کیا علاقہ۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ نے ٹیکنولوجی پر قابو پالیا ہے، اس لئے وہ ساری دنیا میں اپنی من مانی کاروائی کرتا جارہا ہے۔ ورنہ تہذیب و شرافت سے ان کیا واسطہ۔ اور انسانیت کو کچھ دینے کا کیا تصور۔ یہ صرف انسانیت کے ناسور اور Cancer ہیں، جو انسانیت کو صرف دکھ دے سکتے ہیں۔

چونکہ یہ موضوع اس مضمون کا عنوان نہیں ہے، اس لئے اس کے متعلق صرف اس پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ورنہ تفصیل تو کتاب کی متقاضی ہے۔ انسانیت کو جس چیز سے سب سے زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے اور جو چیز قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے، اور جس کا تذکرہ دوران مضمون کیا گیا تھا کہ اس کا ذکر آخر مضمون میں کیا جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین ہے سخت تعجب و حیرانی کی بات ہے اور آپ خود بھی اس بات پر بار بار غور فرمائیں کہ قرآن کریم نے ساری دنیا میں جاری مذہب کے تصور کو بالکل یک دم بدل کے رکھ دیا قرآن کریم سے پیشتر اس نظریہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ نظریہ اس وقت کی انسانیت کے فہم و ادراک سے اس درجہ بلند تھا کہ اس پر عمل کرنے اور اس سے بے حد فوائد حاصل ہونے کے بعد بھی، انسانیت نے اس کو چھوڑ دیا اور سخت بدقسمتی یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے اس نظریہ کو ترک کر کے مذہب کا سابقہ نظریہ اپنا لیا۔ مذہب کے نظریہ کے مطابق ہر شخص اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق قائم کر سکتا ہے یہ تعلق ایک طرح کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اس کا

احساس بھی انفرادی و ذاتی ہوتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کے طریقے بھی مختلف ہو سکتے ہیں، جن کے لئے صحیح اور غلط ہونے کا کوئی معیار قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ تعلق مسجد، مندر گرجا، Synagogue، کسی جگہ بھی قائم ہوسکتا ہے۔ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ اس کا تعلق باللہ کا طریقہ درست ہے اور دوسرے کا غلط۔ کیونکہ اس تعلق کے نتائج اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے، اسی طرح مذہب یا تعلق باللہ کو دنیاوی امور سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوتا۔ ان مذاہب کے متبعین کو دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی ضابطہ حیات بنانا اور اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ان اختیار کردہ مذاہب کو انسانوں کے باہمی تعلقات و تنازعات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بالکل برخلاف قرآن کریم کے دین کا تصور یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات، معاملات، تنازعات کو قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق طے کرنا دین ہے۔ اس میں انسان کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق نہیں ہوسکتا بلکہ اس نظام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے اس میں مختلف لوگ مختلف طریقے اختیار نہیں کرسکتے۔ ہر شخص صرف ایک دین کے ماتحت رہ کر ہی اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔ اس دین کے نتائج اس دنیا میں ہی سامنے آجاتے ہیں، اس لئے دین کے صحیح یا غلط ہونے کا علم یہاں دنیا میں ہی معلوم ہوجاتا ہے۔ اس میں حقوق اللہ و حقوق العباد الگ الگ نہیں ہوتے دین میں اس تفریق کی کوئی راہ نہیں ہے۔ کفر درحقیقت دین یا نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی، یا اعتقادی جس میں ہم سب مسلمان اس وقت مبتلاء ہیں۔ اصل شے وہ دین خداوندی ہے جسے انسان قائم کرتا ہے اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ دین میں انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں، لیکن طاغوتی نظام جو قرآن کریم کی اقدار کے خلاف قائم ہوتا ہے، اس میں انفرادی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے قائم رکھا جاتا ہے۔ انسانیت پر ظلم کرنے والے طاغوتی نظام کے اندر انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ قرآنی نظام وہ نظام ہے کہ اگر اس کو قائم کرلیا جائے تو اس کے منافع و نتائج ساری دنیا کو جنت بنا دیتے ہیں اور پھر لارڈ میئر Ken Living

جیسے حضرات کو صحیح علم ہو کہ اسلام اور اس کے داعی مسلمان دنیا کو کیا کچھ دے سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں احکامات مدینہ شریف میں نازل ہوئے ہیں۔ مکہ شریف میں جو آیات نازل ہوئیں وہ عموماً عقائد سے متعلق تھیں۔ اب جو قرآن کریم کے نسخوں میں سورۃ کے شروع میں مدنی یا مکی تحریر ہوتا ہے یہ صرف روایات کو سامنے رکھ کے ان کا تعین کیا گیا ہے جو بالکل ظنی ہے۔ آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ اس بات کو واضح کرنے کا نہیں ہے کہ قرآن کریم کون سی آیات مکی یا مدنی ہیں۔ مجموعی طور پر مفسرین کا خیال ہے کہ جو آیات عقائد سے متعلق ہیں اور زیادہ فصیح و بلیغ ہیں وہ مکی ہیں اور جن میں احکام نازل ہوئے ہیں۔ وہ مدنی ہیں۔ احکام نازل ہی جب ہوئے جب مدینے شریف میں نظام کی ابتدا ہو چکی تھی۔ احکام کے نزول کے بعد یہ نہیں ہوتا تھا کہ ان پر انفرادی طور پر عمل کیا جاتا ہو، بلکہ اس کا طریقہ ہی یہ تھا کہ وہ احکامات نظام کی طرف سے نافذ ہوئے تھے۔ مثلاً جب چوری سے متعلق احکامات نازل ہوئے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ جس کے گھر چوری ہوتی تھی اس نے محلّے کے لوگوں کو جمع کیا، اور چور کا ہاتھ کاٹ دیا بلکہ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جس کے گھر چوری ہوئی وہ حضورؐ کے پاس یا حضورؐ کے مقرر کردہ نمائندوں کے پاس اس جرم کی اطلاع کرتے اور وہ نمائندے تحقیق و تفتیش کے بعد اس جرم کا فیصلہ کرتے۔ نکاح، طلاق کے احکامات میں حکومت کو Involve کرنا لازمی تھا۔ بغیر حکومت کی Involvement کے نکاح و طلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ وراثت کے احکامات کا اطلاق حکومت کی جانب سے ہوتا تھا۔ قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی تھی۔ چونکہ یہ احکامات اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے، اور رسول اللہ ان کو نافذ فرماتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام یا دین جس کو حضورؐ نے عملاً اس زمین پر نافذ فرمایا، صرف اور صرف، اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ نظام کے قیام کے بغیر اللہ و رسول کی اطاعت کا تصور ''حدیث بے خبراں'' ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔

(1) یہ نظام زندہ بادی نظام ہوتا ہے۔ اس میں زندہ اتھارٹی کا ہونا لازمی ہے۔ لوگ پہلے اس

اتھارٹی کے احکامات سنتے ہیں پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ مجرد کتاب (قرآن کریم) یا روایات کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں 'سمع' کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

(1) وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُo(2/285)

اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم نے سنا اور مان لیا، ہمیں تیری مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہےo۔

(2) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَo(8/20)

اے ایمان والو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہوo

(3) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَo(24/51)

ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اسکے رسول کی طرف بلایا جائے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیںo۔

(4) فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ(64/16)

تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔

ان آیات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے پیشتر 'سماعت' شرط ہے جو صرف زندہ اتھارٹی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ مجرد کتاب یا روایات سے نہیں ہو سکتی۔

(2) یہ اطاعت ایک ہے قرآن کریم میں ان دو مطاعوں کے لئے ضمیر واحد استعمال کی گئی ہے اس کے لئے آیات (24/54-9/74-9/62-9/24-8/24) وغیرہ۔ ملاحظہ ہوں۔

(3) اس نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے الفاظ جمع کے صیغے میں آتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اطاعت خداوندی اجتماعی نظام میں ہی ممکن ہے۔

(4) اللہ تعالیٰ نے جو وعدے مومنین سے کئے ہیں وہ اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں ارشاد ہوتا ہے o وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6)o زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ مگر آج کل یہ صورت حال نہیں ہزاروں آدمی بھوکے مر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جاری کردہ خود ساختہ نظام کے مطابق رزق کی تقسیم کرتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔ یہ تو غیر مناسب بات ہے کہ رزق ہم اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق تقسیم کریں اور توقع اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے پورا ہونے کی کریں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ آپ قرآن کریم کا معاشی نظام جاری کریں، اس نظام میں ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگی اور ہر شخص کو یقیناً رزق ملے گا اللہ تعالیٰ کا دوسرا وعدہ یہ ہے کہ مومنین ہمیشہ غالب رہیں گے۔ یہ وعدہ بھی اللہ تعالیٰ کے نظام کے ہاتھوں پورا ہوگا۔ انفرادی طور پر یہ وعدہ پورا نہیں ہو سکتا۔ نیز فرمایا۔

(1) وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَo(63/8)

عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں مانتےo۔

(2) إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْo(47/7)

اے ایمان والوں اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گاo۔

(3) وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَo(30/47)

مومنین کی مدد کرنا ہمارا فرض ہےo۔

(4) وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًاo(4/141)

اور اللہ نے کافروں کو مومنین پر غالب رہنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی o۔

ان آیات اور اسی طرح کی متعدد آیات کریمات میں مومنین سے غلبہ کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل مسلمانوں سے زیادہ ذلیل وخوار اور کوئی قوم نہیں ہے اس کی وجہ ظاہر و باہر ہے کہ یہ سب وعدے اللہ تعالیٰ کے کے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر مسلمان وہ نظام قائم کرلیں تو اللہ تعالیٰ کے یہ سارے وعدے پورے ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس قعر مذلت سے نکلنے کا واحد حل ان کے نظام کا قیام ہے۔ جس دن مسلمانوں نے یہ نظام قائم کرلیا اور اس کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دے دیا مسلمانوں کی یہ ساری تباہی وبربادی ختم ہو جائے گی اور مسلمانوں کو صدر اول کا سا عروج واقتدار حاصل ہو جائے گا کیونکہ وہ عروج واقتدار بھی اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوا تھا۔ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ (11/88) میں تو جہاں تک بھی مجھ سے بن پڑے اصلاح کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتا۔

ماہ مئی 2006ء

اللہ ورسول کی اطاعت کی عملی شکل اسلامی حکومت کی اطاعت ہے

اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ضابطہ حیات اور انسانی عقل کا خود ساختہ نظام زندگی برابر نہیں ہو سکتے هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ (13/16) تاریکیاں اور روشنی برابر نہیں ہو سکتیں۔ اسلامی حکومت اپنے وجود میں بالکل منفرد حکومت ہوتی ہے۔ جس کو عقل انسانی وحی الٰہی کی روشنی سے مستفید ہوئے بغیر قائم نہیں کر سکتی۔ اس طرز حکومت کو انسانی وضع کردہ حکومتوں، جمہوریت، اشتراکیت، فاشیت، نازیت وغیرہ سے کوئی مشابہت ومماثلت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ انسانی ذہن کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت قرآن کریم کے احکامات کو قوت کے ذریعہ نافذ کرتی ہے۔ اس کے برعکس جو بھی حکومت اسلامی قوانین نافذ نہ کرے، بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اجراء کرے وہ اسلامی حکومت ہرگز نہیں ہو سکتی خواہ اس حکومت کو چلانے والے سب مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر قانون اور حکومت کا ایک فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے۔ قانون اور حکومت دونوں آپس میں لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ ہر قانون کا اپنی نمود وساخت میں یہ تقاضہ وخاصہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کو پیدا کرے جو اس قانون کو عملاً جاری کرے۔ قرآن کریم چونکہ پوری انسانیت کی ملکیت ہے اور پوری انسانیت کو نفع وفائدہ پہنچانے کے لئے نازل کیا گیا تھا اس لئے اس کا خصوصی مقتضی ومنطقی نتیجہ تھا کہ اس کے قوانین واحکامات کو جاری کیا جائے تاکہ انسانیت اس کے فوائد سے محروم نہ رہے۔ اسی وجہ سے جمہور مسلمانوں کا اس بارے میں ہمیشہ یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ خلیفہ کا نصب کرنا یعنی اسلامی حکومت کو قائم کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ سورۂ نساء کی مشہور آیۂ کریمہ میں جہاں اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، یہ خود اس امر کا مقتضی ہے کہ جب تک کسی اولی الامر کا

وجود و نصب نہ ہوا سے وجود میں لانا یا اس کا نصب کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ کیونکہ اطاعت اولی الامر جو کہ فرض قرار دی گئی ہے، نصب اولی الامر کے بغیر ناممکن ہے۔

سورۃ توبہ میں ارشاد عالی ہے o قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ o(9/29)o ان اہل کتاب سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں جانتے، قتال کرو یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دیں o۔ اس آیہ کریمہ میں کفار کا جزیہ دینا اور ان کا 'صغار' یعنی ماتحت ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں کسی باقاعدہ مضبوط ملک اور اس کی حکومت کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔

نیز ارشاد ہوتا ہے o وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (8/60)o اور کفار سے مقابلہ کرنے کے لئے تم میں جس قدر استطاعت ہو قوت مثلاً گھوڑے وغیرہ تیار رکھو جس سے تم اپنے اور اللہ کے دشمن کو ڈراتے رہو، یہاں قوۃ کا لفظ بطور نکرہ کے استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس میں ہر طرح کی قوت شامل ہو سکے، اس میں اسلحہ کے علاوہ معاشی، سیاسی، افرادی، ہر طرح کی قوت شامل ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے قیام کے بغیر ان قوتوں کا جمع کرنا ممکن نہیں ہے کہ جن کے ذریعے اللہ کے دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے o وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ o(49/9)o اگر کبھی ایسا ہو کہ مومنین کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں، تو ان میں فوراً صلح کرا دو، اگر اس کے بعد ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو تم سب مل کر اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف اٹھ کھڑے ہو، تا آنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانون خداوندی کی رو سے کیا گیا تھا۔ سو اگر وہ لوگ، اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئیں تو

ان میں عدل وانصاف کے مطابق صلح کرادو اور ہمیشہ انصاف پیش نظر رکھو یہ چیز قانون خداوندی کی رُو سے بڑی مستحسن ہےo۔ دو جماعتوں میں صلح کرانا، پھر ان جماعتوں کو صلح کا پابند کرانا، زیادتی کرنے والی قوم کو سزا دینا، یہ تمام امور بغیر غلبہ وحکومت کے کس طرح انجام سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں بیسیوں آیات کریمات پیش خدمت کی جا سکتی ہیں۔ مضمون کے اختصار کے پیش نظر صرف ان ہی آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے حکومت کو نعمتوں میں سے ایک نعمت بھی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہےo
أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًاo(4/54)o کیا دوسرے لوگوں سے اسی چیز پر جلتے ہیں جو ان کو اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔ تو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب، حکمت اور بہت بڑی سلطنت عطا فرمائیo۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کوششیں کی۔o وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَo(5/20)o جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کے احکامات جو تم پر ہو رہے ہیں یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب ملک بنایا تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا میں کسی کو نہیں دیںo۔

آیات قرآنیہ کے علاوہ احادیث نبویہ میں بھی حکومت کے قیام کو فرض قرار دیا گیا ہے۔
ومن مات وليس فى عنقه بيعة مات ميتة الجاهلية، جو شخص ایسی حالت میں مرجائے کہ اس کی گردن میں کسی امیر کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب لزوم الجماعۃ) اس طرح ارشاد ہوتا ہے **وانما الامام جنة يقاتل من ورائة ويتقى به فان امر يتقوى الله وعدل فان له بذلك اجراً وان قال بغيره فان عليه منه** (مشکوٰۃ، کتاب الامارہ والقضاء) بے شک امام وہ سپر ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے سے حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔ پس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو

ثواب ملے گا اور اگر کسی کے خلاف کرے تو گناہ گار ہوگا۔ ہمارے علماء و متکلمین بھی اسلامی حکومت کے قیام کو فرض سمجھتے تھے۔ شرح مواقف جو علم کلام کی مشہور ترین کتاب ہے اور درس میں شامل ہے اس میں درج ہے کہ **نصب الامام واجب عند ناسمعاً**، امام کا تقرر ہمارے اور دلیل نقلی کی بناء پر واجب ہے۔ نیز اسی طرح درمختار میں ہے کہ **ونصبه اهم والواجبات**، امیر کو مقرر کرنا واجبات میں سب سے اہم واجب ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی **ازالة الخفا** میں تحریر فرماتے ہیں۔ مسئلہ واجب بالکفایہ است بر مسلمین۔ **الی یوم القیامة نصب خلیفه مستجمع شروط**، مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے۔ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔ یہاں تک جو پیش خدمت عالی کیا گیا ہے اس سے قارئین کرام نے اندازہ فرمایا ہوگا کہ اسلامی حکومت کا قیام اب بھی مسلمانوں پر اسی طرح فرض ہے جس طرح حضورؐ نے اپنے دور سعید میں اس کو قائم فرمایا تھا۔ ان تحریر کردہ آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اقوال و آثار علماء کے بعد کوئی راہ فرار باقی نہیں رہتی۔

نزول قرآن کریم کے دوران مختلف امور کے متعلق مسلسل قوانین واحکامات دیئے جا رہے تھے۔ ان کی عملی شکل یہ ہوتی تھی کہ مومنین ان پر اجتماعی طور پر ایک نظام کی وساطت سے عمل کرتے تھے۔ زکوٰۃ، خمس، صدقات کے احکامات نازل ہوئے تو لوگوں نے فرداً فرداً زکوٰۃ ادا نہیں کی کہ جس کا دل چاہا اپنی مرضی سے کسی کو زکوٰۃ دے دی بلکہ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یہ رقم حضورؐ کے پاس پیش کی جاتی اور حضورؐ اس کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے بیت المال میں جمع کر دیتے اور حسب موقع اس کو خرچ کیا گیا اسی طرح جب احکام تعزیرات نازل ہوئے کہ زانی کے سو کوڑے مارو یا چور کے ہاتھ کاٹ دو تو لوگوں نے از خود ان احکامات پر عمل نہیں کیا تھا کہ کسی کے گھر چوری ہوئی تو اس نے چور کو پکڑ کر اور محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے، اس چور کے ہاتھ کاٹ دیئے بلکہ صورت حال یہ ہوتی تھی کہ چوری یا زنا کے جرم کی اطلاع حضورؐ کو یا حضورؐ کے مقرر کردہ اسلامی حکومت کے افسران، یعنی اولی الامر کو دی جاتی تھی، وہ اس جرم کی تحقیق و تفتیش کر کے اس کے مطابق اُس مجرم کو سزا دیتے

تھے یا اسے بری کر دیتے تھے۔ اسی طرح نکاح وطلاق کے معاملات بھی حضورؐ کی معرفت طے پاتے تھے قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت اس مرکز کی وساطت، اجتماعی طور پر کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر ان کی اطاعت الگ الگ از خود نہیں کی جاتی تھی اس مرکز کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ احکام اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے اور ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جاری فرما رہے تھے، اس لئے اس نظام (مرکز) کی اطاعت سے اللہ و رسول دونوں کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا اولی الامر خود حاکم نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ خود ان احکامات کی اطاعت کرتے تھے اور دوسروں سے ان کی اطاعت اجتماعی طور پر کراتے تھے۔ اسلامی حکومت میں تو درحقیقت نہ کوئی حاکم ہوتا ہے اور نہ کوئی محکوم۔ بلکہ ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں، اس طرح حاکم صرف قانون الٰہی ہوتا ہے۔ اور وہی طاقت کا منبع ومحور ہوتا ہے۔ یہ حکومت بجا طور پر خالص قانونی حکومت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اس حکومت کے قیام اور اس کی بقا کا راز اور سبب یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اس حکومت کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہو رہی ہے۔ اس نظام میں حکومت کی چار نمایاں خصوصیات ہیں جو پیش خدمت کی جا رہی ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیات اتنی واضح ہیں کہ ہر شخص از خود اندازہ کر سکتا ہے کہ کون سی حکومت اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی ہے۔

(1) اس مملکت کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس میں اللہ ورسول کی اطاعت ایک اطاعت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر جگہ ان دو مطاعوں کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ آیات راقم سطور کے سابقہ مضامین میں کئی بار تحریر کی گئی ہیں۔ بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے حوالے تحریر کئے جاتے ہیں۔ آپ ان کو معہ ترجمہ اپنے نسخوں میں ملاحظہ فرمالیں۔ بعض نسخوں میں ایک یا دو آیات کا فرق ہوتا ہے، اس لئے اس بات کو پیش نظر رکھیں۔

آیت یہ ہیں

(59/1-4-59/8-58/21-33/36-24/63-24/54-9/107-9/74-9/62-9/24-8/46-8/ 20-8/13)

(2) اس حکومت کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ بغیر اس نظام کے قیام کے اللہ ورسول کی اطاعت کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق صرف اس نظام کی وساطت سے قائم ہوتا ہے اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو ہم اللہ ورسول کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں۔ کیونکہ مومن تو وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطہ تسلیم کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہاں سے ہی اس جدوجہد کا آغاز کردے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ و بنیاد سے اُکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں اُن کے لئے ازبس ضروری ہے کہ قرآن کریم کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے باغی، مجرم، نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزے کے پابند ہوں۔ غیر خدائی نظام (طاغوت) میں جس قدر رزق جائز ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے، وہ بھی قرآن کریم کی رُو سے حرام ہوتا ہے۔

(3) اس نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے قرآن کریم میں کئے ہیں۔ وہ اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ اگر وہ نظام وہ وعدے پورے کر رہا ہے تو بے شک وہ اسلامی نظام ہے ورنہ وہ اسلامی نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک ایسا عملی Test ہے جس پر ہر شخص اس حکومت کو پرکھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بہت واضح طور پر وعدہ فرماتا ہے کہ o وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6)o زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہیں ہے نیز ارشاد ہوتا ہے نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (17/31) ہم تمہارے رزق کے

ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کس واضح انداز میں اللہ تعالیٰ سب کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ان سب کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے تو ان میں سے کسی کو بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے تھا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں کروڑوں لوگ دو وقت کی روٹی سے محروم ہیں اور بھوکے مر جاتے ہیں۔ بظاہر ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے جھوٹے ہیں، لیکن ان آیات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ذمہ داریوں کو براہ راست پورا کرتا ہے۔ یہ ذمہ داریاں اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہیں جو اس کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ اگر نظام معاشرہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق قائم ہے تو اللہ کی تمام ذمہ داریاں پوری ہوتی جاتی ہیں۔ وہ نظام جو اللہ تعالیٰ کے نام سے قائم ہوتا ہے وہ ان ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں اور اس کے بدلے میں اس نظام کے افراد بھی وہ تمام واجبات و فرائض ادا کرتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے اللہ سے کیا ہوتا ہے۔ اس مملکت کے لوگ اس حکومت کی اطاعت کرنے کے اس وقت تک پابند ہیں جب تک وہ حکومت ان ذمہ داریوں اور وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس قریہ میں ایک شخص نے بھی رات بھوک میں گذار دی، اس قریہ سے اس حکومت کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے یعنی اُٹھ جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں سے غلبہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے فرمایا۔

(1) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ٥(3/139)

اور مسلمانوں کاہلی نہ کرو اور غم نہ کرو کیونکہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے ٥۔

(2) وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا٥(4/141)

اللہ کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں دے گا٥۔

(3) كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (58/21)

اللہ نے حکم دے دیا ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

(4) وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَo(63/8)
حالانکہ غلبہ تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے، مگر منافقین نہیں جانتےo۔

(5) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ(61/9-48/28-9/33)

وہ ہی تو اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔

یہ اور اسی قبیل کی متعدد دیگر آیات بینات، سب اسی نظام کے قیام سے وابستہ و مربوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ تمام وعدے، صرف اور صرف اس وقت پورے ہوسکیں گے، جب وہ نظام برپا ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ یہ وہ عملی Test ہے جس سے اسلامی حکومت کی پہچان ہوسکتی ہے۔ صدر اول میں یہ وعدے اسی نظام کی وساطت سے پورے ہوئے جب حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہنشاہ ایران کے محل میں داخل ہوئے تو ان کی زبان پر بے ساختہ قرآن کریم کی یہ آیات جاری تھیںo كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍo وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍo وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَo كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ o(44/25.26.27.28)oانہوں نے کس قدر سرسبز وشاداب باغات، خنک وشیریں چشمےo لہلہاتی کھیتاں اور بلند و بالا مقامات عز وشرف اپنے پیچھے چھوڑ دیئےo یعنی وہ تمام سامان آرائش وزیبائش جوان کی خوش حالیوں کا آئینہ دار تھاo وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ہم نے ایک اور قوم کو اس کا وارث بنا دیاo۔

ایرانی قوم عربوں کے مقابلہ میں زیادہ شمار کی جاتی تھی۔ ان کی روزمرہ کی معاشرت عربوں کے مقابلہ میں زیادہ Sophiscated تھی اور ان کے ہاں آرام وآسائش، اور زیبائش کے زیادہ سامان موجود تھے۔ عرب ہمیشہ ان کے حاصل کی Wishful thinking کرتے تھے،

اسی وجہ سے قرآن کریم نے عربوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ایمان لائیں گے تو ان کو وہ اشیاء مل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے ریشمی ملبوسات، جو ہرات اطلس وکمخواب، مرصع بار موتیوں کے کنگن، قصور و محلات، باغات وغیرہ کا وعدہ قرآن کریم میں فرمایا تھا۔ فتح ایران کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب مال غنیمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارسال کیا تو اس سامان کے ساتھ ایک مکمل فہرست بھی سامان کی ارسال فرمائی۔ اس سامان میں وہ تمام اشیاء شامل تھیں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے نظام کی وساطت سے پورے ہوگئے۔ سورہ حج میں ارشاد ہوتا ہے o الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ o (22/41) o اگر ہم انہیں ملک میں حکومت عطا کر دیں، انہیں اقتدار حاصل ہوگیا تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے، یعنی ایسا معاشرہ قائم کریں گے کہ جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں گے۔ یہ تمام نوع انسانی کو سامان نشو ونما مہیا کریں گے ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قرآن کریم درست قرار دیتا ہے اور ان تمام امور سے باز رکھیں گے جنہیں وہ ناجائز قرار دیتا ہے۔ یہ تمام معاملات کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق کریں گے o۔ اسی طرح سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔ o وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ o (24/55)------------ (باقی رہا یہ کہ ان قوانین کی اطاعت سے کیا ملے گا؟) تو ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم نے انہیں زمین میں حکومت عطا کریں گے (33/27) اور ان کی حکومت اس خطہ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی (39/74) یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوام سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (**تمکن فی الارض**) عطا

کی تھی (28/6) اسی قانون کے مطابق ہم ان کے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں اُنہیں حکومت عطا کر دیں گے۔ ان کے اس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تاکہ وہ نہایت اطمینان سے ہمارے اور صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو، کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں (دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں مجبور نہ کر سکے) کہ وہ قوانین الٰہی کے ساتھ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کریں (لیکن یہ اچھی طرح سن لو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد، اس سے عملاً انکار کر دیں (اور احکام خداوندی کی بجائے، اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں) تو یہ لوگ اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو اُنہیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے (مقتبس از مفہوم القرآن)

یہ وہ وعدے ہیں جو اسلامی نظام پورے کرتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لئے مکمل اقتدار اور غلبہ، اس میں دین کا تمکن معاشرہ میں امن و اطمینان، اور قانون خداوندی کا پورا پورا اجراء و نفاذ۔

(4) اسلامی مملکت کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے ایک زندہ، جیتی جاگتی، شخصیت کا ہونا لازمی ہے۔ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں ہے، اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے یہ مرکزی، شخصیت رسول کی ہوتی ہے اور چونکہ اسلام کا نظام ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اس لئے رسول کے بعد یہ مرکزی شخصیت ان کے نائب، ان کے خلیفہ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ **علیکم بسنّتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدین** (مشکوٰۃ شریف) تم پر میرے اور میرے خلفاء راشدین مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، اس کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت گردانی جاتی تھی۔

صدرِ اول میں یہی نظریہ معروف و متداول تھا۔ ہم مسلمانوں کی بدقسمتی کہ ہمارے ہاں

ملوکیت درآئی۔ظاہر ہے کہ ملوکیت کے قیام کے بعد بادشاہوں کی اطاعت، اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ وہ بادشاہ بدچلن، بدکردار، آوارہ اور عیاش تھے۔ وہ تو محض قوت کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے تھے، ایک ایک بادشاہ کے حرم میں کئی کئی سو لونڈیاں ہوتی تھیں۔اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے باعث وہ خود بھی اپنی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دینے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔اگر چہ اپنے مفادات اور Vested Interets کی خاطر انہوں نے اپنے اپنے دور کے علماء وفقہاکرام سے فتاویٰ حاصل کر لئے تھے۔لیکن وہ اس بات کی جرات نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیں۔فلہٰذا ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو قرآن کریم کی اطاعت سے کی جانے لگی لیکن رسول کی اطاعت کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی۔اگر انسانیت اور مسلمانوں کی خوش بختی ان کی یاوری کرتی تو وہ پھر وہی نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور ملوکیت نے اپنے دور کے علماء کے تعاون سے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حدیث رسول کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔اس عقیدہ کے وضع کرنے کے بعد روایات کے ذخیرے مرتب ہونے لگے اور ان کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔جس کسی نے دس فقرے لکھ کر، حضورؐ کی طرف منسوب کر دیئے، ان دس فقروں کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت قرار دیا جانے لگا۔اس طرح ایک زندہ، جیتی جاگتی، شخصیت کا موجود ہونا، اطاعت رسول کے لئے ضروری نہ رہا۔اس طرح یہ اطاعتیں بھی دو اطاعتیں ہو گئیں۔حالانکہ قرآن کریم نے ان دو اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار دیا تھا، اس کے لئے آیات اوپر درج کی جاچکی ہیں۔مزید یہ کہ قرآن کریم نے اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے 'سماعت' شرط قرار دی ہے۔جس کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت ہیں۔لیکن زندہ اتھارٹی کے موجود نہ ہونے سے سماعت کی شرط پوری نہیں ہوسکتی۔کیونکہ روایات کی اطاعت کرنے میں سماعت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا، اور یہی بات قرآن کریم کے خلاف ہے۔

(1) وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُo(2/285)

اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم نے تیرا ارشاد سنا اور مان لیا۔ پروردگار ہمیں تیری ہی مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف کر جانا ہے۔

(2) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ٥
(8/20)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

(3) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥(24/51)

ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(4) فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ(64/16)

تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو، اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اپنی بھلائی کے لئے۔

اب ہمارے موجودہ دور میں یہ صورت حال ہے کہ مسلمان خود اپنے نظریات و قوانین سے مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ بیشتر نظریات و قوانین ملوکیت کے دور کے وضع کردہ ہیں۔ نیز یہ کہ دنیا کے مصائب و نوائب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ساری دنیا اور خود مسلمان عقل انسانی کے بنائے ہوئے نظامہائے حیات سے تنگ آ گئے ہیں اور اسلامی نظام کے قیام کی کوششیں جگہ بہ جگہ جاری ہیں۔ لیکن اس نظام کے قیام میں مسلمانوں کے غلط نظریات رکاوٹ بن کر کھڑے ہو رہے ہیں۔ قرآن کریم کے نظریات کے مطابق، کہیں بھی اور کبھی بھی، اسلامی نظام قائم ہوگا، اس کے سربراہ کو جانشین رسول کا درجہ حاصل ہوگا اور اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔ وہ ایک زندہ، مرکزی

اتھارٹی ہوگا، اس کے احکام کی سماعت ہوگی اور اس کے بعد اس کی اطاعت ہوگی۔لیکن وائے برحال ما کہ ہمارے علماء کرام کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور ملوکیت کا ہی وضع کردہ نظریہ متداول ہے کہ روایات سے رسول اللہ کی اطاعت ہوتی یہی خلاف قرآن نظریہ، اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث سے اللہ ورسول کی اطاعت کرنے کا عقیدہ خود ملوکیت کے دور کا وضع کردہ ہے۔اس میں اسلام دین کی سطح سے گر کر پھر مذہب کی سطح پر آجاتا ہے اور اس میں اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے نظام کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس طرح تو آپ کسی ملک میں بھی اللہ ورسول کی اطاعت کرسکتے ہیں۔اس طریقے کے مطابق تو ہندوستان کے مسلمان بھی اللہ ورسول کی اطاعت کرسکتے ہیں۔پھر نہ تو دین کے قیام کی ضرورت باقی رہتی ہے، نہ ہی کسی مرکزی اتھارٹی کی، اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے اقتدار اور غلبہ کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ ہی اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوسکتے ہیں، اور مسلمان پھر اسی گرداب میں ہمیشہ پھنسے رہے گے۔مسلمانوں کے مصائب ونوائب، پستی زبوں حالی، بدبختی وبدنصیبی، غربت وافلاس، کا واحد علاج ان کے دین کا قیام ہے۔لیکن دین کا قیام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک مسلمان اپنا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق نہیں کرتے اور روایات کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت کے عقیدے کو نہیں چھوڑتے۔یاد رکھئے کہ حدیث کا یہ مقام مذہب میں ہے۔دین میں تو صرف قرآن کریم ضابطہ حیات قرار دیا جاتا ہے اور اسلامی قانون کا ماخذ (Source of Law) بھی صرف قرآن کریم ہوتا ہے۔حدیث کا مقام صرف دین کی تاریخ ہے اور بس۔

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔اس سلسلہ میں یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ مضمون سید قیصر علی صاحب کی مشہور کتاب ''سب سے پہلے پاکستان، کیوں، کیسے، کاش'' کے سلسلہ میں تحریر کیا گیا ہے۔سید قیصر علی صاحب ملک کے معروف دانشمند اور مصنف ہیں۔ان کی پُر مغز کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔اس تقریب میں چند حضرات نے حصہ لیا اور اپنا اپنا موقف بیان فرمایا۔محترم جناب سید قیصر علی صاحب نے اپنی اس کتاب میں سب سے زیادہ زور

دین کے قیام پر ہی دیا ہے۔لیکن دین کے قیام کے سلسلہ میں نہ تو انہوں نے اپنی کتاب میں کوئی وضاحت فرمائی اور نہ ہی احباب کی Discussion میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین کے قیام سے کیا مراد ہے۔اس مختصر سے مضمون میں اس کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی تقریب میں گفتگو کے دوران متقی کی تعریف (Definition) بھی زیر بحث آئی میرے برادر محترم جناب حسین امیر فرہاد نے اس کی بر موقع وضاحت فرمادی۔اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہمارے سامنے متقی کا تصور یہ آتا ہے کہ وہ تہجد گذار ہو، روروکر نعتیں پڑھتا ہو، کئی حج و عمرے کرنے کے باوجود مزید حج وعمرہ کی سعادت سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہو۔چہرہ سے تقشف و تورع، تخشع وخضوع کا نہایت واضح اظہار ہو رہا ہو،لیکن دین میں متقی وہ ہوتا ہے جو اسلامی حکومت کا مطیع وفرنبردار ہو جو شخص جس درجہ اسلامی حکومت کا فرمانبردار ہوگا اسی درجہ وہ متقی ہوگا۔اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت اور تقویٰ ہے۔

میرے محترم جناب سید قیصر علی صاحب نے حقوق العباد وحقوق اللہ کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بھی 'حدیث بے خبراں' ہے۔قرآن کریم نے حقوق اللہ وحقوق العباد کی کوئی تقسیم نہیں کی ہے۔البتہ ہمارے علماء عیسائیت کی ثنویت سے متاثر ہوکر اس کے قائل ہو گئے ہیں۔ عیسائیت میں یہ نظریہ ہے کہ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا حصہ قیصر کو۔لیکن اسلام میں اس کی کوئی تفریق نہیں ہے (17/26-70/24) اور دیگر چند آیات کریمات میں حقوق العباد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں حقوق اللہ کا ذکر نہیں آیا ہے۔

البتہ صرف ایک جگہ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (6/142) آیا ہے۔فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو یہ حق جسے اللہ کا حق کہا گیا ہے وہ وہی ہے جو محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق ہے۔ جو اسلامی نظام کی معرفت ہی اُنہیں دیا جاتا ہے۔قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کے لئے کہا گیا ہے وہ اسلامی نظام کو قرض دینا مراد ہے اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنا آتا ہے إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ (47/7) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اس سے بھی

اسلامی نظام کی مدد کرنا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق وہی ہیں جو اسلامی نظام میں عوام کے حقوق ہیں۔ اور وہ ظاہر ہے کہ انسانوں کے باہمی حقوق ہیں۔ کیونکہ انسانوں کے باہمی حقوق کا ادا کرنا ہی دین ہے اور یہ حقوق وحی کے ذریعے مقرر ہوتے ہیں۔ عقل انسانی، وحی کی ہدایت کے بغیر انسانی حقوق کا تعین نہیں کرسکتی۔ جہاں تک ارکان عبادت کا تعلق ہے۔ اسے عموماً حقوق اللہ شمار کیا جاتا ہے تو یہ ارکان عبادت بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ان کا مقصد بھی اسلامی نظام کا قیام ہوتا ہے۔ یہ اس نظام کے ارکان ہوتے ہیں حدیث شریف میں آیا ہے **الصلوٰۃ عماد الدین** نماز دین کا ستون ہے۔ مقصود بالذات دین ہے، ستون نہیں ہے۔ جہاد صوم، زکوٰۃ، صلوٰۃ، ان سب ارکان کا مقصد قرآن کریم نے الگ الگ واضح طور پر قیام دین بتایا ہے۔ ارکان عبادت سے مقصود دین کا قیام اور اس کے ذریعے انسانی حقوق کی ادائیگی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی غیر ضروری نہیں ہوگا کہ سب سے پہلے پاکستان کا نظریہ ونعرہ نہایت ضروری ہے۔ ہمیں بھی پاکستان دل وجان سے عزیز ہے۔ لیکن قرآن کریم کے نزدیک وطن سے زیادہ عزیز دین کا قیام ہے۔ پاکستان ہمیں بے شک عزیز ہے، اور اس فعل سے اور بھی زیادہ عزیز ہوجاتا ہے کہ یہاں دین کے تمکن کا امکان ہے۔ لیکن اگر پاکستان میں دین کے تمکن کا امکان بالکل ختم ہوجائے، اور کسی اور جگہ دین کا نظام قائم ہوجائے، تو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہمارے لئے وہ مقام زیادہ اہم وعزیز ہوگا۔ اور اس کی طرف ہجرت کرنا ضروری ہوگا۔ قیام پاکستان کی تحریک کے دوران اسی کا نام ''معرکہ دین ووطن'' تھا۔ اور اسی نظریہ کے ماتحت انبیاء کرام ہجرت فرمایا کرتے تھے، اور اسی نظریہ کے مطابق حضورؐ نے ہجرت فرمائی تھی۔

ماہ جون 2006ء

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

برادر مکرم عزیز محترم جناب نسیم احمد خاں صاحب کا ایک گرامی نامہ ماہ جون کے موقر رسالہ صوت الحق میں اس کم ترین ہیچمدان کے نام طبع ہوا ہے جس میں عزیز موصوف نے حد درجہ مہربانی فرما کر یہ تحریر کیا ہے کہ انہوں میرے مضمون کو پسند فرمایا ہے۔ میں اس بارے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ شکایت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اکثر حضرات جنہوں نے محترم المقام پرویز صاحب سے اکتساب علم کیا ہے وہ اپنی کتابوں اور تحریرات میں پرویز صاحب سے استفادہ کرنے کا اعتراف نہیں کرتے۔ اور یہی شکایت انہوں نے مجھ سے بھی فرمائی ہے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے پرویز صاحب کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں اور پرویز صاحب کی ان نوازشات کا تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے قرآنی خدمت کے بارے میں سرانجام دی ہیں۔ نسیم صاحب نے دیگر مصنفین کے متعلق جو کچھ شکایتاً تحریر فرمایا ہے میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا کیونکہ انہوں نے کسی خاص شخص کو Pin-Point بھی نہیں کیا ہے۔ جو کچھ بھی انہوں نے اس کمترین کے لئے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق مضمون کے آخری حصہ میں تحریر کیا جائے گا۔ اور جو چند سطور انہوں نے محترم پرویز صاحب کے متعلق تحریر فرمائی ہیں مجھے ان سے صدفی صد اتفاق ہے۔ قرآن کریم کا کون طالب علم ان سے انکار کر سکتا ہے۔ محترم نسیم صاحب کا یہ خط ہے مضمون نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ پرویز صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے ظاہر کہ وہ خط ہونے کی وجہ سے مختصر ہی تحریر فرما سکتے تھے۔ محترم پرویز صاحب کی قرآنی خدمات ان کی کتب ان کے مضامین ان کے درس پر تبصرہ تو کوئی عالم یا دانشور تحریر کر سکتا ہے البتہ میں چونکہ بالکل اپنی اوائل عمر اور ابتدائی

زندگی سے یعنی آج سے 56 سال پیشتر سے اس تحریک سے منسلک چلا آرہا ہوں اس لئے میں صرف اپنے تاثرات ہی رقم کرسکتا ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ پرویز صاحب نے جو کچھ قرآنی خدمات انجام دی ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ان کی کتابوں پر تبصرہ کرنے سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا صحیح اندازہ تو زمانہ مستقبل میں ہوگا جب اس تحریک کو قبول عام حاصل ہوگا۔ قرآن کریم کی جو تشریح وتعبیر اس تحریک نے کی ہے اس کے علاوہ اور کوئی تعبیر وتشریح اب چل ہی نہیں سکتی اس لئے کہ

حق تو یہ ہے عصر حاضر عصر ہے پرویز کا

بطور جملۂ معترضہ تحریر کیا جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے اس دور میں قرآن کریم کو اس طرح Monopolize کیا ہے کہ پاکستان میں اور خصوصاً لاہور میں جہاں کہیں بھی قرآن کریم کے متعلق کوئی کانفرس یا سیمینار ہوتا ہے تو لوگ ان میں شرکت کرنے سے پیشتر ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ جلسہ پرویزیوں نے منعقد کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ راقم السطور کا ذاتی تجربہ ہے کہ علمائے کرام کے طبقے کو چھوڑ کر کسی بھی دانشوروں، کالم نگاروں اور Intellectuals نے پرویز صاحب کو پڑھا بھی نہیں ہوتا، آپ ان سے سوال کریں کہ آپ نے پرویز صاحب کو پڑھا ہے یا نہیں؟ تو باوجود اس کے کہ انہوں نے پرویز صاحب کی کوئی کتاب نہیں پڑی ہوگی فوراً اثبات میں جواب دیں گے کہ ہم نے پرویز کو پڑھا ہے۔ بعض حضرات کو میں نے سنا کہ فوراً کہہ دیں گے کہ ہاں میں نے مولانا پرویز کو پڑھا ہے۔ اس سے فوراً اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا پرویز کو مولانا کہنا خود ان کی غلط بیانی کی چغلی کھا رہا ہے۔ جہاں تک علماء کرام کا تعلق ہے وہ پرویز کا لٹریچر چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں میری ساری عمر اس محکمہ میں گذری جس میں ہر وقت بڑے بڑے جغادری مولوی صاحبان موجود رہتے تھے اور علماء کرام کی ریل پیل تھی اور محکمہ کی وجہ سے ہی تقریباً تمام دار العلوم میں جانے کا موقع ہوا۔ بڑے بڑے دار العلوم میں طلوع اسلام کے سال بہ سال کے مجلد پرچے میں نے خود دیکھے ہیں۔ پاکستان میں دانشوروں پر پرویز صاحب کا اس طرح قبضہ ہے کہ اس زمانے میں کسی اور کا نہیں ہے۔ اردو اخبارات اور ٹی وی چینلز کے مذاکرات میں حصہ لینے والے اکثر حضرات خود

طلوع اسلام ٹرسٹ سے کتابیں خرید کرلے جاتے ہیں اور ان کی تحریر سے پرویز صاحب کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ان حضرات کے نام تحریر کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا ورنہ میں ان کے نام بھی تحریر کرسکتا ہوں۔

مسلمانوں کے زوال کے اس طویل عرصے کے دوران سینکڑوں کی تعداد میں علماء کرام اور نہایت نیک نیت اور مخلص ریفارمرز پیدا ہوئے امام ابن تیمیہ، امام غزالی اور قریبی دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی اوران کے صاحبزادگان ، جمال الدین افغانی، مصر میں محمد عبدہ علامہ طنطاوی، ترکی میں سعد ذغلول، لیبیا میں سنوسی تحریک، عرب شریف میں عبدالوہاب نجدی اوراس کے علاوہ ایک بڑی تعداد دوسرے حضرات کی۔سب نے نہایت نیک نیتی سے قرآن کریم کی خدمت کی۔اس ایک ہزار سال کے دوران جس قدر علماء دانشور اور ریفارمرز پیدا ہوئے ان سب نے اپنے اپنے دور میں علمی اور بعض حضرات نے عملی تحریکیں برپا کیں، بہت جرأت اور حوصلے سے کام کیا۔ان حضرات کی جس قدر عزت کریں وہ اس کے مستحق ہیں۔لیکن افسوس کہ اس ایک ہزار سال میں ہمارے ان تمام حضرات کی نگاہ بنوعباس کے دور پر جا کر رک جاتی ہے جو دور مذہب کا ترجمان تھا، ان میں سے کسی ایک کی بھی نگاہ دین تک نہیں پہنچتی۔یہ شرف برصغیر کو حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے مذہب اور دین کے فرق کو بھانپا اور اس فرق کو اپنے اشعار کا عنوان قرار دیا۔علامہ اقبال یقیناً قرآن کریم کے گہرے مطالعہ سے ہی اس اہم اور دوررس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے۔لیکن انہوں نے جو کچھ فرمایا اس کو انہوں نے آیات قرآنی سے موید و مستند نہیں کیا اس کو صرف اشعار میں ہی بیان کیا۔کوئی نثری تحریر یا جامع مضمون تحریر نہیں فرمایا اس کام کو بخوبی اور بہ کمال سرانجام دینے کا شرف پرویز کو ہے کہ انہوں نے اس نکتہ کو خوب خوب بیان فرمایا۔تحریک طلوع اسلام یا خود پرویز صاحب کی تمام کتب وتحریروں کا نقطہ ماسکہ یہی ہے کہ چونکہ مسلمان اسلام کے دین کے معیار کو گرا کر مذہب کے معیار پر لے آئے ہیں اس لئے ان کو یہ زوال ہوا ہے اور مسلمانوں کی ترقی وعروج کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اسلام کو بطور دین کے اختیار کریں اس عنوان کو انہوں نے سلیم کے نام کے چوبیسویں

خط ''اطاعت رسول'' میں اس طرح واضح کیا ہے کہ کوئی شخص اس خط کو پڑھ کر اسلام کے دین ہونے میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ یہ خط اکتوبر 1956ء کا تحریر کردہ ہے۔ جبکہ پاکستان کا ماحول اس نظریے پر غور کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ قبل از پاکستان جب کہ انگریز کی حکومت تھی اور اسلام کے دین ہونے کا عقیدہ دور دور تک کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا اس وقت ایک مضمون ''کانگریس سے خطاب'' کے آخیر میں تحریر فرمایا کہ ''مسلمانوں کا نصب العین ہندوستان میں اللہ کی حکومت کا قیام ہے'' یہ مضمون ستمبر 1939ء کا تحریر کردہ ہے۔

''سوشلزم اور اسلام'' تحریر کردہ جولائی 1939ء میں تحریر فرمایا کہ اسلام کے نزدیک آزادی وہ ہے جو آئین الٰہی کے سخت ترین اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ ''جہان نو'' تحریر کردہ 1940ء میں تحریر فرمایا ''مسلمان کا مذہب اس کی حکومت ہے اور مذہبی آزادی سے مفہوم ایک آزاد حکومت کا قیام ہے'' اس قسم کے بے شمار اقتباسات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور جب کہ ان کی عمر چالیس سال سے بھی کم تھی ان کے سامنے دین کا تصور کس طرح واضح تھا۔ یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ یہ وہ دور تھا کہ اس وقت تک پاکستان کا مطالبہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس تاریک دور میں وہ حکومت الٰہیہ کے قیام کی صدا بلند کر رہے تھے۔ علامہ اقبال نے بے شک دین کا تصور دیا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے انہوں نے اس کی تائید و توکید قرآن کریم سے پیش نہیں کی، کیونکہ ہمارے ہاں جو ایک ہزار سال کی تفاسیر موجود ہیں ان میں تو دین کا کوئی تصور تک نہیں ہے۔ یہ ساری تفاسیر مذہب کی رو سے تحریر کی گئیں ہیں اور یہی ساری تفاسیر مسلمانوں کے زوال کا سبب بنی ہیں۔ پرویز صاحب نے اپنی ژرف نگاہی سے قرآن کریم کی ان تمام آیات کریمات کو نمایاں کر کے پیش کیا جن کا ہدف ہی دین کا قیام ہے۔

ان تمام سابقہ تفاسیر کے علی الرغم پرویز صاحب نے مفہوم القرآن تحریر فرمایا، مسلسل درس کا سلسلہ قائم کیا اور اس نظریہ کو کہ اسلام ایک دین ہے اور قرآن کریم ایک ضابطہ حیات اس قدر دلائل اور براہین سے پیش کیا کہ پاکستان کی فضا اور اس کا ماحول اس نظریہ سے گونجنے لگا، یہاں تک

کہ اب ہمارے علمائے کرام بھی اسلام کو بجائے مذہب کے دین کہنے لگے ہیں۔ ہمارے ایک ہزار سال کی تاریخ میں علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہے'' کا عقیدہ پیش کیا۔ لیکن انہوں نے اس موضوع پر صرف ایک مضمون قبل پاکستان غالباً 1938ء میں تحریر فرمایا تھا۔ لیکن اس عنوان کو پرویز صاحب نے یا طلوع اسلام نے اپنا مطمع نگاہ بنالیا۔ اور اس عنوان پر برابر چالیس سال تک مضامین تحریر کیے جاتے رہے۔ پرویز صاحب یا تحریک طلوع اسلام کا یہ منفرد نظریہ ہے۔ ساری ملت اسلامیہ میں یہ نظریہ اب بھی آپ کو کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔ جس دن مسلمانوں نے اس نظریہ کو قبول کرلیا اس دن ان کی بگڑی سنور جائے گی۔ شان نزول کے نظریے نے اور روایات کی وجہ سے ہماری تفاسیر کا بیشتر حصہ نہ صرف غیر قرآنی ہے بلکہ خلاف قرآن نظریات پر مشتمل ہے۔ ملوکیت اور پیشوائیت کے اثر سے ہر خلاف قرآن نظریہ کو قرآنی آیات کے تفسیر کے ذیل میں جگہ دی گئی ہے اور ملوکیت کی وجہ سے ہی تقدیر کے عقیدہ کو پختہ کیا گیا ہے۔ ملوکیت کیونکہ دین کی سخت مخالف ہوتی ہے اس کا وجود ہی مذہب کے سہارے قائم رہتا ہے۔ اس لئے ہماری تفاسیر میں دین کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس قدر خلاف قرآن عقیدے ہمارے تفاسیر میں درآئے ہیں ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہوتی، بلکہ ان کی اطاعت سے ان مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے۔ جنہوں نے وہ عقائد ہماری تفاسیر میں داخل کئے ہیں۔ یہ تمام خلاف عقائد قرآن تفسیر القرآن بالروایات کی وجہ سے ہماری تفاسیر میں داخل ہوئے ہیں۔ اس کا واحد حل یہی تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم سے کی جائے تاکہ خارج از قرآن نظریات داخل ہی نہ ہوسکیں۔ تفسیر القرآن بالقرآن سے خارج از قرآن نظریات کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن کی سب سے پہلے کوشش مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی مرحوم کی تھی، وہ دور قرآن کریم کی مخالفت کا سخت ترین دور تھا۔ مولوی محمد عبداللہ صاحب کے علاوہ اور اہل قرآن علماء نے بھی اس عنوان پر محنت کی اور خواجہ احمد الدین کی تفسیر ''بیان للناس'' طبع ہوئی لیکن ان دونوں تفاسیر میں سب سے بڑی خامی و کمزوری یہی ہے کہ ان میں اسلامی حکومت کا نظریہ نہیں ہے

جو قرآن کریم کی اصل ہے۔

پرویز صاحب کی کاوش اور کوشش اس معاملہ میں بالکل نادر و منفرد ہے۔ انہوں نے اپنے مفہوم القرآن میں خالص قرآنی نظریات پیش کئے۔ ان کے مفہوم القرآن میں ایک عقیدہ بھی خارج از قرآن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ تفسیر القرآن کا اصول ہی اس درجہ پختہ اور مضبوط ہے کہ اس نہج پر تفسیر تحریر کرنے سے خارج از قرآن نظریہ داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ تصریف آیات سے خارج از قرآن نظریات کی تائید ہو ہی نہیں سکتی۔ اس طرح کی کوشش پچھلے ایک ہزار سال میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے علماء ان سابقہ تفاسیر میں نقائص و معائب کے تو قائل ہیں اور یہ بات وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری سابقہ تفاسیر میں خارج از قرآن نظریات بڑی تعداد میں در آئے ہیں، جنہیں وہ خود اسرائیلیات کا نام دیتے ہیں اور یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سابقہ تفاسیر نہ تو موجودہ ذہن کو مطمئن کر سکتی ہیں اور نہ ہی موجودہ ضروریات کو پورا کر سکتی ہیں۔ اور سابقہ تفاسیر ہمارے آج کے مسائل بھی حل نہیں کر سکتیں۔ ان سب اعترافات کے باوجود ہمارے علماء کرام تفسیر نویسی کے اس طریقے اور اس نہج کو نہیں چھوڑتے ایک قدم ''سلف صالحین'' سے آگے نہیں بڑھاتے کیونکہ اس طرح انہیں اپنے خلاف قرآن عقائد کو ترک کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ پرویز صاحب کی اتنی بڑی خدمت ہے کہ جس کی جس قدر تعریف کریں کم ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کس درجہ محنت فرمائی ہے یہ ان کی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں جب کسی آیت پر غور کرتا ہوں تو رات کو غور کرتا ہوا سو جاتا ہوں اور جب صبح کو میں بیدار ہوتا ہوں تو آنکھ کھولنے سے پیشتر وہ آیت میرے ذہن میں گھوم رہی ہوتی ہے۔ اس طرح مسلسل غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں۔ ان کے اس غور و تدبر کی عادت کی وجہ سے راقم سطور جب ان سے کوئی بات کرتا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کے سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے۔

اس مختصر مضمون میں پرویز صاحب کی کتابوں یا قرآنی خدمات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں

ہے۔تبصرہ خود ایک بہت بڑا علمی کام ہے جو صرف ایک بلند پایہ سکالر ہی کر سکتا ہے۔اور یہ ایک پوری ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔یہ مختصر سا مضمون نسیم صاحب کے خط کی وجہ سے تحریر کیا گیا ہے۔البتہ اس مضمون میں پرویز صاحب کی چند ذاتی خوبیوں کا مختصراً تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ان کی سب سے بڑی قابل تعریف بات یہ ہے کہ انہوں نے ساری عمر خود اپنی محنت سے اپنا رزق کمایا۔بہت چھوٹی عمر میں وہ سول سروس میں داخل ہو گئے تھے۔قیام پاکستان کے وقت وہ ہوم منسٹری میں اسسٹنٹ سیکرٹیری تھے۔حالانکہ اپنی تحریر و تصنیف کی وجہ سے ان کا ایک ایک منٹ بڑا قیمتی تھا۔لیکن انہوں نے اس کے باوجود اپنی ملازمت کو جاری رکھا۔انہوں نے ساری عمر اپنے لئے یا تحریک طلوع اسلام کے لئے ایک پیسہ کا مطالبہ نہیں کیا۔وہ اس معاملہ میں اس درجہ محتاط تھے کہ بزموں یا احباب سوسائٹی کی جو رقوم ہوتی تھیں وہ ان کو ہاتھ لگانا گوارا نہیں سمجھتے تھے۔تحریک میں انہوں نے اپنے لئے کوئی منصب یا رتبہ مقرر نہیں کیا،کسی قسم کی روحانیت یا مقام کا دعویٰ نہیں کیا۔اور جو مومن تمہارے پیرو ہوئے ان سے بتواضع پیش آؤ۔(26/215)قرآن کریم کے ہر طالب علم سے وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔انہیں خود پر اس درجہ ضبط وتحمل تھا کہ چاروں طرف سے شدید حملوں اور مخالفت کے باوجود وہ کبھی برافروختہ نہیں ہوتے تھے۔1964ء میں جب لاہور کے درودیوار پر ان کے خلاف کفر کے فتوؤں کے بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے اس وقت بھی وہ بہت Composed تھے انہوں نے نہایت ضبط وتحمل کا مظاہرہ کیا اور تحریک سے منسلک افراد کو بھی سخت تاکید کی کہ وہ کسی قسم کا نہ تو مظاہرہ کریں اور نہ ہی کوئی جذباتی بات کریں۔انہوں نے طلوع اسلام کے اگلے ہی شمارے میں کفر سازی کا مضمون شائع کر دیا۔جس سے ان پوسٹروں کا اثر عوام پر کم ہوا اور عوام کو اندازہ ہوا کہ علماء کرام ایک ہزار سال سے کفر کے فتوے جاری کرتے چلے آرہے تھے۔

جناب محترم نسیم احمد خان کے اس اعتراض کے متعلق کہ کمترین راقم سطور اپنی تحریروں میں پرویز صاحب کا حوالہ نہیں دیتا،یا ان سے اکتساب علم کا اعتراف نہیں کرتا۔اس کے متعلق مضمون

کے شروع میں تحریر کیا گیا تھا کہ اس بات کے متعلق مضمون کے آخر میں کچھ تحریر کیا جائے گا تو اس کے متعلق عرض ہے کہ میرا ایک مضمون ''خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے'' موقر رسالہ صوت الحق بابت اکتوبر 2003ء میں شائع ہوا تھا جس مضمون میں میں نے مختصر طور پر فرقہ اہل قرآن اور تحریک طلوع اسلام کی ذہنی قربتوں اور فاصلوں کو Trace کیا تھا وہ مضمون قارئین نے بہت پسند فرمایا تھا اور سخت تقاضا کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط بھی شائع کی جائے۔ میرا ارادہ اس کی دوسری قسط تحریر کرنے کا ہوا لیکن میں نے اس کی دوسری قسط اس وجہ سے تحریر نہیں کہ اس میں میرا اپنا نام چند مقامات پر ضروری تھا اور یہ بات مجھے پسند نہیں تھی۔ اس وجہ سے میں نے نہیں لکھا۔ لیکن اس مضمون میں جناب نسیم احمد خان صاحب کے اعتراض کے دفاع میں مجبوراً چند سطور اپنے لئے تحریر کرنی پڑ رہی ہیں، جن کے لئے میں معذرت خواں ہوں۔ میں خود کو پرویز صاحب کا کفش بردار سمجھتا ہوں، اور ان کا ایک ملازم خیال کرتا ہوں۔

1948ء میں طلوع اسلام پڑھنا شروع کیا، اس وقت تک تحریک کی کتابیں نہیں آئی تھیں۔ صرف معراج انسانیت یا شاید دو اور کتابیں شائع ہو چکی تھیں اس وقت صرف رسالہ پر گزارہ تھا۔ میں 1952ء میں لاہور سے کراچی حاضر ہو کر پرویز صاحب سے فالور لائنز نیپئر زیرکس پر جا کر ان سے ملاقات کی، یہ ملاقات بہت مختصر تھی اس وقت تک بزمیں نہیں بنی تھیں البتہ بننے کے پروسس میں تھیں۔ مجھے پرویز صاحب نے فرمایا کہ میں لاہور میں عبداللطیف صاحب سے ملوں وہ لاہور میں بزم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نظامی صاحب ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھے میں ان سے ملا چونکہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا اس لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ البتہ میرا طریقہ یہ تھا کہ میں اہل قرآن حضرات سے رابطہ رکھتا تھا اور ''دارالقرآن'' میں جاتا رہتا تھا۔ یہ دارالقرآن گیتا بھون لکشمی چوک پر تھا اور اب بھی ہے۔ کبھی کبھی پرویز صاحب لاہور تشریف لاتے اور ان کی تقریر ہوتی تو میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک تقریر دیال سنگھ کالج ہال میں رات کو ہوئی مشہور بیرسٹر عبدالحق صاحب نے صدارت کی وہ تحریک سے وابستہ تھے ایک تقریر پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال

میں ہوئی ''اسلام میں قانون سازی کا اصول'' کے موضوع پر۔ چوہدری نذیر احمد صاحب وزیر صحت نے صدارت فرمائی وہ بھی طلوع اسلام سے وابستہ تھے۔ ایک تقریر حبیبہ ہال اسلامیہ کالج میں ہونی قرار پائی مگر ہال والوں نے عین وقت پر اجازت کینسل کر دی اس وجہ سے وہ تقریر نہ ہو سکی جو لوگ تقریر سننے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ ایک تقریر دار القرآن میں بھی ہوئی بروز جمعہ قبل نماز سورۃ ماعون اس تقریر کا موضوع تھا۔ تقریر کے بعد نماز ہوئی اور حافظ سردار احمد مشہور عالم اور مناظر نے خطبہ جمعہ دیا۔ اسی دوران سالانہ کنونشن بھی ہوتی رہیں یہ چوہدری عبدالرحمٰن صاحب جو ''بہترین سوپ'' کے مالک تھے ان کی کوٹھی پر ہوئی تھیں یہ کوٹھی Mint کے قریب تھی اور میرا خیال ہے کہ اس کنونشن کے ''باقیات الصالحات'' میں صرف شمیم انور ہیں جو طلوع اسلام کے انگلش سیکشن کی انچارج ہیں۔ برادر مکرم قدیر احمد خان سابق نمائندہ بزم کوئٹہ اور یہ راقم سطور ہی رہ گئے ہیں باقی سب لوگ مر گئے قدیر بھائی اس وقت قصور Posted تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔

اپریل 1958ء میں پرویز صاحب لاہور تشریف لے آئے اور اکتوبر 1958ء سے ان کے درس کا سلسلہ شروع ہو گیا اپنے درس کی انہوں نے تفسیر سے ابتدا نہیں کی بلکہ مختلف موضوعات پر تقریر کر کے حاضرین کے تصورات درست کئے۔ اللہ تعالیٰ کا تصور، نبوت، مقام نبوت وغیرہ قسم کے موضوعات کا انتخاب کیا تھا، قرآن کریم کے طلباء کے لئے یہ درس نہایت گراں بہا سرمایہ ہیں۔ پرویز صاحب کے لاہور تشریف لانے اور ان کی وفات تک کمترین کا برابر رابطہ رہا، درس کے شرکا دیکھتے تھے کہ میں درس سے چند منٹ پیشتر حاضر ہوتا تھا۔ لاہور میں انارکلی بازار کے اندر اتوار کے روز تقریباً بیس پچیس کتب فروش زمین پر کتابیں سلیقہ سے رکھ دیتے تھے اور کتابوں کے شائقین وہاں سے اپنی منشاء کے مطابق کتابیں خریدتے تھے ان کتب فروشوں اور مختلف لائبریریوں سے میں کتابیں جمع کر کے پرویز صاحب کو دیتا تھا اور اگلے اتوار کو واپس لیتا تھا۔ میرا مفاد اتنا تھا کہ وہ ان کتابوں پر تبصرہ کر دے۔ اگر وہ کسی کتاب پر Comment نہیں کرتے

تھے تو میں پوچھ لیتا تھا کہ بابا جی یہ کتاب ملاحظہ فرمائی تو وہ سمجھ جاتے تھے اور مہربانی فرما کر تبصر کر دیتے تھے۔ کتابوں کے اس طرح دینے اور لینے میں جو واقعات پیش آئے وہ الگ ایک مضمون کے متقاضی ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔

جہاں تک اپنے مضامین میں پرویز صاحب کے نام کا حوالہ نہ دینے کا تعلق ہے تو میں نے ہمیشہ طلوع اسلام کا حوالہ دیا اور طلوع اسلام کا حوالہ خود پرویز صاحب کا ہی حوالہ ہے۔ کیونکہ تحریک طلوع اسلام کا سارا علمی سرمایہ ان کا ہی مہیا کردہ ہے البتہ طلوع اسلام نے ایسا ذہن بنادیا ہے جو شخصیت پرستی سے بالکل ابا کرتا ہے۔ ذاتی محنت اور شخصیت پرستی میں بڑا لطیف فرق ہے۔ بار بار ان کے نام کا حوالہ نہ دینے کی وجہ طلوع اسلام کا بنایا ہوا ذہن ہے جو شخصیت پرستی پر آمادہ نہیں ہاں جہاں تک ان سے اکتساب علم کا تعلق ہے تو اس کا تہ دل سے اقرار ہے کہ جب کبھی چند سطور تحریر کی گئیں یہ ان کی کفش برداری کا نتیجہ ہے۔

ذاتی محبت مجھے ان سے بہت تھی، میں ان کے انتقال اور تجہیز و تکفین میں شامل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں تقریباً ایک سال تک درس میں شرکت نہیں کر سکا کوٹھی میں داخل ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اوائل عمر ہی سے بہت رقیق القلب ہوں کبھی ضروری کام سے دفتر طلوع اسلام جاتا بھی تو رونے لگ جاتا تھا۔ شیخ حمید مرحوم مجھے تسلی دیتے تھے۔ اس وقت بھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں خون کے آنسو میری آنکھوں سے رواں ہیں، سینہ غم سے پھٹا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے دل اندر سے کٹ رہا ہے۔

کیا کہیں کیسے مراسم تھے ہمارے اس سے وہ جو ایک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

ماہ جولائی 2006ء

مکاتیب

برادر محترم جناب فرہاد صاحب۔ مُدّ ظلہ۔ السلام علیکم۔ ایک عریضہ پیش کر رہا ہوں۔ اس کو طبع فرما کر شکر گذار فرمائیں۔ کتمانِ حقیقت کے معنی سچی بات کو پوشیدہ رکھنا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے یہ بہت بڑا اخلاقی جرم ہے اور عیب ہے، اور یہ عیب عموماً زوال پذیر اقوام میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ خصوصاً وحی کی رو سے جو تعلیم دی گئی ہے، جو صداقت وحقیقت پر مبنی ہے، اس تعلیم کو پوشیدہ رکھنا، سب سے بڑا جرم ہے۔ ہمارے ہاں اس جرم کی مرتکب عموماً مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ضد سے کام لیتے ہیں اور ضد کا جذبہ انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ حقیقت کو چھپائے رکھیں۔ اسی لئے وہ قرآن کریم کی حقیقی تعلیم کو چھپا کر فتاویٰ جاری کر دیتے ہیں۔ خود وضع کردہ عقائد کو فروغ دیتے ہیں اور انہیں احکام شریعت کہہ کر، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے نکاح کی چند شرائط مقرر فرمائی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک شرط بلوغت بھی قرار دی ہے حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (4/6) جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو (ترجمہ حضرت شیخ الہند) لیکن ہمارے علمائے کرام بلوغت کو نکاح کی شرط قرار نہیں دیتے اور نابالغوں کا نکاح جائز قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم کے خلاف ان سے اس عقیدہ کی کوئی قرآنی سند دستیاب نہیں ہو سکی، تو انہوں نے اس کے لئے تاریخ کا سہارا پکڑا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح کی مثال اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن بہت عرصہ پیشتر پرویز صاحب مرحوم نے حضرت عائشہؓ کی عمر کے متعلق تحقیق کر کے طلوع اسلام میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ حضرت عائشہؓ کی

عمر نکاح کے وقت 17 سال اور رخصتی کے وقت ان کی عمر 19 سال تھی اس تمہید کے بعد، اس بارے میں اصل بات پیش خدمت کی جاتی ہے۔

مولانا عمر احمد عثانی مرحوم مشہور قرآنی عالم گذرے ہیں اُنہیں ایک Advantege یہ بھی تھی کہ وہ علماء کے معروف خانوادے سے متعلق تھے۔ مشہور عالم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ان کے جد امجد تھے اور شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثانی صاحب اعلاء السنن ان کے والد گرامی قدر تھے۔ چونکہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے اس لئے تقریباً تمام اکابر دیوبند سے ان کے تعلقات تھے۔ اس تمام پس منظر کے باوجود وہ خالص قرآنی فکر کے حامل تھے۔ اور ان کا ادارہ طلوع اسلام سے گہرا تعلق تھا۔ جب ادارہ طلوع اسلام کراچی میں تھا تو وہ اس سے وابستہ تھے۔ میرے علم میں یہ بات تو نہیں ہے کہ وہ اس ادارہ میں کس کام پر مامور تھے البتہ یہ معلوم ہے کہ پرویز صاحب مرحوم کے نام جو خطوط آتے تھے، پرویز صاحب کی ہدایت کے مطابق عمر احمد صاحب ان کے جوابات ارسال فرما دیتے تھے۔ اس عرصہ میں میں نے جو خطوط لاہور سے پرویز صاحب کو تحریر کیے تھے۔ ان کے جواب عمر احمد صاحب کے Pad پر ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ان ہی مولانا عمر احمد عثانی نے فقہ القرآن، دس جلدوں میں تحریر فرمائی ہے یہ کتاب اسلامی فقہ کی تمام کتابوں میں بالکل منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے۔ اس کتاب میں ڈیڑھ ہزار سال کے تدوین کردہ فقہ کا خالص قرآن کریم کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے اور خلاف قرآن قوانین کو الگ کر کے خالص قرآنی قوانین کو نکھار کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ مذہب کا غلبہ ہے اور ہر طرف سے علماء کرام کی یلغار ہے۔ اس لئے یہ کتاب جس تعریف و تحسین کی مستحق ہے وہ اسے حاصل نہیں ہوسکی۔ تاہم اس کے باوجود قرآنی حلقوں اور خصوصاً وکلاء اور کورٹس میں اس کتاب کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات میں کورٹس میں اس کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب سے ایک اقتباس نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں **وھو ھذا** اس سلسلہ میں بڑی اہم اور مسرور کن خبر

یہ بھی ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی پانی پتی سرگودھا (فاضل دیوبند اور مولانا عظمت اللہ صاحب فاضل دیوبند) مہتمم مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتم بالشان کتاب سامنے آئی یہ حضرات شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب کا نام "**کشف الغمۃ عن عمر الامّۃ**" ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے جن سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صغرسنی پر استدلال کیا جاتا تھا محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی ہے اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا کہ 143 ہجری تک بخاری شریف کی ہشام بن عروہ والی اس روایت کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پا گئی ہے۔"

محترم مولانا حکیم نیاز احمد اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔ "پہلے خیال تھا کہ اس شائع نہ کیا جائے کیونکہ اس سے احادیث کی صحت پر حرف آئے گا اور منکرین حدیث کو تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلہ خیال کیا گیا اکثر کی رائے یہی تھی (کہ اس کو شائع نہ کریں۔ راقم) لہٰذا کتاب کے مسودے میں بار بار ترمیم کرنی پڑی۔

روایات کو پرکھنے کا راستہ بھی خود ہی پیدا کیا۔ منقول ذخائر میں اس کے لئے مواد بہت ہی کم ملا۔ جن ہم عصر علماء سے مشورہ لیا ان میں سے بعض نے فرمایا کہ جب سابق علماء نے کچھ نہیں رکھا تو آپ کو گڑھے مردے نکالنے کی کیا ضرورت وغیرہ وغیرہ۔ شروع میں تو اپنے اطمینانِ قلب کے لئے اس تاریخی روایت کو دیکھا اور پرکھا۔ مگر جب اس روایت پر محنت کر کے دیکھا اور شرح صدر ہوگیا تو ارادہ کرلیا کہ اہل علم کے سامنے اپنی کاوش کو پیش کیا جائے۔ **عند الامتحان یُکرم الرجل اویُھان الخ**"۔ آپ نے اقتباس ملاحظہ فرمالیا۔ اس سے آپ کو کچھ اندازہ ہوگا کہ ہمارے علماء کرام کس طرح کتمان حقیقت کے مرتکب ہوتے ہیں اور محض اس لئے کہ اس سے

منکرین حدیث کوتقویت نہ ملے،اس کے لئے کیا کیا ترا کیب اختیار کرتے ہیں ورنہ حق تو یہ ہے کہ یہ حضرات پرویز صاحب مرحوم کی اس کاوش کی تعریف کرتے لیکن محض ضد کی بناء پراُنہوں نے پرویز صاحب کی اس محنت کو بالکل نظر انداز کردیا۔ اتفاق سے یہ بات سامنے آ گئی ورنہ ان حضرات کی حد درجہ کوشش ہوتی ہے کہ تحریک طلوع اسلام کی ہر ہر طرح مخالفت کریں خواہ وہ کس درجہ حق بات ہو۔

آپ کا بردار۔ازہرعباس

ماہ فروری 2007ء

32

(مکاتیب) غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی حیثیت

محترم جناب مہتاب حسین شاہ صاحب نے کہروڑ پکا سے ایک گرامی نامہ ارسال کیا ہے جس میں انہوں نے چند سوالات درج کئے ہیں جن کا تعلق کمترین کے ان مضامین میں سے ہے جو راقم سطور نے اسلامی نظام کے سلسلے میں تحریر کئے ہیں۔ چونکہ سوالات اصولی نوعیت کے ہیں اس لئے ان کا جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔

(1) ''اگر کوئی شخص گناہ مثلاً زنا، چوری وغیرہ کی استطاعت رکھتے ہوئے ان سے اجتناب کرے تو وہ اطاعت الٰہی یا عبادت (الٰہی احکامات کی محکومیت) نہیں ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم کا نظام نافذ نہیں ہے۔ اور انفرادی عبادت واطاعت کی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا پس جرائم کرنے میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں''

(2) ''ممنوع امور سے باز رہنا اور معروف کام بجالانا تو ضروری ہوا اور ایسا کرنا اطاعت الٰہی بھی نہ کہلاتا ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے یہ 'پابندیاں' کیا کہلائیں گی اور ہم کس کی اطاعت کر رہے ہوں گے''

سوالات واضح ہیں۔ محترم مستفسر کا سوال یہ ہے کہ غیر خدائی نظام میں نیکی و بدی، اطاعت، معصیت، ثواب و گناہ کا کیا تصور ہے۔ کیا انفرادی نیکیاں و پابندیاں نتیجہ خیز ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی کیا حیثیت ہے۔

پہلے آپ اسلامی نظام کی اطاعت کے اثرات اور غلط معاشرہ میں زندگی بسر کرنے کے نتائج کو پیش نظر رکھیں، پھر بات واضح ہونے میں آسانی ہوگی۔

قرآن کریم کے نزدیک موجودہ انسان سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس سے پیشتر صرف حیوانیت کا ارتقاء تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوگا۔ انسانیت سے مراد اس جسم انسانی میں صفات الٰہی کا موجود ہونا ہے۔ جس قدر ان صفات خداوندی کی نمود ونشونما ہوتی جائے گی۔ اسی قدر انسانیت مستحکم ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن انسانیت کے ارتقاء کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق بسر کیا جائے، اور زندگی کا ایک ایک لمحہ قوانین الٰہی کے ماتحت گذارا جائے۔ چونکہ آج ساری دنیا میں قوانین الٰہی صرف قرآن کریم میں ہیں۔ اس لئے حکومت الٰہی کا ضابطہ قوانین بھی صرف قرآن کریم ہوگا۔ زندگی بالنفس یا انسانیت صفات الٰہی کی حامل ہوتی ہے۔ جس طرح ہمارے جسم انسانی پر طبعی قوانین اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری انسانیت کو وحی کے قوانین GOVERN کرتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ وحی کے قوانین پر عمل کئے بغیر انسانیت ترقی نہیں کر سکتی۔ صرف وحی پر عمل کرنے سے انسانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے انسانیت یا خودی مضمحل یا کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسلامی حکومت چونکہ وہ قرآنی قوانین نافذ کرتی ہے، جو صفات الٰہی پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لئے ان قوانین پر عمل کرنے سے انسان میں صفات الٰہی کی از خود تکمیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس درجہ صفات الٰہی کی نمود ہوتی جاتی ہے، اسی درجہ انسانیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ اطاعت خارجی طور پر IMPOSE نہیں ہوتی جس طرح پانی پینے سے ہماری پیاس دور ہوتی ہے، اور یہ کسی کی خارج سے اطاعت نہیں ہوتی، اسی طرح اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے سے ہماری اپنی اندرونی URGE پوری ہوتی ہے۔ غیر الٰہی حکومت میں یہ صورت نہیں ہو سکتی۔ اس میں صفات الٰہی کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اس کے قوانین پر عمل کرنے سے انسان میں صفات الٰہی کی نمود نہیں ہوتی۔ غلط معاشرہ جو سود کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس میں ایک ایک لقمہ کھانے سے صفات الٰہی بالنفس انسانی میں ضعف ہوتا ہے، کیونکہ قرآن کریم کے مطابق یہ معاشرہ اللہ و رسول کی دشمنی پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومت میں ہر دنیاوی معاملہ جس کا فیصلہ وحی الٰہی کے مطابق کر دیا جائے

، دینی بن جاتا ہے۔ اگر دو آدمیوں کے درمیان کسی زمین کا تنازعہ ہے، اور وہ مقدمہ اسلامی حکومت کی عدالت میں دائر ہے اسلامی حکومت کی عدالت جو فیصلہ دے گی وہ فیصلہ دینی ہوگا، اور اس فیصلہ کی اطاعت ان دو آدمیوں کے لئے اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی، اس طرح اسلامی حکومت کے تمام فیصلے، انسانی نفس یا انسانیت کی نشوونما کے ذریعے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک شخص غیر اسلامی حکومت میں اپنے دفتر صحیح وقت پر جاتا ہے تو اس کو دنیاوی طور پر تو فائدہ ہوگا کہ اس کے افسر ان اس سے خوش ہوں گے، لیکن اس کی اس پابندی سے اس کو کوئی دینی فائدہ نہیں ہوگا۔ البتہ اگر یہ اسلامی حکومت ہے۔ تو اس شخص کا وقت پر دفتر جانا، اسلامی حکومت کے حکم کی اطاعت ہوگا، اور اس کی نفس یا انسانیت کی پرورش کا باعث ہوگا۔ اور اس طرح یہ خالص دنیاوی معاملہ دینی بن جاتا ہے۔ اسی طرح جرائم کی پوزیشن ہے۔ اگر ایک شخص چوری کرتا ہے۔ عدالت نے اس کو دو سال کی سزا دی ہے۔ وہ دو سال کی سزا پوری کر کے، حکومت کے قائدے کے مطابق آزاد ہوگیا، اب اس پر حکومت کی طرف سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔ لیکن اس کے نفس یا اس کی انسانیت پر جو بُرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، وہ زائل نہیں ہوتے اور اس سے انسانیت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ اسلامی حکومت ہے اور اسلامی حکومت نے اس کو دو سال کی سزا دی ہے، وہ اس سزا کے پوری ہونے کے بعد جس طرح دنیاوی حکومت کے نزدیک قابل مواخذہ نہیں رہتا، اسی طرح اس کے نفس پر جو بُرے اثرات مرتب ہوئے تھے، وہ بھی زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ اس نے دو سال اسلامی حکومت کی سزا برداشت کی، اس طرح اس کا اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا، اس کے بُرے اثرات کو زائل کر دے گا، اور اس طریقہ سے یہ خالص دنیاوی کام دینی معاملہ بن جاتا ہے۔

یہاں تک جو تحریر کیا گیا ہے، اس سے آپ کے ذہن میں اسلامی حکومت کا لابدّیت اور اہمیت وضرورت واضح ہوگئی ہوگی۔ کہ اس میں زندگی بسر کرنے، نفس، خودی، یا انسانیت، از خود ترقی کرتی ہے۔ جبکہ غیر اسلامی حکومت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے کہ اس کی اطاعت کرنے سے، ہر ہر منٹ، نفس انسانی از خود مضمحل اور کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس میں انسانیت کی

نشو ونما بالکل رک جاتی ہے، اس تمہید کے بعد اب اصل سوال کی طرف آتے ہیں۔

جہاں تک نفس انسانی پر اثرات مرتب ہونے کا سوال ہے، وہ تو اسلامی حکومت یا غیر اسلامی حکومت دونوں میں مرتب ہوتے ہیں۔ جو شخص چوری کرے گا اس کا اثر یقیناً اس کے نفس پر مرتب ہوگا اور اگر اس نے اجتناب کیا تو اس کا اثر بھی اس کے نفس پر مرتب ہوگا۔ لیکن جیسا کہ واضح کیا گیا ہے اگر وہ اسلامی حکومت میں سزا بھگت لے گا تو اس کے نفس کے اثرات بھی زائل ہو جائیں گے۔ لیکن دنیاوی حکومتوں میں اس کو یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

قرآن کریم کے نزدیک انسانیت پر ظلم کرنے والے نظام کے اندر انفرادی نیکیاں ثواب کا باعث نہیں بن سکتیں۔ اگر وہ نظام ہی باطل بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہے، تو افراد کی ذاتی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت پر ظلم کرنے کو جائز سمجھتا ہے قرآن کریم نے اس مسئلہ کو خوب واضح کرنے کے لئے دو مثالیں پیش کی ہیں۔

پہلی مثال کہ یہودی اپنی قوم کے ایک طبقہ کو مفلس، غریب بنا کر، انہیں ان کے گھر سے باہر نکال دیتے تھے۔ ان غریب لوگوں کو دوسرے قبائل اپنا غلام بنا لیتے تھے۔ پھر ان یہودیوں کے علماء قیدیوں کو رہا کرانے کے ثواب بتاتے تھے چنانچہ وہ یہودی ان علماء کے مواعظ سے متاثر ہو کر، ثواب کمانے کی خاطر ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے، انہیں قید سے چھڑاتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، قیدیوں کو آزاد کرانے کا ثواب کماتے ہو، لیکن یہ بات کبھی نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کو اس حالت پر تم نے ہی پہنچایا ہے۔ تم ان لوگوں کو اس حالت تک پہنچا دیتے ہو، اور اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کی ''نیکیاں'' حاصل کرتے ہو، قرآن کریم اس واقعہ کو بیان کرنے سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ خود دوسروں کو اس حالت پر پہنچا دینا، کہ وہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہو جائیں خود ایک جرم عظیم ہے اور پھر مدد کر کے، اپنے آپ کو اطمینان دلانا کہ ہم نے اتنا بڑا ثواب کمایا، خود کو دھوکہ دینا ہے۔

دوسری مثال بیان کرنے میں قرآن کریم قریش مکہ کی کج ذہنی پیش کرتا ہے فرمایا o

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (9/19)o کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور خانہ کعبہ کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانین الٰہی اور حیات آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور نظام الٰہی کے قیام و بقا کے لئے مسلسل جہد وجہد کرتا ہے۔ (یاد رکھو) معیار الٰہی کے مطابق یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت کبھی ایسے لوگوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا جو ظلم سے باز نہ آئیں (اس قسم کی ذاتی اور انفرادی نیکیوں سے اپنے کو دھوکہ نہ دو کہ ہم نے ثواب کما لیا۔ اصل عمل اور اصل ثواب تو اس نظام کا قیام ہے جس سے دنیا میں ظلم وجور از خود ختم ہو جاتا ہے)

ان دو مثالوں کے ذریعے قرآن کریم نے واضح فرمایا کہ ذاتی نیکیاں قرآنی نظام کو قائم کرنے کی مسلسل جدوجہد کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ انفرادی نیکیاں یقیناً ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں غلط معاشرہ میں صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہ نیکیاں صحیح نتائج اسی وقت پیدا کرتی ہیں، جب یہ قرآنی نظام کے اندر کی جائیں۔ ہمارے آج کے موجودہ دور میں زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا ہے، کہ حتی الامکان قرآنی منکرات سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن جن منکرات سے اجتناب بھی نہ کیا جا سکے، انہیں مجبوراً برداشت کیا جائے، جیسے کہ آج کل سارا نظام سودی ہے، آپ اس سے نہیں بچ سکتے۔ اس جرم کا ازالہ اس بات سے کریں کہ اسلامی نظام کے قیام کی حد درجہ، سرتوڑ کوشش کریں۔ کیونکہ اسلامی نظام کے قیام کی کوشش سب سے بڑی عبادت ہے۔

سوالات کا جواب یہاں ختم ہوتا ہے۔ لیکن آخر میں ایک اعتراف کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ''اسلامی حکومت کی اطاعت ہی، اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے'' یہ عنوان، دیگر رسائل کے علاوہ ''صوت الحق'' کا منفرد نظریہ ہے۔ امت مسلمہ اہل الذکر والقرآن کے اولین کے علماء، مولوی عبداللہ صاحب مرحوم چکڑالوی ''بیان اللناس'' کے مصنف خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری، رسالہ ''اشاعت القرآن'' کے ایڈیٹر مولوی حشمت علی صاحب، اس نظریہ کے داعی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں ہوں، اس کے اول داعی حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم تھے۔ البتہ جب بلاغ

القرآن 1960ء میں جاری ہوا، تو اس وقت کے اہل قرآن علماء، میاں اسماعیل مرحوم، ماسٹر محمد علی رسولنگری، وغیرہ بھی اس نظریہ کے داعی ہو گئے تھے۔ ان دو تحاریک کے علاوہ ہماری پوری تاریخ میں، جب سے اسلامی لٹریچر تحریر کیا جانا شروع ہوا ہے، کسی جگہ اس نظریہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے اس موضوع پر نہ کہیں کوئی لٹریچر ملتا ہے، اور نہ ہی کہیں سے کوئی راہ نمائی۔ ان دو تحریکوں میں بھی اس موضوع پر بہت کم مواد موجود ہے۔ مجھ کمترین نے اس موضوع پر مسلسل سات (7) مضامین تحریر کئے ہیں جن میں سے بیشتر موقر رسالہ 'صوت الحق' ہی میں شائع ہوئے، کیونکہ یہی واحد رسالہ خالص قرآنی نظریات کا داعی ہے۔ ان مضامین کے شائع ہونے کے بعد مجھے برابر استفسارات و اعتراضات موصول ہوتے رہے، اور میں حتی الامکان ان کے جواب ارسال کرتا رہا ہوں۔ لیکن میری یہ بڑی مجبوری اور کمزوری ہے کہ مجھے اس موضوع پر کہیں سے کوئی راہ نمائی نہیں ہو رہی ہے، جس سے مزید استفادہ کیا جا سکے۔

قرآنی نظریات کے نکارت و اجنبیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ میں نے ''وحی صرف قرآن کریم میں ہے'' کے موضوع پر سب سے پہلا مقالہ دسمبر 1982ء میں شائع کیا تھا اور اسی موضوع پر دوسرے مقالے بعد میں بھی شائع ہوئے جب میں نے پہلا مقالہ طبع کرا کر، بڑی کثیر تعداد میں تقسیم کرایا تو تحریک طلوع اسلام کے حلقہ کے لوگوں کو اس موضوع پر تعجب ہوا، اور چند ایسے احباب نے، جو عرصہ دراز سے اس فکر سے منسلک تھے، اس موضوع پر تردد کا اظہار کیا۔ حالانکہ تحریک طلوع اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہے۔ اور اس پر اس تحریک نے بہت کام بھی کیا ہے۔ میں نے اس بات کا ذکر محترم المقام جناب پرویز صاحب سے بھی کیا۔ انہوں نے یہی فرمایا کہ غیر قرآنی نظریات ہماری زندگی میں اس درجہ سرایت کر گئے ہیں، کہ قرآنی نظریات پھیلنے میں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ یہ چند سطور بطور اعتراف تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ خالص قرآنی نظریہ ہے۔ اور نہایت درجہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ اس پر غور و فکر فرمائیں اور جو حضرات اس موضوع پر کچھ تحریر فرمائیں وہ ضرور تحریر کر کے، اس رسالہ کو ارسال فرما دیں، کیونکہ

خالص قرآنی نظریات کے مضامین صرف اس رسالہ صوت الحق میں ہی طبع ہو سکتے ہیں، باقی تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

ماہ جولائی 2006ء

اسلامی اصول فقہ پر ایک نظر

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ آج کل حدود آرڈیننس کے بارے میں ملک میں ایک عام بحث چل رہی ہے۔اس بحث کی ابتدء ٹی وی کے مشہور چینل ''جیو'' نے کی ہے۔یہ چینل اس لحاظ سے قابل میار کباد ہے کہ اس نے ہماری جیسی مردہ قوم میں اس مسئلہ پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے اور مورخہ 11 جون کو اس چینل پر ایک LIVE مباحثہ بھی پیش کیا گیا جس میں ملک کے مشہور علماء نے حصہ لیا، چند امور پر ان علماء کرام کا اتفاق رائے بھی ہوا ہے۔لیکن نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ساری بحث میں رجم اور زنا کے بارے میں چار گواہوں کی شہادت کو برقرار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں امور قرآن کریم کے خلاف ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ اسلامی قانون سازی کے بارے میں دو باتیں بہت غور طلب ہیں۔جن کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہی حدود آرڈیننس میں اسقام وخامیاں واقع ہوئی ہیں اور جب تک یہ دونوں امور واضح نہیں ہوں گے، آئندہ بھی اس بات کا یقین ہے کہ قانون سازی کسی طور پر بھی درست نہیں ہو سکتی۔

(1) پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ کیا قانون سازی کے ماخذ SOURCE OF LAW صرف قرآن کریم ہے،یا حدیث شریف بھی قانون کا ماخذ ہے۔

(2) دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث شریف بھی قانون سازی کا ماخذ ہے تو ایسے قوانین جو قرآن کریم کے خلاف اور حدیث کے مطابق ہیں، ان میں حکومت کیا موقف اختیار کرے گی۔یعنی اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کے دونوں ماخذوں میں باہم تضاد وتخالف ہو تو حکومت کس ماخذ کو اختیار کرے گی؟۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صرف قرآن کریم اسلامی قانون کا ماخذ ہے اور حدیث اسلامی قانون کا ماخذ نہیں ہوسکتی تو اس بارے میں تو قرآن کریم کا حکم ایسا واضح ہے کہ اس میں دو آراء نہیں ہوسکتیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o (5/44) اور جو کوئی بما أنزل الله کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے o اسی مضمون کو قرآن کریم بار بار دہراتا ہے کہ جو کوئی بھی مَا أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے۔ یا اگر کوئی شخص منزل من اللہ میں کوئی اضافہ یا تخفیف کردے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ کافر ومشرک ہے۔ فیصلہ تو صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ کے مطابق ہونا چاہئے صرف اور صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ ہی قانون کا ماخذ ہے۔ چونکہ اس موضوع کی آیات اس قدر واضح اور کثرت سے ہیں، اس لئے ہمارے علماء کرام بھی اس سے تو انکار نہیں کرسکتے کہ قانون کا ماخذ صرف مَا أَنزَلَ اللَّهُ ہے۔ اس معاملہ میں ہمارا ان کا صد فیصد اتفاق ہے۔ لیکن وہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور اس طرح اس ترکیب سے وہ حدیث کو ماخذ قانون قرار دیتے ہیں۔ اب ثابت یہ کرنا ہے کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث شریف اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کی تائید و وضاحت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ (5/48) اور ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو گذشتہ کتابوں کی مصدق ہے اور سب پر شامل ہے، پس تو ان میں حکم کر، جو کچھ اتارا اللہ نے۔ اس آیت کریمہ نے خود مَا أَنزَلَ اللَّهُ کی وضاحت کتاب سے کردی ہے کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ صرف کتاب ہے، جس کے مطابق حکم کرنا لازمی ہے اور اس کے علاوہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ میں کوئی اور چیز شامل نہیں ہے۔ نیز سورۂ رعد میں ارشاد ہوتا ہے وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ (13/36) اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو اترا تیری طرف (موضح القرآن) اس آیت کریمہ نے تو بات ہی بالکل واضح کردی کہ أُنزِلَ إِلَيْكَ کی وضاحت کتاب سے کردی۔ یہاں کتاب اور أُنزِلَ إِلَيْكَ ایک

دوسرے کا بدل اور مبدل منہ واقع ہوئے ہیں۔یعنی جو کتاب ہے وہ اُنزِلَ اِلَیکَ ہے اور جو کچھ بھی اُنزِلَ اِلَیکَ ہے وہ صرف کتاب ہے اور کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے۔اس موضوع پر کہ مَا اُنزَلَ اللّٰہُ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث شریف اس میں شامل نہیں اس لئے ان ہی دو آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔کیونکہ اس بارے میں رسالہ صوت الحق میں اس قدر مواد فراہم کیا گیا ہے کہ اس کو یہاں دوبارہ تحریر کرنا،اسی مواد کو دہرانا ہے اور قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔صرف قرآن کریم کو ہی منزل من اللہ ثابت کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ہے اور حدیث قرآن کریم کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ وہ امور جو قرآن کریم کے خلاف ہیں اور حدیث شریف کے مطابق ہیں،اور جن امور کے متعلق خود ان دونوں ماخذ وں میں تضاد و تخالف ہے،ان میں حکومت یا ہمارے علماء کرام کیا موقف اختیار کرتے ہیں؟اس بارے میں صرف چند موضوعات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(1) رجم (2) قتل مرتد (3) محجوب الارث (4) وصیت ووراثت (5) فرقہ بندی

ان میں سے ہر مسئلہ قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور حدیث شریف کے مطابق ہے اور ان سب مسائل کی اساس صرف احادیث پر ہے۔جہاں تک پہلے دو موضوعات یعنی رجم اور قتل مرتد کا تعلق ہے،ان دونوں موضوعات پر راقم سطور کے مضامین موقر ماہنامہ 'صوت الحق' بابت اگست 06 میں اور طلوع اسلام اگست 06 میں علی الترتیب طبع ہو چکے ہیں۔جن حضرات کی نظر سے یہ دونوں رسالے گذرتے ہیں انہوں نے یہ دونوں مضامین ان رسالوں میں ملاحظہ فرما لئے ہوں گے ان دونوں موضوعات پر دوبارہ تحریر کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ان دونوں مضامین میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ دونوں مسئلے قرآن کریم کے خلاف اور احادیث کے مطابق ہیں۔ان دونوں مسائل میں ہمارے علماء کرام نے واضح مسلک قرآن کریم کے خلاف اور حدیث کے مطابق اختیار کیا ہے۔تاہم ان دونوں مسائل،یعنی رجم اور قتل مرتد کے بارے میں ایک اقتباس اپنے مضمون ارتداد سے پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے،جس سے ان دونوں نظریات کی تردید ہو جاتی ہے

کہ ان پر مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

وھوھذ..............''ارشاد ہوتا ہے مَن قَتَلَ نَفساً بِغَيرِ نَفسٍ أَو فَسَادٍ فِي الأَرضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً (5/32) تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس کا ترجمہ تحریر ہے ''جس کسی نے قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا'' حضرت اقدس جناب شیخ الھند نے ترجمہ فرمایا ''جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض ایک جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو''۔تمام تراجم اسی طرح ہیں، اور واضح ہیں کوئی ابہام نہیں ہے میں اس کا ترجمہ مزید آسان اور واضح عرض کرتا ہوں ''جو کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو، اور نہ ہی زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو۔ تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔ یہ آیہ کریمہ بطور ایک واضح اصول کے نہایت روشن و درخشندہ ہے۔اس آیہ کریمہ میں کسی ایک فرد کو قتل کرنے کو ساری انسانیت کے قتل کے مرادف بیان کیا گیا ہے اور قتل کی حد درجہ مذمت کردی ہے اس سے زیادہ پُر زور FORCEFUL انداز شاید ہی کوئی دوسرا ہو سکے۔لیکن کسی کو بھی قتل نہ کرے کہ سلسلہ میں یہاں صرف دو استثناء (EXCEPTIONS) بیان کی گئی ہیں ایک تو قاتل کو قتل کے بدلہ میں قتل کرنے کی اجازت ہے (6/153) اور دوسرے باغی کو بغاوت کے جرم میں قتل کرنے کی اجازت ہے (5/53) اس آیت کی یہ دونوں رخصتیں (اجازتیں) آیات (5/33-6/153) میں بھی ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔اس کے علاوہ اور کسی حال میں بھی، کسی جرم کے بدلے، کسی فرد کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔اس آیت نے ایک ایسا حصار قائم کر دیا ہے کہ جس کو کسی حال میں بھی توڑا نہیں جا سکتا۔اس آیہ کریمہ کے پیش نظر ان دو افراد (قاتل و باغی) کے علاوہ کسی کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔فالہذا مرتد و زانی کا قتل کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔اس آیہ کریمہ سے قتل مرتد اور رجم دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

(3) محجوب الارث کا مفہوم یہ ہے کہ یتیم پوتے کو اس دادا کی میراث سے، چچا کی موجودگی کی

وجہ سے، محروم کر دیا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں ایسی آیات بکثرت موجود ہیں جن میں یتیموں کی حفاظت، ان کی سرپرستی، اور ان سے حُسن سلوک کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ خود سورۃ النساء کی ان آیات میں جن میں تقسیم میراث کے تفصیلی احکامات بیان کئے گئے ہیں، ان میں بھی اصل احکام بیان کرنے سے پیشتر بطور مقدمہ سلسلہ بیان یتیموں کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یتیموں کے بارے میں قرآن کریم جو SOFT-CORNER رکھتا ہے، اس کے پیش نظر یتیم پوتے کو محروم الارث کرنا، اسلامی مزاج، اسلامی روح اور اسلام کے عدل و انصاف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ قانون اسلام کے دیگر قوانین میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام کے دیگر عادلانہ اصول و احکام تو یتیموں کے ساتھ محبت و شفقت کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کی تائید کرتے ہیں۔ اس بارے میں مسدس حالی کے مشہور اشعار اسلامی ذہن و جذبہ کی پوری پوری ترجمانی و عکاسی کرتے ہیں، اور حضورؐ کی یتیموں کے بارے میں محبت و شفقت کو بیان کرتے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، یتیموں کا ماویٰ — ضعیفوں کا حامی، غلاموں کا مولا

مجوب الارث کا مسئلہ خالص فنی اور TECHNICAL ہے۔ ایک LAY MAN اس مسئلہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اس مسئلہ پر اسی وقت گرفت ہو سکتی ہے۔ جبکہ کوئی شخص علم الفرائض اور سراجی پر خوب مہارت رکھتا ہو۔ اس لئے اس مسئلہ پر اس سے زیادہ اس مضمون میں کچھ تحریر کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ تحریک طلوع اسلام اور فرقہ اہل قرآن کا فراہم کردہ لٹریچر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ فرقہ اہل قرآن تقریباً سو سال سے اس موضوع پر لکھتا چلا آ رہا ہے البتہ یہاں ہم اپنے تائید میں جناب مولانا مودودی صاحب کا ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جس سے ہماری بحث کہ اگر قرآن و حدیث میں تضاد و تخالف ہو۔ تو کیا صورت اختیار کی جائے، اس موضوع کی اصولی طور پر تائید ہوتی ہے کہ قرآن کریم سے مجوب الارث کی کوئی اصل

ثابت نہیں ہوتی، یہ نظریہ قرآن کے خلاف محض حدیث پر مبنی ہے۔

''فقہائے اسلام'' میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو، وہ وارث نہیں ہوتا، بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث قرآن وحدیث میں ایسا صریح حکم نہیں ملا ہے جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلے کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں کہ اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف رائے دینا مشکل ہے''

(ترجمان القرآن، مارچ 1953ء)

یہ بیان بالکل واضح ہے اور اس بیان سے یہ خوشی ہوتی ہے کہ مولانا صاحب مرحوم نے اس معاملہ میں نہایت درجہ دیانتداری سے کام لے کر، اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس مسئلہ کی بنیاد قرآن کریم پر نہیں ہے۔ البتہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے ان جیسا عالم انہیں شیعوں کی معلومات اس درجہ محدود تھیں کہ انہوں نے شیعوں کو اس مسئلہ میں مستثنیٰ کر دیا ہے۔ جبکہ شیعوں کے ہاں بھی محجوب الارث کا مسئلہ درست قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے یتیم پوتوں اور یتیم نواسوں کو جائیداد سے محروم کر دیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مولانا نے یہ بات کیسے تحریر فرما دی۔

(4) جہاں تک وصیت کا تعلق ہے تو ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی جائیداد کے متعلق وصیت کر دے یہ وصیت اس کے پورے مال کے متعلق ہونی چاہئے اور ہر اس شخص کے لئے ہونی چاہئے جسے وہ اپنے ترکہ میں سے کچھ دینا چاہتا ہے۔ اس میں وارث اور غیر وارث کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ لیکن ہمارے علمائے کرام (1) ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ (2) نیز وہ ورثا کے لئے وصیت کرنے کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ وہ وصیت صرف غیر ورثا کے حق میں کرنے کو جائز گردانتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں پابندیاں جو ہمارے علماء کرام نے عائد کی ہیں وہ قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان دونوں پابندیوں کا قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کیونکہ اس آیہ کریمہ میں پہلے **کُتب علیکم** بیان کیا گیا ہے یعنی تم پر یہ بات فرض ہے اور آیت کے بالکل آخر میں **حقاً علیٰ المتقین** فرما کر یہ تاکید مزید کی گئی ہے کہ تمام مومنین پر وصیت کرنا لازمی وضروری ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ ترکہ کے پورے کے پورے مال کے لئے وصیت کو فرض قرار دیا گیا ہے اور والدین اور اقربا کو اس آیت میں شامل کر کے، اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ وصیت ورثاء کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اور علماء کرام کے اس نظریہ کی تغلیط کردی کہ ورثاء کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی۔

اصل یہ ہے کہ ان دونوں خلاف قرآن عقیدوں کو ہمارے علماء کرام نے دو وجوہات کی بناء اختیار کیا ہوا ہے۔ پہلے عقیدہ کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ وصیت کی آیات منسوخ ہوچکی ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ خود قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم میں جہاں وراثت کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں وہ سورۃ النساء کی صرف دو آیتیں ہیں (4/11.12) اور ان دونوں آیتوں کے بعد **من بعد وصیة یوصی بها او دین**، (اور یہ سب) میت نے جس کے بارے میں وصیت کی ہے اس کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد، چار مرتبہ وصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ میراث کی یہ تقسیم متوفی کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد عمل میں لائی جائے گی۔ اگر وصیت کا حکم منسوخ ہوچکا ہوتا تو ان میراث کی آیات میں چار مرتبہ وصیت کے حکم کا اعادہ نہ کیا جاتا۔ خود آیات میراث میں وصیت کو پورا کرنے کی چار مرتبہ تاکید کرنا صاف بتا رہا ہے کہ وراثت کی آیات نے وصیت کے حکم کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ اس کو باقی رکھا ہے۔ جہاں تک دوسرا مسئلہ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہوسکتی ہے تو اس کے لئے علام ءکرام کے ایک حدیث کہ **لا وصیة لوارثه** وہ اس نظریہ کی اساس اس حدیث پر رکھتے ہیں۔ جو خلاف قرآن ہے اور یہاں پھر وہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے دونوں ماخذوں میں تضاد وتخالف ہے۔

واضح رہے کہ ہم نے اوپر جو کچھ وصیت کے بارے میں دلیل تحریر کی ہے کہ اس کے احکام منسوخ نہیں ہوئے ہیں وہ صرف علماء کرام کے لئے تحریر کی ہے۔ جو نسخ کے قائل ہیں۔ ورنہ

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک تو نسخ آیات کا عقیدہ ہی قرآن کریم کے خلاف ہے۔

(5) پانچواں مسئلہ جو قرآن کریم کے خلاف اور سنت و فقہ کے مطابق ہے اور جس نے مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے وہ ہماری فرقہ بندی ہے۔قرآن کریم کی نص صریح کے مطابق فرقہ بندی شرک ہے۔

(1) وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً (30/31.32)

اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا o کہ انہوں نے اپنے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بہت سے گروہ ہو گئے۔

(2) إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159)

o بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ بن گئے، آپ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(3) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ o (3/105)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آنے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے o

(4) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا (3/103)

o تم سب مل کے قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔

فرقہ بندی کے خلاف قرآن کریم میں اس کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں۔لیکن آپ دیکھیں گے کہ ہمارے علماء کرام اس کے خلاف ایک لفظ نہیں بولتے۔کیونکہ یہ حدیث وفقہ کے مطابق ہے۔ فرقہ بندی کے خلاف سب سے پہلے طلوع اسلام نے آواز بلند کی تھی۔دستور پاکستان کے آرٹیکل

277(1) میں درج ہے ''تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو'' آرٹیکل کے پیش نظر پھر اسی دشواری سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ فرقہ بندی حدیث کے مطابق ہے لیکن قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس میں حکومت نے پھر قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور سنت کی پیروی کی۔ نہ صرف یہ کہ حدیث کی پیروی کی بلکہ صدارتی حکم نمبر 14، مجریہ 18 ستمبر 1980ء میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کر دی گئی ہے۔ وضاحت۔ جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لا (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی''۔

دستور کی شق نمبر (1)277 کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا آئینی تحفظ مل گیا۔ جس سے عملاً دو دشواریاں پیدا ہوں گی۔ پہلی دشواری یہ کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک مختلف قوانین وضع ہوں گے۔ اس طرح ایک ہی ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق تو سیکولر حکومتوں میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں، لیکن پرسنل لاء جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو، تو وہاں پرسنل اور پبلک لاء کی تفریق نہیں ہوتی۔

فرقہ بندی کے سلسلہ میں یہ دشواری ہے کہ ہمارے علمائے کرام تو صرف فرقہ بندی کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو خود فرقہ بندی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر فرقہ کو چاہئے کہ رواداری سے کام لے۔ لیکن جب فرقہ بن جاتا ہے تو رواداری از خود ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ کیونکہ فرقہ تو قائم ہی اس وقت تک رہتا ہے جب مختلف فیہ اور متنازع فیہ امور کو ہوا دی جاتی ہے۔ اگر ان مختلف فیہ امور کو ہوا نہ دی جائے اور ان کو نظر انداز کر کے متفق علیہ اور مجتمع فیہ مسائل ونظریات کو پھیلایا جائے تو پھر فرقہ باقی کیسے رہ سکتا ہے؟ یہ مضمون تو اس غرض کے

پیش نظر تحریر کیا گیا تھا کہ یہ دکھایا جائے کہ اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کا ہی باہم اتفاق نہ ہو تو پھر علماء کرام اور حکومت وقت کیا موقف اختیار کرے گی ۔ اس مضمون میں یہاں تک یہ بات پانچ موضوعات کے ذریعہ واضح کردی گئی ہے کہ ہمارے علماء کرام اور ہماری حکومت نے اس بارے میں قرآن کریم کو نظر انداز کر کے، حدیث پر عمل کرنے کو ترجیح دی ہے۔

فرقہ بندی کے نقصانات کے سلسلہ میں اپنے قارئین کرام کے ازدیاد علم کے لئے ایک اور بات کا اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔کچھ عرصہ ہوا کہ پروفیسر MR.SAMUEL.P.HUNTINGTON جو ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک معروف پروفیسر ہیں، ان کا ایک مضمون THE CLASH OF CIVILIZATION ایک مشہور رسالہ FOREIGN AFFAIRS کے SUMMER 1993 کے ISSUE میں طبع ہوا تھا اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔ ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں دوسرے مضمون کا موضوع پرکشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہذیبوں کا ہوگا۔ایک طرف مسلمان اور کنفوشش کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔ مضمون پُر مغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات وواقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے زیر نظر مضمون کو اس کی صحت وسقم سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ اس زیر تسوید مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو بات قارئین کرام کی خدمت عالیہ میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخر میں انہوں نے دیگر سات مشورے دینے کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دے ان مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

TO EXPLOIT DIFFERENCES AND CONFLICTS AMONG CONFUCIAN AND ISLAMIS STATES کنفوشش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں آپس کے اختلافات سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یعنی کنفوشش کے پیروکاروں میں جو باہمی اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہئے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں جو باہمی اختلافات، مناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

واضح رہے کہ جن حضرات نے اس عبارت کا یہ مفہوم لیا ہے کہ کنفوشش کے پیروکاروں اور مسلمانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے تو انہوں نے اس عبارت کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ اس عبارت کا درست مفہوم یہ ہے کہ کنفوشش کے پیروکاروں کے اپنے باہمی اختلافات اور مسلمانوں کے اپنے باہمی (فرقہ وارانہ اختلافات۔ازراقم سطور) اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے اس عبارت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہ ہے۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ تجاویز جناب پروفیسر نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف کے اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرقہ بندی کی لعنت ہمارے لئے کس درجہ مُہلک اور تباہ کن اور ہمارے اغیار واعدا کے لئے کیسی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

مضمون کے آخر میں یہ کمترین راقم سطور آپ سب قارئین کی خدمت میں یہ درخواست کرتا ہے کہ آپ خود غور فرمائیں کہ ہم مسلمانوں میں یہ تباہی و بربادی کی بات کیوں ہے کہ ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کرسکتے۔ حالانکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات کا فیصلہ واضح طور پر دیتا ہے۔ ۝وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)۝ اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہمارے تمام متنازع فیہ امور جو ہزار سال سے چلے آرہے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اور نہ آئندہ ہونے کی توقع ہے۔ ہمارے دونوں فرقوں، شیعہ وسنی میں جس قدر امور متنازعہ فیہ ہیں، اس ایک ہزار سال میں، ایک بات میں بھی آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا۔ حالت یہاں تک پہنچی کی ختم نبوت جیسا بنیادی مسئلہ جس پر

ڈیڑھ سو سال سے احمدی حضرات سے مناظرے ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن دونوں طرف کے علماء کسی واضح فیصلہ پر نہیں پہنچ پاتے۔ قرآن کریم سے اگر کوئی واضح فیصلہ نہیں ملتا تو کیا نعوذ باللہ وہ واضح فیصلہ دینے سے قاصر ہے یہ کتاب کا سقم ہے کہ وہ کوئی واضح فیصلہ نہ دے، اور ہر فرقے کی تائید اس سے حاصل ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کے متعلق اس قسم کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو میزان و محک بناتے ہی نہیں ہیں۔ اور حدیث و سنت اور فقہ کی بھول بھلیوں میں گم رہتے ہیں۔ اول تو قرآن کریم کو سامنے ہی نہیں لاتے اور اگر قرآن کریم کو سامنے لاتے ہیں تو آیات کی وہ تفسیر کرتے ہیں جو شان نزول و روایات کے ذریعے کی جاتی ہیں۔ وہ پھر مختلف فیہ ہوتی ہیں۔ اور بھڑوں کا چھتہ۔ اور بقول مرزا غلام احمد صاحب کے مداری کا پٹارا۔ آپ کسی بھی معاملے اور مسئلے میں صرف اور صرف قرآن خالص کو سامنے رکھیں ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بھی مسئلہ کا صاف اور واضح جواب آپ کو اس سے نہ ملے اس کا دعویٰ ہے۔ اُدْعُونِیْ أَسْتَجِبْ لَکُمْ (40/60) مجھے پکارو میں جواب دوں گا۔ نیز فرمایا۔ أُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ (2/186) جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اس کے یہ دعاوی کسی حال میں غلط نہیں ہو سکتے۔ یہ ہماری غلطی اور ہمارا سقم ہے کہ ہم قرآن کریم کی بارگاہ کو چھوڑ کر دوسرے دروازوں پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔ اور یوں ہر مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل تر بناتے چلے جاتے ہیں۔ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

ماہ ستمبر 2006ء

35

اسلامی قانون سازی کے بارے میں چند گذارشات

اخباری اطلاعات کے مطابق صدر محترم جناب پرویز مشرف صاحب نے مورخہ 17 جولائی06 کو لاء منسٹری (وزارت قانون) کی ایک تقریب میں ارشاد فرمایا کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے، تاکہ لوگ عزت کی زندگی بسر کر سکیں اور ملک سے ناانصافیاں دور کی جاسکیں۔ جناب صدر محترم نے جو بیان ارشاد فرمایا ہے وہ ہمارے ملک کے علماء کرام اور عام مسلمانوں کے نظریہ وعقیدہ کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے ہاں مسلمانوں میں قانون سازی کا طریقہ بھی یہی چلا آرہا ہے کہ ہماری فقہ کی اساس قرآن وسنت پر ہی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہونے چاہئیں تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تمام اسلامی قوانین قرآن و روایات کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یعنی سنت کا عملاً مفہوم کتب روایات ہوتا ہے۔ وقتی اور موجودہ حالات سے بالاتر (DETACHED) ہوکر اس موضوع کے بارے میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اب تک ہماری فقہ کس طرح تیار ہوئی ہے۔ اس کے ماخذ کیا تھے، اور اس سابقہ فقہ کی موجودہ دور میں کیا اہمیت ہے۔ اور اس کو قرآن وسنت کے مطابق کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قانون کے چار ماخذ چلے آرہے ہیں۔ قرآن، وحدیث، اجماع، وقیاس، انہیں اصطلاحاً **اَدِلّہ اربعہ** کہتے ہیں، اور ان چاروں ماخذوں نے ایسی مُسلمہ حیثیت اختیار کی ہوئی ہے کہ کوئی عالم ان سے انحراف کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ قانون کا ماخذ ہونے کے لحاظ سے بھی ان کی یہی ترتیب واہمیت ہے، جس ترتیب سے یہ تحریر کئے گئے ہیں۔

قیاس سے یہ مراد ہے کہ جس معاملہ و مسئلہ کا کوئی حکم قرآن و حدیث میں نہیں ہوتا، اس معاملہ میں اپنی عقل سے کام لے کر قرآن و حدیث کے احکامات کو پیش نظر رکھ کر، نئے مسئلہ کے متعلق استنباط کر لیتے ہیں۔ مثلاً جب قرآن کریم نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے، تو فقہا نے بھنگ اور ہر نشہ آور چیز کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیاس درحقیقت قانون سازی کا ایک عمل ہے۔ خود قانون کا ماخذ نہیں ہے۔ لیکن جب دورِ بنی عباس میں ہمارے فقہ کی تدوین ہوئی، تو ہم نے اس کو ایک PROCESS کے بجائے، قانون کے ماخذ کا درجہ دے دیا۔

یہی صورت اجماع کی ہے کہ اس پر اس قدر طول طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ اور اس کی اس قدر متضاد و مختلف تعریفیں DEFINITIONS ہیں، کہ آج تک تیرہ سو سال بعد بھی ان پر کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ اس کا منعقد ہونا ایک امر محال ہے، اور آج تک کسی مسئلہ میں بھی مسلمانوں میں کبھی اجماع نہیں ہوا۔ یہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتا۔ یہ بھی قانون سازی کا ایک PROCESS ہے کہ ہر دور میں، امت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا، اور انہیں نافذ کرنا، ہر دور کا اجماع کہلائے گا۔

حدیث شریف کے بحیثیت ماخذ قانون ہونے کے بارے میں جس قدر کم گفتگو کی جائے، اس قدر بہتر ہوگا۔ اس کا درجہ و مقام مذہب میں ہوتا ہے، دین میں اس کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسلامی نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اس میں اطاعت رسول کے لئے الگ حدیث کی اطاعت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، اسلامی حکومت کی اطاعت سے ہی حدیث کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جو سنتیں مشہور ہیں کہ ڈاڑھی رکھنا سنت ہے، ایک خاص وضع کا لباس پہننا سنت ہے، مسواک کرنا، سرمہ لگانا، اونچے پاجامے اور نیچے کرتے پہننا، یہ سنت کا اتباع ہے، سنت کا یہ اتباع مذہب میں ہوتا ہے، دین میں سنت کا اتباع اسلامی حکومت کے مقرر کردہ معاشرتی احکام کا اتباع ہی سنت کا اتباع ہوتا ہے۔ یہ جو معاشرتی احکام مقامی حالات، موسم، وغیرہ کی وجہ سے تبدیل ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک تو اسلامی قانون کا ماخذ صرف اور صرف قرآن ہے۔ قرآن

کریم کی رُو سے یہ نظریہ اس درجہ واضح ہے کہ اس میں دو رائے ہونے کا امکان ہی باقی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(1) وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ o(5/47)

جو کوئی بھی ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فاسق ہے o

(2) وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ o(5/45)

جو ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ ظالم ہے o

(3) وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o(5/44)

جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ کافر ہیں o ان تین آیات کریمات سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ:

(1) جس حکومت میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں ہوتے، اس میں کسی کام کو بھی نیک عملی نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ وہ کام انفرادی طور پر کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ حکومت ہی فاسقین کی ہے۔

(2) ایسی حکومت کا کوئی فیصلہ عدل پر مبنی نہیں ہو سکتا کیونکہ اس حکومت کی اساس ہی ظلم پر قائم ہے۔

(3) ایسی حکومت اسلامی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ وہ کافرانہ نظام ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی خود ہی واضح فرما دیا ہے کہ ما انزل اللہ صرف قرآن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ oوَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ (13/36)o اور (اے رسول) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ تو اس سے جو تجھ پر نازل ہوا ہے خوش ہوتے ہیں۔ اس آیۃ کریمہ نے بات بالکل واضح فرما دی ہے جب کہ أُنزِلَ إِلَيْكَ کی وضاحت کتاب سے کر دی ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں أُنزِلَ إِلَيْكَ اور کتاب ایک دوسرے کا **بدل** اور **مُبدل منه** واقع ہوئے ہیں۔ یعنی جو کتاب ہے وہ أُنزِلَ إِلَيْكَ ہے اور جو کچھ بھی أُنزِلَ إِلَيْكَ ہے وہ صرف اور صرف کتاب ہے اور ما

اُنزِلَ اِلَیکَ میں کوئی اور چیز مثلاً حدیث وغیرہ کے ہرگز ہرگز شامل نہیں ہے۔

(1) وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ(5/48)

اور ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو گذشتہ کتابوں کی مصدق ہے اور سب پر شامل ہے پس تو ان میں حکم کر اس کے ساتھ جو کچھ اتر االلہ نے۔ اس آیت نے خود مَا أَنزَلَ اللَّهُ کی وضاحت کتاب سے کردی کہ مَا أَنزَلَ اللَّهُ صرف کتاب ہے جس کے مطابق حکم کرنا لازمی ہے اور اس کے علاوہ نہ تو مَا أَنزَلَ اللَّهُ میں کوئی چیز شامل ہے اور نہ ہی اس کے مطابق احکام دیئے جا سکتے ہیں۔

(2) آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ(2/285)

رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب نے اس کی طرف نازل کی اور مومنین بھی اسی پر ایمان لائے۔

(3) وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ(42/10)

اور تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف رکھتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ کے ہی حوالہ ہے۔

(4) اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ(7/3)

جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ کسی کارساز کا اتباع نہ کرو۔

اسی کتاب کو حضورؐ نے امت کو دیا اور امت کو اس کا وارث بنایا۔ **قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصتم بہ کتاب اللہ** میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کو تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ ہے کتاب اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی امت مسلمہ کو صرف اسی کتاب کا وارث بنایا۔ ○ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (35/32) ○ پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے

چھٹا۔ ان مندرجہ بالا آیات کریمات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت میں قانون کا ماخذ صرف مَـا اُنـزَلَ اللّـٰه یعنی قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم کے علاوہ حدیث، اجماع قیاس قانون کے ماخذ نہیں ہو سکتے۔

اصل یہ ہے کہ یہ بحث کہ اسلامی قانون کے ماخذ کیا ہیں، مذہب میں پیدا ہوتی ہے۔ دین میں تو نہ اس قسم کا کوئی سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر بحث و مباحثہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ بات بہت واضح ہے کہ ایک مرکزی اتھارٹی قرآن کریم کے احکام نافذ کرتی ہے۔ اس اتھارٹی کے سامنے صرف قرآن کریم ہوتا ہے۔ یہ اتھارٹی امت کے باہمی مشورہ سے، حالات کے مطابق، قوانین بناتی ہے اور انہیں جاری کرتی ہے۔ اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان دو مطاعوں کی اطاعت ایک اطاعت ہوتی ہے۔ اس نظام کی معرفت اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوتے ہیں جو اس نے مومنین سے قرآن کریم میں کئے ہیں۔ انسانوں کی عزت و عظمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کے چلانے والوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور ان کے کاموں کو اپنا کام بتاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

o فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8/17) o اور (مسلمانوں) ان کفار کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ خود ان کو اللہ نے قتل کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ o إِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9/111) o اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ (ان کی قیمت) ان کے لئے جنت ہے، اس طرح اسلامی حکومت جو مومنین کی جانیں اور مال خریدتی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز ارشاد عالی ہوتا ہے o إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ (48/10) o بے شک جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ لوگ اللہ سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ ان آیات میں مومنین کے کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کام بتائے ہیں اور ان کاموں کو اپنی طرف نسبت دی ہے۔

چونکہ اس حکومت کے قوانین اللہ تعالیٰ کی صفات پر منحصر و مَنُوط (وابستہ) ہوتے ہیں،

اس لئے مومنین ان کی پیروی کرنے سے اپنے میں صفات الٰہی کی نمود و پرورش کرتے چلے جاتے ہیں، اور اس طرح ان کا تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات ونمود سے ان میں دیانتداری، عدل وانصاف، رحم وحسن سلوک، بلند اخلاق، پختہ سیرتی جیسی صفات پیدا ہو کر ان کا تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تصوف میں جس چیز کو تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ وہ اصل میں نفس کو مارنا ہوتا ہے تزکیہ نفس نہیں ہوتا، تزکیہ تو اسلامی حکومت میں ہوتا کہ اس میں انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہو جاتی ہے، انہیں تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ غیر اسلامی معاشروں میں قوانین میں ردوبدل کرنے، اور خارج سے پابندیاں عائد کرنے سے جرائم کا انسداد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی حکومت میں انسان پر خارج سے پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں، بلکہ اس میں انسان خود اپنے آپ پر اندر سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس حکومت کی اطاعت نہیں کی تو وہ عنداللہ ماخوذ ومعتوب ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ سیکولر نظریہ حیات کی رُو سے انسانی زندگی کا تصور پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس میں نفع ونقصان کا مدار طبعی امور پر ہوتا ہے۔ جبکہ قرآنی حکومت میں نفع ونقصان کا مدار اس کے نفس پر اچھے یا برے اثرات کے مرتب ہونے سے ہوتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے دین کا تصور ہی نہیں ہے۔ ہمارے مسلمانوں کی مذہبی حکومتیں بھی سب سیکولر ہیں ان میں قرآنی حکومت کا تصور ہی نہیں ہے۔ قرآنی حکومت کی چند خصوصیات تحریر کی جا چکی ہیں، وہ حکومت اللہ تعالیٰ کے وعدے اور قرآن کریم کے دعاوی کو پورا کرتی ہے قرآن کریم نے دعویٰ کیا o وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6) o اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اسلامی حکومت ہی یہ وعدہ پورا کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس حکومت میں حکومت کی اطاعت کرنے کی وجہ سے تزکیہ نفس ہوتا ہے جس کا مختصر سا حوالہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس میں پابندیاں اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآنی حکومت محض اقتصادی مشکلات حل نہیں کرتی بلکہ وہ اس سے بہت بلند مقام تک لے جاتی ہے۔ روٹی کا مسئلہ تو انسانی وحیوانی زندگی کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ قرآنی نظام ان مسائل کا بھی حل پیش کرتا ہے۔ جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہے۔

بھی ایک بنیادی فرق ہے سیکولر حکومت اور قرآنی حکومت میں، سیکولر حکومت تو انسانی سطح پر پہنچتی ہی نہیں وہ تو صرف حیوانی سطح پر جا کر رک جاتی ہے غیر مسلموں کے علاوہ ہم مسلمانوں کے ذہن میں بھی انسانی سطح کی حکومت کا خیال اس لئے نہیں آتا کہ ہم خود مذہب کے مارے ہوئے ہیں اور مذہب گزیدہ ہیں ہم تو خود ہی انسانی سطح پر زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں۔ جب ہماری اپنی سطح حیوانی سطح ہے، تو پھر ہم انسانی سطح کی حکومت، یعنی دین کا تصور کیسے لا سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان طفلانہ بحثوں اور لایعنی نظریات میں، کہ حدیث قانون کا ماخذ ہے یا نہیں، اُنہی میں اُلجھے رہتے ہیں

خارج سے پابندیاں عائد کرنے کے بجائے اندر سے پابندیاں از خود عائد کرنے کی مثالیں خود قرآن کریم نے بھی پیش فرمائی ہیں۔ اس بارے میں حضرت یوسفؑ کی مثال چمکتے ہوئے ستارے، اور مینارہ نور کی مانند ہے۔ ہمارے علماء کرام کا اصرار ہے کہ عورتوں کو پردے میں رکھا جائے کیونکہ عورتوں کے بے پردہ باہر چلنے پھرنے سے علماء کرام کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں، اور چال چلن خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر، لحافوں میں لپیٹ کر رکھنا ہی ضروری ہے۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ حضرت یوسفؑ کے معاملے میں، دولت و حشمت، غلبہ و اقتدار کی ملکہ عورت گھر کے اندر ہے۔ گھر میں حضرت یوسفؑ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ وہ عورت اُنہیں ہر طرح کی ترغیب و ترہیب دیتی ہے اور اُنہیں حد درجہ مجبور کر دیتی ہے۔ قرآن کریم نے هَيْتَ لَكَ (12/23) کے الفاظ استعمال کئے ہیں، بظاہر جن کا ترجمہ ''لو، آؤ'' ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا صحیح ترجمہ اردو میں ہو ہی نہیں سکتا کہ اس میں کس درجہ رغبت دلائی جاتی ہے اور اس میں کس درجہ (PERSUSION) ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ۔

عجب درماندہ ام در کار اینان مرا زندان بہ از دیدار اینان

کہہ کر اپنا کرتا چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد، اس وقت کی خوبصورت ترین عورتوں کا ایک ہجوم ان کو گھیر لیتا ہے۔ ان کو دھمکی ملتی ہے کے اگر وہ بدچلنی پر آمادہ نہیں ہوتے تو

اُنہیں قید کر دیا جائے گا، لیکن ان کا ایمان ہے کہ ۔

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر　　لطف کچھ دامن بچا کر گذرنے جانیم میں ہے

وہ اپنے سامنے دو (ALTERNATIVES) دیکھتے ہیں ۔ یا تو بد چلنی پر آمادہ ہو جائیں، یا پھر جیل خانہ کی لمبی قید ان کا مقدر ہوگی ۔ وہ نہایت بہادری اور ایمانی حرارت سے کہتے ہیں کہ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (12/33) اے میرے پروردگار جس بات کی یہ عورتیں خواہش رکھتی ہیں ۔ اس نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے ۔ یہاں جرائم کے انسداد کے لئے جو لفظ غور کرنے کے قابل ہے وہ أَحَبُّ إِلَيَّ کا لفظ ہے ۔ یہ لفظ ہی جرائم کا انسداد کرنے کی کلید ہے انہوں نے فرمایا کہ اس عورت کے ساتھ بد چلنی کرنے کے مقابلہ میں قید کی زندگی زیادہ نفع بخش ہے ۔ انسداد جرائم کا سارا فلسفہ اس بات پر منوط ہوتا ہے کہ آپ کسی چیز کو زیادہ منفعت بخش سمجھتے ہیں ۔ اور اس پر آپ کا پورا پورا ایمان بھی ہو ۔ یہ ایمان ہی اندر سے عائد کردہ پابندی بن جاتی ہے اس کا باہر کی (IMPOSED) کردہ پابندی سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ۔

دوسری مثال ساحرین (علماء) دربار فرعون کی ہے ۔ جب حضرت موسیٰ کی طرف سے پیش کردہ صداقت پر وہ ایمان لے آئے تو فرعون نے ان کو دھمکی دی تو تم میری اجازت حاصل کئے بغیر موسیٰ کی تعلیم پر ایمان لے آئے ہو، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تمہیں صلیب پر لٹکا دوں گا ۔ یہاں بھی ساحرین نے دونوں (ALTERNATIVES) پر غور کیا اور نہایت دلیری و دل جمعی سے جواب دیا کہ ہم تمہاری بات پر غور و فکر کرنے کے بعد یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ o (20/73) تمہاری طرف داری کی نسبت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اچھی اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی اور تابندہ نتائج کی حامل ہے ۔ یہاں غور فرمائیں کہ فرعون کی اتنی بڑی دھمکی اُنہیں ڈرا نہیں سکی اور اب وہ سابقہ علماء اور بقول مفسرین کے جادوگر راسخ الایمان مومنین تھے ۔ انہوں نے اتنی بڑی دھمکی کے جواب میں کہا کہ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گذرو، اب ہم ان روشن دلائل کے بعد اپنے خالق پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تمہیں ترجیح نہیں دے سکتے ۔ تم اگر کچھ بھی کر سکتے ہو

تو اسی دنیا میں کر سکتے ہو، اور ہمیں اس دنیا کی کوئی پروا نہیں ہے۔

یہاں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ یہ ایمان کا اثر ہے کہ یہ وہی جادوگر تھے، جن کا حال قرآن نے دوسری جگہ یہ بیان کیا تھا کہ جب وہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ کے لئے بلائے گئے تھے تو انہوں نے فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی تھی، جس پر فرعون نے اُنہیں یقین دلایا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ اس کے مقرب بنا دیئے جائیں گے اور اب ایمان لانے کے بعد اس دنیا کی کسی چیز کی اہمیت ان کے سامنے نہیں رہی اس طرح کے نفسیاتی تغیر METAMORPHOSIS، سے اسلامی حکومت میں جرائم کا انسداد از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

تیسری مثال آل فرعون کے مردِ مومن کی ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم نے سورہ مومن میں فرمایا ہے کہ یہ مردِ مومن اگرچہ فرعون کے شاہی خاندان اور اس کے عزیزوں میں سے تھے، لیکن شروع سے ہی ان کی ہمدردیاں حضرت موسیٰ کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی حضرت موسیٰ کو آگاہ کیا تھا کہ حکومت اُنہیں قتل کرنا چاہتی ہے اور اُنہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں۔ جب تک انہوں نے یہ محسوس کیا کی وہ ایمان کو پوشیدہ رکھ کر حضرت موسیٰ کے مشن کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں، انہوں نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا۔

آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے اندرونی حلقوں کے رکن تھے۔ لیکن جب ان کو محسوس ہوا کہ ان کے خاموش رہنے سے دین کو خطرہ ہوگا، تو انہوں نے مصلحت کا پردہ چاک کر دیا، اور نہایت دلیری اور بہادری سے فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ کی حمایت بھی کی اور اپنے ایمان کا اعلان بھی کیا۔ اس مردِ مومن کی تقریر اس درجہ جامع وپُر اثر تھی کہ قرآن کریم نے اس کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اس کو محفوظ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں سے بھی یہی فرمایا کہ سیکولر نظام حیات کے حامی لوگوں نے حرام طریقوں سے بھی جو کچھ دولت جمع کر رکھی ہے تم اس سے دھوکا نہ کھا جانا۔ خوب یاد رکھو۔ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى o(20/131)o اللہ تعالیٰ کے نظام میں حاصل کردہ رزق اس سے کہیں زیادہ

بہتر ہے اور تابندہ اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔ یہاں بھی سیکولر نظام حیات اور قرآنی نظام حیات کا فرق بیان فرمایا ہے۔ اور اس طرح رزق حرام کھانے کا دروازہ مسدود کر دیا، اور اس طرح مالی و معاشی معاملات سے متعلق جرائم کا انسداد ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کی تدوین کے بارے میں مضمون کے آخر میں ایک نہایت اہم بات تحریر کی جاتی ہے جو قرآنی حلقوں میں زیادہ غور طلب اور قابل پذیرائی ہوگی۔

اسلامی قانون کا اجراء صرف اسلامی حکومت میں ہو سکتا ہے غیر اسلامی حکومت میں اسلامی قانون کا اجراء نہیں ہو سکتا خواہ وہ قانون قرآنی ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم کی رو سے شراب پینا حرام ہے۔ اگر ہندوستان کی حکومت قرآنی حکم کے مطابق شراب خوری کو قانوناً منع کر دے تو وہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ ترکی کی حکومت اگر زنا کی سزا کے لئے سو کوڑے مارنے لگے تو یہ حکم اسلامی نہیں ہوگا۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت خالص ملوکیت ہے، وہاں نافذ کردہ حدود، اسلامی قوانین نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جب فقہ کی تدوین ہوئی تو اول تو وہ انفرادی کوششیں تھیں دوسرے یہ کہ بنو عباس کی حکومت اسلامی حکومت نہیں تھی۔ اسلامی حکومت کی خصوصیات مضمون ہذا میں تحریر کی جا چکی ہیں وہ صرف مسلم حکومت تھی۔ اس نے ہمارے وہ قوانین جو فقہ اسلامی کے نام سے مشہور ہیں، اور جن کی بناء پر ہمارے ہاں فرقہ بندی کی لعنت چلی آ رہی ہے وہ اسلامی قانون ہی نہیں ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ قوانین صرف اپنے دور اور اپنے عصر کے لوگوں کے لئے تھے، ہم ان کی اطاعت کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ یہی صورت ہماری آج کل کی حکومت کی ہے۔ ہماری پاکستانی حکومت مسلم حکومت ہے۔ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ جو قوانین بھی اسلام کے نام پر جاری کر رہی ہے۔ یہ سرے سے اسلامی قانون ہی نہیں ہیں۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جو قوانین اسلام کے نام پر جاری ہوئے ہیں۔ وہ اسلامی قطعاً نہیں ہیں۔ حدود آرڈیننس کے بارے میں یہ بحث کرنا کہ وہ اسلامی ہے یا نہیں، یا اس کی کتنی دفعات اسلامی ہیں اور کتنی قرآن کریم کے خلاف، بالکل بے معنی بحث ہے۔ وہ قرآن کے مطابق ہونے کے بعد بھی غیر اسلامی رہیں گے۔

اسلامی حکومت میں کونسل آف اسلامک آئیڈیولوجی، cii نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح کے قانونی مشورے دینے والے ادارے سیکولر حکومت میں ہوتے ہیں صدر محترم نے اس کونسل کو حکم دیا ہے کہ وہ حدود آرڈیننس میں ترمیم کرے اور مختلف الخیال، اور سارے حلقوں کے علماء کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور ان علماء کے باہمی مشورے CONSENSUS سے اس میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ انہوں نے جو یہ ہدایت مذکور بالا کونسل (cii) کو فرمائی ہے، اس پر عمل درآمد کرنا ہی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے علماء کرام کے مختلف حلقے کسی بات پر بھی اتفاق نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہوں نے حدود اللہ کے تحفظ کے لئے تحریک چلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ صدر صاحب اس کونسل کو یہ حکم فرماتے کہ وہ اس آرڈیننس کو قرآن کریم کے مطابق کرے خواہ اس میں علماء کرام کا CONSENSUS ہو یا نہ ہو، کیونکہ حُجت تو صرف قرآن کریم ہے، علماء کرام حُجت نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلامی قانون تو وہ بھی نہ ہوتا البتہ، اس قانون کی وجہ سے خواتین کو جو نقصان وضرر اسلام کے نام پر ہو رہا ہے وہ ختم ہو جاتا۔ موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے خود موجودہ حکومت کو آہستہ آہستہ اسلامی بنائیں، اس کا عمل کوئی ایک دو دن کا عمل نہیں ہے، اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا۔

جب حکومت خود اسلامی ہوگی اور قرآنی احکام نافذ کرے گی۔ اس کے نافذ کردہ احکام اسلامی ہوں گے۔ اور ان احکام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔ اسلامی حکومت سب سے پہلے حضورؐ نے قائم فرمائی تھی۔ اس میں احکام اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے۔ اور ان کو نافذ حضورؐ کرتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت اللہ ورسول دونوں کی اطاعت ہوتی تھی، حضورؐ کے بعد آپ کے جانشین، حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہتا، تو اب تک حکومتوں کے سربراہوں کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہی ہوتی رہتی۔ اب جو حضرات قوانین کو اسلامی بنانے کی خواہش رکھتے ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود حکومت کو اسلامی بنائیں، اس حکومت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیں۔ اس کے سربراہ کی اطاعت کو حضور کی اطاعت کے

بمنزلہ قرار دیں۔ پھر اس حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی بھی ہوں گے اور قرآن و سنت کے مطابق بھی ہوں گے o فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ (40/44)o جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، عنقریب ہی تم اسے یاد کرو گے۔

ماہ اکتوبر 2006ء

ایک عریضہ بنام جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ 'صوت الحق'

موقر رسالہ "صوت الحق" کے قارئین کرام کو بخوبی علم ہے کہ اس رسالہ کا عملی سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نہ پاکستان میں، اور نہ پاکستان سے باہر کسی اور ملک میں۔ البتہ اس مرتبہ امریکہ کے مڈٹرم الیکشن کے سلسلے میں ایک ایسی خوش آئند بات سامنے آئی کہ دل چاہتا ہے کہ قارئین کرام کے علم میں بھی وہ بات لائی جائے، تاکہ وہ اس سے بے خبر نہ رہیں۔

امریکہ کی آبادی 28 کروڑ ہے۔ پچاس STATES پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سینٹ ہوتی ہے اور ایک HOUSE OF REPRESETATIVES (مجلس نمائندگان) سینٹ کی تعداد سو 100 ممبران کی ہوتی ہے اور ہر سٹیٹ سے دو نمائندہ اس میں منتخب ہوکر آتے ہیں جبکہ مجلس نمائندگان کی تعداد 435 ہے جو تمام ریاستوں سے انتخاب لڑ کر آتے ہیں۔ ان دونوں HOUSES کو ملا کر کانگریس کہتے ہیں۔ ان دونوں ہاؤسس کے انتخاب ہر دوسرے سال ہوتے ہیں۔ چونکہ واقعہ پیش نظر کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات کافی ہیں اس لئے ان پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔ مزید معلومات، جس قدر بھی تحریر کی جائیں گی، یہ خط طویل تر ہو جائے گا۔

1930ء میں امریکہ میں ایک شخص فرد محمد نام کا کسی ملک سے وارد ہوا، اور اس نے اسلام کی تبلیغ شروع کردی۔ اس نے بہت کافی لوگوں کو مسلمان کیا جن میں سے اکثریت سے (BLACK CRIMINALS) کی تھی۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے ایک شخص ELIJAH MUHAMMAD۔ اردو میں اس کو عموماً عالیجاہ محمد لکھ دیتے ہیں اگرچہ اس کا صحیح تلفظ علائی جاہ محمد ہے۔ یہ شخص بھی قید کے دوران مسلمان ہوا۔ یہ شخص غیر معمولی صلاحیتوں

کا حامل تھا۔فرد محمد تو1934ء میں امریکہ سے واپس چلا گیا اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں چلا گیا۔۔البتہ وہ ایک کافی تعداد مسلمانوں کی بنا گیا جس میں سب سے نمایاں شخصیت عالیجاہ محمد کی ہی تھی۔ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ جاری رکھی اور NATION OF ISLAM نام کی ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی۔یہ تحریک آہستہ آہستہ ترقی کرتی چلی گئی۔عالی جاہ چونکہ بہت غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔اس نے اس تحریک کو بڑی SOUND بنیادوں پر استوار کیا تھا،اور ایک بہت بڑی جائیداد اس تحریک کے نام خرید لی۔اور یہ تحریک مالی طور پر بہت آسودہ ہوگئی۔دیگر افراد کے علاوہ ایک شخص میلکم ایکس(MALCOM,X)نام کا بھی اس تحریک میں شامل ہو گیا۔یہ شخص بھی جرائم پیشہ تھا اور اس کی قید کے دوران اس کے بھائی،عالی جاہ محمد کے اثر سے مسلمان ہو گئے تھے۔اس کے بھائیوں نے اس کو دوران اسیری میں ہی مسلمان کر لیا۔قید سے رہائی کے بعد میلکم ایکس نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینا شروع کر دیا۔اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس نے،عالی جاہ محمد کو بھی OVER-SHADOW کر دیا۔اگر چہ اس تحریک کا نام نیشن آف اسلام ہے،لیکن یہ اس طرح کے مسلمان نہیں ہیں،جیسے ہم ہیں۔یہ فرد محمد کو خدا مانتے ہیں اور عالی جاہ کو اس کا رسول۔لیکن یہ بائبل اور قرآن کریم دونوں کو حجت مانتے ہیں۔اور قرآن کریم پر اپنی دانست کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں،اور کہلاتے ہیں۔یہ سب BLACK ہیں،محمد علی کلے مشہور BOXER بھی ان ہی میں سے ہے،ان کے دعویٰ کے مطابق ان کی تعداد گیارہ ملین یعنی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ان کا ایک ہفتہ وار اخبار FINAL CALL بھی نکلتا ہے۔عالی جاہ محمد ایوب خاں کے دور میں پاکستان آئے تھے،اور ایوب خان نے ان کا اچھے انداز میں استقبال کیا تھا۔یہ 1975ء میں فوت ہو گئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے ڈاکٹر W.W.DEEN،اس تحریک کے صدر ہوئے میلکم ایکس ان میں بہت زیادہ مشہور شخصیت ہے۔وہ حج پر بھی گیا اور کرنل قذافی کی دعوت پر وہ لیبیا بھی گیا۔لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔میلکم ایکس حج کے بعد عام مسلمانوں جیسا ہی مسلمان ہو گیا۔لیکن اس دوران میلکم

ایکس اور عالیجاہ محمد کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے۔اور میلکم ایکس نے عالی جاہ پر الزام لگایا کہ اس کے اپنی سیکریٹری سے ناجائز تعلقات ہیں پہلے تو عالیجاو اس الزام کا انکار کرتے رہے، لیکن بعد میں، حالات سے مجبور ہو کر، انہوں نے اس بات کا اعتراف کرلیا۔لیکن ان دونوں کے تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ میلکم ایکس کو قتل کردیا گیا۔عام خیال یہی ہے کہ عالیجاہ محمد نے اسے قتل کرایا، لیکن نیشن آف اسلام والوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت نے اس کو قتل کرایا تھا۔میلکم ایکس پر کئی فلمز بھی بنی ہیں۔وہ فلمز یہاں پاکستان میں بھیVideos پر دستیاب ہیں جو بآسانی مل جاتی ہیں، امید ہے کہ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ دیکھی بھی ہوں۔میلکم ایکس اور عالیجاہ پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ان میں سے چند پاکستان میں بھی دستیاب ہیں۔البتہ انٹر نیٹ پر کافی کتابیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

مجھے گذشتہ بیس20 پچیس25 سال سے اس جماعت کے متعلق چند معلومات حاصل ہوئی تھیں تو میں بھی اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا بہت مشتاق تھا۔لیکن کوشش بسیار کے باوجود مجھے معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔اس زمانہ میں کمپیوٹر بھی نہیں تھا کہ اس کے ذریعہ معلومات حاصل کرتا۔میرے جن عزیزوں اور دوستوں کی امریکہ آمدورفت تھی، اُن سب سے میں نے معلومات حاصل کرنا چاہیں، لیکن مجھے کہیں سے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔نہ ہی کوئی کتاب یا کوئی مضمون کسی اخبار بھی اس بارے میں کہیں سے دستیاب ہو۔اس تمام طویل عرصہ میں جناح باغ لاہور کی لائبریری میں ایک جرنل(JOURNAL) میں بھی ایک مختصر سا مضمون میرے ہاتھ آیا۔ اتفاق سے1995ء میں میری خواہرزادی نے میری مشکل حل کی اور مجھے بتایا کہ ان کے دفتر میں ایک صاحب جو اس تحریک سے وابستہ ہیں ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور وہ ان کو مجھ سے ملادیں گی۔چنانچہ اگلے ہی روز ایک صاحبLEE ROY MUHAMMAD نام کے ان کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لے آئے۔یہ صاحب بالکل جوان تھے، اور اس جماعت کے نہایت فعال و سرگرم رکن تھے۔مجھے انہوں نے عالیجاہ محمد کی تین کتابیں بھی مطالعہ کرنے کے لئے

چندروز پر واپسی شرط کے ساتھ دیں اور یہ بھی بتایا کہ ان لوگوں کی ایک مسجد BRIXTON کے علاقہ ،لندن میں موجود ہے اور چندروز کے بعد وہاں ایک لیکچر بھی ہونا ہے۔ چنانچہ چندروز کے بعد، جب وہاں لیکچر ہونا تھا تو میں ایک عزیز دوست کے ساتھ اس مسجد میں گیا۔ وہاں ایک صاحب DENNIS MOHD نام کے CHASTITY (عفت) اور FAMILY SANCTITY پر تقریر کررہے تھے اور مجمع تقریباً سو 100 آدمیوں پر مشتمل ہوگا، مرد وخواتین دونوں موجود تھے، لیکن سب BLACK ہی تھے ان BLACK لوگوں کی انگریزی قدرے مختلف اور غلط ہوتی ہے اور ان کا تلفظ ولہجہ بھی الگ ہوتا ہے جس کو مشکل سے سمجھا جاتا ہے، اس لئے پوری تقریر تو میری سمجھ میں نہیں آئی البتہ جب وہ آیات کا حوالہ دیتے تھے، تو میں ان کے مفہوم کے قریب قریب پہنچ جاتا تھا۔ چونکہ امریکہ میں بدچلنی عام ہے، اور کنبہ کی گرفت بھی کمزور ہوگئی ہے، اس لئے یہ موضوع ان حضرات کے لئے بہت اہم تھا LEEROY MOHD نے مجھے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ ان کا اخبار Final Call، امریکہ سے نکلتا ہے اور ہر اتوار کی شام کو اس تحریک سے متعلق لڑکے Diceadilly بازار میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اتوار کی شام کو وہاں جا کر اخبار خرید لیا۔ جس کی قیمت ایک پاؤنڈ تھی۔ یہ اخبار اب بھی نکلتا ہے آپ حضرات بھی اس کو W.W.W.Final Call.Com پر ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کے سربراہ LOUIS FARRA KHAN ہیں۔ اس اخبار سے آپ کو اس تحریک کی پوری معلومات حاصل ہوجائیں گی۔

LEEROY MOHD سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تحریک سے ٹوٹا ہوا گروپ، یعنی اس کا ایک SPLINTER GROUP بھی ہے، جو ہم مسلمانوں جیسے عقائد رکھتا ہے۔ اور اس گروپ کے علماء مولوی یا مولانا کے بجائے اپنے نام کے ساتھ امام کا سابقہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر امام علاء الدین شہباز اور امام WW.DEEN، اس گروپ میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اور یہ حضرات CHICAGO میں رہتے ہیں اور انہوں نے

مجھے ان کا مکمل پتہ دیا۔ چنانچہ میں نے لندن سے ہی امام شہباز کو ایک خط تحریر کیا اور انہوں نے فوری اس کا جواب مجھے دیا، جو مجھے چند روز میں مل گیا۔ ان کے اس گرامی نامہ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تحریک طلوع اسلام سے واقف ہیں۔ بلکہ اس تحریک کے بہت مداح ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات بھی صرف قرآن کریم کو حُجت سمجھتے ہیں اور حدیث کو کوئی اہمیت نہیں دیتے نہ ہی عرب معاشرت اور فقہ کے قائل ہیں۔ بالکل طلوع اسلام کے نظریات کے حامل لوگ ہیں۔ مجھے اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ وہ اس قدر باخبر لوگ ہیں حالانکہ یہ لوگ اردو سے بالکل ناواقف ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی CONSPIRASIES AGAINST QURAN پڑھی ہوئی تھی۔ اس طرح مجھے اس تحریک کے اور علماء کا بھی علم ہوا، جن کی چند کتابیں پڑھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی قرآن کریم پر گہری نظر ہے۔ لندن میں ہی میں نے ایک VIDEO، امام ڈبلیوڈبلیو ڈین کے پروگرام کا دیکھا۔ یہ صاحب عالیجاہ محمد کے صاحبزادے ہیں، اور ان کے انتقال کے بعد یہ ہی اس تحریک کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ لیکن چونکہ یہ اس تحریک کے نظریات چھوڑ کے خالص قرآنی بن گئے تھے اس لئے یا تو انہوں نے خود اس تحریک کو چھوڑ دیا، یا جماعت نے ان کو ہٹا دیا ہوگا۔ لیکن FINAL CALL کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اب بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔

لاہور آنے کے بعد میں نے دفتر طلوع اسلام میں بھی بیٹھ کر ایک طویل خط، ڈاکٹر امام علاءالدین شہباز کی خدمت عالی میں ارسال کیا، اور انہیں وہ خط اور ادارہ کی تین کتابیں ارسال کر دیں۔ میں نے اپنے خط میں تحریک طلوع اسلام HISTORY TRACE کی اور انہیں عرض کی کہ یہ ادارہ تقریباً 50 سال سے خالص قرآن کریم کی تبلیغ کر رہا ہے اور ہر ہر موضوع پر قرآن خالص کی روشنی میں مواد تحریر کیا ہے۔ اور ان سے درخواست کی کہ اگر انہیں کسی CORNER سے کوئی اعتراض ایسا آئے جس کے جواب میں ان کو کوئی دقت محسوس ہو تو وہ اس اعتراض کو اس ادارہ کی طرف REFER کر دیں، یہ ادارہ اس کا جواب تحریر کر کے ارسال کر دے گا۔ میرے عریضے اور کتب کے جواب میں ان کا گرامی نامہ آیا جس میں انہوں نے کتابوں کے وصول کرنے کا شکریہ

ادا کیا۔ اور انہوں نے بھی اپنی دو کتابیں ارسال فرمائیں ایکHOMOSEXUALITY اور دوسری POLYGAMY ان دونوں کتابوں کے لئے انہوں نے اجازت دی کہ ادارہ ان کو طبع بھی کر سکتا ہے اور ترجمہ بھی کرا سکتا ہے۔ چنانچہ ادارہ نے پہلی کتاب کا ترجمہ ''ہم جنس پرستی'' کے نام سے طبع کرایا۔ دوسری کتاب کے سلسلہ میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ طاہرہ کے خطوط اور ان کی کتاب POLYGAMY میں نظریات ایک جیسے ہی ہیں۔ بعض مقامات پر انہوں نے نشان تک لگا دیئے تھے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ادارہ کے نظریات اور ان کے نظریات میں بہت تطابق ہے۔ مجھے انہوں نے یہ بھی اصرار فرمایا کہ میں ادارہ کا لٹریچر کثرت سے اُنہیں ارسال کروں اس طرح وہ عام لوگوں کو، اور خصوصاً نیشن آف اسلام کے لوگوں کو، مسلمان بناتے چلے جائیں گے ۔ یہ لوگ خالص قرآنی نظریات کے حامل ہیں۔ جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے صرف قرآن کریم کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ اور عرب معاشرت کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ میں نے لندن میں ایکVIDEO ، اماW.W.DEAN کا دیکھا تھا۔ اگرچہ نسلاً وہBLACK ہیں لیکن ویڈیو میں وہ بہت DIGNIFIED معلوم ہو رہے تھے۔ اسی ویڈیو میں ان کے گروپ کے ایک عالم کو دکھایا کہ وہ شراب کی ایک دکان کے باہر کھڑے ہیں اور وہ دکان عربوں کی تھی۔ وہ ان عربوں کو بُرا کہہ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ میں رکاوٹ ہوتی ہے، کیونکہ وہ عرب شراب بھی پیتے ہیں اور جوا بھی کھیلتے ہیں۔ اس پر ان عربوں نے اس عالم کا مذاق اڑایا، اور کوئی اثر نہیں لیا۔ اس گروپ کے علماء بہت اچھے عالم ہیں۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے تفسیر قرآن بھی لکھی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کتاب میں ایک عالم نے لکھا تھا کہ ہم غزالی اور ابن تیمہ اور علماء کے حوالے دیتے ہیں اور ان سے INSPIRE ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے (یعنی اس گروپ) کے اپنے علماء بھی جاہلیت میں ان سے کم نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے علماء کا ہی حوالے دینا چاہئے۔

یہ ساری تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے تا کہ قارئین کرام نفس مضمون سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ 7، نومبر 06 کو امریکہ میں جو الیکشن ہوا ہے اس میں ایک صاحب نیشن آف اسلام کے

بھی کامیاب ہو کر مجلس نمائندگان میں آئے ہیں۔ان کا اسم گرامیELLISONKEITH ہے۔ان کی عمر صرف 43 سال ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر ہیں۔اُنیس19 سال کی عمر میں رومن کیتھولک مذہب کو خیر آباد کہہ کر نیشن آف اسلام میں شامل ہو گئے تھے۔جس وقت کہ یہ اپنے آبائی وطنDETROIT،یئنٹ میں طالب علم تھے۔لیکن اب یہ MINNESOTA کی سیٹ سے آئے ہیں۔ یہ عراق کی لڑائی کے خلاف ہیں۔ الیکشن کے دوران جیسا کہ دستور ہے ہر پارٹی اپنے مخالف امیدوار پر ہر طرح کا الزام لگاتی ہے ان پر بھی اسلام کا لیبل لگنے کے الزام کو بہت ہوا دی گئی۔نیشن آف اسلام نے1995ء میں ایک جلوس نکالا تھا۔ انہوں نے اس جلوس میں بہت حصہ لیا تھا،ان کی اس کمزوری پر مخالفین نے بہت گرفت کی،لیکن اس کے باوجود وہ کامیاب ہو گئے۔کامیاب ہونے کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ حلف برداری کی تقریب میں بائبل پر حلف نہیں لیں گے، بلکہ قرآن کریم پر حلف اٹھائیں گے۔مجلس نمائندگان میں قرآن کریم کی یہ پہلی آواز ہے۔

موقر رسالہ'صوت الحق' کے محترم مدیر صاحب کے نام یہ خط برائے طباعت ارسال کیا جارہا ہے تاکہ قارئین کرام

ماہ جنوری2007ء

37

محترم التھام جناب حسین امیر فرہاد صاحب

کمترین کا ایک مضمون ''خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے''صوت الحق بابت اکتوبر 2003ء میں شائع ہوتھا۔اس مضمون کو دونوں سرچشموں کے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا اس مضمون میں میں نے بار بار فرقہ اہل قرآن کی اصطلاح تحریر کی تھی ۔لندن سے میرے چند قریبی دوستوں نے مجھے خطوط اور ای میل کے ذریعے اس پر انتباہ کیا کہ فرقہ بندی خود قرآن کریم کے خلاف ہے۔اس لئے مجھے بار بار فرقہ اہل قرآن تحریر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ایک یا دو خطوط بھی اس اعتراض کے بارے میں رسالہ صوت الحق میں طبع ہوئے ۔دو روز پیشتر میرے بزرگ دوست جناب عبدالخالق کھوکھر صاحب کا ایک بہت طویل فون لندن سے آیا اور انہوں نے پھر اس بارے میں میری گرفت کی اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند سطور میں اس کی وضاحت عرض کردوں۔

فرقہ اہل قرآن جب شروع ہوا تھا اس وقت دین کا قطعاً کوئی تصور نہیں تھا صرف مذہب سب کے پیش نظر تھا۔فرقہ اہل قرآن بھی مذہب کی سطح پر ہی رہا۔دین کی سطح پر یہ بھی نہیں آیا تھا۔اس دور کے قرآنی علماء مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم، مولوی خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری مرحوم، نے زیادہ زور فقہ پر رکھا کہ ان کی فقہ قرآنی ہوجائے ۔کیونکہ اس دور میں ان کے سامنے دین نہیں تھا۔اسی لئے انہوں نے جزئیات کا تعین بھی قرآن کریم سے ہی کیا اگر ان کے سامنے دین ہوتا تو وہ جزئیات کا تعین حکومت کے ذریعہ قرار دیتے ۔البتہ بعد کے علماء اہل قرآن نے جب 1960ء میں رسالہ بلاغ القرآن جاری کیا تو اس وقت ان کے سامنے دین واضح صورت میں تھا۔انہوں نے اپنی تفسیر بھی دین کو سامنے رکھ کے تحریر کی ہے۔آپ اس فرق کو ان کے لٹریچر میں خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں

فرقہ بندی دین میں منع ہے ارشاد ہوتا ہے۔o اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعاً (6/159)o جن لوگوں نے دین میں فرقے بنائے اور وہ گروہ بن گئے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ o مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ (30/31.32) اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا o کہ انہوں نے اپنے دین میں فرقے بنائے ہیں۔ نیز ارشاد ہوتا ہے اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (42/13) یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بناؤ۔ دین کے برعکس طاغوت ہوتا ہے طاغوت میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ اس میں جو رزق جائز ذرائع سے بھی حاصل کیا جاتا، وہ پھر بھی ناجائز ہوتا ہے۔ طاغوت میں ہوتے ہوئے فرقہ کی تعریف یہ ہے کہ اس میں آخری اتھارٹی کسی نہ کسی شخصیت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا قول یا تحریر حُجت ہوتی ہے اس لئے فرقہ بندی شرک ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ کوئی شخصیت میں حُجت تسلیم کی جاتی ہے ۔علماء اہل قرآن نے فقہ کی حد تک تو سند صرف قرآن کریم کو قرار دیا، کوئی شخصیت ان کے ہاں حُجت نہیں تھی۔ لیکن ان کا فقہ عملی زندگی میں رائج نہیں ہوا۔ اس میں حکم طاغوت کا جاری تھا۔ اصل یہ ہے کہ سور کی بوٹی خواہ وہ سر کی ہو، یا سُرین کی حرام ہے طاغوت تو خود پورا حرام ہے، اس میں فرقہ بندی یا ایک ایک چیز کی نشاندہی کر کے، حرام کہنا فائدہ مند نہیں ہے بلکہ فائدہ مند یہ بات ہے کہ اس کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کے دین جاری کر دیا جائے۔ پھر اس میں فرقہ بندی بے شک حرام ہوگی۔

اہل قرآن علماء چونکہ شروع سے اپنی شناخت کے لئے فرقہ کا لفظ لکھتے چلے آ رہے تھے، اس لئے میں نے بھی یہ لفظ تحریر کر دیا۔ متعدد خطوط اور برادر محترم عبدالخالق کھوکھر صاحب کے کہنے سے بھی اس بارے میں تنبُہ ہوا، اس لئے اس لفظ سے اجتناب بے شک مناسب ہے۔

ماہ فروری 2007ء

ارتداد

کرنل ریاض جعفری صاحب کا ایک خط 12 مئی 2006ء کے ''دی نیوز'' میں اور پھر وہی خط 13 مئی کے ڈیلی ٹائمز میں طبع ہوا جس سے معلوم ہوا کہ نیشنل اسمبلی میں ارتداد کا بل پیش ہونے والا ہے۔ اس بل کی حمایت میں 23 ممبرز کے دستخط ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ T.V چینلز کے پروگرام 'الف' میں بھی ارتداد کا موضوع زیر بحث آیا۔ نیز 24 مئی کے ڈیلی ٹائمز میں ایک مضمون بعنوان:

DOES ISLAM TRUELY REQUIRE DEATH PENALTY FOR APOSTASY

شائع ہوا ہے۔ اس کے تحریر کرنے والے حاجی عبدالرحمٰن واحد صاحب ہیں جن کے متعلق تحریر ہے کہ موصوف انڈونیشیا کے سابق صدر ہیں۔ یہ صاحب دنیا کی سب سے بڑی تنظیم **نہضت العلماء** کے 1984ء سے 1999ء تک ڈائریکٹر رہے ہیں انہوں نے بھی اپنے اس مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ اسلام کے علماء کرام اسلام کو اسلامی قانون کا ازسرنو جائزہ لینا چاہیے۔ بہر حال کیونکہ ارتداد کا موضوع آج کل اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس بارے میں قرآن کریم کا موقف معلوم کریں۔ اصولی اور اساسی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم فکر انسانی کی پرورش کے ذرائع مہیا کرتا ہے اور کوئی اصول یا حکم ایسا نہیں دیتا کہ جس سے فکر انسانی کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ واقع ہو۔ اسی وجہ سے قرآن کریم آزادی مذہب کا داعی ہے۔ آزادی مذہب کے مدعی ہونے کا لازمی و منطقی نتیجہ تبدیلی مذہب کی اجازت ہے۔ اس مضمون میں پہلے آزادی کی آیات پیش

کی جائیں گی اوراس کے بعد تبدیلی مذہب سے متعلق آیات دی جائیں گی۔ اگر یہ دونوں موضوع قرآن کریم کے ذریعے واضح ہو جائیں تو ارتداد کا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے آزادی مذہب اور تبدیلی مذہب کی اجازت دے دی، تو پھر قرآن کی رو سے ارتداد کوئی جرم ہی نہیں رہتا، پھر اس کی سزا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب پہلے آزادی مذہب کی آیات ملاحظہ فر مائیں۔

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت عنایت کی گئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہدایت خداوندی کا اتباع کرے اور اگر چاہے تو اس
سے انحراف کی راہ اختیار کرے، وہ اس معاملہ میں بالکل آزاد ہے ارشادہ ہوتا ہے۔

(1) فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ o(2/38)

تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا o اور اس کے برعکس ارشاد ہوا کہ

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ o(2/39)

اور جو لوگ میری ہدایت کا انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے تو یہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے o

یہ دونوں مسلسل آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دونوں راہوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیا تاکہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔ نیز فرمایا۔

(2) لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (2/256)

دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ کیونکہ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی

ہے۔اس لئے ہر شخص کو اختیار ہے

کہ اپنی فکر وصوابدید کے مطابق جو مذہب پسند ہو وہ اختیار کرے۔

(3)oقَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا

أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍo(6/104)

o تمہارے پاس تو بجھانے والی چیزیں آ چکی ہیں، پھر جو دیکھے (سمجھے) تو اس کے

اپنے لئے ہے، اور جو اندھا بنے تو

اس کا نقصان بھی خود اسی پر ہے اور اے رسول، ان سے کہہ دو کہ میں تم لوگوں کا

نگہبان تو ہوں نہیںo

(4)oوَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى

يَكُونُوا مُؤْمِنِينَo(10/99)

o اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے آدمی ہیں وہ سب کے سب ایمان لے

آتے تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے

ہیں کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیںo

(5)oوَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ(18/29)

o کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے تو اب جس کا جی چاہے ایمان

لائے اور جس کا جی چاہے وہ کفر کی راہ

اختیار کرے۔

(6)oإِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَى فَلِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا

يَضِلُّ عَلَيْهَا(39/41)

o ہم نے تمہارے پاس کتاب سچائی کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کے واسطے نازل کی تو

جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے

ہی بھلے کے لئے اور جو گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ یہاں آزادی فکر کا ذکر کرنے سے پہلے نزول کتاب کا ذکر عمداً کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ واضح کر دیا جائے کہ اس درجہ اہم کتاب کے نزول کے باوجود ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اس سے زیادہ آزادی مذہب پر اور کیا بیان کیا جا سکتا ہے۔

(7)oإِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًاo(76/3)

o ہم نے ہر انسان کو راستہ دکھایا ہے اس کے بعد وہ جی چاہے تو شکر گذار بندہ بن جائے اور چاہے تو نافرمان بن جائے o

انسان کو پورا پورا اختیار عطا فرما دیا گیا ہے۔

ان آیات سے آپ نے بخوبی اندازہ فرما لیا ہوگا کہ قرآن کریم مذہب اختیار کرنے کی پوری پوری آزادی دیتا ہے اور انسان پر کسی پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اب تبدیلی مذہب کی اجازت سے متعلق آیات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

(1)oكَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَo أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَoخَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ oإِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌo(3/86.87.88.89)

o بھلا اللہ ایسے لوگوں کی کیوں کر ہدایت کرے گا جو ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گئے، حالانکہ وہ اقرار کر چکے تھے کہ پیغمبر

برحق ہے اور ان کے پاس واضح اور روشن دلائل بھی آ چکے تھے اور اللہ ایسے ہٹ دھرمی کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور سب لوگوں کی پھٹکار ہے اور وہ ہمیشہ اسی

پھٹکار میں رہیں گے نہ تو ان کے عذاب میں ہی تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی مگر ہاں جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اپنی خرابی کی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہےo

اس آیہ کریمہ میں مرتدین اور ان کی سزا کا نہایت واضح بیان ہو رہا ہے اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ان کی سزا اللہ و ملائکہ اور سب انسانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی لعنت مقرر فرما دی ہے۔ وہ ہمیشہ عذاب الٰہی میں رہیں گے۔ نیز انہیں توبہ واصلاح کا بھی موقع دیا گیا ہے کہ ان میں سے جو توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو یہاں اس کا بیان لعنت کے ساتھ ساتھ ضرور کیا جاتا۔ مزید یہ کہ ان کو توبہ کا موقع بھی نہیں ملتا توبہ واصلاح کا موقع تو جب ہی ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ رہیں اور قتل نہ کئے جائیں یہ آیت واضح طور پر قتل مرتد کے خلاف راہنمائی کرتی ہے، اور قتل مرتد کی مخالفت کرتی ہے۔

(2) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَo(3/90)

جو لوگ اپنے ایمان کے بعد کافر ہو گئے، پھر اپنا کفر بڑھاتے چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ اور یہی لوگ گمراہ ہیںo

اس آیت میں بھی ان کے قتل کی بجائے یہی فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ نیز آیت کا یہ حصہ کہ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا، پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے خصوصی طور پر قابل غور ہے۔ یعنی وہ مرتد ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ وہ کفر میں بڑھتے ہی چلے جائیں۔ اگر وہ ارتداد کے بعد قتل کر دئے جاتے، تو کفر میں اضافہ کرتے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(3) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًاo(4/137)

جو لوگ ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر

ہو گئے اور پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو نہ اللہ ان کی مغفرت کرے گا اور نہ اُنہیں راہ راست کی ہدایت ہی کرے گاo

یہاں صرف ایک بار مرتد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دو بار مرتد ہونے کا تذکرہ ہے۔ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو کوئی دو بار مرتد کیسے ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی ان کے متعلق یہ حکم نہیں دیا گیا کہ اُنہیں قتل کردو بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی بخشش نہیں ہوسکے گی۔

(4) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (5/54)

اے ایمان والو، تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب ہی اللہ ایسے لوگوں کو ظاہر کردے گا جنہیں اللہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ ایمان والوں کے ساتھ منکسر اور کافروں کے ساتھ سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی کچھ پروا نہ کریں گے۔

اس آیت میں خود مرتد کا لفظ استعمال کرکے اس معاملہ کو بالکل ہی واضح فرمادیا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام چھوڑتا ہے تو بے شک چھوڑ دے وہ اسلام کا کچھ نقصان نہیں کرسکتا۔ مومنین کو حوصلہ اور تقویت دی جارہی ہے کہ کسی کے مرتد ہونے پر پریشان نہ ہوں، اگر کچھ لوگ اسلام چھوڑ بھی دیں تو ان کی جگہ ایسے لوگ مسلمان ہوجائیں گے، جو مومنانہ فضائل کے حامل ہوں گے۔ یہاں بھی قتل کا کوئی تذکرہ دور دور تک نہیں ہے۔

(5) مَن كَفَرَ بِاللَّهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌo(16/106)

اس شخص کے سوا جو (کفر پر) مجبور کیا جاوے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن

ہو۔ جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے گا بلکہ خوب سینہ کشادہ (جی کھول کر) کفر کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ٥

اس آیہ کریمہ میں بھی ارتداد کی سزا خود غضب الٰہی کا نزول اور آخرت کا عذاب مقرر فرمادی گئی ہے، لیکن قتل کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ قرآن کریم اس معاملہ میں کس درجہ واضح موقف رکھتا ہے۔ اصل بات تو یہی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک ارتداد کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ اسی لئے جو حضرات علماء کرام ارتداد کی سزا قتل بتاتے ہیں وہ بھی اپنے نظریہ کی تائید میں قرآن کریم سے ایک آیت بھی پیش نہیں کر سکتے۔ ان کا سارا دارومدار صرف دو روایات پر ہے۔

ارتداد کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک اہم بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے ہم آج اس مسئلہ کو مذہب کی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام جو ارتداد کی سزا قتل مقرر کر رہے ہیں وہ بھی اس مسئلہ کو مذہب کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ صدر اول میں یہ معاملہ دین کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وقت جو مرتد ہوتا تھا وہ حکومت کے خلاف بغاوت ہی کرتا تھا۔ اس وقت ارتداد اور بغاوت لازم وملزوم تھے۔ اُس وقت ارتداد کے معنی صرف مذہبی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی تھی بلکہ ارتداد کے معنی اسلامی حکومت کو تبدیل کرنے کے ہوتے تھے۔ اور مرتد حکومت کا باغی ہوتا تھا اس لئے اس کی سزا قتل تھی۔ اسی وجہ سے ہماری فقہ میں ہے کہ اگر عورت، یا نابینا، یا معذور وضعیف مرتد ہو جائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ارتداد میں قتل کی اصل وجہ ارتداد نہیں بلکہ بغاوت تھی۔ اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ اب دین کا تصور تو دور دور تک نہیں ہے۔ لیکن ارتداد کی جو سزا دین میں تھی یعنی حکومت سے بغاوت کی سزا، ہمارے علمائے کرام اس پر اصرار کرتے چلے آ رہے ہیں۔

عیسائیت میں بھی اس قسم کے حالات پیش آتے تھے۔ انگلستان میں TUDOR اور STUARTS کے زمانہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی شدید مخالفت تھی۔ وہاں اکثریت پروٹسنٹ کی تھی۔ وہاں جو شخص کیتھولک ہوتا تھا تو اس کے معنی صرف یہ نہیں تھے کہ اس نے

اپنا مذہب بدل لیا، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کی ہمدردی اپنی حکومت سے بدل کر فرانس اور سپین سے ہو جاتی تھی، جو اس وقت اس مذہب کے مرکز تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں تبدیلی مذہب کی سزا زیادہ سخت تھی۔ اب ایسی صورت نہیں ہے۔ مذہب تبدیل کرنے سے حکومت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح ہمارے ہاں صدر اول میں ہوتا تھا۔ روایات میں جو مرتد کی سزا کا ذکر آتا ہے اس کی اصل وجہ ارتداد نہیں بلکہ حرابہ ہوتی تھی۔ بہر حال قرآن کریم کی رُو سے ارتداد کوئی جرم نہیں ہے۔

آزادی مذہب و تبدیلی کے بارے میں آپ نے بالترتیب 7 عدد، 5 عدد، آیات ملاحظہ فرمائیں جس سے قرآن کریم کے موقف کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے اور مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک آیت ایسی حُجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اس کا نقل کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ آیہ کریمہ انسانی جان کی قدر و قیمت اور حفاظت و صیانت کو بطور ایک اصول کے پیش کرتی ہے اور اس میں قتل کی سزا کا اس طرح ذکر کر دیا ہے کہ یہ رجم کے عقیدہ کی بھی تردید کر دیتی ہے۔ یہ امر واقعہ صرف ایک اتفاق پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے عالی مرتبت علماء اہل قرآن کی توجہ اس آیہ کریمہ کی طرف منعطف نہیں ہوتی، یا کم از کم راقم سطور کی کوتاہ نگاہی کے باعث وہ راقم سطور کے زیر مطالعہ نہیں آئی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً (5/32) تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس کا ترجمہ تحریر ہے ''جس کسی نے قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا'' حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے ترجمہ فرمایا ''جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض ایک جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو''۔ تمام تراجم اسی طرح ہیں اور واضح ہیں کوئی ابہام نہیں ہے میں اس کا ترجمہ مزید آسان اور واضح عرض کرتا ہوں، ''جو کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو، اور نہ ہی زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو۔ تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔ یہ آیہ کریمہ بطور ایک واضح اصول

کے نہایت روشن و درخشندہ ہے۔اس آیہ کریمہ میں کسی ایک فرد کے قتل کرنے کو ساری انسانیت کے قتل کے مرادف بیان کیا گیا ہے اور یہ قتل کی حد درجہ مذمت کر رہی ہے اس سے زیادہ پُر زور FORCEFUL انداز شاید ہی کوئی دوسرا ہو سکے۔لیکن کسی کو بھی قتل نہ کرنے کے سلسلہ میں یہاں صرف دو استثناء(EXCEPTIONS) بیان کی گئی ہیں ایک تو قاتل کو قتل کے بدلہ میں قتل کرنے کی اجازت ہے(6/153)اور دوسرے باغی کو قتل کرنے کی اجازت ہے(5/53)اس آیت کی یہ دونوں رُخصتیں (اجازتیں) آیات (5/33-6/153) میں بھی ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔اس کے علاوہ اور کسی حال میں بھی، کسی جرم کے بدلے، کسی فرد کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔اس آیت نے ایک ایسا حصار قائم کر دیا ہے کہ جس کو کسی حال میں توڑا نہیں جا سکتا۔اس آیہ کریمہ کے پیش نظر ان دو افراد (قاتل و باغی) کے علاوہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے فلہذا مرتد و زانی کا قتل کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔اس آیہ کریمہ سے قتل مرتد اور رجم دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

ماہ اگست 2006ء

سعودی علماء کی پارسائی پر ڈیلی ٹائمز کا تبصرہ

پاکستان میں مذہب کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ چونکہ ہر ملک کا میڈیا، ملکی حالات کا آئینہ ہوتا ہے، ہمارے ہاں بھی میڈیا پر مذہب پوری طرح مسلط ہو گیا ہے۔ ٹی وی کے تمام چینلز مذہبی پروگرام نشر کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کی کوشش کر رہے ہیں۔ بقیہ یہی حالت پریس کی ہے۔ ہمارے ہاں جس قدر ادبی علمی فکری رسالے جاری تھے۔ وہ تقریباً سب بند ہو گئے ہیں۔ صرف چند رسالے باقی ہیں۔ وہ بھی بمشکل جاری ہیں۔ کیونکہ لوگوں میں اس طرح کے رسالے مطالعہ کرنے کا رجحان ہی نہیں رہا۔ اخباروں کی بھی یہی حالت ہے۔ حتی کہ انگریزی اخبار بھی مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سارے ملک میں لے دے کے صرف ٹائمز ایک ایسا اخبار ہے جو LEFTIST ہے اور جو مذہب کے اثر سے باہر ہے۔ اس کے اداریوں میں، مذہب، مذہبی طبقہ اور مولوی حضرات کے غلط نظریات پر تنقید ہوتی ہے اور کے اداریے عموماً بہت متوازن ہوتے ہیں۔ 'صوت الحق' کے قارئین کو یاد ہوگا کہ اس کے اداریوں پر تبصرہ رسالہ ھذا میں کئی بار طبع ہو چکا ہے جو قارئین کرام نے بہت پسند فرمایا تھا۔ اس اداریوں میں زبان بہت معیاری اور TERSE ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کا ترجمہ کرنا، بہت اُکتا دینے والا کام ہوتا ہے مورخہ 10، اکتوبر 06 کے اخبار میں ایک SUB-EDITORIAL طبع ہوا ہے، چونکہ یہ تراشہ بہت مختصر ہے، اس لئے اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ وھو ھذا۔

سعودی (علماء کی) غیر ضروری پارسائی

سعودی عرب کے علماء نے عرب میڈیا کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ستاروں کے زائچے چھاپنے

بند کر دیں جو کہ عرب دنیا میں، علماء کی پابندی کے باوجود، بہت مقبول ہیں۔ علماء کرام کے نزدیک زائچے اور علم نجوم ناجائز ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ ان چیزوں کو عوام کے سامنے نہیں لانا چاہئے۔ بلکہ ان کو نماز اور دیگر نیکیوں کی ترغیب دینا چاہئے۔

ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک خاص ہیئت میں تبدیل کرنے میں سعودی علماء نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ہر جگہ لوگوں نے بڑی بڑی ڈاڑھیاں رکھنی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ آج کل ڈاکو بھی نہ صرف ڈاڑھی رکھنے لگے ہیں۔ بلکہ جب وہ کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالتے ہیں، تو اسباب کو لوٹنے کے دوران وہ مالک مکان کو نماز کا پابند رہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس صورتِ حال کے ذمہ دار سب سے زیادہ خود عرب کے علماء ہیں کیونکہ نہایت تنگ نظر اسلام کی تبلیغ کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں شہزادوں اور تجار سے ڈالرز ملتے ہیں اور یہ شہزادے اور تجار ان علماء کو اپنی سیاست میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے، مختلف اسلامی ممالک کی تہذیب و تمدن ان علماء کی یلغار کے سامنے دم توڑ چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے فرقہ وارانہ تشدد نے جنم لیا ہے۔ ہمارے اردو اخبارات کو چاہئے کہ علماء کی اس اپیل کی طرف توجہ نہ دیں، کیونکہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو زائچوں نے تباہ نہیں کیا ہے، بلکہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہی کچھ ہیں، اور علماء کرام خود اس زوال کا ایک حصہ ہیں (اداریہ ختم ہوتا ہے)

جہاں تک زائچوں کا تعلق ہے ہمارے نزدیک سعودی علماء کا موقف درست ہے، البتہ اخبار مذکور نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں خود علماء کرام کو بھی ایک بڑا سبب گردانا ہے، لیکن یہ کہ مسلمانوں کے زوال میں خود علماء کا کیا کردار ہے اخبار نے اس کی نشاندہی نہیں کی۔ صرف ان کی تنگ نظری پر ہی اکتفاء کیا ہے، لیکن ہمارے خیال میں تنگ نظری صرف ایک علامت ہے۔ اصل سبب یہ بھی نہیں ہے، اصل سبب کچھ اور ہی ہے۔ یہ بات ہر شخص کو بخوبی معلوم ہے کہ نہ تو مولویوں کی بارش آسمان سے ہوتی ہے، اور نہ ہی مولوی زمین سے اُگتے ہیں، اور نہ ہی یہ جنس عجیب کا سد کسی ملک سے IMPORT ہوتی ہے۔ ہم ہی اپنے بچوں کو مولوی بناتے ہیں پھر ان کے نظریات اور

اُن کی مختلف معاشرت کی وجہ سے ان سے بیزاری کرنے لگ جاتے ہیں لیکن اگر اس مسئلہ پر بالکل OBJECTLY غور کیا جائے تو اس میں سے چند پہلو خود بخود نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں پہلا پہلو مولویوں کی سیرت سے متعلق ہے، دوسرا ان کے خلافِ قرآن نظریات جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے، تیسرے ان کی موجودہ دور میں تشدد اور ان کی NUISASE VALUE۔

جہاں تک سابقہ علماء کرام کی پختہ سیرت کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں چند واقعات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند، سرسید احمد خان کے ہم عصر تھے۔ ساری عمر انگریزوں کے مخالف رہے اور ساری عمر مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی علمی ترقی کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ انہوں نے سخت نامساعد حالات کے باوجود دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اس زمانہ میں انگریزی عدالتوں میں سند یافتہ مولویوں کو بھی سٹاف میں رکھا جاتا تھا تاکہ وہ جج حضرات کو عربی کتابوں کے تراجم مہیا کرسکیں جن کو بنیاد بنا کر وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ مولوی محمد قاسم صاحب کو بھی ایک عدالت میں 75 روپے ماہوار کی مترجم کی پوسٹ پیش کی گئی، مگر مولوی صاحب موصوف نے اس کو قبول کرنے سے فوری انکار کردیا اور ساری عمر مطبع مجتبائی میں صرف 15 روپے ماہوار پر گذار دی جہاں وہ عربی کُتب کی پروف ریڈنگ کرتے تھے۔

مولانا میاں اصغر علی صاحب اپنے دور کے مشہور فقیہ اور دارالعلوم دیوبند میں علم الفرائض کے استاد تھے۔ ان کی تنخواہ (40) چالیس روپے تھی۔ جب دارالعلوم کے مالی حالات بہتر ہوئے اور وہاں اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا، تو میاں اصغر علی صاحب نے اضافی رقم لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ ان کا گذارہ 40 چالیس روپے میں بخوبی ہو جاتا ہے۔

مولوی لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، مشہور عالم اور سیاسی لیڈر تھے۔ اس دور کے حالات کے مطابق وہ کانگریس سے وابستہ تھے اور مولانا حسین احمد مدنی کے دستِ راست تھے۔ پانی پت میں بو علی شاہ قلندر کی ایک مشہور درگاہ تھی۔ اس درگاہ میں دور دور تک کے لوگ اپنے ذہنی معذور عزیزوں کو

چھوڑ جاتے تھے۔ بعض لوگ تو اس درجہ معذور ہوتے تھے کہ بالکل برہنہ گھومتے رہتے تھے، یہ اس درگاہ پر ایک طرح کی ASYLAM تھی جہاں محتاجوں اور معذوروں کی دیکھ بھال ہوتی تھی، اور ان کی نگرانی کے لئے لوگ مقرر تھے، جنہیں درگاہ کے وقف سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ مولوی صاحب چونکہ دیوبندی فکر سے منسلک تھے، اس لئے ان کا اس درگاہ سے کوئی عقیدتاً وابستگی نہیں تھی۔ لیکن جب تقسیم ہند ہوا اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، تو پانی پت سے بھی لوگ بذریعہ ٹرین پاکستان آنے لگے۔ قتل و غارت کی وجہ سے ہر شخص جان بچانے کے لئے وہاں سے جلد از جلد نکلنا چاہتا تھا، مولوی لقاء اللہ کو وہاں سے نکلنے کا موقع ملا لیکن انہوں نے اپنے گھر والوں کو تو روانہ کر دیا، لیکن وہ ان معذور، محتاج لوگوں کی وجہ سے رُکے رہے اور اپنی نگرانی میں تمام معذوروں کو آخری ٹرین میں سوار کرا کر پاکستان کے لئے روانہ کر دیا اور اس کے بعد بھی وہ پانی پت میں صرف اس وجہ سے ٹھہرے رہے کہ انہوں نے کئی سو مغویہ عورتوں کو پولیس کی مدد سے برآمد کرا کے پاکستان روانہ کیا اور کئی سو بوریاں قرآن کریم کے نسخوں کی جو مسلمان وہاں چھوڑ آئے تھے، پاکستان بھجوائیں اور وہ پانی پت میں بالکل تنہا فوت ہو گئے۔

محکمہ اوقاف جنوری 1960ء صدر ایوب خان کے حکم پر قائم ہوا اس سے پیشتر اوقاف کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ محض اوقاف بورڈ ہوتا تھا۔ محکمہ کے قیام کے کچھ عرصے بعد صدر ایوب کو لاہور آنا تھا۔ محکمہ اوقاف کے افسران کو خیال ہوا کہ محکمہ کے چند مشہور علماء کو ایئرپورٹ پر لے جایا جائے تاکہ وہ صدر ایوب خان کا استقبال کریں تاکہ محکمہ کی کارکردگی کا صدر صاحب کو علم ہو اور افسران بالا کے بھی نمبر بنیں۔ وہ اس سلسلہ میں مدرسہ اشرفیہ فیروزپور روڈ بھی گئے۔ مدرسہ اس وقت زیر تعمیر تھا۔ لیکن ''مسجد حسن'' بن چکی تھی اور اسی مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، شیخ الحدیث تھے درس دینے میں مصروف تھے۔ مدرسہ کے کسی کارکن نے جا کر مولانا کو اطلاع دی کہ محکمہ اوقاف کے چند افسران ان سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے اس کارکن کو ہدایت کی کہ ان افسران کو مسجد میں ہی لے آؤ۔ سردی کے دن تھے۔ محکمہ کے افسران بھی مسجد کے ایک گوشہ

میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ افسران نے اپنی آمد کا مدعا عرض کیا اور مولوی صاحب سے درخواست کی کہ کچھ وقت نکال صدر صاحب کو ائیر پورٹ پر RECEIVE کرلیں۔ اور انہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ سرکاری کار ان کو لے جائے گی۔ مولوی صاحب ایک دومنٹ بالکل خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ ہمارا صدر صاحب سے کیا تعلق، کہاں وہ، کہاں ہم فقیر لوگ، اس لئے انہوں نے قطعی طور پر معذرت کردی۔ افسران نے کہا کہ صدر صاحب علماء کرام سے مل کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ اگر صدر صاحب علماء سے مل کے خوش ہوتے ہیں، تو وہ یہاں تشریف لائیں۔ ہم اُن کا استقبال بھی کریں گے اور اپنی وسعت کے مطابق ان کی ضیافت بھی کریں گے۔ ہر چند کہ افسران نے مولوی صاحب سے اصرار کیا، لیکن انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے افسران کو ٹال دیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی خفیہ تحریک ریشمی رومال کے رُکن تھے اس تحریک کی مختلف پارٹیوں کے مابین ہزاروں روپوں کی TRASACTION کرائی۔ لیکن ان کی اپنی یہ حالت تھی کے اوکھلے کا علاقہ جو دہلی کے نواح میں ہے، وہاں سے جامع مسجد، دہلی، پیدل جاتے تھے، اور 4 آنے کا کرایہ ادا نہیں کرسکتے تھے۔ انگریزی حکومت چونکہ اس تحریک کی نگرانی کررہی تھی اس لئے وہ رومال گورنمنٹ نے شیخ عبدالرحیم کے پاس سے پکڑلیا۔ وہ اس وقت اس رومال کو ایک بوری کے اندرسی رہے تھے یہ شیخ عبدالرحیم اچاریہ کربلانی، صدر آل انڈیا کانگریس کے بڑے بھائی تھے۔ رومال پکڑے جانے کے بعد وہ شرمندگی کی وجہ سے روپوش ہوگئے تھے۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات علماء کی سیرت کے متعلق تحریر کئے جاسکتے ہیں۔ جب ہمارا معاشرہ خراب ہوا، تو اس میں ہر طبقہ ہی خراب ہوا۔ کیا ڈاکٹر اور کیا وکیل۔ ڈاکٹروں کا حال کسی کو معلوم نہیں، مریض کو پہلے درست دوا دے کر اس کو روبصحت کردیتے ہیں۔ پھر اس مریض کو چند روز لٹکائے رکھتے ہیں۔ پھر اس کی مالی حیثیت کے مطابق اس کا درست علاج کردیتے ہیں۔ یہی حال وکلاء کا ہے۔ دونوں طرف کی پارٹیوں سے رابطہ رکھتے ہیں جس سے زیادہ منفعت حاصل ہو

سکے، اس کا ساتھ دے دیا۔ معاشرہ جب رُو بہ انحطاط ہوا، اس میں ہم سب ہی لوگ انحطاط کی زد میں آئے۔ الا ماشا اللہ اور جو اپنے مقام پر جمے کھڑے رہے، وہ یقیناً قابل صد احترام ہیں۔ ہمارے علماء کرام یا مولوی حضرات کے بارے میں اصل چیز جو قابل غور ہے وہ ان کے خلافِ قرآن نظریات اور ان کا تعلیمی نظام ہے جس میں IN-BUILT اور INHERENT خرابی ہے۔ اس کے بارے میں غالب کا مصرع بالکل صادق آتا ہے کہ میری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ اس سسٹم کی تعمیر ہی غلط ہے۔ جب تک ہمارے علماء کرام ان نظریات کو نہیں چھوڑیں گے جن نظریات پر یہ سلسلہ قائم ہے، نہ ہی تعلیمی سسٹم درست ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہمارے علماء کرام کوئی تعمیری نتائج سرانجام دے سکتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ہمارے علماء مولوی حضرات جس طرح تھے وہ قابل برداشت تھے۔ لیکن جب سے مدارس میں TERROR شروع ہوا ان کی NUISANSE VALUE اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے مدارس میں جو تشدد و تخریب کاری آئی ہے اس میں ہمارے علماء کرام کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی محض سیاسی وجوہ کی بنا پر باہر سے ان پر IMPOSE کیا گیا ہے۔ علماء کرام کو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق کرنے، اور انہیں تعمیری کاموں میں فائدہ مند بنانے کے لئے چند اقدام نہایت ضروری ہیں

ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ قرآن کریم نے جو وعدے کئے ہیں وہ برحق ہیں۔ ان میں کسی خلاف ورزی کا امکان ہی نہیں ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ o(3/9) اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا o مذہب میں **توکل** کے معنی ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جانے کے ہیں، لیکن دین میں **توکل** کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ قرآنی اعمال کے نتائج وہی برآمد ہوں گے جن کا قرآن کریم نے وعدہ کیا ہے۔ قرآن کریم کے وعدوں پر جس درجہ بھروسہ ہوگا، اسی درجہ توکل میں پختگی ہوگی۔ قرآن کریم نے مومنین سے وعدہ فرمایا ہے کہ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ o(3/139) اگر تم مومن ہو، تو لازماً تم ہی بلند تر ہو گے o مزید ارشاد ہوتا ہے وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا o(4/141) اللہ کافروں کو مومنین پر غالب نہیں آنے

دے گا○ سیاسی غلبہ کے علاوہ معاشی خوشحالی کے بھی وعدے کئے گئے ہیں ۔○ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11/6)○ زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6/151) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔

سیاسی غلبہ اور رزق کی فراوانی کے لئے مزید آیات بھی ہیں لیکن اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے ان ہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان تمام وعدوں کے نتائج کیوں برآمد نہیں ہو رہے ہیں ۔ اور ہم اس درجہ ذلیل وخوار کیوں ہیں ۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے وعدے اس کے دین ، اس کے نظام سے وابستہ ہیں ۔ ذرا سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ہم رزق کی تقسیم اپنے وضع کردہ نظام کے مطابق کریں، تو اس کی اچھی یا بُری صورت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی وہ اللہ تعالیٰ پر عائد نہیں ہو سکتی ۔ یہ بات کہ نظام معشیت ہم اپنا جاری کریں اور توقع اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہونے کی کریں ، یہ بات سخت ناوانی اور خودفریبی کی ہوگی۔ منطقی نتیجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی سرفرازی وسربلندی کے سارے وعدے اس کے دین سے مَنُوط ہیں جو حضورؐ نے اپنے دور میں قائم فرمایا تھا اور دنیا نے اس کے خوشگوار نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ یہاں تک ایک بات مکمل ہوئی۔

ہمارے سابقہ علماء کرام جو خود مسلمان ملوک وسلاطین کے دور میں رہے، اور اس کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی میں رہے، وہ نظری طور پر تو دین کا ہلکا سا تصور رکھتے تھے۔ لیکن ان کا قیام دین پر اصرار نہیں تھا لیکن اب کچھ تو زمانے کے تھپیڑوں اور حالات کے تقاضوں نے مجبور کیا، اور اصل وجہ یہ ہوئی کہ علامہ اقبالؒ اور ان کے تتبع میں تحریک طلوع اسلام نے دین کے تصور کو، اور اس کے وجوب وفرضیت کو اس درجہ واضح اور روشن کیا کہ ہمارے علماء کرام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن وقت پھر وہی ہے کہ قیام دین کے قائل ہونے کے باوجود علماء کرام اس کو صحیح طریقہ پر قائم نہیں کر سکے۔ اور اس کی وجہ بھی بہت صاف ہے کہ دین کا نظام خلافت راشدہ

تک قائم رہا۔اوراس کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت کا غلبہ ہوگیا جس کی وجہ سے دین کا نظام منقرض ہوگیا اوراسلام بطور مذہب کے باقی رہ گیا، جوآج تک ہزار سال سے ہمارے ہاں مروج ہے۔

ہمارے علمائے کرام مذہب کی پیداوار اور اس کے نمائندے ہیں۔ان کا دین سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ان کے سارے نظریات وعقائد، رسومات واوہام سب مذہب سے وابستہ ہیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر مذہب پر قائم ہے۔تمام تفاسیر تمام کتب روایات کے ڈھیر مذہب کو تقویت دیتے ہیں۔دین کا نظام قائم کرنے اور قرآنی نتائج وثمرات سے متمتع ہونے کے لئے ہمیں اس ایک ہزار سال کے سارے لٹریچر کو خیر باد کہنا ہوگا۔جس کے لئے ہمارے علماء کرام کسی حال میں بھی آمادہ نہیں ہوسکتے۔اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ مذہب کا احیاء ہورہا ہے۔دین کا قیام نہیں ہورہا ہے۔یہ ہے وہ کشمکش جس جگہ آج ہم کھڑے ہیں۔اوراس کشمکش سے بخوبی نکلنے پر ہی ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔اور عملی طور پر دینی نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مولانا حضرات ہورہے ہیں۔

ہمارے ہاں علماء کرام کا اثر ہمیشہ سے رہا ہے اور موجودہ دور میں زیادہ ہوگیا ہے۔علماء کرام کے تعاون کے بغیر دینی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ہمارے علماء کرام کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی لائی جائے۔موجودہ مدارس جو بالکل فرسودہ نظام پر قائم ہیں اور جو مذہب کی تعلیم دیتے ہیں ان میں تبدیلی لائی جائے۔علماء کرام کو مذہب کے بجائے دین کا نمائندہ بنانا ہوگا۔ظاہر ہے کہ یہ ایک دودن کا کام نہیں ہے۔اس کے لئے برسوں درکار ہیں۔لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

ہمارے علماء کرام دینی نظام یا اسلامی حکومت کے لئے یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی مملکت کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق بنادیئے جائیں تو وہ اسلامی حکومت ہوجاتی ہے اوران کا زیادہ اصرار حدود وتعزیرات کے اجراء پر ہوتا ہے۔لیکن یہ بات واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے، اس طرح کی حکومت اسلامی نہیں ہوتی۔اسلامی حکومت کی تعریف (DEFINITION) میں یہ

لازمی شرط ہے کہ ایک زندہ اتھارٹی قرآن کریم کے قوانین جاری و نافذ کرتی ہے۔اور اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔اسلامی حکومت قرآنی قوانین نافذ کرتی ہے جو اقدامات لیتی ہے اور اس کے بارے جو فیصلے کرتی ہے وہ ہی سُنّت ہوتی ہے۔حضوؐر کے اپنے اور خلافت راشدہ کے دور کے قرآنی احکامات نافذ کرنے کے بارے میں جو اقدامات کئے گئے، اور اس بارے میں جو فیصلے ہوئے وہ سُنّت تھے اسی لئے حدیث میں حضوؐر کی سُنّت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سُنّت کو شامل کیا گیا تھا۔ علیکم بسنتي وبسنة الخلفاء الراشدين المهدیین ۔تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کی پیروی ضروری ہے۔اب جب بھی اسلامی حکومت قائم ہوگی، اس حکومت کے فیصلے مع سُنّت قرار پائیں گے۔ہم مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے نکالنے کا واحد حل دین کا قیام ہے جس سے سارے قرآنی وعدے پورے ہونے لازمی ہیں۔جس میں سیاسی غلبہ و رزق کی فراوانی ہوگی اس کے علاوہ جو عیوب واسقام ہمارے اندر مذہب کی وجہ سے بار پا گئے ہیں، وہ بھی دین کے قیام سے از خود دور ہو جائیں گے۔

(1) ہمارے ہاں فرقہ بندی صرف مذہب کی بناء پر ہے۔اگر دین کا قیام ہو جائے تو فرقہ بندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔دینی نظام میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق نہیں ہوتی یہ تفریق مذہب میں ہوتی ہے۔اسلامی حکومت میں ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے، اور ہر مسلمان کو اس کی اطاعت کرنی ضروری ہوتی ہے۔اسلامی حکومت خود نماز، روزہ کے اوقات، نکاح و طلاق اور جملہ عائلی قوانین اور سارے پبلک قوانین جاری کرتی ہے۔اس میں فرقہ کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔البتہ غیر مسلم حضرات کا معاملہ اس سے دیگر ہے۔

(2) اسلامی حکومت کے قوانین ہی اس حکومت کی فقہ و شریعت ہوتے ہیں۔اسلامی حکومت ،قرآن کریم کی روشنی میں، آپس کے باہمی مشورے سے، روزمرہ کی ضرورت کے مطابق ،قوانین وضع کرتی چلی جاتی ہے، اور یہی اسلامی اجتہاد کہلایا جاتا ہے۔واضح رہے کہ دین میں اجتہاد حکومت کرتی ہے انفرادی اجتہاد مذہب میں ہوتا ہے۔سابقہ ایک ہزار سال پیشتر کے وضع کردہ قوانین، آج

کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے ، ہماری مذہبی پیشوائیت میں ،قدامت پرستی وجمود اس وجہ سے ہے کہ یہ سابقہ قوانین جاری کرتی ہے ۔ موجودہ دور کے مطابق قوانین بنانے سے ہمارے موجودہ دور کے علمائے دین میں روشن خیالی پیدا ہو سکتی ہے اور ہمارے علماء اسی طرح روشن خیال ہو جائیں گے جس طرح آج کے بیرسٹر اور وکلاء صاحبان اور جج حضرات ہوتے ہیں ۔

(3) سُنّت کی اس تعریف سے جو اوپر تحریر کی گئی ہے ۔ ہمارے مذہبی طبقہ کی معاشرت بالکل تبدیل ہو جائے گی ۔ ہمارے علماء کرام نے عربی معاشرت کو ، اور خصوصاً اس دور کی عربی معاشرت کو ، دین کا جزو بنا رکھا ہے یہ قرآن کریم کی اقدار پر کم ، اور عربی معاشرت پر زیادہ اصرار کرتے ہیں ۔ ہم میں سے جو شخص بھی مذہب کی طرف راجع ہوتا ہے وہ فوراً ایک خاص وضع کی ہیئت کذائی بنا لیتا ہے ۔ ڈاڑھی رکھنا ضروری سمجھتا ہے ۔ مسواک کرنا ، لمبے کرتے ، اونچے پاجامے عمامے ، استعمال کرنا سُنّت خیال کرتا ہے ۔ اس سے معاشرہ میں یبوست و ضیاقت پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ بالکل جامد STATIC ہو کر رہ جاتا ہے اور ڈیڑھ ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے ۔

(4) اس زمانہ کے تقاضے کے مطابق ہم مسلمانوں کے لئے اہم ترین بات رواداری اور حسن سلوک کا پابند ہونا ہے ۔ خود مسلمانوں میں باہمی طور پر بھی ۔ اور خصوصاً غیر مسلموں کے ساتھ ۔ آج دنیا کے مہذب ممالک بظاہر مطمئن اور پُر سکون دکھائی دے رہے ہیں ۔ اگرچہ وہ ہم سے تو بہتر ہیں ، لیکن ان کے معاشروں میں بھی زندگی پُر سکون نہیں ہے ۔ ان کے اندر رہ کر اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ امریکہ اور دیگر نام نہاد مہذب ممالک کی جیت (ADVANTAGE) یہ ہے کہ انہوں نے ٹیکنولوجی پر قبضہ کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ، ان سے حد درجہ فائدہ اٹھالیا ہے ، جس کی وجہ سے وہ دیگر اقوام کے مقابلہ میں طاقتور ہیں ۔ ورنہ جن اقوام میں HOMOSEXUALITY ۔ لواطت و سحاقت جیسے شنیع و مذموم افعال جائز ہوں ، ان کا تہذیب سے کیا تعلق ، اور ان کا اقدار VALUES سے کیا علاقہ ۔ ان کے مقابلہ میں ہماری اقدار نہایت اچھی ، بلند اور پُر کشش ہیں ۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ان اقدار کو ان تک

PEACEFULLY پہنچایا جائے جس میں تشدد VOILENCE استعمال نہ کیا جائے۔ پھر آپ دیکھیں کہ کیسے عمدہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن کریم اسلام کی طرف دعوت دینے والوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف حکمت وموعظت، دلائل وبراہین کے ساتھ دعوت دے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (16/125) (اے پیغمبر) (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور بحث ومباحثہ کرو بھی تو ایسے طریقے سے جو (لوگوں کے نزدیک سب سے اچھا ہو) داعیان اسلام کو چاہئے کہ وہ غیر مسلموں کے علم وبصیرت اور دانش وبینش کو اپیل کریں اوراس طرح ان کو ان حقائق کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ کریں۔ قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (12/108) اے رسول ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں کو) اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے متبعین (دونوں) مضبوط دلائل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ ہم نے غلط اور خلاف قرآن راستہ اختیار کرکے، تشدد کو جو اپنا شعار بنالیا ہے یہ ہمارے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہورہا ہے۔ اوراس کے نقصانات مزید پریشان کن برآمد ہوں گے۔ ہمیں تشدد کی بجائے تمام انسانیت کو قرآن کریم کے اس نظریہ سے آگاہ کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے دنیا کو وحدتِ خلق کی بلند ترین حقیقت اوراحترام انسانیت کے روشن ترین اصول سے روشناس کرایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کی بڑی قدر وقیمت ہے اور کسی کی جان لینا اس کے ضابطہ آئین میں عظیم ترین جرم ہے۔ انسانی زندگی کی قدر وقیمت کو ظاہر کرنے کے لئے اس نے ایسا جامع اور پُرکشش بیان اختیار کیا ہے کہ جس سے ایک طرف وحدتِ خلق کا عالمگیر اصول واضح ہوجاتا ہے تو دوسری طرف تشدد اور قتل ناحق کے خلاف سخت ترین سرزنش وعتاب کا پہلو ظاہر ہوجاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا (5/32) جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں، نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (بلکہ ناحق) قتل کرڈالے گا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کرڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے

مطابق تو مسلمان کی یہ حالت ہونی چاہئے کہ کسی کے خلاف ناحق ہاتھ اور تشدد کرنا تو بڑی چیز ہے وہ تو غیر مذاہب کے لوگوں کی گالی کا جواب بھی گالی سے نہیں دے سکتا۔ o وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (6/108) o یہ مشرکین جن کی اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں انہیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی اللہ کو بے سمجھے عداوت سے برا کہیں گے۔

غیر اسلامی حکومتوں میں اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری چند رسوم میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ حکومت صرف حیوانی سطح کی زندگی کے مسائل حل کرتی ہے۔ یہ حکومتیں، روٹی، کپڑا، مکان، ملازمت وغیرہ قسم کے مسائل بخوبی حل کرتی ہیں لیکن قرآن کریم کا موضوع حیوانی سطح کی زندگی نہیں ہے اس کا تو موضوع بھی یہی ''انسانی زندگی'' ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم نے ''حیوانی سطح'' کے متعلق قطعاً کوئی ہدایت نہیں دی۔ حیوانی زندگی، انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں ہدایت نہیں دی کہ سردی میں گرم کپڑے استعمال کرو اور گرمی میں ٹھنڈے کپڑے، کھانا، پینا جو ہمارے روز کے معمولات ہیں، جن کا تعلق حیوانی زندگی سے ہے، اس کے متعلق قرآن کریم نے کوئی ہدایت نہیں دی کہ کس طرح ان کو تیار کیا جائے۔ جس کا دل چاہے گھی استعمال کرے اور جس کا دل چاہے مکھن۔ لیکن قرآن کریم نے یہ حکم دے دیا کہ جو شخص بھی گھی استعمال کرے وہ جائز ذرائع سے حاصل کردہ ہو نا جائز ذرائع سے حاصل کردہ گھی انسانی زندگی کو نقصان دے گا۔ قرآن کریم کا موضوع ''انسانی زندگی'' ہے۔ اسی لئے اسلامی حکومت کا تعلق بھی خالص انسانیت سے ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت ان مسائل کا حل پیش کرتی ہے جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہوتا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے ایک اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں۔ اسلامی حکومت دنیا میں مقاصد خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑی سیاست ہے ان لوگوں کے لئے جو اس طرح مقاصد خداوندی کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس زمرہ میں شامل فرمائے۔

اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا اولین مقصد انسان میں وہ استعداد پیدا کرنا ہے جس

کے ذریعے یہ ارتقاء کی اگلی منزل طے کر سکے۔اس طرح کی استعداد پیدا کرنے میں اسلامی حکومت کس طرح ممدومعاون ہوتی ہے،اور حیوانی وطبعی سطح کی زندگی،اس میں کیا کردارادا کرتی ہے،یہ ایک خالص علمی مضمون ہے،جوشاید قارئین کی دلچسپی کا موجب نہ ہو۔ہاں اگر قارئین کرام نے حکم فرمایا تواس موضوع کی وضاحت کردی جائے گی۔یہ موضوع خودایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

مملکت مارا اساس دیگر است　　　این اساس اندر دل ما مضمر است

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَo

ماہ مارچ 2007ء

اللہ ورسول کی پکار اور اس کے جواب کا صحیح مفہوم

مومن صرف اور صرف وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ، واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات اور آخری دین تسلیم کرے، اسی لئے ہر مومن کا فرض عین ہے کہ وہ اس دنیا میں دین الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے، وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جہد وجہد کو شروع کردے، کیونکہ دین خداوندی کسی قیام یا کسی دور سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ وہ تمام نظام ہائے حیات کو جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر صرف اللہ کے قانون اور اس کے دین کو جاری کرے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از حد ضروری ہے کہ اُن کا دیا ہوا دین جاری کریں۔ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے نظام یا دین کے علاوہ کسی بھی اور دین کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے باغی، عاصی، نافرمان اور مجرم ہیں (6/122) خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں اور کتنے ہی درود وظائف ادا کرتے ہوں۔ دین صرف وہ ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور قرآن کریم کے چھوڑنے سے ہی دین چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی دین سے تمسک صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب ہم یہ باور کرلیں کہ دین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت ہیں۔ دین قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اسی خالص دین کا اتباع کرنے سے صدر اول کے مسلمانوں نے عروج واقبال حاصل کیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد اسی کو ترک کرنے سے اُنہیں زوال و ادبار سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس دین پر عمل کرنے سے ہر مردہ قوم زندہ ہو

سکتی ہے شرط صرف اتنی ہے کہ اس دین پر پورا پورا عمل کیا جائے اور اس میں غیر قرآنی نظریات کی آمیزش نہ کی جائے اور اگر اس طرح اس کی تعلیم پر عمل کیا جائے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ قوم زندہ اور دیگر اقوام پر غالب نہ آ جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ o(3/9) اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا o آج اس مضمون کا یہی موضوع ہے۔ لیکن اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے سے پیشتر چند ضروری گذارشات بطور تمہید کے پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے ''سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا'' یعنی ''سماعت واطاعت''، لازمی وملزوم ہیں۔ یعنی اطاعت الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے احکامات جاری ہوں، پھر سب مسلمانوں اُن احکامات کی اطاعت کریں اس خیال سے کہ قرآن کریم کا یہ نادر اور اساسی نقطہ نظر قارئین کرام کے اذہان عالیہ میں مُرتسم ہو جائے، اس کی تائید میں (4) آیات کریمات یکجا تحریر کی جاتی ہیں۔

(1) وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ o(5/7)

اور جو احسانات اللہ نے تم پر کئے ہیں ان کو اور اس عہد کو یاد کرو جس کا تم سے پکا اقرار لے چکا ہے، جب تم نے یہ کہا تھا کہ ہم نے (احکامات اللہ کو) سُنا اور مان لیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید سے باخبر ہے o

(2) كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ o(2/285)

مومنین بھی سب کے سب اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر ایمان لائے (اور کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اے پرور دگار ہم نے سنا اور مان لیا، ہم تیری مغفرت کی خواہش کرتے

ہیں، اور تیری ہی طرف لوٹ کے جانا ہے

(3) یا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَo(8/20)

o اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب تم سن رہے ہوo

(4) إِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِینَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ أَن یَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَo(24/51)

o ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کردیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سُنا اور مان لیا، اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیںo

مندرجہ بالا چار آیات کریمات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ اطاعت کرنے سے پیشتر احکامات الٰہی کا سُننا، لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سماعت و اطاعت آپس میں اس طرح لازم وملزوم ہیں کہ اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا لازمی ہے کہ جو احکامات جاری کرے اور مومنین اس کے احکامات کو سُن کر اس کی اطاعت کریں۔ اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت شمار کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں اس موقر جریدہ میں اس قدر مضامین تحریر کئے گئے ہیں کہ ان کو بار بار دُہرانے سے قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ (اس کے لئے کمترین کا مضمون اساس محکم اکتوبر 2004ء صوت الحق میں ملاحظہ فرمائیں) ان سب مضامین میں بے شمار آیات کریمات سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ "اللہ و رسول" کے الفاظ قرآن کریم کی اپنی وضع کردہ اصطلاح ہے جس کے معنی اسلامی حکومت کی فائنل اتھارٹی، اسلامی حکومت کا مرکز، امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، صدر مملکت، یا جو نام بھی آپ اس کا تجویز فرمالیں۔ اس سے وہ مراد ہے، وہ ایک ایسی اتھارٹی ہوتی ہے کہ جو قرآن کریم کے احکامات کو نافذ کرتی ہے، خود ان احکامات کی اطاعت کرتی

ہے، اور مومنین سے اس کی اطاعت کراتی ہے۔ اس کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ اس نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے بلکہ انسان کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے صرف اس نظام کی معرفت ہی قائم ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق قائم رکھنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی رُو سے اللہ اور بندے کا ذاتی، نجی، پرائیویٹ تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کا تعلق صرف مذہب اور دھرم میں قائم ہوتا ہے۔ دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین میں اللہ تعالیٰ اور بندے کا پرائیویٹ تعلق قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ اللہ ورسول کے معنی فائنل اتھارٹی کے ہوتے ہیں، اس کے لئے آپ اپنے نسخوں میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں (3/172-4/100-5/33-8/13-9/1-9/3-33/57-59/4-59/8)

یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم کہ جس میں پہلے احکامات خداوندی کو براہ راست سربراہ مملکت سے سُننا اور پھر اس کے احکامات پر عمل درآمد کرنا تھا۔ اس طرح نظام کا قیام لازمی اور لابدی ہو جاتا ہے۔ اور اس اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیا جاتا ہے، اور اس طرح اللہ ورسول کی اطاعت ایک ہی اطاعت شمار ہوتی ہے، لیکن ہم مسلمانوں کی بدبختی کہ ہم نے ان واضح آیات کے باوجود ''سماعت'' کی شرط کو جو کہ اطاعت کے لئے لازمی قرار دی گئی تھی، درمیان سے نکال دیا۔ جس کی وجہ سے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت بھی لازمی نہیں رہی اور صرف ایک لفظ کے محو (ignore) کرنے سے قرآن کریم کی ساری تعلیم کی عمارت خود بخود منہدم ہوگئی۔ اب اطاعت الٰہی کو سربراہ حکومت کی واحد اطاعت کے بجائے، دو اطاعتیں قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذریعہ قرآن کریم، اور حضورؐ کی اطاعت کا ذریعہ روایات قرار دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آیات جو نظام اسلامی کو پیش نظر رکھ کر، معمولی غور کرنے کے بعد، صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں، وہ نظام کے تصور کو نکال دینے کے بعد کسی طرح بھی صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اور قرآن کریم کی بے شمار آیات چیستان بن کے رہ گئیں۔ اس سلسلہ میں صرف مثال کے طور پر ایک آیت کریمہ جو دو فرقوں میں تنازع کا باعث بنی رہی ہے، اور آج تک کوئی حتمی مفہوم سامنے نہیں آسکا، پیش کی جاتی ہے، یہ

سورۃ النساء کی مشہور آیت ہے۔ ٥یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللَّهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (4/59)٥اے ایمان والوں اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان اختیار ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو، پس اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر کو اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو۔ اس آیت کریمہ کا مطلب اسلامی نظام کو سامنے رکھتے ہوئے تو بہت واضح ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت کرو (أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ) اور أُولِي الْأَمْرِ یعنی مقامی حکام کی بھی اطاعت کرو اور اگر تمہارا اور مقامی حکام کا کسی بات میں تنازعہ ہو جائے تو اس متنازع فیہ امر کو مرکزی حکومت (CENTRE) کی طرف (REFER) کردو، اس لئے کہ مرکزی حکومت کا فیصلہ حتمی فیصلہ ہوگا اور اس طرح ملک میں کسی قسم کی انارکی (نوضویت) نہیں رہے گی۔ لیکن اسلامی نظام کو درمیان سے نکال دینے کے بعد جو اس کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے مباحث اس درجہ پیچیدہ اور متضاد ہیں کہ یہ مختصر سا مضمون ان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس آیت کریمہ کا حوالہ صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک تو یہ اندازہ ہو سکے کہ جو آیات فٹ ہی نظام کے تصور سے ہوتیں ہیں وہ اس تصور کے نکال دینے کے بعد پھر کس قدر اُلجھن کا باعث بنتی ہیں۔ اور دوسرے یہ بات عرض گزار کرنی مقصود ہے کہ اس آیت کریمہ میں تمام مفسرین کرام نے أُولِي الْأَمْرِ کا ترجمہ ایسا کیا ہے کہ جس کے مفہوم میں اقتدار و اختیار ضروری ہوتا ہے شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ اختیار والے کیا ہے۔ أُولِي الْأَمْرِ کے لئے تو غلبہ و اختیار ضروری قرار دیا ہے لیکن اللہ و رسول کے لئے غلبہ و اقتدار شرط نہیں قرار دیا اس کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ ہر متنازعہ فیہ یا مختلف فیہ مسئلہ کو قرآن و روایات کی طرف (REFER) کردو اور جو کچھ قرآن و روایات سے اس کا فیصلہ ملے اس پر عمل کرلو۔ لیکن قرآن و روایات سے تو آج تک چودہ سو سال میں کسی ایک مسئلہ کا حل بھی نہیں ملا۔ بلکہ اس طریقہ کو اپنانے سے مزید اختلافات بڑھتے ہیں اور اسی لئے مخالف بھی برابر چلے آرہے ہیں۔ لیکن یہ سب تباہی و بربادی صرف 'ساعت' کی

شرط کو درمیان سے نکال دینے سے واقع ہوتی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ یہ مفسرین عظام اُوْلِی الْاَمْرِ کے لئے تو اقتدار ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن اللہ و رسول کے لئے اقتدار کو شرط قرار نہیں دیتے، جس کا عملاً مفہوم اسلامی حکومت کا سربراہ ہوتا ہے۔ اسی کے ماتحت اُوْلِی الْاَمْرِ ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ قرآن کریم میں اللہ و رسول کے معنی اسلامی حکومت کے سربراہ کے ہیں، اصل موضوع کی طرف مراجعت کی جاتی ہے۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ o یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ (8/24) o اے ایمان والوں لبیک کہو اللہ و رسول کی آواز پر جب وہ تمہیں پکارے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندہ کر دے۔ یہ آیت کریمہ مردہ قوم کو زندہ کر دینے کے اس دعویٰ پر مشتمل ہے کہ جو قوم اللہ و رسول کی پکار کا جواب دے گی، اسے یقیناً یقیناً زندگی حاصل ہو جائے گی۔ آیت کریمہ جس قدر اہم اور توجہ کی متقاضی ہے، اسی قدر مختصر اور مُوجز ہے۔

اس آیت کریمہ میں اصل کام اللہ و رسول کی پکار اور اس کے جواب دینے کے طریقہ کا تعین کرنا ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کا صحیح تعین ہو جائے اور پکار کا صحیح طور پر جواب دے دیا جائے تو وعدہ الٰہی کے مطابق زندگی کا حصول ایک لازمی امر ہے۔ لیکن اگر نہ تو پکار کا ہی صحیح مفہوم سمجھا جائے اور نہ ہی اس کا صحیح طریقہ پر جواب دیا جائے، تو پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں جس قدر لٹریچر قرآن کریم کی تفاسیر پر مشتمل ہے، اس میں اس آیہ کریمہ کو اس نقطہ نگاہ سے حل ہی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس آیہ کریمہ کے ذیل میں اہم کام ہی یہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہماری تفاسیر میں یہ بات پیش نظر نہیں رکھی گئی، اس کی کیا وجہ ہے، وہ مضمون کے آئندہ حصہ میں آتی ہے فی الحال چند چند تفاسیر کے اقتباسات پیش خدمت کئے جاتے ہیں جن سے قارئین کرام کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں تفاسیر کس درجہ اپنے دور، اور ملوکیت کے اثرات کے ماتحت تھیں۔ اور کس طرح صحیح مفہوم سے اعراض کیا جاتا تھا۔ اور موجودہ تفاسیر بھی انہیں کا چربہ ہیں۔

(1) مشہور تفسیر تدبر قرآن میں تحریر ہے ''چنانچہ قرآن نے کفار کو جگہ جگہ مردہ کہا ہے۔

اللہ ورسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہوتی ہے۔ اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق وانفس کے اسرار حقائق سے اس کے لئے پردے اٹھاتا ہے اس سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس کو ایک **مُضغَۂ** گوشت سے تجلیات وانوار الٰہی کا آئینہ بنا دیتی ہے۔فرمایا کہ اللہ ورسول کی اس دعوت پر لبیک کہو،اس لئے کہ اسی سے تم کو حقیقی اور جاوداں زندگی حاصل ہوگی (یعنی آخرت میں۔راقم سطور) جلد 3 صفحہ 458۔

(2) ''یہ دعوت اس دین کی دعوت ہے جو حیات ابدی کا پیغام ہے،اس پر لبیک کہو تاکہ توفیقات الٰہی تمہارے شامل حال ہو اور اگر تم نے روگردانی کی تو ایسا نہ ہو،کہ توفیقات تم سے سلب ہو جائیں۔'' فصل الخطاب جلد 3 صفحہ 415۔

(3) یعنی اللہ ورسول تم کو جس کام کی طرف دعوت دیتے ہیں (مثلاً جہاد وغیرہ) اس میں از سر تا پا تمہاری بھلائی ہے۔ان کا دعوتی پیغام تمہارے لئے دنیا میں عزت واطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیات ابدی کا پیغام ہے۔پس مومنین کی شان یہ ہے کہ اللہ ورسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں۔ جس وقت اور جدھر وہ بُلائیں،سب اشغال چھوڑ کر اُدھر پہنچیں۔تفسیر عثمانی،مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم۔

(4) ''سُدی نے کہا زندہ کرنے والی چیز سے مراد ہے ایمان کیونکہ کافر مردہ ہے۔قتادہ نے کہا قرآن کریم مراد ہے،اس سے زندگی،نجات،اور دونوں جہاں میں عذاب سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔مجاہد نے کہا حق مراد ہے،ابن اسحاق کے نزدیک جہاد مراد ہے۔جہاد کے ذریعے سے اللہ نے ذلت کے بعد عزت عطا فرمائی'' تفسیر مظہری جلد 5 صفحہ 49۔

آپ نے زیر نظر آیت کریمہ کا مفہوم مختلف چار تفسیر میں ملاحظہ فرمایا،ان میں سے کسی تفسیر نے نہ تو اللہ ورسول کی پکار کے مفہوم کو واضح کیا اور نہ ہی اس کا جواب دینے کے طریقے کو۔اور نہ ہی اس سے یہ مراد لی کہ اس طریقہ سے مردہ قوم زندہ ہو جاتی ہے۔ان کے ہاں قوم کی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔حالانکہ آیت کریمہ میں اللہ ورسول کی پکار اور اس کے جواب دینے پر اصرار

کیا گیا ہے اور اسی جواب دینے پر زندگی کا انحصار بیان کیا گیا ہے۔ کسی اتھارٹی کے لئے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اس میں تین باتوں (Pre.Requisites) کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اتھارٹی زندہ ہو، تمکن فی الارض کی حامل ہو، اور اس کا حکم سُنا جارہا ہو، تاکہ اس کا جواب دیا جائے۔ یعنی اس کی اطاعت کی جائے۔ زندہ اتھارٹی کی ضرورت کس درجہ لازمی ہے وہ مضمون کے ابتداء میں بھی عرض کیا گیا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ارشادات الٰہی، اور فرمودات نبوی دونوں میں ''سمع وطاعت'' کولازم وملزوم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی پہلے حکم سننا اور پھر اس حکم کی اطاعت کرنا۔ اس کے لئے چار آیات کریمات اوپر درج کردی گئی ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے فرمایا کہ **لااسلام الابجماعته ولا امیرالابالسمع والطاعة** ۔ اسلام نام ہے جماعت کا اور امیر اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے احکامات کو سُنا جائے اور پھر اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی لئے صدر اول میں کہ جس دور میں مسلمانوں کو غلبہ وتسلط حاصل رہا، اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور امیر کی اطاعت سے یہی مفہوم تھا۔ یہ الگ الگ اطاعتیں نہیں تھیں بلکہ یہی اطاعت الٰہی کا عملی طریقہ تھا۔

سابقہ توضیحات کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس آیت کریمہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب بھی اسلامی نظام کا سربراہ تمہیں کسی بات کا حکم دے تو اس حکم کو سننے کے بعد اس کی اطاعت بجالاؤ۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام کی اطاعت کرے اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ وہ مسلم قوم عزج واقتدار کے مراتب حاصل کرے گی۔ اصل یہ ہے کہ جب تک نظام باطل بنیادوں پر قائم رہتا ہے، اس میں قرآن کریم کے مطابق عمل کرنے کے باوجود قرآنی نتائج حاصل نہیں ہوسکتے، جو قرآنی نظام میں ازخود حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اور کوئی نظام نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا، اس لئے اس نظام کی کوئی مضبوط اساس ہونی ضروری ہے، علامہ اقبال نے اس مفہوم کو ایک ہی شعر میں ادا کردیا۔

گر تو میخواہی نظام عالمے   جستہ او را اساسِ محکمے

اسلامی حکومت کی اساس محکم ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی نظام کے قیام میں قرآن کریم نے مسلمانوں کی زندگی کا راز مُضمر رکھا ہے اسلامی حکومت کی تعریف (DEFINITION) ہماری ساری دنیا کے علماء یہی کرتے ہیں کہ ہروہ حکومت جس میں قرآن و روایات کے مطابق قانون تشکیل دے دیئے جائیں وہ اسلامی حکومت ہے لیکن قرآن کریم کی رُو سے یہ تعریف درست نہیں ہے، قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہی یہ ہے اور یہی عروۃ الوثقیٰ ہے جس کے سہارے وہ قائم رہتی ہے۔ اس آیت کریمہ کا مفہوم یہی ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اسلامی نظام قائم کرلیا اور اس کی اطاعت کو مقصد حیات مان لیا تو قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ مسلمان مردہ قوم کے بجائے زندہ اقوام میں شامل ہو جائیں گے۔

واضح رہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کا یہ مفہوم اس لئے نہیں لیا کہ ان کے ہاں نظام کا تصور محو ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اس آیت کریمہ پر اس نقطہ سے غور ہی نہیں فرمایا، یہاں اللہ ورسول کی پکار سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ کے احکامات کو پہلے سُننا اور پھر اس پر عمل کرنا (سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا) یعنی اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو مسلمانوں کو زندگی بخشتا ہے اور ان کو عروج واقتدار عنایت کرتا ہے۔

ماہ اپریل 2007ء

علماء کرام کی خدمت میں، تحریک طلوع اسلام کا اجمالی تعارف

صدر اول سے لے کر آج تک ہم مسلمانوں نے قرآن کریم کو ہی اپنا محور، مرکز اور عروۃ الوثقیٰ بنائے رکھا۔ اس طویل و عریض عرصہ میں صدہا علماء وفقہاء پیدا ہوئے اور سب نے نہایت نیک نیتی سے قرآن کریم پر کام کیا۔ صدہا تفاسیر تحریر کی گئیں اور پھر ہر دور میں قرآن فہمی، درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا۔ ہمارے برصغیر ہند و پاک میں بھی گذشتہ صدی میں قرآن کریم پر خوب کام ہوا۔ ہمارے مفسرین کرام نے اپنی اپنی صوابدید اور اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق بہتر سے بہتر تفاسیر پیش کیں۔ نہایت ذلت و پستی، زوال وادبار سے دوچار ہو جانے کے بعد، اب مسلمانوں میں ایک بیداری کی لہر ہر طرف موجزن ہے۔ سابقہ صدی میں مصر اور برصغیر پاک و ہند میں چند تحریکیں بھی اُٹھیں، اور قرآن کریم پر بھی بہت تحقیقی کام ہوا۔ ماضی قریب میں ایران میں ایک ایسی ہی ہمہ گیر تحریک پیدا ہوئی اور وہاں قرآن کریم پر بھی موجودہ دور کے مطابق تفاسیر رقم کی گئیں۔ پاکستان میں بھی ماضی قریب سے جو کام شروع ہوا، اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مختلف جماعتوں اور تحریکوں کے علاوہ یہاں تحریک طلوع اسلام نے بھی کام شروع کیا۔ اس تحریک کے بانی و داعی و منادیاً ینادی الاسلام، مشہور مفکر قرآن، غلام احمد پرویز تھے۔ جنہوں نے اس تحریک کو خالص قرآنی نظریات پر قائم کیا۔ انہوں نے تقریباً 50 سال رسالہ طلوع اسلام جاری رکھا اور تقریباً 50 کتابیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں تحریر کیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم مسلمان قرآن کریم کو مرکز و محور قرار دیتے ہیں لیکن جب بھی کہیں سے خالص قرآن کی آواز بلند ہوئی، مسلمانوں نے ہی اس کی مخالفت کی، سرسید اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت ہوئی۔ ان پر کفر کے فتوے لگے، پرویز صاحب نے بھی خالص

قرآنی نظریات بیان کیے، لیکن ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ، اور ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے، خود ہمارے علماء کرام کے زیادہ نظریات قرآن کے خلاف ہوتے چلے گئے، اس لئے خالص قرآنی نظریات کی اشاعت و ترویج سے ان کے اپنے نظریات کی تردید ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ بات اُن کو ناگوار گذرتی ہے اور اس کے ردِعمل میں وہ نہ صرف ان نظریات کو عام نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ اس داعی قرآن کے خلاف بھی طرح طرح کے الزامات و غلط افواہیں عام کرتے رہتے ہیں۔

تحریک طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب کے سلسلہ میں بھی ہمارے علمائے کرام کا یہی رویہ رہا ہے۔ ہمارے علماء کرام کے بیشتر طبقے نے پرویز صاحب کی کوئی کتاب مطالعہ کئے بغیر ہی ان کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا ہے۔ اس مضمون کا مقصد ان کتابوں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ کام کسی بہت بڑے عالم کا ہے کہ وہ ان کی کتب پر تبصرہ تحریر کرے، یہ مضمون چند احباب کے اصرار پر ،صرف اس غرض سے تحریر کیا جا رہا ہے کہ پرویز صاحب یا تحریک طلوعِ اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات ہمارے علماء کرام میں پائے جاتے ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، اس مضمون میں پرویز صاحب کے بنیادی و اساسی نظریات کو بہت مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن کریم شخصیت پرستی کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کی اس تعلیم کے پیشِ نظر پرویز صاحب کا تحریر کردہ لٹریچر بھی جو ذہن بناتا ہے، وہ شخصیت پرستی سے سخت نفرت رکھتا ہے۔ پرویز صاحب نے خود بھی ساری عمر جگہ جگہ یہ تحریر کیا ہے کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ قرآن کریم کے صرف ایک ادنیٰ طالب علم ہیں۔ ان کے اور قرآن کریم کے ہر طلب علم کے لئے سند صرف اللہ کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔ شخصیت پرستی سے ابا کرنے کی وجہ سے اس مضمون میں پرویز صاحب کا نام بار بار تحریر کرنا، گوارا نہیں ہوا، اور اس جگہ ہر بار تحریک طلوعِ اسلام کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ تحریک ان کی ہی قائم کردہ اور ان ہی کے نظریات کی حامل ہے۔ اس تحریک کی مدافعت سے ان پر عائد کردہ الزامات کی ہی تردید کرنا مقصود ہے۔

یہ بات بھی تحریر کرنی غیر مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کسی کا دعویٰ نہیں ہے طلوع اسلام کی تحریر کردہ ہر بات اور ہر نظریہ درست ہے بلکہ دعوت صرف اس بات کی ہے کہ اس تحریک کے اساسی و بنیادی نظریات خالص قرآن کریم پر مبنی ہیں ۔ اور صرف اُن ہی چند اساسی نظریات کا تعارف اس مضمون میں کرایا جارہا ہے۔علماء کرام سے حد درجہ عاجزی و انکساری سے درخواست ہے کہ وہ اس مضمون کو بغیر کسی سابقہ تعصب کے خالصتاً لوجہ اللہ مطالعہ فرمائیں ۔

قرآن کریم نے انسان کو نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ عنایت فرمایا ہے اور اسی سبب نے انسان پر انسان کی حکومت کو حرام قرار دیا ہے قرآن کریم کا یہ اصول زرین حروف سے لکھنے کا متقاضی ہے۔قرآن کریم نے یہ نعرہ اس وقت بلند کیا تھا کہ جب انسان پستیوں اور مجبوریوں سے دوچار تھا۔ انسانی حقوق کا کوئی تصور تک نہیں تھا قرآن کریم کے نزدیک حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کے علاوہ سب بتان آزاری۔اس بلند نعرہ واصول کے پیش نظر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کی حکومت اس سرزمین پر قائم فرمائی اور اس حکومت کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیا۔کچھ عرصے بعد یہ حکومت منقرض ہوگئی اور مسلمانوں میں ملوکیت در آئی ۔ملوکیت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے لیکن ہمارے سب علماء کرام ملوکیت کے قائل وحامی نظر آتے ہیں۔**السلطان ظل الله فی الارض** کا نظریہ درست تسلیم کیا جاتا ہے۔سعدی شیرازی کا یہ مشہور شعر ہے ۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں　　　　بباید گفت اینک ماہ و پرویں

کی تعلیم دینا، اس دور کی عکاسی کرتا ہے ۔ بنوعباس کے وہ خلفاء جو نہایت آوارہ اور بدچلن تھے اور جن کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں رہتی تھیں ۔ ہمارے علماء کرام ان کو گوارا کرتے تھے اور ان کو دعائیں دیتے تھے ۔ ہمارے اپنے دور میں مشہور عالم شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے المامون جیسی کتابیں ان کی تعریف میں تصنیف کیں ہمارے علماء کرام ملوکیت سے بالکلیہ COMPROMISE کر چکے ہیں اور تیرہ سو سال سے ملوکیت ہی چلی آرہی ہے۔آج سعودی عرب میں ملوکیت قائم ہے۔ جمعہ کے خطبوں میں بادشاہوں کا نام لیا جاتا رہا ہے۔غرض یہ کہ ہمارے

علماء کرام قرآن کریم کے اس بنیادی اصول کو بالکل نظر انداز کر چکے تھے، کہ ملوکیت قرآن کریم کے خلاف ہے اس کے علیٰ الرغم تحریک طلوع اسلام نے، اس نعرہ کو بہت زور سے بلند کیا کہ قرآن کی رو سے ملوکیت بالکل حرام ہے اور اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد عملی طریقہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ بغیر اس نظام کے قیام کے اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق صرف اس حکومت یا نظام کی وساطت سے قائم ہوتا ہے اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو ہم اللہ و رسول کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں۔ اس نظریہ کی وضاحت کہ اللہ و رسول کی اطاعت کی عملی شکل اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے، اس بات کی متقاضی تھی کہ طلوع اسلام سب سے پہلے اپنے قارئین کے سامنے دین اور مذہب کا واضح فرق بیان کرے۔ چنانچہ ہماری پوری تاریخ میں تحریک طلوع اسلام پہلی تحریک ہے کہ جس نے اس موضوع پر خوب سیر حاصل مواد مہیا کیا۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ ہمارے علماء کرام اس کو جس قدر بھی اہمیت دیں وہ کم ہے، اور وہ اس بارے جس قدر مواد چاہیں، وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مذہب میں احکامات الٰہی کی اطاعت انفرادی طور پر ہوتی ہے، لیکن دین کی صورت یہ ہے کہ نزول قرآن کے دوران مختلف امور کے متعلق مسلسل قوانین و احکامات دیئے جا رہے تھے ان کی عملی شکل یہ ہوتی تھی کہ مومنین ان پر اجتماعی طور پر ایک نظام کی وساطت سے عمل کرتے تھے، زکوٰۃ، خمس، صدقات کے احکامات نازل ہوئے تو لوگوں نے فرداً فرداً زکوٰۃ ادا نہیں کی کہ جس کا دل چاہا اپنی مرضی سے کسی کو زکوٰۃ دے دی بلکہ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یہ رقم حضورؐ کے پاس پیش کی جاتی اور حضورؐ اس کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے بیت المال میں جمع کر دیتے تھے اور حسب موقع اس کو خرچ کیا جاتا تھا اسی طرح جب احکام حدود نازل ہوئے کہ زانی کے سو کوڑے مار دیا، چور کے ہاتھ کاٹ دو تو لوگوں نے از خود ان احکامات پر عمل نہیں کیا تھا کہ کسی کے گھر چوری ہوئی تو اس نے چور کو پکڑ کر اور محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے اس چور کے ہاتھ کاٹ دیئے بلکہ صورت حال یہ ہوتی تھی کہ

چوری یا زنا کے جرم کی اطلاع حضورؐ کو یا حضورؐ کے مقرر کردہ اسلامی حکومت کے افسران، یعنی اولی الامر کو دی جاتی تھی وہ اس جرم کی تحقیق و تفتیش کر کے اس جرم کے مطابق اس مجرم کو سزا دیتے تھے یا اُسے بری کر دیتے تھے اس طرح نکاح وطلاق کے معاملات بھی حضورؐ کی معرفت طے پاتے تھے قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت، اس مرکز کی وساطت سے، اجتماعی طور پر کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر اُن کی اطاعت الگ الگ ازخود نہیں کی جاتی تھی اس مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ احکام اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے اور ان کو رسول اللہ جاری فرما رہے تھے اس لئے اس نظام (مرکز) کی اطاعت سے اللہ ورسول دونوں کی اطاعت ہو جاتی تھی۔''

قرآن کریم نے اس بات کی اجازت ہی نہیں دی کہ لوگ خود انفرادی طور پر اس کی اطاعت کریں بلکہ ہر جگہ اطاعت رسول پر اصرار کیا گیا ہے۔ اطاعت رسول پر اصرار کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کو بحیثیت ایک نظام اور دین کے اختیار کیا جائے اور تحریک طلوع اسلام کی پیش کردہ یہ بات علماء کرام کی توجہ کی متقاضی ہے۔

ہمارے علماء کرام کو تحریک طلوع اسلام کے خلاف ایک عام شکایت یہ ہے کہ یہ حدیث کی منکر ہے۔ لیکن یہ الزام حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ عرصہ دراز تک رسالہ طلوع اسلام کے ٹائیٹل کے صفحہ پر ہر ماہ حدیث شریف درج کی جاتی تھی۔ جن حضرات نے تحریک طلوع اسلام کے سالانہ اجتماعات میں شرکت کی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اجتماع کے پنڈال میں آیات قرآنی کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی کے بڑے بڑے بینرز جلی حروف میں آویزاں کئے جاتے تھے۔ جن میں یہ حدیث شریف ''**ومن استواء یو ماہ فھو معبون**'' بھی ہوتی تھی۔ اصل میں یہ تحریک حدیث کی قطعاً منکر نہیں ہے وہ حدیث کو تسلیم کرتی ہے، حدیث کے بارے میں اس تحریک کا موقف جب آپ بغور مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کا یہ اعتراض ازخود دور ہو جائے گا۔

یہ بات ہر شخص پر عیاں ہے کہ اسلام کا نظام کوئی وقتی یا ہنگامی نظام نہیں تھا بلکہ اس کو ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے جاری رہنا تھا۔ اور یہ بات بھی سب پر واضح ہے کہ o اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُم مَّيِّتُونَ o (39/30) o انہیں بھی مرنا ہے اور تمہیں بھی مرنا ہے o کے مطابق حضورؐ کو فوت بھی ہونا ہے۔ اب زیرِ غور سوال یہ تھا کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعت رسولؐ کا حکم آیا ہے اس اطاعت رسولؐ کے فریضہ کو کس طرح ادا کیا جائے۔ طلوع اسلام چونکہ اسلامی نظام کا داعی ہے اور ہر جاری نظام میں ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے جو قرآنی احکامات کا اجراء کرے، اس لئے طلوع اسلام کے نزدیک اسلامی نظام کے سربراہ کی اطاعت، حضورؐ کی اطاعت ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام کے نزدیک حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی، حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی کیونکہ وہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے قرآنی احکامات نافذ فرمارہے تھے۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت حضورؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے علمائے کرام کے نزدیک صورت حال یہ ہے کہ کیونکہ وہ دین کے بجائے مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور مذہب میں زندہ اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں انفرادی طور پر اطاعت کر لی جاتی ہے، اس لئے وہ حضورؐ کے بعد احادیث کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کا قائم مقام بنادیتے ہیں، جو قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن اس میں علمائے کرام کا کوئی قصور نہیں ہے جب آپ اسلام کو دین کے بجائے مذہب کی سطح پر لے آئیں گے تو آپ کے سامنے اطاعت رسول کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نکل ہی نہیں سکتی۔ مذہب میں حدیث کی اطاعت، رسول اللہ کی اطاعت کے قائم مقام بن جاتی ہے، جبکہ دین میں اسلامی نظام کے سربراہ کی اطاعت رسول اللہ کی اطاعت کی قائم مقام ہوتی ہے، لیکن ہمارے علماءِ کرام کا جواب دین کی طرف آرہے ہیں وہ اس سقم وخامی کا بخوبی اندازہ کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام خدانخواستہ حدیث کا منکر نہیں ہے بلکہ وہ حدیث کو تسلیم کرتا ہے، البتہ وہ حدیث کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کا مقام نہیں گردانتا۔

ہمارے ہاں تفسیر نویسی کا سلسلہ جب شروع ہوا، تو تفاسیر تحریر کرنے سے پیشتر تفسیر نویسی کے کوئی اصول طے نہیں کیے گئے، اور اس سلسلہ میں نہ صرف قرآن کریم سے کوئی راہنمائی حاصل

نہیں کی گئی بلکہ قرآن کریم نے جو قرآن فہمی کے طریقے بتائے ہیں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔
ہمارے مفسرین کرام نے زیادہ زور شان نزول پر دیا ہے اور ہر آیت کا شان نزول سامنے رکھ کر آیات قرآنیہ کی تشریح کی ہے۔ جب تفاسیر تحریر کرنے کا دور شروع ہوتو فرقہ بندی کی ابتداء ہو چکی تھی اس لئے آیات کے شان نزول بھی مختلف فرقوں کے مختلف تھے۔ شان نزول آیت کے مفہوم کو بالکل ایک آیت کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور اس آیت کی ابدیت، ہمہ گیریت، آفاقیت بالکل جاتی رہتی ہے۔ اکثر و بیشتر اوقات شان نزول کی وجہ سے آیات کا مفہوم بالکل برعکس و برخلاف ہو جاتا ہے۔ عقلی طور پر بھی یہ بات تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات وقتی حادثات و واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر نازل ہوتی تھیں فرض کریں کہ اگر وہ حادثہ وجود میں نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر زیادہ واقعات وجود میں آجاتے تو کیا زیادہ آیات نازل ہو جاتیں۔ ہمارے ہاں قذف کی سزا کو واقعہ افک سے منوط کرتے ہیں۔ (جو بظاہر غلط ہے) تو اگر واقعہ افک نہ ہوتا تو کیا قذف کے احکامات نازل نہیں ہوتے، اسی طرح سرقہ، زنا، غیبت اور سینکڑوں امور کو وجہ بنا کر آیات کا نزول ان پر منحصر کر دیتے ہیں جو ظاہر بظاہر بالکل خلاف عقل ہے سورہ نور کی چونسٹھ آیات ہیں، روایات کے مطابق یہ سورت بیک وقت نازل ہوئی ہے تو کیا اس کے نزول سے پیشتر 64 واقعات ایسے وجود میں آئے ہوں گے کہ یہ 64 آیات نازل ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے، اور یہ حقیقت بہت ہی اہم ہے کہ آیات قرآنی انسانیت کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوئی ہیں۔ قیامت تک کے لئے انسانیت کے لئے جو جو تقاضے اور ضروریات ہو سکتی تھیں، قرآن کریم میں وہ ساری آیات نازل کر دی گئیں۔

شان نزول کے نظریہ کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی آیات یقینی ہیں، اوران میں کسی قسم کا شک و ریب نہیں ہے جبکہ شان نزول کی روایات ظنی ہیں اور شک پر مبنی ہیں ایک یقینی شے اور حق کی تفہیم و توضیح میں شک و ظن کو شامل کرنے سے خود آیات کی تفہیم و تشریح ظنی و مبنی بہ شک ہو جاتی ہے۔ ہمارے مفسرین کرام کا طریقہ یہ ہے کہ آیت تو قرآن کریم سے لے لی، اور اس کی تشریح کے لئے اس کے شان نزول کو روایات کی کتابوں میں تلاش کرنا شروع

کر دیا۔ مختلف فرقوں کی مختلف شان نزول ہونے کے علاوہ، خود ایک ہی فرقہ میں، ایک ایک آیت کے تین تین چار چار، پانچ پانچ شان نزول ہیں اور ان تمام شان نزول کو سامنے رکھنے کے باوجود بھی قاری کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ تفسیر کرنے کے اس طریقہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہماری تفاسیر میں بیشتر نظریات قرآنی تعلیم کے خلاف داخل ہوگئے ہمارے مفسرین کرام بھی اس کے معترف ہیں اور وہ اس کو اسرائیلیات نام دیتے ہیں۔ ان خارج از قرآن نظریات و احکامات کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان کی اطاعت سے ان مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے۔ جنہوں نے وہ نظریات تفاسیر میں داخل کئے ہیں اور اس طرح ہم مسلمان مجموعی حیثیت سے اللہ ورسول کی صرف دس فیصدی ہی اطاعت کرتے ہیں باقی نوے فیصد اطاعت ان مفسرین کے اپنے داخل کردہ عقائد کی کر رہے ہیں۔

خالص قرآن کریم کو سامنے رکھنے اور خارج از قرآن نظریات کو کاٹ کے الگ پھینک دینے اور سو فیصدی خالص اللہ ورسول کی اطاعت کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان اصولوں کے مطابق تشریح وتفسیر کی جائے جو اصول خود قرآن کریم نے تجویز فرمائے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر کا جو خلاف قرآن طریقہ ایک ہزار سال سے چلا آرہا ہے، تحریک طلوع اسلام نے اس پر خط نسخ پھیر کر، تفسیر القرآن کا طریقہ اختیار کیا۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کرنے میں قرآن کریم نے خود دو اصول لازمی قرار دیئے ہیں اور انہیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو محاورہ، عرب، کیونکہ قرآن کریم اسی طرز تکلم میں نازل ہوا ہے جس میں عرب خود کلام کرتے تھے۔ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ o (51/23) بلاشبہ یہ قرآن حق ہے اور اس کا انداز بیان بالکل وہی ہے جس طرح تم آپس میں روزمرہ گفتگو کرتے ہو o نیز فرمایا کہ لسان عربی میں مبین میں ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے تصریف آیات لازمی ولابدی چیز ہے انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ o (6/65) آپ دیکھئے تو سہی ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں

شاید وہ سمجھ جائیں o نیز قرآن کریم کے مطابق حضورؐ کا طریقہ قرآن فہمی کا یہی تھا وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ o (6/105) اے رسول ہم اس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریفات آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا o اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیات کی خود تبئین کر دیں۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں چودہ سو سال سے قرآن فہمی کے لئے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں، اور جس طرح قرآن کریم کی تفاسیر تحریر کی گئی ہیں ان میں یہ دونوں اصول بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان بنیادوں اصولوں کو مفسرین کرام نے اہمیت ہی نہیں دی اور آیات کی تفسیر میں سارا زور شان نزول اور متعلقہ روایات پر دیا گیا ہے۔ حالانکہ، جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے، شان نزول کی وجہ سے متعلقہ آیت کی عالم گیریت، ابدیت، اور عمومیت بالکل جاتی رہتی ہے اور آیہ کریمہ کسی نہ کسی فرد یا کسی نہ کسی وقتی واقعہ سے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام نے اس طریقہ کو بدل کر تفسیر القرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ طلوع اسلام قرآن کریم کی کسی تشریح و تفسیر کو دائمی و ابدی نہیں سمجھتا اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آئندہ کے ازمنہ و ادوار میں جب انسانیت کی علمی سطح بلند ہوتی جائے گی، تو انسانیت قرآن فہمی میں بھی ہم سے آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ ہمارے گذشتہ مفسرین کرام نے جو تفاسیر تحریر فرمائیں وہ اس دور کی علمی سطح کے مطابق تھیں۔ ان مفسرین کرام نے ان کی تصنیف میں بہت محنت کی ہے۔ انہوں نے جو خدمات سر انجام دیں ہمیں ان کا اعتراف کرنا ضروری ہے لیکن یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم ان مفسرین کی تفاسیر کو دائمی سمجھ بیٹھے ہیں اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

قرآن کریم قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کا ضابطہ حیات ہے اس کا وعدہ و دعویٰ

ہے کہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ غالب ہی رہے گی کسی حال میں مغلوب نہیں ہو سکتی۔ اس موضوع پر قرآن کریم میں بے شمار آیات آتی ہیں جو بار بار رسالہ طلوع اسلام کے صفحات پر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ہم مسلمان قرآن کریم کے ان تمام وعدوں کے علی الرغم سب سے زیادہ مغلوب و مقہور قوم ہیں۔ ان آیات کی تشریح و تعبیر میں ہمارے مفسرین کو بڑی دقت پیش آتی تھی اور ان کے لئے کوئی راہ نہیں نکلتی تھی کہ اپنے مغلوبیت و پستی کے حالات کے موجودہ ہوتے ہوئے، ان آیات کو کس طرح حل کریں، اس کا طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ ان آیات کو آخرت سے منسلک کر دیا کہ آخرت میں اس طرح کا غلبہ و اقتدار مسلمانوں کو نصیب ہوگا۔ ان آیات کی تفصیل تو بہت طویل و طولانی ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن طلوع اسلام نے ان تمام آیات کی تشریح اس طرح کی ہے جس سے ان کا تعلق اسی دنیا میں اقتدار و غلبہ حاصل ہونے سے رکھا ہے اور مسلمانوں کے عروج و اقتدار کا تعلق بھی آخرت کی بجائے اس دنیا کو قرار دیا ہے۔ ان آیات کی تفصیل مفہوم القرآن میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جہاں ان آیات کی تفسیر ان کے مفہوم کے مطابق کی ہے جس سے مسلمانوں میں حریت و غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

تحریک طلوع اسلام سے پیشتر آپ کسی جگہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کسی عالم نے فرقہ بندی کے خلاف کچھ لکھا یا کہا ہو۔ ہمارے علماء کرام تو خود کسی فرقہ سے متعلق ہوتے ہیں، پھر وہ کس طرح اس کے خلاف کچھ تحریر کر سکتے ہیں۔ بلکہ وہ "اختلاف امتی رحمۃ" جیسی حدیث پیش کر کے فرقہ بندی کی تائید کرتے تھے۔ طلوع اسلام نے فرقہ بندی کے خلاف قرآنی تعلیم کو عام کیا کہ فرقہ بندی شرک ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔ فرقہ بندوں کا کوئی تعلق حضورؐ سے نہیں رہتا۔ طلوع اسلام نے اس نظریہ کو اس درجہ عام کیا کہ اور اس موضوع پر اتنے مقالے میں طبع کئے کہ اب عام مسلمان فرقہ بندی سے تنفر کرنے لگے ہیں اور ہمارے علماء کرام میں بھی جو سعید روحیں ہیں وہ اس نظریہ کو درست تسلیم کرنے لگی ہیں کہ فرقہ بندی قرآن کریم کے خلاف ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس موضوع کے خلاف اس سے زیادہ اس لئے نہیں لکھ سکتے کہ ان کی یہ اپنی مجبوری ہے کہ وہ خود فرقہ واریت کی

پیداوار ہوتے ہیں وہ بھلا فرقہ بندی کے خلاف کیسے لکھ سکتے ہیں۔ ہمارے T.V چینلز پر ہمارے علمائے کرام نہ صرف مختلف فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ اپنے فرقے کا حوالہ دے کر بات کرتے ہیں۔

ہمارے علماء کرام ڈیڑھ سو سال سے احمدی حضرات سے مناظرہ کرتے چلے آرہے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کے اپنے نظریات میں کمزوری تھی جس کی وجہ سے احمدی علماء ہمارے علماء کو لاجواب کر دیتے تھے خود ہمارے علماء کرام کے جو نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ احمدی علماء ان خلاف قرآن نظریات سے فائدہ اٹھا کر، ان کو ہی EXPLOIT کرتے تھے۔احمدی حضرات مرزا کو ''مسیح موعود و مہدی معہود'' کہتے ہیں۔حالانکہ یہ نام ہی خلاف قرآن ہے۔لیکن ہمارے علماء کرام ان کے اس نام پر اعتراض نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام مہدی بھی تشریف لائیں گے،اور وہ نزول مسیح کے بھی قائل ہیں۔لیکن یہ دونوں نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں۔قرآن کریم میں دور دور کہیں حضرت امام مہدی کے تشریف لانے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی نزول مسیح کا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق ہے اس لئے مرزا صاحب کا نام ہی غلط اور خلاف قرآن ہے۔ ہمارے علماء کرام اگر اپنے یہ دونوں خلاف قرآن نظریات ترک کر دیں تو احمدیت اسی روز اپنی موت آپ مرجائے گی،مگر افسوس کہ ہمارے علماء کرام اپنے خلاف قرآن عقائد کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پرویز صاحب نے ''احمدیت اور ختم نبوت'' نام کی کتاب تحریر کی،اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں۔ یہ کتاب کئی مرتبہ طبع ہوئی اور ادارہ طلوع اسلام نے اس کو مفت تقسیم کیا۔ پاکستان میں احمدیت کے فروغ کے خلاف اس کتاب نے نہایت مضبوط بند باندھ دیا۔لیکن اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام نے محض تعصب کی وجہ سے اس کتاب کی پذیرائی نہیں کی اور نہ ہی اپنے نظریات میں کوئی اصلاح کی۔

مغرب کے نظریات سے متاثر حضرات جو اسلام کو محض ایک چلا ہوا کارتوس سمجھتے تھے ان کے لئے الگ کثیر تعداد میں مواد فراہم کیا گیا۔''سلیم کے نام'' کی تین جلدوں میں 44 خطوط ہیں

۔اس کتاب سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان متاثر ہوئے۔قرآن کریم کی حقانیت، قرآن کریم کی رُو سے اللہ کا تصور، وحی کی ضرورت، مقام نبوت، اطاعت رسول، مقام محمدی، قسم کے تمام اہم مضامین کی اس کتاب میں اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ قاری اس سے متاثر نہ ہو ۔یہ کتاب ایک ایسا دلدل ہے کہ ہر قاری جس قدر بھی باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہ اس کے اندر دھنستا چلا جاتا ہے اور اس کتاب کے نظریات عقلی طور پر ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہماری ایک ہزار سال کی تاریخ میں اس سے بہتر کوئی کتاب علم کلام پر دستیاب نہیں ہو سکتی۔اس کتاب نے علم کلام کا ایک نیا طریقہ اور ایک نیا عنوان قائم کر دیا ہے جو ضروریات حاضرہ کے مطابق بھی ہے اور جو موجودہ تعلیم یافتہ ذہن کو مطمئن کر دیتا ہے۔ہمارا سابقہ علم کلام، آج کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے بالکل قاصر ہے۔

مغرب سے متاثر حضرات کے علاوہ کمیونزم کی تردید میں اس قدر اہم اور پُر مغز کتب و مقالات تحریر کئے گئے کہ خود مغرب میں بھی کمیونزم کے خلاف اس درجہ کا علمی کام نہیں ہوا ہوگا۔ ''نظام ربوبیت''۔''جہاں مارکس ناکام ہوا اس سے آگے''۔''ماؤزے تنگ اور قرآن'' جیسی کتاب اور مقالات طبع کئے گئے۔ پاکستان میں اس علمی کام کے بعد کمیونزم کا سیلاب بالکل رُک گیا ان کتابوں کے تحریر کرنے کی وجہ سے ہمارے علماء کرام کو تحریک طلوع اسلام کی پذیرائی کرنی چاہئے تھی کیونکہ ہمارے علماء کرام تو اس قسم کے موضوعات پر چند سطور بھی تحریر نہیں کر سکتے۔لیکن ہمارے علمائے کرام نے ان کو بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

ہمارے ہاں جب تاریخ نویسی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں چند وجوہات کی وجہ سے معروضیت (OBJECTIVITY) بالکل نہیں رہی، اس لئے ہماری تاریخ کا بیشتر حصہ حقائق اور اصلیت کے بالکل خلاف ہے۔پہلی وجہ تو یہ ہوئی کہ تاریخ نویسی سے پیشتر فرقہ بندی شروع ہو چکی تھی، اس لئے تاریخ میں زیادہ تر فرضی روایات، خود تراشیدہ قصے، لوگوں کے فرضی فضائل و معائب سب داخل ہو گئے۔ ہر فرقہ نے اپنے فرقہ کے موافق اور دوسرے فرقہ کے خلاف مواد فراہم

کیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو حکومت زبردستی قبضہ کرتی ہے وہ سابقہ حکومت کو بہت بری صورت میں پیش کرتی ہے جس سے وہ اپنے اقتدار کا جواز ثابت کرتی ہے۔ ہماری تاریخ بنو عباس میں کے دور میں تحریر کی گئی ہے انہوں نے بنو امیہ سے حکومت زبردستی لی تھی، اس لئے ہمارے مورخین نے، اپنے دور کی ملوکیت سے متاثر ہو کر، بنو امیہ کو بہت برے انداز میں DEPICT کیا ہے۔ خصوصاً امیر معاویہؓ کی سیرت بہت بُری بیان کی ہے۔ بنو عباس کے دور میں عموماً جانشینی کے مسلہ پر کشت وخون ہوا کرتا تھا۔ جو مدعی خلافت دوسرے کو قتل کر دیتا تھا وہ زبردستی قوت کے زور پر جانشین بن جاتا تھا۔ محض اس کشت وخون کو جائز قرار دینے کے لئے جنگ جمل و جنگ صفین و جنگ نہروان کے واقعات بیان کئے گئے کہ جب حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہؓ جانشینی کے مسلہ پر جنگ کر سکتے تھے، تو یہ ہمارے دور میں بھی جائز ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی رُو سے صحابہ آپس میں جنگ وقتال نہیں کر سکتے تھے (48/29-19/96) اسی طرح اپنے لئے نابالغوں کے ساتھ شادی کرنے کا جواز تلاش کرنے کی خاطر حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت صرف 9 سال کی قرار دی گئی۔ حالانکہ قرآن کریم نے بلوغت کو نکاح کی شرط قرار دیا ہے (4/6) طلوع اسلام میں بھی حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں تحقیقی مقالات شائع ہوئے جن میں واضح کیا گیا کہ حضرت عائشہؓ کی عمر رخصتی کے وقت 19 سال کی تھی۔ طلوع اسلام کی یہ خدمت بہت اہم ہے کیونکہ اکثر مستشرقین اور مذہب برگشتہ حضرات اس بارے میں بہت دریدہ دہنی سے کام لیتے ہیں تاریخ کے بارے میں ہمارے علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ وہ تاریخ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور قرآن کریم کو ثانوی حیثیت دے کر، قرآن کریم کی تفسیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی واقعہ غلط ثابت نہ ہو سکے۔ اس کے برخلاف تحریک طلوع اسلام کا اصول یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو اساسی معیار قرار دیتی ہے ہر وہ واقعہ جو قرآن کریم کے مطابق ہے وہ درست ہے اور تاریخ کی ہر وہ بات جو قرآن کریم کے خلاف جاتی ہے وہ غلط ہے خواہ اس کے ذرائع کتنے ہی قابل اعتبار کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ ہماری تاریخ کی تو یہ حالت ہے کہ حضورؐ نے دس سال نماز پڑھی روزانہ پانچ وقت پڑھی

صحابہ کے مجمع میں پڑھی، لیکن تاریخ و روایات سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ نے نماز کس طرح ادا کی۔

پرویز صاحب حب رسول میں سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ ان کی رگ رگ اور نس نس میں حضورؐ کی محبت موجزن تھی حضورؐ کی سیرت پر انہوں نے جو کتاب ''معراج انسانیت'' تحریر کی ہے اس کے صفحہ صفحہ اور سطر سطر سے، حب رسول اُبلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جن علمائے کرام نے ان کی یہ کتاب مطالعہ کی وہ سب حیرت میں رہ گئے کہ ان کا تصور پرویز صاحب کے متعلق کیا تھا، اور کتاب پڑھ کے ان کے متعلق کیا تاثر ہوتا ہے۔ راقم سطور علماء کرام سے بصد التجاء درخواست گذار ہے کہ وہ حضورؐ کی سیرت کے سلسلہ میں یہ کتاب ضرور مطالعہ فرمائیں، اس کے مطالعے سے ان کے حب رسول میں اضافہ ہوگا۔

ہمارے علماء کرام میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے اس پر غور و خوض کرنے کے لئے امام راغب کی مفردات اور زمخشری کی کشاف کفایت کر جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی اور کتاب نہ ہو تو اُن کے خیال کے مطابق صرف یہ دو کتابیں ہی قرآن فہمی کے لئے کافی ہیں۔ یقیناً یہ دونوں کتابیں بہت بلند مقام کی حامل ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں پرویز صاحب کی لغات القرآن اور ان کا تحریر کردہ مفہوم القرآن، قرآن فہمی کے لئے کلید کا درجہ رکھتی ہیں۔ راقم سطور علماء کرام سے نہایت عاجزی سے گذارش کرتا ہے کہ وہ ان دونوں کتابوں کو کشادہ دلی اور بالغ نظری سے مطالعہ فرمائیں وہ ان کتابوں کو انشاء اللہ راغب کی مفردات اور زمخشری کی کشاف سے بہتر پائیں گے۔ ان دو کتابوں کے مطالعہ کی مدد سے آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کی ہر آیت اپنا مفہوم خود بول کر آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

جیسا کہ صدر مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ تحریک طلوع اسلام کا مزاج شخصیت پرستی سے ابا کرتا ہے، اس لئے اس مضمون میں حتی الامکان پرویز صاحب کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ لیکن ہمارے مذہبی حلقوں میں چونکہ ان کے خلاف ایک سکیم کے مطابق عمداً پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اس لئے چند

فقرے ان کی سیرت کی پختگی کے لئے تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، انہوں نے بوجہ انکسار اپنی زندگی کو تحریک سے بالکل الگ رکھا اس وجہ سے ان کی ذاتی باتیں نہ تو لوگوں کو زیادہ تر معلوم ہیں، اور نہ ہی ان کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت ہے۔ البتہ صرف چند اصولی باتیں جو ایک داعی قرآن میں ہونی چاہئیں ان کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کسی کی دعوت پر غور و فکر کرنے اور اس کا اتباع کرنے کا ایک سنہرا اصول قرآن کریم نے خود بیان فرما دیا o اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا (36/21) o ایسے لوگوں کا اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے آپ قرآن کریم کے اس اصول کو کسوٹی و میزان بنائیں پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے ہاں کتنے ایسے حضرات ہیں جو اس اصول پر پورے اترتے ہیں۔ اس اجر میں صرف مالی منافع ہی مذکور نہیں ہے۔ اس اجر میں سیاسی اقتدار بھی شامل ہے۔ یہ جو ہمارے سیاسی راہنما قوم کے غم میں گھلے جاتے ہیں، آپ ان سے کہیں کہ بغیر کرسی حاصل کئے قوم کی خدمت کریں، پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ کتنے لوگ ہیں جو بغیر اجر کے کوئی خدمت کرنے کو تیار ہوں گے۔ یہی صورت حال ہمارے علماء کرام اور مشائخ عظام کی ہے، انہیں مالی اجر بھی ملتا ہے، اور مریدوں کے دلوں پر حکومت بھی۔ اس ایک ہی اصول کو پیش نظر رکھ کر، پرویز صاحب کی سیرت ملاحظہ فرمائیں۔ انہوں نے ساری عمر قرآن کریم کی خدمت میں گذار دی۔ ہزارہا صفحات تحریر کئے، تصنیف و تالیف میں حد درجہ معروف و مشغول رہے، لیکن اس کے باوجود کسی پر بوجھ نہیں بنے۔ ساری عمر ملازمت کی اور صرف اپنی تنخواہ پر گزارہ کیا۔ کبھی کسی سے ایک پیسہ طلب نہیں کیا۔ ساری عمر نہایت سادگی سے بسر کی۔ ان کی احتیاط کا عالم یہ تھا کہ جب بزمیں قائم ہوئیں یا جب طلوع اسلام کالج کے لئے دو سو کنال زمین خریدی، تو وہ کسی مالی معاملہ میں INVOLVE نہیں ہوئے۔ تحریک کے دوسرے ارکان رقوم کا حساب رکھتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے کسی کو بیعت کیا۔ نہ اپنے لئے کوئی مقام خاص کیا مختصر یہ کہ وہ اس آیہ کریمہ کی میزان پر صد فیصد کامیاب اترتے ہیں، اور کسی سے کوئی مالی، سیاسی، یا مزعومہ روحانی اجر طلب نہیں کیا۔

حضورؐ نے اپنی سیرت کو اپنی نبوت کی صداقت کی دلیل میں پیش کیا تھا فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ٥(10/16) میں تم میں اس سے پیشتر مدتوں رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے ٥ اسی لئے ہر داعی قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضورؐ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی سیرت کو پختہ تر رکھے۔ اسی لئے پرویز صاحب اپنی سیرت میں نہایت پختہ تھے، جھوٹ، کذب بیانی ،الزام تراشی قسم کے عیوب سے انہیں سخت نفور تھا، ان پر چاروں طرف سے یلغار تھی۔ تقریباً بیس، پچیس ماہانہ رسالے ان کے خلاف مضامین و مقالات چھاپتے رہتے تھے، جو تمام ان کی نظر سے گذرتے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر مضامین میں ان کے خلاف کذب بیانی یا الزام تراشی سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے ان کے جواب میں نہ تو کبھی کوئی الزام تراشی کی اور نہ ہی کوئی سوقیانہ زبان استعمال کی۔ 1963ء میں جب ان کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری ہوا تو انہوں نے ایک سچے، مخلص داعی، قرآن کی طرح تحمل و برداشت سے کام لیا، اور کسی سے کوئی گلا شکوہ نہیں ہوا۔

جب تحریک طلوع اسلام کی دعوت پر تعلیم یافتہ حضرات آہستہ آہستہ قرآن کریم کے قریب آنے لگے، تو قرآنی نظریات کی مزید نشر و اشاعت کی خاطر بزمیں قائم کی گئیں اور سالانہ کنونشن بھی منعقد ہونے لگے۔ پرویز صاحب کا اگرچہ ذاتی طور پر ان بزموں سے کوئی رابطہ نہیں تھا، لیکن بزموں کے جن حضرات کو وہ جانتے تھے وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنی شدید ترین مصروفیت کے باوجود ان سے ملنے سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم میں حضورؐ کو حکم ہوا تھا ۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ٥(15/88) اور ایمان والوں سے جھک کے ملا کرو ٥ چنانچہ حضورؐ اس حکم کے مطابق اپنے صحابہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسی سنت کی پیروی میں پرویز صاحب بھی قرآنی فکر کے لوگوں سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ جب سالانہ کنونشن ہوتی تھی تو وہ ہر بزم کے ارکان کو خود خوش آمدید کہتے تھے اور سب سے بغلگیر ہوتے تھے۔ کنونشن کے قیام کے دوران، سب سے رابطہ رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ طبعاً بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ ان کے خلاف جو ایک جھوٹا تاثر پیدا کیا گیا ہے، اس کو پیش نظر رکھ

کر یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں ورنہ اس مضمون کا مقصد ان کی LIFE پیش کرنا نہیں ہے۔

ماہ مئی 2007ء

ایک آیت کریمہ کی تشریح

رسالہ صوت الحق قرآن خالص اور دین کے قیام کا داعی ہے۔ اس کے قارئین کا حلقہ آہستہ آہستہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اور اس کا پورا (CREDIT) اس کے مدیر جناب حسین امیر فرہاد کو جاتا ہے، کہ وہ اس عمر میں بھی دن رات اس کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے قارئین کے حلقہ کا وسیع تر ہونے اور اس حلقہ کا اس کے مضامین ونظریات کو اہمیت دینے کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قارئین کرام کے استفسارات اور اعتراضات میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اعتراضات کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین تک پیغام پہنچ رہا ہے اور وہ اس کو اہمیت دے رہے ہیں۔ یہاں تک تبلیغ کا نصف حصہ سرانجام پاجاتا ہے۔

پشاور سے چند حضرات نے آیہ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ٥(15/87) کا مفہوم دریافت فرمایا ہے، اس رسالے کے قارئین چونکہ قرآن کریم کے طالب علم ہیں اور اس کے شیدائی ہیں اس لئے ان کے خطوط ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور ان کے جوابات دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کے حکم کے مطابق اس آیہ کریمہ کی تشریح کے بارے میں چند گزارشات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔ **وھو الرحمٰن و علیه التکلان**۔

ہمارے مفسرین کرام نے اس آیہ کریمہ میں سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ سے مراد سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں قرار دی ہیں جو نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ مفسرین کرام کے نزدیک اس سے مراد **السبع الطوال** یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں ہیں۔ بعض

مفسرین نے قرآن کریم کی تمام سورتوں کو اس کا فحویٰ (ملشا) قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان تمام سورتوں میں واقعات تکرار کے ساتھ آئے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ سے حٰمٓ والی سورتیں مراد ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اس کا ترجمہ "درآئینہ دادم ترا ہفت آیت از آنچہ در نماز مکرر خواندہ میشود یعنی سورۃ فاتحہ و دادیم ترا قرآن بزرگ" کیا ہے۔ ان کے محترم و مکرم صاحبزادے جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ "اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آیتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجہ کا" لکھا ہے اور اس ترجمہ پر بطور تفسیر شیخ الاسلام جناب مولانا عثمانی نے تحریر فرمایا ہے، سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ کے مصداق میں اختلاف ہے صحیح اور راجح یہ ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں جو ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں۔ جن کو بطور وظیفہ کے بار بار پڑھا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں تمام مفسرین نے یہ موقف اختیار کئے ہیں چند اور اقوال بھی ہیں جو چنداں لائق

(1) اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ جس کے اندر بسم اللہ شریف کو بھی شامل کر کے سات آیت بنتی ہیں۔ اور یہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

(2) اس سے مراد قرآن کریم کی ابتدائی سات سورتیں ہیں۔

(3) اس سے پورا قرآن کریم مراد ہے۔

جب سے قرآن کریم کی تفاسیر کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہمارے ہاں تفسیر القرآن بالر وایات کا ایک ہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر تحریر کرنے کا یہ طریقہ مذہب کی طرف منتج ہوتا ہے، کیونکہ تمام روایات مذہب ہی کی تائید کرتی ہے ہیں۔ البتہ تفسیر القرآن بالقرآن میں چونکہ قرآن خالص سامنے آتا ہے اور یہ طریقہ تفسیر خارجی و بیرونی نظریات کو نہ صرف داخل نہیں ہونے دیتا بلکہ خارجی نظریات کی جڑ کاٹ دیتا ہے اس لئے اس طریقہ تفسیر سے دین کی طرف رہنمائی ہوتی

ہے۔اس آیت کریمہ میں تفسیر القرآن بالروایات کے ذریعے جو مذہبی مفہوم بنتا ہے وہ جناب کی خدمت عالی میں پیش کیا جا چکا ہے اب اس کا دینی مفہوم تفسیر القرآن بالقرآن سے پیش کیا جاتا ہے۔

آپ ایک ہزار سال کی ساری سابقہ تفاسیر ملاحظہ فرمائیں خواہ سلف کی ہو یا خلف کی سب نے اس آیت میں سبع کے معنی سات (SEVEN) کے لئے ہیں۔حتیٰ کہ راغب اصفہانی نے بھی اپنی مفردات میں اسی پر اکتفا کیا ہے، لیکن لغات القرآن میں مختلف حوالوں سے پرویز صاحب نے اس کے معنی متعدد (SEVERAL/MANY) دیئے ہیں لیکن مختلف لغات کے حوالوں سے بھی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی تھی جب تک کہ قرآن کریم کی اپنی کوئی سند نہ ہو اس لئے انہوں نے قرآن کریم سے بھی ایسی مسکت (خاموش کرا دینے والی) سند دی ہے جسے کوئی سرکا نہیں سکتا اور جسے رد کرنے کی کسی کو مجال نہیں۔جس سند سے سبع کے معنی متعدد اور کئی SEVERAR ہوتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے۔o مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (2/261)o ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے اور ایک بالی میں سو سو دانے ہوں۔ظاہر ہے کہ یہاں سَبْعَ سَنَابِلَ سے مراد متعدد (SEVERAL) ہے یہاں اس آیت کریمہ نے سبع کے معنی بہت (MANY) واضح کر دیئے ہیں۔**مثانی مثنی** کی جمع ہے اس کے معنی ہیں بار بار دہرائی جانے والی چیز۔

قرآن کریم کا مقصد اس دنیا میں دین کا قیام ہے، قرآن کریم صرف دین کا نظام ہی نہیں دیتا جو میکانکی طور پر کسی طرح بھی قائم کر دیا جائے بلکہ وہ اس نظام کو قائم کرنے کے چند سنہری اصول بھی خود ہی تجویز کر دیتا ہے ان متعدد اصولوں میں سرفہرست یہ اصول ہے۔إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (13/11) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت میں تغیر نہ کریں اللہ ہرگز اس قوم میں تغیر نہیں کرتا۔قوم کا داخلی تغیر، اس کے عروج اور زوال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔قرآن کریم

نے مومنین کے سامنے نہ صرف اصول پیش کیا بلکہ انہیں اس بات کی دعوت بھی دی کہ وہ اس اصول کا اطلاق بھی مختلف قوموں میں دکھا کر اس سے علیٰ وجہ البصیرت اطمینان حاصل کریں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم فلسفہ تاریخ اور قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں بیان کرتا ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب پر غور وتفحص کرنے کے لئے خود قرآن کریم نے اتنا مواد فراہم کر دیا کہ اگر کوئی مفکر اس موضوع پر ساری تحقیق کرتا رہے تو اس کو قرآن کریم سے باہر جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ مزید اطمینان کے لئے تاریخ داں مفکرین کے نتائج کو بھی دیکھ لے کہ ان کی موجودہ فکر بھی قرآن کریم کے اصولوں کی تائید کرتی ہے؟ تاریخی نظائر اس لئے دیئے گئے ہیں کہ مفکرین تاریخ یہ دیکھ سکیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا تھا تو ان کا انجام کیا ہوا؟

سورۃ مومن میں ہے o أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (40/21-30/9) یہی الفاظ تین مرتبہ آئے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے زمین پر چل پھر کر یہ نہیں دیکھ لیا کہ جو قومیں ان سے پیشتر ہوئی ہیں ان کا کیا انجام ہوا؟۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے o وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ o (24/34) o ہم نے تو تمہارے پاس ایسی واضح روشن آیتیں بھیجیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے حالات اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت کی باتیں نازل کیں o اس آیت کریمہ میں مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ کا ترجمہ ”جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے حالات رقم کیا گیا ہے۔ اس حصہ کا ترجمہ حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے فرمایا ”اور کچھ حال ان کا جو ہو چکے تم سے پہلے“ آیت کے اس حصہ کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مواقع پر کی ہے۔ اور ہر جگہ اس حصے کی وضاحت میں قوموں کے عروج وزوال کا کوئی نہ کوئی سبب بیان کیا ہے نمبر (40/21-30/9) دونوں میں ارشاد ہے کہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح قوانین کے ساتھ آتے رہے، لیکن انہوں نے ان کے احکام سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ قانون الٰہی کے وجود سے انکار ان کی تباہی کا سبب بنا۔

وہ ازمنہ و اعصار جن میں حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ اور جن میں حکومت الٰہی قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہیں کو قرآن کریم نے اَیَّامِ اللّٰہِ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے o وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ o (14/5) o اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تاکہ قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور انہیں اللہ کے وہ دن یاد دلائے اس میں شک نہیں کہ اس میں تمام صبر شکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں o یہاں موسیٰ کی جدوجہد اور زوال سے عروج کی طرف ان کے دنوں کو اَیَّامِ اللّٰہِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جن کو یاد دلانے کی تاکید ذَکِّرْھُمْ میں آتی ہے۔ اس حقیقت کو (11/120) میں ذکریٰ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

تصریف آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کریمہ o وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ o (15/87) میں جو الفاظ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي کے آئے ہیں ان کا وہی مفہوم ہے جو دوسری جگہ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ (24/34) یا اَیَّامِ اللّٰہِ اور ذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ کا آیا ہے، یعنی قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی شواہد و نظائر۔ آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہیں قرآن کریم دیا اور اس قرآن کریم میں ہی وہ بہت سے (سَبْعًا) تاریخی واقعات و اصول بیان کر دیئے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کریم قوموں کے عروج و زوال کے جو اسباب بیان کر رہا ہے وہ بالکل درست ہیں اور ان سابقہ اقوام کے حالات ان کی تائید کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ جن اقوام تک اللہ تعالیٰ کا پیغمبر یا اس کی وحی پہنچی ہے صرف ان سے ہی مواخذہ کیا جائے گا۔ جن اقوام تک وحی الٰہی نہیں پہنچی ان کی گرفت و مواخذہ نہیں لے گا۔ یہ بات ہے بھی معقول کہ جن کے پاس تعلیم ہی نہ جائے ان کا محاسبہ کیسا؟ ارشاد ہوتا ہے كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ o قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا (67/8.9) جب اس (دوزخ) میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو ان سے داروغہِ جہنم پوچھے گا، کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں ہمارے پاس

ڈرانے والا تو آیا تھا مگر ہم نے اس کو جھٹلا دیا۔ اسی لئے حضورؐ کو حکم تھا۔

وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ (14/44) اور اے رسول لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس دن ان پر عذاب نازل ہوگا۔ دوسری جگہ ارشاد ہےo قُمْ فَأَنذِرْo (74/2)o اے رسول اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤo نیز یہ حکم ہواo وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا (6/51)o اے رسول اس قرآن کے ذریعے تم ان لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ وہ اکھٹے کئے جائیں گے۔

اسی طرح کی اور متعدد آیات جن میں حضورؐ کے لئے پوری انسانیت کو قرآن کریم کے ذریعے ڈرانے کا حکم ہے، یہ حکم صرف حضورؐ کے دور کے ساتھ مختص نہیں تھا۔ کیونکہ یہ تمام اقوام و امتوں پر حجت ہے۔ آج کے دور کی اقوام بھی جن کے پاس وحی نہیں پہنچ سکی وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تک کوئی نذیر یا اس کی وحی کی تعلیم نہیں آئی، اس لئے ہم گرفت یا مواخذہ سے باہر ہیں آیۃ کریمہ (6/51) نے وضاحت کردی کہ حضورؐ قرآن کریم ہی کے ذریعہ ڈراتے تھے اور جب تک قرآن کریم باقی ہے مومنین پر فرض ہے کہ وہ دیگر اقوام کو ان کے غلط اعمال کے تخریبی نتائج سے ڈرائیں یہ ہر مومن پر قیامت تک فرض رہے گا۔

بالکل یہی صورت وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ (14/5) کی ہے انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ یہ ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم اس کشمکش حق و باطل وحکومت الٰہی کے قائم کرنے کی جدوجہد کو ہمیشہ یاد رکھیں اور جو جماعت بھی دین کے تمکن کے لئے اٹھ کھڑی ہو وہ قراان کریم میں مذکوران قوانین کو سامنے رکھے جن کے ذریعے انبیاء کرام نے دین قائم کیا تھا۔ اور ان ہی قوانین کو اس جماعت کا لیڈر اپنی جماعت کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کی یاددھانی کراتا رہے۔ اور یہی وہ مَثَلًا مِّنَ الَّذِينَ خَلَوْا اور سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي ہیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔

ماہ مئی 2007ء

قرآن کریم کے موجودہ تراجم

کچھ عرصے پیشتر تک عام طور پر علماء کرام ہی قرآن کریم کا مطالعہ کرتے تھے۔لیکن یہ دور اس معاملہ میں خوش نصیب ہے کہ اس دور میں علماء کرام کی یہ اجارہ داری ختم ہوگئی ہے اور علماء کرام کے علاوہ عام مفکرین (Laymem) بھی براہ راست قرآن کریم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بلکہ علماء کرام کے درس نظامی میں تو اٹھارہ علوم ہوتے ہیں، جس میں قرآن کریم صرف تبرکا و تبرعاً ہ شامل ہوتا ہے وہ بھی صرف سورۃ بقرہ، لیکن موجودہ دور میں جو غیر علماء قرآن کریم سے دلچسپی رکھتے ہوئے، اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں، وہ اپنی ساری عمر اس کے مطالعہ میں صرف کر دیتے ہیں۔علماء کرام صرف سابقہ تراجم پر اکتفاء کرتے تھے۔اس کے علاوہ موجودہ حالات نے مفکرین قرآن کریم کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سابقہ تراجم و تفاسیر پر نظر ثانی کریں۔اس کے علاوہ دو اور امور بھی قرآن فہمی میں مدومعاون ہوئے ہیں۔ایک تو رسل و رسائل عام ہوگئے ہیں۔ کثرت سے مسلمان اپنے ممالک چھوڑ کر، یورپ و امریکہ میں آباد ہو رہے ہیں۔ یہاں انہیں ان ممالک کے حالات سے سابقہ پڑا اور ان کا Vision بھی وسیع ہوا۔جس PRIVILAGE سے ہمارے علماء کرام محروم تھے۔ دوسری بات یہ کہ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں عام آگاہی (AWARENESS) ہوئی ہے۔اور موجودہ قرآنی مفکرین نے اس نکتہ کو بھی پیش نظر رکھا۔نیز خود خواتین نے بھی قرآن کریم میں غور وخوض شروع کر دیا ہے اور قرآن کریم پر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔جس کی مثال سابقہ ادوار میں کہیں دکھائی نہیں دیتی، اس تمہید کے بعد اب اصل خبر کی طرف توجہ فرمائیں۔

ڈیلی ٹائمز مورخہ 2007-03-26 میں ایک خبر بعنوان QURAN

(قرآن کا وہ ترجمہ TRANSLATION IYNITES CONTROVERSIES
جس نے آگ بھڑکا دی) طبع ہوئی ہے۔ یہ نہایت مختصر سا تراشہ خالد حسن صاحب کا تحریر کردہ ہے۔
خالد حسن صاحب عرصہ دراز سے واشنگٹن میں مقیم ہیں اور معروف صحافی ہیں، ان کے مضامین اور
آرٹیکل بہت کثرت سے کئی اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں زیادہ محنت درکار ہوتی
ہے، اس لئے اس مختصر تراشہ کا GIST تحریر کیا جاتا ہے۔

(اس اخبار میں تحریر ہے) ایک ایرانی خاتون لیلیٰ بختیار نے قرآن کریم کا انگریزی
ترجمہ کرنے میں سات سال لگائے ہیں۔ ان کا یہ انگریزی ترجمہ۔ قاضی پبلی کیشنز ''شکاگو'' سے
آئندہ سال طبع ہوگا۔ یہ خاتون (لیلیٰ بختیار) جب آیہ کریمہ وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ (4/34) اور وہ عورتیں جن کے سرکش
ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے تو اُنہیں سمجھاؤ (اور اس پر نہ مانیں تو) تم ان کے ساتھ سونا چھوڑ
دو (اور اگر اس پر بھی نہ مانیں) تو تم اُنہیں مارو۔ پر پہنچی تو اُنہیں وَاضْرِبُوْهُنَّ کا ترجمہ مارنا درست
معلوم نہیں ہوا۔ اُنہوں نے سارے تراجم دیکھے سب میں اس کا ترجمہ مارنا یا اس کا ہم معنی لفظ لکھا ہوا
تھا۔ لیکن چونکہ یہ مترجمہ (لیلیٰ بختیار) اس ترجمہ سے مطمئن نہیں تھیں تو انہوں نے مشہور عربی
۔انگلش لغت، جو ولیم لین (W.LANE) کی تحریر کردہ ہے وہ (CONSULT) کی۔ لین نے
اپنی ڈکشنری میں ضرب کے معنی مارنے کے بجائے GO AWAY کئے ہیں۔ اس ترجمہ پر
مترجمہ کا دل ٹھک گیا اور اُنہوں نے سوچا کہ جب رسول اللہ کو اپنی ازواج سے کوئی دقت پیش آتی
ہوگی تو یقیناً وہ اُن کو مارتے نہیں ہوں گے، تو عام مسلمان اپنی بیویوں کو کیوں ماریں۔

قرآن کریم کے تراجم کا دارومدار عربی گرئمر اور احادیث پر ہوتا ہے۔ اس ترجمہ پر
اعتراض کرنے والے حضرات لیلیٰ بختیار کے ترجمے پر دو نقطہ ہائے نظر سے اعتراض کر رہے ہیں۔
تاہم لیلیٰ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں پہلے سے ہی ان اعتراض کی توقع تھی۔ کیونکہ ان کا خیال
تھا کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ ترجمہ ایک امریکن باشندہ کا ہے اور وہ بھی عورت (لہٰذا یہ

درست نہیں ہوسکتا)NYT (نیویارک ٹائمز نے لکھا ہے کہ یہ سہ مراحل پروگرام عرب کے اس معاشرے میں جب قرآن نازل کیا گیا تھا، ایک اصلاحی پروگرام تھا۔ اور اس آیت میں مردوں کو مارنے کی ایک عام اجازت بھی نہیں تھی بلکہ ان کو ایک ایسی چھوٹی شاخ سے مارنا تھا جو مسواک کے برابر ہوتی ہے۔

مصر کے مفتی اعظم شیخ علی قوما، نے کہا کہ'' آیات کو حالات کے مطابق دیکھنا چاہیۓ MUSTBI VIEWED THROUGH PRISM OF ERAانہوں نے نیز یہ بھی فرمایا'' ہمارے دور میں بیویوں کو مارنا بالکل غیر مناسب ہے کیونکہ معاشرہ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے مزید اختلافی اضافہ ہوگا اور انتشار پھیلے گا۔'' یہاں آ کر، اس خبر کا خلاصہ ختم ہو جاتا ہے۔ پیشتر اس سے کہ ضرب کے لفظ کی تشریح کی جاۓ دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب بھی شان نزول اور روایات سے صرف نظر کر کے قرآن خالص کو سامنے رکھ کر غور کیا جاۓ گا، تصریف آیات کے ذریعے قرآن کریم کا نظریہ خود اُبھر کے سامنے آ جاتا ہے۔ یہ خاتون (لیلیٰ بختیار) ایرانی علماء سے زیادہ قابل نہیں ہیں اور نہ ہی عربی زبان پر بہت عبور ہے، لیکن یہ صحیح نتیجہ پر صرف اس وجہ سے پہنچ گئیں کہ وہ روایات اور شان نزول میں نہیں اُلجھیں۔

دوسری قابل توجہ بات جو NYTنے QUOTE کی ہے، وہ مفتی اعظم شیخ قوما کا بیان ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ آیات قرآنی کا مطالعہ اپنے حالات کے پیش نظر کرنا چاہیۓ۔ اس بات سے علماء کرام کے موقف کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے علماء کرام ہر وقت سلف صالحین کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ کہ چونکہ سلف صالحین نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے، اب اس لئے اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

اب اصل موضوع آیہ کریمہ کی تشریح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ضرب کے کئی معنی ہیں۔ اور قرآن کریم نے بھی اس لفظ کو متعدد معانی میں استعمال کیا ہے۔ ان کے حوالوں سے مضمون میں طوالت ہوگی۔ لیکن ضَـــرَبَ کے معنی خود قرآن کریم نے بتاۓ ہیں'' بیان

کرنا، کسی بات کو بتانا'' بھی کئے ہیں ۔ جو یہاں سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں ۔ عربی زبان میں (بلکہ عموماً تمام زبانوں میں) چونکہ الفاظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں ۔ اس لئے قرآنی آیات میں وہ معانی لینے چاہئیں جو اس اس مقام پر سب سے زیادہ مناسب ہوں ۔ اور یہی چیز تدبر قرآن کہلاتی ہے ۔

اس آیہ کریمہ میں ضرب لفظ کے معنی ہمارے علماء کرام ''مارنا'' لیتے ہیں ۔ کہ اگر بیویاں نافرماں ہوں، تو ان کو شوہر ماریں ۔ لیکن یہ معنی یہاں درست نہیں ہیں ۔ دو ذاتی واقعات کمترین تحریر کرتا ہے ۔ ایک بہت بڑے عالم دین، جو کمترین کے استاد بھی تھے اوران سے یہ کمترین اس زمانہ میں حماسہ و متنبی (عربی دواوین) پڑھ رہا تھا، ان سے اس آیہ کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی ۔ میں نے ضرب کے معنی ''بیان کرنا'' کے تجویز کئے ۔ انہوں نے فرمایا کہ بے شک ضرب کے معنی بیان کرنے کے آتے ہیں، لیکن یہ صرف اس وقت آتے ہیں جبکہ اس کے ساتھ مثلاً کا لفظ بھی استعمال ہو، اور چونکہ یہاں مثلاً کا لفظ ساتھ نہیں آیا ہے، اس لئے اس آیت میں یہ معنی نہیں ہو سکتے ۔ گھر واپس آکر قرآن کریم دیکھا ۔ یقیناً وہاں زیادہ مقامات پر ضرب کے ساتھ مثلاً کی PREPOSITION استعمال کی گئی ہے ۔ لیکن میں نے مزید جستجو کی تو معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں، کیونکہ لغات القرآن میں وہ آیات دی گئی ہیں جن میں ضرب کے معنی قرآن کریم نے 'بیان کرنا' کئے ہیں لیکن وہاں مثلاً کا لفظ ساتھ نہیں لایا گیا ۔ ارشاد ہوتا ہے كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (13/17) اسی طرح اللہ حق و باطل کی بات سمجھاتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا (43/58) یہ لوگ تجھ سے بات نہیں بیان کرتے بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں ۔ تعجب یہ ہے کہ ان دونوں مقامات میں تمام مترجمین نے ضرب کے معنی خود بیان کرنے کے لئے ہیں ۔ مارنے کے نہیں لئے ۔ میں نے یہ بات اپنے قابل صد احترام استاد کے سامنے پیش کی اور آیات کے حوالہ مع علماء کرام کے تراجم کے پیش کئے ۔ لیکن وہ ماننے کو آمادہ نہیں ہوئے اور لمبی بحث میں پڑھ گئے ۔

دوسرا موقع ایک مشہور اور کامیاب وکیل کے ساتھ ہوا ۔ وہ میرے دفتر میں تشریف لائے

اور وہ اتفاق سے کسی ازدواجی مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ وہ شوہر کی طرف سے وکالت کر رہے تھے، اور اس آیت کے حوالے سے بیوی کو مارنے کی اجازت کو PLEAD کر رہے تھے مگر یہ اصرار تھا کہ صرف ڈنڈی یا مسواک سے مار سکتے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے آیت کا صحیح مفہوم پیش کیا، اور اپنا نظریہ بتایا کہ میرے نزدیک بیویوں کو مارنا چوڑھوں، چماروں کا کام ہے شریف آدمی کو اس سے کیا تعلق۔ آیت کریمہ کا جو مفہوم میں نے عرض کیا انہوں نے فوراً قبول کیا اور یہ عقلی طور پر بھی درست تھا۔ اور شرافت سے بھی نزدیک۔ انہوں نے اس مفہوم کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی بہت تعریف کی۔

آیہ کریمہ وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ ۔عورتیں اگر تمہیں ان کی نافرمانی کا خوف لاحق ہو جائے تو انہیں نصیحت کرو (اگر وہ نہ مانیں) تو انہیں بستروں میں الگ کردو اور ان سے (اس علیحدگی کا) سبب بیان کرو۔ آیہ کریمہ میں وَاضْرِبُوهُنَّ کے الفاظ، ترتیب کے لحاظ سے وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے بعد آئے ہیں کہ تم انہیں بستروں میں الگ کرنے کے بعد، ان پر اس اقدام کی وجہ بیان کرو کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تاکہ تمہارا یہ قول اثر انداز ہو۔ مثلاً اگر تم نے اس کو کسی کے ساتھ دیکھا ہے تو آپ بیان کریں کہ تم فلاں شخص کے ساتھ جا رہی تھیں، اور مجھے اس وجہ سے شک ہوا ہے۔ اس کے جواب میں بیوی آپ کو صحیح صورت حال سے اطلاع دے گی۔ ممکن ہے کہ آپ کو غلطی لگی ہو، اور اس طرح وجہ بتانے سے غلط فہمی دور ہو جائے۔ بیوی کو ناراضگی کی وجہ بتانی نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے یہاں مارنے کے بجائے افہام و تفہیم، اور شکوک و شبہات بیان کرنا، زیادہ بہتر ثابت ہوں گے۔

لین (LANE) نے اس کا ترجمہ GO AWAY کیا ہے۔ یوں تو اس کا ترجمہ جانا ہی ہے، لیکن محاورہ میں یہاں یہ ترجمہ ہے کہ اگر وہ نہ مانیں تو ان کو دفع کردو، اس نے بھی اس کا ترجمہ مارنا نہیں کیا، لیکن تصریف آیات سے یہاں بہترین ترجمہ "بیان کرنا" ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

-

ماہ جون 2007ء

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

کیا اوامر ونواہی، انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیئے جا سکتے

یوں تو قرآن حکیم نے اپنے وحی الٰہی ہونے کے خود بھی دلائل و براہین فراہم کئے ہیں۔ لیکن ان دلائل کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عقل انسانی اس کو وحی الٰہی ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے اوران مقامات کی وجہ سے ہی اس کی تعلیم کا بے مثل و بینظیر ہونا واضح ہوتا ہے۔انسان اس بات کو بخوشی تسلیم کر لیتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر انسان ہمہ وقت اپنا ہی مفاد پیش نظر رکھتا ہے،اور ہر وقت اس کوشش میں مبتلاء ہے کہ ؎

تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

اپنے بچوں کی پرورش اور ایثار میں بھی اس کا ذاتی مفاد مضمر ہوتا ہے اور یہی ذاتی مفاد اس کے قومی مفاد میں بھی مضمر ہوتا ہے۔آج جبکہ علوم کی ترویج عام ہے اور عقل انسانی نے ترقی کر کے،فطرت کی قوتوں کو بڑی حد تک مُسخر کر لیا ہے۔اب بھی عقل انسانی اپنی قوم کے مفادات کے معیار سے بلند نہیں ہو سکی ۔آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی آپ غور فرمائیں تو ہر قوم کا وہی سب سے بڑا ہیرو (HERO) ہے جس نے ساری انسانیت کو غارت کر کے،اپنی قوم کو آگے بڑھایا ہے۔ہمارے ہی پڑوسی ملک میں مہاتما گاندھی ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔لیکن کون نہیں جانتا کہ وہ ہم مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے کے لئے ہر وقت ساعی تھے۔ لندن میں پارلیمنٹ کے بالکل سامنے رچرڈ دی لائن ہارت (RICHARD THE LION HEART) کا مجسمہ ہے جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے اور بہت بڑی تلوار اس کے ہاتھ میں

ہے۔ کچھ ہی آگے بڑھ کر LORD CANNING (لارڈ کیننگ) اور چرچل کے مجسمے ہیں۔ یہ انگریزوں کے نہایت بلند مقام کے حامل ہیروز ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ انہوں نے دو صدیوں تک ساری انسانیت کا گلا گھونٹ کر، اس کا خون پیا ہے اور خاص طور پر ہمارے برصغیر سے ارب ہا ارب روپیہ انگلستان گیا ہے۔ وہاں کی عظیم الشان عمارات اور زیر زمین ٹیوب لائن پر یہاں کے غریب کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ انگریزی دور میں سالانہ بجٹ DISCUSS نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ یہاں کی دولت انگلستان لے جانے میں کسی کو جوابدہ نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود انگریز قوم خود کو انسانیت کا سب سے بڑا خادم خیال کرتی ہے۔ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کے لئے أَكَابِرَ مُجْرِمِيهَا (6/123) فرمایا ہے۔

آپ اس پیش کردہ تناظر کے پس منظر میں اس بات پر غور فرمائیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر قرآن کریم کا ارشاد عالی ہے o كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (3/110)o تم بہترین امت ہو کہ تمہیں انسانیت کے فائدہ کے لئے اٹھایا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ عربی زبان میں لام (ل) اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدہ کے لئے ہو۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ (2/286) جو کوئی اچھا کام کرے گا وہ اس کے فائدے کے لئے ہوگا۔ اس آیہ کریمہ میں مسلمانوں کے وجود کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ تم ساری انسانیت کے فائدے کے لئے اٹھائے گئے ہو۔ آپ ساری انسانیت کی، اور خصوصاً تمام مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ فرمالیں آپ کو کسی جگہ کسی مذہب یا کسی قوم کے لٹریچر میں اس طرح کے الفاظ ہرگز ہرگز نہیں مل سکتے۔ کہ اس قوم کا مقصد حیات ہی انسانیت کی خدمت ہو، یہ قرآن کریم کا ہی مقام بلند و عالی ہے کہ اس نے اس وقت ساری دنیا کو للکار کے اعلان کیا کہ مسلمانوں کا تو مقصد حیات ہی ساری انسانیت کے لئے فوائد اور منافع فراہم کرنا ہے۔

یہ وہ مقامات ہیں جہاں قرآن کریم کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ساری

انسانیت کا مفاد ذہن انسانی کے فہم سے بالاتر ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ، یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔جس سے مراد یہ ہے کہ تم اس لئے خیر امۃ ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، اور منکر سے روکتے ہو، یہ اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اس منصب عالی پر تم نسل ونسب کی وجہ سے سرفراز وسربلند نہیں ہوئے ہو، جیسا کہ اہل کتاب نے اپنے لئے گمان کیا ہوا تھا۔ بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمہیں اس کا شرف عنایت کیا ہے۔آیہ کریمہ اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ یہ منصب صفات و ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے۔کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو باندھ نہیں دیا ہے کہ لازماً یہ اسی کے ساتھ بندھا رہے۔ پھر مسلمانوں کو مزید واضح کیا گیا ہے کہ ان کا لازمی فریضہ ہے کہ ٥ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (3/104)٥ اور لازماً تم ایک ایسی جماعت بن کے رہو، کہ وہ تمام نوع انسانی کو قرآن کی دعوت دے (22/78) معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو خیر امت صرف اس وقت تک قرار دیا ہے جب تک وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ہمارے ہاں ہمارے علماء کرام حسب معمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دینی مفہوم کو خیر باد کرکے، اس کا وہ مذہبی مفہوم اختیار کرتے ہیں جوان کے لئے آسان وسہل بھی ہے، اور جس سے ان کا تسلط بھی قائم رہتا ہے، البتہ قوم، اس مفہوم کی وجہ سے قعر مذلت میں جا پڑتی ہے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن کریم کی بڑی جامع اصطلاح ہے۔آپ کے سامنے اس کا دینی مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ جامع اصطلاح ان ہی الفاظ میں کئی مقامات پر استعمال کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ٥ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥(3/104) حضرت مولانا اصلاحی صاحب نے اپنی مشہور تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے ''اور چاہیئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی

دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ یہ ترجمہ بالبدایت غلط ہے اور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کے تمام تراجم میں تقریباً یہی ترجمہ کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہمارے یہ محترم و مخلص علماء کرام عربی کے ماہر نہیں تھے، ان حضرات کو عربی زبان اور عربی ادب پر کامل عبور ہوتا ہے اور حضرت مولانا اصلاحی صاحب کا تو عربی ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ اصل وجہ پھر وہی ہے کہ ان حضرات کے سامنے دین ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے سامنے مذہب ہوتا ہے، اس لئے یہ اس قسم کے تراجم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہمارے علماء کرام اس آیہ کریمہ کے ترجمہ میں جو تسامح کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اول تو یہ خیر کا ترجمہ قرآن کی بجائے نیکی اور بھلائی کردیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود قرآن کے لئے لفظ خیر استعمال کیا ہے ارشاد ہوتا ہے o وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْراً (16/30) o اور جب پرہیزگاروں سے کہا کہ تمہارے رب نے کیا اتارا ہے تو انہوں نے کہا خیر۔ یہاں قرآن کریم نے اپنے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہمارا ایمان بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ قرآن کریم کی جگہ نیکی اور بھلائی ترجمہ کرنے سے یہ حضرات یہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ یہ پھر خود نیکی اور بدی کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور اس طرح خدائی اختیار حاصل کرنے کا چوردروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس کا درست ترجمہ یہ ہے کہ تم ایک ایسی امت ہو کہ ساری انسانیت کو قرآن کریم کی طرف بلاتی ہو۔

دوسرا تسامح جو یہ حضرات کرام کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیت کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ "اور چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو" بلکہ اس کے معنی یہ ہیں " کہ تم ہی وہ جماعت ہو" علماء کرام کا ترجمہ غلط ہونے کی وجہ عرض کی جاتی ہے۔ جس میں معمولی سے عربی گرامر INVOLVE ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا سی توجہ سے اس کو ملاحظہ فرمالیں تو بات آپ پر واضح ہوجائے گی۔

عربی زبان میں حرف 'مِن' دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک تو بعض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مِّنْ كَلَّمَ اللَّهُ (2/253) ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام

ہوا۔ یعنی کل میں سے بعض، اسے من تبعیضیہ کہتے ہیں اسی طرح ارشاد ہوتا ہے وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ o (40/79) اور چار پایوں میں سے بعض کو تم کھاتے ہو o دوسرا استعمال اس کا بیانیہ ہوتا ہے۔ اس کو من بیانیہ برائے استغراق کہتے ہیں۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (22/30) سب کے سب بتوں کی نجاست سے بچو۔ یہاں اگر من تبعیضیہ لیا جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا کہ بعض بتوں کی نجاست سے بچو، جو بالکل غلط ہوگا۔ اس لئے ہمیشہ من تبعیضیہ اور من بیانیہ کا فرق پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے o وَالَّذِيْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ (35/31) o اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل حق ہے۔ اس آیت میں بھی من بیانیہ ہے اور کسی صورت میں بھی تبعیضیہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لئے یہاں من بیانیہ ہی لیا جا سکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ بھی وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

یہاں دو آیات من بیانیہ کی اور دو آیات من تبعیضیہ کی دے کر من بیانیہ اور من تبعیضیہ کا فرق قرآنی آیات سے واضح کر دیا گیا ہے۔

آیہ زیر غور (3/103) میں من کے معنی من بیانیہ کے لئے جائیں گے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم (پوری کی پوری امت) وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے گی۔ قرآن کریم کی رو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری کی ساری امت کا ہے نہ کہ امت میں سے کسی خاص ایک گروہ کا۔ ہمارے علماء کرام نے اپنے مخصوص گروہ کے جواز کے لئے 'منکم' کے ترجمہ میں من تبعیضیہ قرار دے کر ایک خاص گروہ کے لئے امر و نہی مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے چند آیات بعد ارشاد ہوتا ہے o كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (3/110) o تم بہترین امت ہو کہ

لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہو کہ تم (پوری اُمت) اچھے کام کا حکم کرتے ہو، اور بُرے کام سے روکتے ہو۔ اس آیہ کریمہ میں **امر بالمعروف ونهي عن المنكر** کا فریضہ پوری امت کا بتایا گیا ہے نہ کہ امت کے کسی خاص طبقہ کا۔ اگر آیت (3/103) میں یہ فریضہ صرف علماء تک محدود کر دیا جائے تو ان دونوں آیت میں تضاد واقع ہوگا۔ جو قرآن کریم کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ قرآن میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوسکتا

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ ہے اور اس فریضہ کو اسلامی حکومت ہی ادا کرسکتی ہے۔ اس کو انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا سورۃ حج میں ارشاد ہوتا ہے oالَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ o(22/41) اس آیہ کریمہ کے چند متداول تراجم پیش کئے جاتے ہیں تا کہ اس کے بعد ان پر تبصرہ کیا جاسکے۔ یہ آیہ کریمہ اقامت صلوۃ ایتائے زکوۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے عروۃ الوثقی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور زکوۃ اور حکم کریں بھلے کام کا، اور منع کریں بُرائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند۔

(2) وہ کہ جب ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو نماز قائم کریں گے اور زکوۃ ادا کریں گے اور بھلائی کا حکم ادا کریں گے اور بُرائی سے باز داشت کریں گے۔ تفسیر مظہری جلد 8، ص 87۔

(3) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو روئے زمین پر قابو دیدیں تو (بھی) یہ لوگ پابندی سے نماز ادا کریں گے اور زکوۃ دیں گے اور اچھے اچھے کام کا حکم کریں گے اور بُری باتوں سے (لوگوں) کو روکیں گے۔ اور (یوں تو) سب کاموں کا انجام اللہ کے ہی اختیار میں ہے۔ ترجمہ حافظ فرمان علی صاحب۔

(4) جلالین شریف میں ہے ''یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دیدیں (دشمن

کے مقابل میں) ان کی مدد کرے، تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔ اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کام کا حکم دیں اور بُرے کام سے منع کریں۔

(إِن مَّكَّنَّا میں جو شرط تھا أَقَامُوا الصَّلَاةَ اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے) قوسین کی عبارت بھی جلالین کی ہے۔ ہمارا اضافہ نہیں ہے۔

صرف چار آیات بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ان چاروں میں، اقامت صلوٰۃ ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اقتدار ملنے کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل نہیں تو وہ ان چاروں فرائض میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرسکتی کوئی بھی مغلوب قوم یہ امور سرانجام نہیں دے سکتی۔ جلالین نے بھی اپنی عربی عبارت میں ''**جواب الشرط وھُوَ جوابُه** تحریر کیا ہے جس کا ترجمہ اوپر قوسین میں درج کردیا گیا ہے اور بات بالکل واضح کردی کہ ان چاروں چیزوں کے لئے اقتدار اور اپنی حکومت شرط PRE-REQUISITE ہے۔ اور اقتدار و حکومت کے بغیر یہ چاروں چیزیں سرانجام نہیں دی جاسکتیں۔

قرآن کریم کے دینی مفہوم کی رو سے قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین ہی معروف و منکر ہوتے ہیں۔ ان کا اجراء اسلامی حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے جو حدود و اقدار متعین کردیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ لیکن اسلامی حکومت اپنے دور کے حالات کے مطابق ان احکام کو جاری کرتی ہے یہی احکام معروف و منکر ہوتے ہیں۔ اور POLITICAL PARLANCE میں یہی HUMAN RIGHTS ہوجاتے ہیں، اور اسلامی TERMINOLOGY میں یہی سنت کہلاتے ہیں۔ جن میں زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

یہ بات مثال کے ذریعے اس طرح واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے جنسی تمتع کے لئے نکاح کو شرط قرار دیا ہے کوئی اسلامی حکومت اس شرط کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ بغیر نکاح کے جنسی تمتع قطعاً ممنوع ہوگا۔ البتہ قرآن کریم نے نکاح کے لئے مہر، بلوغت، اعلان تراضی مابین وغیرہ شرط قرار

دیئے ہیں۔اسلامی حکومت اپنے حکم کے ذریعہ، مہر کی رقم کا تعین کرے گی، اسی طرح اسلامی حکومت بلوغت کی عمر خود مقرر کرے گی، اعلان، تراضی مابین کے قواعد بھی جاری کرے گی۔ان احکامات پر عمل کرنا لازمی ہوگا، اور یہی اسلامی حکومت کے معروف ہوں گے اور ان کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہوگی۔یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی حکومت میں صرف معروف کی اطاعت لازمی ہوگی۔اس کے علاوہ عوام بالکل آزاد ہوں گے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کو جس STYLE پر گذارنا چاہیں گذاریں، یہی بات آیت کریمہ (60/12) میں بیان کی گئی ہے جو ہمارے موقف کی موید ہے اسلامی حکومت میں رویت ہلال کمیٹی وغیرہ ادارے نہیں ہوتے۔حکومت خود اعلان کردے گی کہ فلاں دن عید ہے، یہ حکومت کا امر بالمعروف ہے تمام پبلک پر لازم ہوگا کہ اسی روز عید منائے۔اس طرح اور بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں۔

ہمارے محترم علماء کرام جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جاری ہونے پر اصرار کرتے ہیں، انہیں لازم ہے کہ وہ پہلے اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش فرمائیں پھر اس اسلامی حکومت کے ذریعے معروف اور منکر کا اجراء کریں جس میں پوری امت شامل ہوتی ہے نہ کہ علماء کا کوئی خاص گروہ۔علماء کرام کو اس بات کا اجارہ نہیں ہے کہ وہ خود معروف اور منکر کی فہرستیں بنا کر، ان کو جاری کرنے پر اصرار کریں۔ہمارے علمائے کرام کو گانا ناپسند ہے، وہ اس کو منکر میں شامل کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں کہیں گانے کو حرام قرار نہیں دیا۔اسی طرح ہر وہ چیز جو مولوی حضرات کو ناپسند ہو وہ منکر نہیں بن سکتی۔معروف اور منکر صرف اسلامی حکومت ہی طے کرسکتی ہے اور ان پر اجتماعی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے۔معروف و منکر پر انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ٥

ماہ جولائی 2007ء

ایرانی وزیر داخلہ کا بیان

قم میں علماء کی ایک کانفرنس میں وزیر داخلہ ایران جناب مصطفیٰ پور محمدی صاحب نے ایک بیان دیا جس کو وہاں کے ایک اخبار ''کارگذران'' نے شائع کیا۔ جناب وزیر موصوف نے فرمایا کی جوانوں کی بے اعتدالیوں کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ عارضی (TEMPORARY) نکاح کی رسم کو ترویج دی جائے ، انہوں نے فرمایا کہ اسلام تمام انسانی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے اور موقت نکاح اسی (جنسی ضرورت) کا ایک حل ہے۔ ایران کو چاہئے کہ اس رسم کو ترویج دیں اور علماء کو چاہئے کہ اس معاملہ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ''خدا کے اس حکم'' کو معاشرے میں جاری کرنے کے اقدامات پیش کریں۔ (ڈیلی ٹائمز مورخہ۔3/6/07)

ادارہ صوت الحق کا جیسے کہ قارئین کرام کو علم ہے کسی ملک، قوم یا فرقہ سے قطعاً کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اِس کا تعلق صرف اور صرف قرآن کریم سے ہے اور بس۔ اسی نقطہ نظر سے یہ سارے معاملات کو دیکھتا ہے۔ قرآن کریم

کے متعلق دنیا کے کسی گوشہ میں بھی گفتگو ہو، یہ ادارہ قرآن کریم کے متعلق نظریات و بیانات کی تحسین وتوصیف کرتا ہے۔ البتہ اگر کوئی اتہام یا الزام قرآن کریم پر لگایا جاتا ہے تو ادارہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے کہ اس معاملہ میں قرآن کریم کا درست نظریہ بیان کردے۔ یہ ادرہ صرف اسی حد تک جاتا ہے، یہ کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ کوئی شخص کون سے نظریات اختیار کرے۔

اسلامی لٹریچر میں اس عارضی نکاح کو متعہ کہا جاتا ہے۔اس کی حرمت وحلّت کا مسئلہ ہم مسلمانوں میں صدر اول سے آج تک مختلف فیہ ومتنازعہ فیہ چلا آرہا ہے۔اس موضوع پر تمام تفاسیر میں طبع آزمائی کی گئی ہے اور حسب دستور علماء کرام کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے اور وجہ بالکل ظاہر ہے۔روایات کے ڈھیر میں بالکل متضاد احادیث و روایات موجود ہیں کہ قاری سوائے حیرت و تحیّر کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ ہمارے نزدیک روایات کسی مسئلہ کا حل پیش نہیں کرسکتیں۔ البتہ فریقین (قائلین ومنکرین متعہ) نے اس معاملہ کو سر کرنے میں قرآن کریم کو بھی ساتھ ساتھ لپیٹنے کی کوشش کی اور وہ اس طرح کہ آیت تو قرآن کریم کی لی اور تفسیر اس کی موضوع روایات سے کی۔اس سے معاملہ پھر الجھ گیا۔لیکن اگر آپ صرف قرآن کریم سامنے رکھیں یہ مسئلہ صرف ایک ہی آیت سے واضح ہو جاتا ہے۔اس لئے اس مضمون میں روایات سے

صرف نظر کر کے صرف قرآن کریم کا حکم پیش کیا جاتا ہے کہ خود قرآن کریم کی یہی روایت ہے کہ o وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10) o تمہارا کسی معاملہ میں اختلاف ہو اس کا حکم اللہ کے ذمہ ہے۔

متعہ ایک فقہی اصطلاح ہے جس کے معنی کسی مرد اور عورت کا وقتی طور پر مباشرت کے لئے نکاح کر لینا اور اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دے دینا ہے۔ وہ وقت معینہ اور مقررہ کے گذر جانے کے بعد یہ ''نکاح'' از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں ایک سہولت ہے، یہ کہ قائلین متعہ (یعنی شیعہ حضرات) روایات کے علاوہ کہ جہاں ان کا پلڑا بھاری ہوتا ہے، قرآن کریم سے صرف ایک ہی مقام سے استناد کرتے ہیں، اگر اس مقام کی بخوبی تشریح کر دی جائے، تو مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مقام پانچویں پارے کی بالکل ابتداء ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

o وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (4/24) o اور وہ عورتیں حرام ہیں جو قیدِ نکاح میں ہوں مگر یہ کہ وہ

تمہاری ملک یمین بن جائیں، یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔ ان کے ماسوا جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں، اس طرح کہ تم اپنے مال کے ذریعے سے ان کے طالب بنو۔ ان کو قید نکاح میں لے کر نہ بدکاری کے طور پر۔ بس ان میں سے جن سے تم نے تمتع کیا ہو تو ان کو ان کے مہر دو فریضہ کی حیثیت سے۔ آیۂ کریمہ میں بات بالکل واضح ہے اور کسی طرح بھی اس سے متعہ جائز نہیں ہوتا۔ لیکن قائلین متعہ اپنی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ اس آیۃ میں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کے بعد اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ایک میعاد مقررہ) بھی شامل تھا جو موجودہ قرآنی نسخوں میں نہیں ہے۔ اس طرح ایک نئی بحث شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ان حضرات کا ان الفاظ کا اضافہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قرآن کریم کے موجودہ نسخوں سے اپنے موقف کو ثابت نہیں کر سکتے۔ اب چونکہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کی وجہ سے ہمارے علمائے کرام اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کریم سات قرائتوں میں نازل ہوا تھا اور حضرت ابن عباس کی قراءت میں یہ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ایک میعاد مقررہ کے لئے) شامل ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کے اضافہ کی وجہ سے منکرین متعہ (سنی حضرات) اپنا مقدمہ ہار جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ موجودہ قرآن کریم جو ہمارے لئے حجت ہے، اس سے متعہ کسی طرح

ثابت نہیں ہوسکتا۔ متعہ صرف روایات کے ساتھ اور قرآن کریم کی روائتی تفسیر کے ساتھ قراءت ابن عباس کے اضافہ کے ساتھ یقیناً درست ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے موجودہ نسخوں سے جو ہمارے لئے حجت (دلیل) ہیں ان سے متعہ کسی طرح حلال ثابت نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم کا حکم ہے کہ o وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10) o تمہارا کسی معاملہ میں اختلاف ہو اس کا حکم اللہ کے ذمہ ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے اس واضح حکم کے مطابق صرف قرآن کریم سے رجوع فرمائیں تو ارشاد ہوتا ہے o وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحاً حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (24/33) o اور جو لوگ نکاح کرنے کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہئے کہ پاک دامنی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے مالدار کردے۔

کس قدر واضح حکم ہے جنسی تمتع کا واحد اور صرف واحد ذریعہ نکاح ہے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ قرآن کریم نے جائز قرار نہیں دیا اور نکاح کے علاوہ تمام طریقے حرام ہیں۔ تعجب ہے کہ قائلین متعہ نے سورۃ النساء کی 24 ویں آیۃ جس سے وہ **اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی** کے اضافہ کرنے سے جس سے وہ متعہ کو جائز قرار دیتے ہیں اس پر تو ان حضرات نے صفحے کے صفحے سیاہ کرڈالے

ہیں لیکن اس آیت کریمہ o وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰی یُغۡنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ (24/33) o اور جو لوگ نکاح کرنے کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہئے کہ پاک دامنی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے مالدار کردے۔ کی تفسیر یا حاشیہ پر سب لوگوں نے سکوت اختیار کیا ہے۔ گویا کہ اس آیت کریمہ کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ صدر اول سے لے کر آج تک متنازعہ فیہ تھا۔ لیکن ادارہ صوت الحق کے سامنے چونکہ خالص قرآن کریم ہے اس لئے اس نے اس مسئلہ کو پانچ منٹ میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے بعد بھی درخواست ہے کہ ادارہ نے جو تشریح کی ہے اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو تو وہ ادارہ کو بے شک اطلاع دیں ادارہ ان کا شکر گذار ہوگا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ہمارا استناد صرف قرآن کریم سے ہوگا۔

ماہ اگست 2007ء

46

محترم جناب پرویز صاحب (مرحوم) پر ایک سنگین افتراء

موقر ماہنامہ 'صوت الحق' بابت جون 2007ء میں محترمہ جناب نعیم فاطمہ علوی صاحبہ کا ایک گرامی نامہ طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے میرے ایک مضمون ''تحریک طلوع اسلام کا تعارف'' کو سراہا ہے جس کے لئے میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک محفل میلاد میں شرکت کرنے کا واقعہ بھی تحریر فرمایا ہے اور اس موقع پر جو اعتراض ان کے سامنے کیا گیا ہے اس اعتراض کا جواب انہوں نے مجھ سے طلب فرمایا ہے، جس کے لئے میں مزید ان کا شکرگزار ہوں۔ محترمہ موصوفہ کا واقعہ ان کے اپنے الفاظ میں تحریر ہے۔

(محفل میلاد سے) ''وہ اٹھ کر چلی گئی تو الھدیٰ کی دوسری خاتون آ کر بیٹھ گئیں۔ اُس نے بتایا کہ میں نے پرویز صاحب کو بہت پڑھا ہے۔ ان کی باتیں دل کو لگتی ہیں، مگر ایک بار میں نے طلوع اسلام میں کسی کا سوال پڑھا کہ کیا سور حلال ہے تو اس کا جواب پرویز صاحب نے دیا کہ اگر سور کو گھریلو جانور کی طرح پالا ہو تو اس کا گوشت حلال ہے۔ میں اس سوال کا جواب تفصیلی طور پر خواجہ ازہر عباس سے چاہوں گی۔ امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گے۔'' اس واقعہ/اعتراض پر تبصرہ کرنے اور اس کا جواب عرض کرنے سے پیشتر تمہیداً چند گذارشات پیش خدمتِ عالی ہیں۔

ہم مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے چند وجوہات کی بناء پر قرآن کریم ہمارے سامنے نہیں رہا اور ہم اس کی فکر سے آہستہ آہستہ دور سے دور تر ہوتے ہی چلے گئے۔ اس کے بعد شدہ شدہ، فرداً فرداً کچھ آوازیں قرآنی فکر کی بلند ہوتی رہیں مگر وہ آوازیں بھی کبھی خالص قرآنی نہیں ہوئیں۔ متقدمین ہمارے ہاں معتزلہ کا ایک فرقہ اُٹھا جو بڑے بڑے مفکرین، اہل علم و

دانش پر مشتمل تھا۔ انہوں نے قرآن کی آواز بلند کی۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ ان سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے وقت کی حکومت کی سرپرستی قبول کرلی۔ جس سے وقتی طور پر تو انہیں بڑا فائدہ ہوا، اور عروج واقتدار حاصل ہوگیا لیکن IN THE LONG RUN، یہ پالیسی ان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئی اور اس حکومت کے زوال اور تبدیلی کے بعد، انہیں بھی زوال آیا۔ یہاں تک کہ ان مفکرین کو ذاتی مصائب وتکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اور ان کا لٹریچر بھی سب تباہ کردیا گیا۔ اب معتزلہ کا براہ راست کوئی لٹریچر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے نظریات کی تردید کرنے میں مکتبہ فکر اشاعرہ ومحدثین نے جو اُن کے نظریات کے حوالے دیئے ہیں، اس سے ان کے عقائد کا علم ہوتا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی معلومات ان کے عقائد کی دستیاب ہوتی ہیں، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتزلہ کی فکر بیشک قرآن کریم کے بہت قریب تھی۔ لیکن خالص قرآنی فکر ان کی بھی نہیں تھی۔ معتزلہ کے منقرض ہوجانے کے بعد، وقفے وقفے کے ساتھ، ایسے علماء پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے رجعت الی القرآن کی۔ اور قرآن کریم کے بہت قریب تر آتے رہے۔ ماضی قریب میں مصر میں علامہ جمال الدین افغانی کے زیر اثر مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا مرحوم، دیگر علماء کی نسبت قرآن کریم کے زیادہ قریب رہے۔ ہمارے برصغیر میں سرسید احمد خان کے دور سے قرآن کریم کی آواز بلند ہونا شروع ہوئی، علامہ اقبال نے قرآنی فکر کو عام کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ فرقہ اہل قرآن کے بانی مولوی محمد عبداللہ مرحوم نے لاہور سے، اور امت مسلمہ نے امرتسر سے قرآن کی آواز بلند کی۔ اس دور میں خالص قرآنی فکر پر مبنی تفاسیر بھی طبع ہونے لگیں، یہ سب حضرات قرآنی فکر کے داعی تھے۔ اور بہتر سے بہتر شہ پارے پیش کررہے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کے ہاں بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ محترم پرویز صاحب اور ان کی تحریک طلوع اسلام، خلافت راشدہ کے بعد سے اس دور تک پہلی اور منفرد آواز ہے جس نے قرآن خالص کے علاوہ دین کی طرف دعوت دی۔ اس سے پیشتر کسی نے دین کی دعوت نہیں دی۔ یہ بات کہ خلافت راشدہ سے لے کر آج تک کسی نے دین کی دعوت نہیں دی۔ میں اس سے پیشتر بھی دو تین مرتبہ تحریر کرچکا ہوں جس پر چند قرآنی مفکر کو اشکال واعتراض

ہوا۔لیکن میرے خیال کی تائید اس لئے ہوتی ہے کہ دین میں انفرادی عبادت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں انفرادی خلافت راشدہ کے فوری بعد سے چلی آرہی ہے۔اگر درمیان میں کوئی دین کی دعوت دیتا، تو وہ انفرادی عبادت کو ضرور چیلنج کرتا اور انفرادی صلوٰۃ (نماز) کا تسلسل و تواتر خلافت راشدہ سے نہ دیتا۔چودہ سو سال میں یہ پہلا موقع ہے کہ محترم التھام، مفکر قرآن جناب عزیز اللہ بوھیو نے انفرادی صلوٰۃ (نماز) کی تردید میں چند کتب تحریر فرمائی ہیں۔ورنہ ایسی کتابیں سابقہ سارے لٹریچر میں کہیں نہیں ہیں۔بدقسمتی سے ہم مسلمانوں میں یہ دستور بھی رہا ہے کہ جس نے بھی قرآن کریم کی طرف دعوت دی، اسی کو علماء کرام نے مطعون کیا۔اور طرح طرح کے الزام لگائے۔ آپ اس اصول کو پیش نظر رکھیں کہ جو عالم یا جو تحریک قرآن کریم کے جس قدر قریب ہوگی، اسی قدر اس کی مخالفت بھی شدید ہوگی۔اس اصول کے مطابق آپ ملاحظہ فرمائیں کہ خود رسول اللہ سے لے کر جو قرآن کریم کے اولین داعی تھے پرویز صاحب تک، کہ جو اس زمانہ میں قرآن کریم کے داعی تھے، جس نے بھی قرآن کریم کی دعوت دی، اس پر ضرور کفر کے فتوے لگے۔

طلوع اسلام کی مخالفت میں سب سے پہلے اس پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ انکار حدیث کا ہے۔ہر چند کہ طلوع اسلام اس کی تردید کرتا رہا۔یہاں تک کہ رسالہ کے TITLE PAGE پر حدیث تحریر کی جاتی تھی۔اس کی سالانہ کنونشن میں حدیث کے BANNER آویزاں کئے جاتے تھے، لیکن ہمارے محترم علماء کرام اس پر یہ اعتراض کرتے ہی رہے۔

اس کے علاوہ طلوع اسلام پر یہ اعتراض بھی تھا کہ چونکہ طلوع اسلام مرکز ملت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک ہر فاسق و فاجر، کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے اگر وہ فاسق سربراہ حکومت ہو جائے اس اعتراض کی تردید میں طلوع اسلام میں اس سے بہت عرصہ پیشتر 1961ء میں ہی ایک مفصل مضمون طبع ہوا اور اس اعتراض کی تردید کرتے ہوئے تحریر کیا گیا" امید ہے اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ مرکز ملت، سے ہماری مراد اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کے سوا کچھ نہیں۔جیسا کی شروع میں لکھا جا

چکا ہے ہم اس حقیقت کو اس سے قبل کئی بار طلوع اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ جو حضرات ہماری مخالفت کرتے ہیں ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ہاں طلوع اسلام جاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر نہیں کہ مرکز ملت سے ہماری مراد کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات برابر لکھتے چلے آرہے ہیں کہ طلوع اسلام کے نزدیک ہر فاسق و فاجر کی اطاعت (معاذ اللہ معاذ اللہ) ''خدا اور رسول'' کی اطاعت ہے۔ آپ ہی فرمائیے ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔'' اس پوری تصریح کے باوجود طلوع اسلام کے خلاف یہ اعتراض جاری رہا۔

عرصہ ہوا کہ گول باغ، لاہور میں اردو زبان میں نماز پڑھائی گئی جس پر بہت ہنگامہ ہوا، اس کے پس پردہ کون حضرات تھے اور ان کے MOTIVES کیا تھے، اس وقت اکثر لوگوں کو معلوم تھا۔ لیکن اس کے باوجود مخالفین نے عمداً، دانستہ طور پر طلوع اسلام کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کی، ماہنامہ طلوع اسلام بابت جون 1957ء میں اس کی پُر زور تردید شائع کی گئی، لیکن اس کے باوجود یہ پروپیگنڈا جاری رہا کہ پرویز صاحب نماز اردو میں پڑھنا جائز سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے سوقیانہ اعتراضات طلوع اسلام پر برابر وارد ہوتے رہے یہاں تک کہ 1962ء میں پرویز صاحب کے خلاف ایک ہزار ''علماء کرام'' نے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا۔ اس فتویٰ کے بڑے بڑے اشتہار مندر میں دیواروں پر چسپاں کئے گئے۔ لاہور سیکرٹریٹ کی دیواروں پر خصوصاً یہ اشتہار بہت نمایاں جگہ لگائے گئے تاکہ سیکرٹریٹ کے سٹاف کے لوگ ان کو بخوبی پڑھ سکیں۔ جو حضرات اب طلوع اسلام کے حلقہ سے وابستہ ہیں انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کس درجہ آزمائش کا دور تھا لیکن پرویز صاحب بالکل مطمئن اور COMPOSED تھے، انہوں نے کسی کے خلاف کوئی گفتگو نہیں کی۔ سب کچھ نہایت تحمل سے برداشت کیا۔ لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود میرا خیال ہے کہ مولوی محمد عبداللہ صاحب، مولوی حشمت علی دہلوی کا دور اس سے بھی زیادہ صبر آزما دور تھا۔ اُنہیں تین مرتبہ زہر دیا گیا جس سے جسم کا ایک حصہ بالکل مفلوج ہوگیا تھا۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ طلوع اسلام نے قرآن کریم کی جو خدمت کی، اس کی طرف مخالفین کی توجہ

بالکل نہیں جاتی۔

قیام پاکستان کی جہد وجہد میں جو کردار طلوع اسلام نے ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ سب علماء قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ طلوع اسلام نے ان سے چومکھی لڑائی لڑی دوقومی نظریہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کیا اور علماء کرام کے اعتراضات کا مسلسل جواب دیتا رہا۔ یہاں تک کہ طلوع اسلام کے جوابات سے متاثر ہو کر علمائے کرام نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کرنی شروع کردی اور چند معروف علماء کرام نے پاکستان کے قیام کی کوششوں میں عملاً بھی حصہ لیا۔

ختم نبوت کا مسئلہ ایک سو سال سے بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح مسلسل سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے اپنے غلط اور خلاف قرآن نظریات ہونے کی وجہ سے، ہمارے علماء کرام، احمدی علماء کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اور ہر بار انہیں ہزیمت ہوتی تھی، طلوع اسلام نے کہ جو خالص فکر کا داعی ہے، مسئلہ ختم نبوت کا خالص قرآنی فکر میں جائزہ لیا، قرآنی فکر کے سامنے، احمدیت، تصوف، تشیع، ''پائے چوبین'' کی مانند ہیں، یہ تنکوں کے پُل بنا کر، اس پر سے ہاتھی گذارنے کے عادی ہیں بھلا کہاں ان مسالک کی تاریکیاں اور کہاں قرآنی فکر کی تابندگی، طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے عام ہونے سے کم سے کم پاکستان میں احمدیت کی تبلیغ بالکل رُک گئی۔ البتہ پاکستان کے باہران کی تبلیغ جاری ہے۔ ''احمدی تحریک اور ختم نبوت'' نام کی کتاب نے احمدیت کو بالکل ننگا کر کے رکھ دیا۔ کمیونزم کے خلاف خود مغرب میں اتنا گہرا و عمیق لٹریچر تحریر نہیں کیا گیا جو یہاں پاکستان میں بیٹھ کر پرویز صاحب نے تحریر کیا۔ راقم سطور کو خود کمیونزم کے لٹریچر سے بڑی دلچسپی تھی اور حتی الوسع اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پرویز صاحب نے اس کی علمی سطح پر تردید کی، وہ خود یورپ میں بھی نہیں ہوئی۔ افسوس کہ ان کی کتابیں اور سب مضامین اردو زبان میں تھے، اور مغربی مفکرین و دانشوروں تک وہ لٹریچر نہیں پہنچ سکا۔ اگر یہ لٹریچر انگریزی زبان میں ہوتا تو یقیناً وہاں کے مفکرین اس کو سراہتے اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے۔

یہاں پرویز صاحب کی دینی و قرآنی خدمات کو شمار کرانا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ نکتہ پیش

خدمت عالی کرنا ہے کہ پرویز صاحب یا دوسرے الفاظ میں تحریک طلوع اسلام کی خدمات کو ہمارے علماء کرام نے بالکل نظر انداز کر دیا اور طرح طرح کے بے بنیاد اعتراضات وارد کرتے چلے آرہے ہیں۔اس تمہید کے بعد، اصل اعتراض کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر مومن کا فریضہ ہے کہ جو خبر بھی سنے اس کی ضرور تصدیق کرے (کہ یہ خبر درست ہے یا نہیں) ایسی صورت میں کہ جب ان خاتون کو یہ شبہ ہوا تھا کہ پرویز صاحب سور کے گوشت کو حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس بات کی طلوع اسلام کے لٹریچر میں تحقیق کرتیں کہ یہ بات درست ہے یا نہیں۔جس طرح مبہم VAGUE اشارہ انہوں نے تحریر فرمایا'' کہ ایک بار میں نے طلوع اسلام میں کسی کا سوال پڑھا، کہ کیا سور حلال ہے، تو اس کا جواب پرویز صاحب نے دیا''، یہ اشارہ کوئی سنجیدہ کوشش قرآن کریم تک پہنچنے کی نہیں ہے۔ہم نے بھی طلوع اسلام کا سارا لٹریچر بالا پڑھا ہے۔یہ فقرہ کسی جگہ نظر سے نہیں گذرا۔یہ صرف بہتان ہے۔اس فقرہ پر تبصرہ کرنا بھی صرف اس وقت ضروری تھا جب موصوفہ خاتون طلوع اسلام کے کسی پرچہ کا، یا پھر پرویز صاحب کی کسی کتاب کا حوالہ تحریر فرماتیں۔لیکن وہ خود اس بارے میں بالکل مشکوک ہیں۔تو اس پر تبصرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تاہم عام قارئین کرام کی معلومات کے لئے تحریر ہے کہ یہ بات کہ پرویز صاحب پالتو سور کے گوشت کو حلال سمجھتے تھے ان پر بالکل بہتان وافتراء ہے اور ان پر بے بنیاد الزام ہے۔وہ سور کے گوشت کو قطعاً حرام سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ 621 پر تحریر فرمایا ہے'' قرآن کریم نے وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ہوا ہے۔نیز انہوں نے اسی آیہ کریمہ (2/173) کے ذیل میں مفہوم القرآن میں تحریر کیا ہے'' اب یہ سن لو کہ خدا نے حرام کس کس چیز کو قرار دیا ہے۔مُردار، بیٹھا ہوا خون، خنزیر کا گوشت، اور ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے، مفہوم القرآن صفحہ 62،

نعیم فاطمہ علوی اور دیگر حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ پرویز صاحب اور ان کی تحریک، تحریک طلوع اسلام کے خلاف قرآنی فکر کے مخالفین طرح طرح کے

اعتراضات وارد کرتے رہتے ہیں۔اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ آپ خود ان کا لٹریچر بغور مطالعہ فرمائیں۔مزید درخواست ہے کہ آج کل پاکستان میں بے شمار ماہنامے اور رسالے طبع ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ادبی ہیں، باقی زیادہ تر رسالے مذہبی ہوتے ہیں۔لیکن قرآنی فکر کے حوالے سے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔سارے پاکستان میں صرف 'صوت الحق' 'طلوع اسلام' اور 'بلاغ القرآن' یہ تین رسالہ خالص قرآنی فکر کے حامل ہیں اور یہ صرف قرآنی حلقوں میں ہی پڑھے جاتے ہیں۔قارئین کرام سے درخواست ہے کہ ان تینوں رسالوں کو خود بھی ہمیشہ پڑھتے رہیں، اور حد درجہ ان کا حلقہ وسیع تر کرنے کو کوشش کریں، کیونکہ ہمارے پاس یہی ذریعہ قرآنی فکر کو عام کرنے کا ہے۔

ماہ اگست 2007ء

تیری آواز مکّے اور مدینے

انسانی دنیا میں بعض سوالات ایسے حیران کن ہوتے ہیں کہ ان کا جواب فراہم کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں سے ایک حیران کن سوال یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی اسے اس دنیا میں عروج واقتدار خود حاصل ہو جائے گا۔ وہ خیر امت کے منصب اور مرتبے پر بھی فائز ہوگی۔ لیکن اس دعوے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ آج دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل قوم شمار ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی موجودگی کے باوجود کسی قوم کا ذلیل و مقہور ہونا ایک تعجب انگیز بات معلوم ہوتی ہے۔

اس سوال کے جواب کی تلاش میں قرآنی طلباء کو جو دشواری پیش آتی رہتی ہے۔ وہ سابقہ تفاسیر کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً غلبہ واقتدار کے متعلق جو آیات توضیح وتفسیر میں مفسرین کرام تقریباً سب ہی بالکل بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ نے تو غلبہ واقتدار سے متعلق آیات کو آخرت سے متعلق کر دیا۔ کچھ حضرات نے ان کو حضورؐ کے دور ہمایونی تک محدود کر دیا۔ اور کچھ مفسرین نے اس غلبہ کو عرب کے خطہ کے غلبے سے مراد لیا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ تمام مفسرین کی کوششوں کے باوجود بات بنتی نظر نہیں آتی کیونکہ مفسرین نہ تو قرآن کریم کے دعاوی کو غلط اور بے بنیاد قرار دے سکتے ہیں، اور نہ ہی مسلمانوں کی موجودہ پستی کی حالت سے اغماز کر سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہے کہ یہ سب حضرات ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ہم مسلمانوں میں ڈیڑھ ہزار سال میں ہزاروں علماء اور بہت قلیل تعداد میں مفکرین پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں چند مخلص مفکرین نے اصلاح احوال کی کوشش بھی کی۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، عبدالوھاب نجدی۔ برصغیر میں

قدماء میں مجدد الف ثانی، متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور ان کا خانوادہ سب نے ہی اپنے تئیں مسلمانوں کی کشتی کو گرداب بلا سے نکالنے کی کوشش کی لیکن سب کی کوشش بے سود ثابت ہوئیں۔ان سب حضرات کی کوشش وجود دھر میں ایک ہی سمت میں رہیں، اور سمت کی تعین کی غلطی سب حضرات نے کی۔

ہمارا دور اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ اس دور میں مسلمانوں میں اصلاح احوال کی جو کوشش ہو رہی ہیں ان کی سمت کا تعین درست کیا گیا ہے۔ کچھ تو انسانیت خود بہ حیثیت مجموعی باطنی اضطراب میں مبتلا ہے کچھ یہ کہ مسلمان بالکل ہی پستی کو چھو چکے ہیں۔ان حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ قرآن خالص کی طرف رخ کریں۔کہ خود قرآن کریم کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ

رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا۝(18/27) اس (قرآن) کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔اور تم اس کے سوا کہیں بھی پناہ گاہ نہ پاؤ گے ۝

پاکستان میں موجودہ حالت کے تقاضے کا جواب سب سے پہلے تحریک طلوع اسلام نے دیا اس نے مسلمانوں کو تنزل و پستی سے نکال کر عروج واقتدار حاصل کرنے اور خیر امت کا منصب حاصل کرنے کا طریقہ خود قرآن کریم سے ہی متعین کیا۔ہزار بارہ سو سال کے عرصہ دراز میں تحریک طلوع اسلام وہ پہلی تحریک ہے جس نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ اس دنیا میں خیر امت ہونے کا واحد طریقہ خالص قرآن کریم کو پیش نگاہ رکھنا اور اس کا نظام قائم کرنا ہے۔اس تحریک نے نہایت بلند وا شگاف الفاظ میں بلا لومۃ لائم، اعلان کیا کہ مسلمان جب تک حدیث وفقہ کو دین کا جزو شمار کرتے رہے گے۔وہ نہ تو اس دنیا میں قرآن کریم کا نظام قائم کر سکیں گے اور نہ ہی کبھی خیر امت کے منصب پر فائز ہو سکیں گے۔حدیث اور سابقہ ملوکیت کے دور کا مدون کردہ فقہ یہ دور کاوٹیں ایسی ہیں کہ جن کی موجودگی میں مسلمان لاکھ جتن کر لیں اس کے باوجود وہ گرداب بلا سے باہر نہیں نکل سکتے۔

یہ خالص قرآنی نظریات آج ساری دنیا میں کسی ملک میں بھی مسلمانوں میں نہیں پائے جاتے۔ایران میں انقلاب کے دوران قرآن کریم پر شیعہ علماء نے بہت کام کیا۔وہاں غیر علماء کے

طبقہ نے بھی کام کیا۔ جن میں ڈاکٹر علی تشریعی سر فہرست تھے۔ وہاں ایک گروہ آیت اللہ صادقی کا بھی تھا، جو اہل قرآن شمار ہوتے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بھی نظریات خالص قرآنی نہیں تھے۔ ترکی میں حالات کے پیش نظر بہت لٹریچر طبع ہو رہا ہے۔ یحییٰ ہارون وہاں کے بہت بڑے سکالر ہیں، ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ سوڈان میں عالمی شہرت کے حامل خود ڈاکٹر حسن ترابی بہت بڑے Statore کے عالم ہیں۔ مگر خالص قرآنی نظریات آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔

راقم سطور طویل عرصہ سے ادارہ صوت الحق اور تحریک طلوع اسلام سے وابستہ ہے۔ اس دور میں جبکہ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہے صرف یہ دو ادارے ایسے ہیں جو خالص قرآنی فکر کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس تمام عرصے میں یہ دلی خواہش ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ سے ہر وقت یہی دعا ہوتی تھی کہ یا اللہ ان نظریات کے حامل علماء اور تحریکیں دوسرے ممالک میں بھی پیدا فرمائیے کہ ان کے ذریعہ ان ممالک میں قرآن کریم کی آواز بلند ہو سکے۔ بہت عرصے سے دلی خواہش ہونے کے باوجود یہ تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب جو یہ دعا قبول ہوئی اور ایسی جگہ سے قبول ہوئی کہ جس کا کوئی سان وگمان بھی نہیں تھا۔ تو راقم سطور اس بات سے اس درجہ خوش ہے کہ اس کو آواز کی گرفت میں نہیں لاسکتا۔ اور یہ خواہش ہے کہ صوت الحق کے قارئین بھی اس خوشی میں شامل ہوں اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل خوش خبری پیش خدمت عالی ہے۔

نابغہ روزگار مشہور دانشور اور عظیم مفکرِ قرآن جناب راشد شاز صاحب دہلی میں رہتے ہیں گزشتہ چند سالوں سے ان کی شہرت پاکستان میں ہونی شروع ہوئی۔ خصوصاً یہاں کے قرآنی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت وتوقیر سے لیا جانے لگا حالانکہ یہاں ان کی تصنیفات دستیاب نہیں ہیں۔ چند حضرات نے ذاتی کوشش سے ان کی کتب دہلی سے منگوائیں ہیں۔ اور صوت الحق نے ان کے چند عالی مضامین کو شائع فرمایا ہے۔ یہاں کراچی میں ایسے تاجران کتب ہیں جو بھارتی مطبوعات منگواتے ہیں، اگر محترم راشد شاز صاحب پسند فرمائیں تو اس سلسلہ میں صوت الحق ان کی مدد کر سکتا ہے۔ اس طرح تشنہ گان علم کے لئے آسانی ہوگی۔ وجہ یہ ہے اس وقت لاتعداد خطوط

آرہے ہیں جن میں موصوف کی کتب کا پتہ پوچھا جاتا ہے۔

ماہ اگست 2007ء

یوم آزادی

میں آپ سب حضرات کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں آپ کے سامنے چند گذارشات پیش کرسکوں۔ آج چودہ اگست کا دن ہمارے لئے بہت خوشی کا دن ہے کہ آج سے 59 سال پیشتر ہمیں انگریز کی غلامی سے آزادی حاصل ہوئی غیر مسلم اقوام کے لئے مذہبی آزادی اتنی ہی ہوتی ہے کہ اُنہیں اپنی مذہبی رسوم وعبادات ادا کرنے کی اجازت حاصل ہو۔ اور وہ اپنے پرسنل لاء کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکیں۔ زیادہ سے سے زیادہ یہ کہ اُنہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کی بھی اجازت ہو۔ ان کے نزدیک مذہبی آزادی صرف اسی کا نام ہے۔ مسلمانوں میں بھی جو حضرات اور خصوصاً ہمارے علماء کرام جو صرف مذہب کے پابند تھے، ان کے پیش نظر بھی صرف اتنی ہی آزادی کافی تھی، اور اسی وجہ سے وہ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے پر رضامند بھی تھے۔ لیکن اس کے برخلاف دین کے نقطہ نگاہ سے یہ آزادی کافی نہیں ہوتی۔ جن حضرات کے پیش نظر دین ہوتا ہے ان کے لئے تو ایک خطہ ارضی کی ضرورت لازمی ہوتی ہے کہ جہاں دین پر بطور نظام حیات عمل کیا جاسکے۔ مسلمان کی آزادی کی Definition یہ ہے کہ وہ جس معاشرہ میں زندگی بسر کررہے ہوں اس میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے بجائے وحی الٰہی کے قوانین کا نفاذ ہو۔ مسلمانوں کے لئے وحی الٰہی کی پابندی ہی ان کی آزادی ہے وہ جس قدر وحی الٰہی کے پابند ہوں گے، اسی نسبت سے وہ آزاد ہوتے چلے جائیں گے۔ اور جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے قرآن کریم اسے خیرامۃ کے لقب سے نوازتا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک صرف افراد کا اچھا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے نقطہ نگاہ سے نظام کا درست ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ وہ

مقام ہے جہاں بڑے بڑے مفکرین سے بھی لغزش ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام اخلاقی اصول سب مذاہب میں موجود ہوتے ہیں، اور یہی اچھا معاشرہ قائم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن قرآن کریم ان اصول وضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے، جن کے مطابق ایک اچھا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کریم کی انفرادیت اور بے مثال ہونا، سامنے آتا ہے۔ بے شک عام اخلاقی اصول اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے اصول وضوابط اس سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ہندو سوسائٹی پر غور فرمائیں۔ ایک برہمن چوری نہیں کرتا، اور پختہ سیرت سے زندگی گذارتا ہے انسان تو ایک طرف جانوروں تک کے لئے پانی وغیرہ کا بندوبست کرتا ہے، لیکن وہ جو معاشرہ قائم کرتا ہے اس میں اس درجہ تفاوت اور فرق ہوتا ہے کہ اس برہمن کی ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کرنے میں گذر جاتی ہے جبکہ شودر کے ہاں پیدا ہونے والے بچے ساری عمر سسکیاں بھرتے زندگی گذارتے ہیں۔ اس معاشرہ میں فرد کا ذاتی جوہر اور اس کی محنت کسی کام نہیں آتی۔

اس قسم کے معاشرے میں افراد کی نیکیاں کام نہیں آتیں۔ اسی طرح یہودی سوسائٹی اور یہودیت کے متعلق غور فرمائیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ جو بچہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات حاصل نہیں کرسکتا یہاں بھی اس قسم کے معاشرہ میں افراد کی نیکیاں کام نہیں آسکتیں۔ اسی طرح کا تصور عیسائیت میں ہے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور اس کی نجات و شفاعت حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بخشش کی کوئی اور راہ نہیں ہے، اس قسم کے معاشرہ میں لوگوں کا شریف و نیک ہونا، شرف انسانیت کی دلیل نہیں ہے، ان تینوں مذاہب سے الگ ہوکر، آپ ملوکیت کے نظام پر غور کریں، ایک بادشاہ جو بے شمار انسانوں پر حکومت کرتا ہے، اُنہیں اپنے احکام کا پابند بناتا ہے، اس کی ساری عمر کی تہجد کی نمازیں یا اس کا شراب نہ پینا کیا قابل فخر ہوسکتا ہے؟ اسی طرح نظام سرمایہ داری میں اگر ایک سرمایہ دار، جاگیردار، یا کارخانہ دار جو ہزاروں غریب مزدوروں کا خون چوس لیتا ہے، یہ کہتا ہے کہ میں غریب مزدوروں کا مفت علاج کراتا

ہوں، تو کیا اس کی یہ بات نیکی میں شمار کی جا سکتی ہے؟ اسی طرح ایک مذہبی مبلغ جو مسلسل عوام کو غلط راہ پر ڈالتا ہے، غلط عقاید کی تعلیم دیتا ہے، غربت و امارت کو تقدیر سے وابستہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غربت و امارت اللہ کی طرف سے ہے، اور اس کے خلاف لب کشائی کرنا منع ہے، اگر یہ مبلغ یہ کہتا ہے کہ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا تو کیا اس کی یہ انفرادی نیکی انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہے؟ ان پیش کردہ مثالوں سے آپ خود غور فرمائیں کہ ان انفرادی اخلاقی خوبیوں کی ایک غلط اجتماعی نظام میں کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ مذہب میں صرف ذاتی اخلاقیات پر عمل کیا جاتا ہے۔ کسی بھی اجتماعی نظام سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ اس کے بالکل برخلاف دین اجتماعی نظام انسانیت کو اپنا مطمع نگاہ بناتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو ایک الگ آزاد مملکت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے پاکستان کا حاصل کرنا، نہایت ضروری بات تھی۔

آپ یقیناً اس بات سے باخبر ہوں گے کہ آج کل ہمارے ہاں حدود آرڈیننس پر بہت بحث و تمحیص جاری ہے۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات میں اس کے متعلق روزانہ خبریں چھپ رہی ہیں۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان حدود کا مخالف ہے کیونکہ یہ حدود قرآن کریم اور عقل عامہ کے خلاف ہیں۔ لیکن ہمارے علماء کرام اس آرڈیننس کی حمایت کر رہے ہیں اور ان حدود کے جاری کرنے پر مُصر ہیں ۔لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ ہمارے سابقہ علماء کرام پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو یہ حدود کس طرح جاری ہو سکتی تھیں۔ اور اس اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان علماء کے سامنے دین کا تصور نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد، آج بھی ان حضرات کے سامنے دین کا تصور نہیں ہے۔ ان کے سامنے اب بھی مذہب کا ہی تصور ہے۔ اس بات کی وضاحت ان کے حدود کے تصور سے ہو جاتی ہے کہ اب بھی ان کے سامنے حد کا مذہبی تصور ہے۔ حد کا دینی تصور ان کے سامنے اب بھی نہیں ہے۔

دین میں تو قرآن کریم کے پورے کے پورے احکام حدود شمار ہوتے ہیں۔ یہ حدود

صرف سزاؤں تک محدود نہیں ہوتیں۔قرآن کریم نے حدود کے الفاظ اکثر مقامات پر اس طرح بیان فرمائے ہیں کہ وہاں سزاؤں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حدود اللہ صرف سزائیں نہیں ہیں۔ان میں سے چند مقامات یہ ہیں۔

(1) کفارہ سے متعلق احکام کو(58/4)میں حدود اللہ کہا گیا ہے۔

(2) احکام طلاق بیان کرنے کے بعد(2/229)میں کہا گیا کہ یہ حدود اللہ ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا۔

(3) وراثت کے احکام بیان کرنے کے بعد(4/13)میں فرمایا کہ یہ حدود اللہ ہیں،ان سے تجاوز نہ کرنا۔

(4) روزوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد(2/18)میں فرمایا کہ یہ حدود اللہ ہیں،ان کے قریب نہ جانا۔

(5) (65/1)میں فرمایا کہ حدود اللہ سے تجاوز کرنے والا،خود اپنے پر زیادتی کرتا ہے،اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

ان پیش کردہ آیات سے آپ نے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ حدود اللہ صرف سزائیں نہیں ہیں ۔بلکہ یہ قرآن کریم کے احکامات ہی حدود اللہ ہیں ۔دین میں حدود اللہ کا مطلب اعمال کا وہ دائرہ ہے جس کے اندر رہنے کی آزادی ہے اور جن سے تجاوز کرنا قطعی منع ہے۔حدود اور اصول و احکامات ایک ہی سکہ کے دورخ ہیں۔چونکہ یہ احکام وقوانین (حدود) وحی الٰہی نے مقرر کئے ہیں اس لئے ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں۔وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ o(2/229)اور جو کوئی تجاوز کرے اللہ کی باندھی ہوئی حدود سے سو وہی ظالم ہیں o۔
واضح رہے کہ قرآن کریم کی سب سے اہم حد یہ ہے کہ۔

(1) انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے۔حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا o(18/26)نیز یہ کہ طاغوت میں زندگی بسر کرنا حرام

ہے(4/60)

(2) قرآن کریم کی اہم ترین حد یہ ہے کہ اس کے نزدیک ربو حرام ہے اور ربو کھانا اللہ و رسول کے خلاف جنگ کرنا ہے(2/279)

(3) قرآن کریم کی نہایت اہم حد یہ ہے کہ فرقہ بندی حرام ہے اور شرک ہے (30/32)، جو کوئی فرقہ بندی کرتا ہے، اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔(6/159)

اسی طرح قرآن کریم کی بے شمار حدود ہیں ۔ آپ غور فرمائیں کہ ہمارے علمائے کرام ان حدود کی طرف کوئی توجہ نہیں فرماتے ۔ قبل قیام پاکستان، علماء کا پیشتر حصہ، متحدہ ہندوستان میں رہنے کے لئے تیار تھا ۔ اور طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنے پر آمادہ تھا ۔ کیا یہ حدود اللہ کی کھلی کھلی مخالفت نہیں تھی ۔ اب ہمارا سارا معاشی نظام سودی نظام ہے ۔ بلکہ ہماری فقہ کا تو مدار ہی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ وابستہ ہے یہ سرمایہ دارانہ نظام خالص ربو ہے ۔ تحریک طلوع اسلام سے پیشتر آپ سارا مذہبی لٹریچر نہایت غور سے کھنگال ڈالیں ۔ اس سارے لٹریچر میں آپ کو ایک لفظ فرقہ بندی کے خلاف نہیں ملے گا ۔ طلوع اسلام نے فرقہ بندی کے خلاف آواز بلند کی ۔ کیونکہ اس بارے میں آیات بہت واضح ہیں، اس لئے ہمارے علماء کرام کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا ۔ وہ فرقہ بندی کا جواز کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے تاویلات کرنی شروع کر دیں کہ یہ فرقہ بندی نہیں ہے، یہ صرف مکاتب فکر کا اختلاف ہے ۔ لیکن حقیقت تو کبھی پوشیدہ نہیں رہتی ۔ ہمارے ہاں کئی سال سے فرقہ بندی کی وجہ سے قتل ہوتے چلے آ رہے ہیں، اور فرقہ بندی نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ خود علماء کرام فرقہ بندی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے بلکہ اس کو Condemn بھی کرنے لگے ۔ لیکن ان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ خود فرقہ بندی کی پیداوار ہیں ۔ وہ صرف زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ کیا فرقہ بندی حدود اللہ سے کھلی بغاوت نہیں ہے؟ ۔

ہمارے ہاں یہی علماء کرام جو حدود اللہ کے تحفظ کی تحریک چلانے کا اعلان کر چکے ہیں، وہ

خود ان سب حدود کی مخالفت کے مرتکب ہو رہے ہیں، ان کی کیفیت حضرت عیسیٰؑ کی اس مثال کی مانند ہے جس میں انہوں نے یہودی احبار و رہبان کے متعلق فرمایا تھا کہ تم پر افسوس ہے کہ تم اونٹ کو نگل جاتے ہو، اور مچھر کو چھان لیتے ہو۔ یہ بات مشہور ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد کچھ کوفیوں نے امام حنیفہؒ سے آ کر دریافت کیا تھا کہ اگر کپڑوں پر مچھر کا خون لگ جائے تو نماز ان کپڑوں میں ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں تو امام صاحب نے فرمایا تھا کہ امام حسینؓ کے خون آلودہ کپڑوں سے تو تم نے نماز ادا کر لی اور اب مچھر کے خون کے متعلق فتویٰ معلوم کرتے ہو، یہ صورت آج ہمارے علمائے کرام کی ہے۔

حدود اللہ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، یہ دین میں حدود کی اہمیت ہے، یقیناً ان کا تحفظ ہمارا ایمان ہے۔ لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا۔ تو افسوس صد افسوس کہ یہی حدود اللہ صرف سزاؤں تک محدود ہو گئیں۔ مذہب میں، یعنی ہماری فقہ میں حد قرآن کریم کی مقرر کردہ سزا کو کہتے ہیں اور ہمارے علماء کرام صرف ان کے تحفظ پر ہی اصرار کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے سامنے دین نہیں ہوتا، اس لئے وہ ان حدود کی پروا نہیں کرتے جو دین میں اہمیت رکھتی ہیں اور جن میں سے صرف تین حدود کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ حدود کا اجراء صرف اسلامی حکومت میں ہی ہو سکتا ہے۔ غیر اسلامی حکومت میں ان کا اجراء نہیں ہو سکتا۔ اسلامی حکومت کی تعریف Definition بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک وہ حکومت جس کے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں اور اس میں اسلامی شریعت جاری ہو، خواہ اس میں اللہ تعالیٰ کی انفرادی طور پر اطاعت ہو رہی ہو، وہ اسلامی حکومت ہے۔ اس حکومت میں انفرادی طور پر نماز ادا ہو سکتی ہے، اس میں انفرادی طور پر زکوٰۃ بھی ادا ہو سکتی ہے، اس میں انفرادی نیک عملیاں بھی سرانجام دی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف قرآن کریم کے نزدیک اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جس میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس میں اطاعتِ الٰہی کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہوتا

ہے۔ جس کی اطاعت بمنزلہ رسول اللہ کی اطاعت کے ہوتی ہے۔ اس حکومت کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہوتی ہے۔ اس میں صلوٰۃ زکوٰۃ حکومت کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس حکومت کے احکام معروف اور اس کے جرائم منکر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی اسلامی حکومت اور صرف اس طرح کی اسلامی حکومت میں حدود کا اجراء ہوسکتا ہے۔ مولوی صاحبان کی تحریک تحفظ حدود اللہ سے حدود اللہ کو انگلیوں پر تو شمار کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح ان کی حفاظت کی جاسکتی ہے، لیکن ان کو جاری نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں تک کے بیان سے آپ نے اندازہ فرمالیا ہوگا کہ پاکستان میں 59 سال گذر جانے کے بعد ہمارے علماء کرام اور عوام کے سامنے صرف مذہب کا تصور ہے۔ دین کا کوئی تصور سرے سے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے ان کے سامنے حدود اللہ کا مذہبی تصور ہے۔ دینی تصور ان کے سامنے آتا ہی نہیں۔

چونکہ ہمارے ہر طرف مذہب ہے اور ہم چاروں طرف سے مذہب میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ مذہب اور دین کے تصور کو بالکل واضح طور پر اپنے سامنے رکھیں اور اپنے عقائد، روزمرہ کے مذہبی معمولات اور مذہبی اصلاحات پر غور کر کے ان کو فوراً دینی مفہوم میں خود منتقل کرلیا کیجئے۔ آپ کی سہولت کے لئے چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

(1) عبادت کے مذہبی معنی پرستش، worship کے ہیں، لیکن اس کے دینی معنی اسلامی حکومت کی اطاعت کے ہیں۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادتِ الٰہی ہے۔

(2) اقامتِ صلوٰۃ کا دینی مفہوم قرآنی حکومت قائم کرنا ہے جس میں تمام افراد قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں۔ قرآن کریم میں جہاں o حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى (2/238) آیا ہے۔ مذہب میں وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى سے مراد عصر کی نماز ہے لیکن دین میں وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى سے سنٹرل اتھارٹی مراد ہے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ تنہا آیا ہے اس سے اجتماعات صلوٰۃ مراد ہیں اور جہاں صلوٰۃ و زکوٰۃ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں

اس سے مراد اسلامی حکومت ہے۔ جس کے لئے (22/4) میں وضاحت آئی ہے کہ اس کے لئے اقتدار شرط ہے۔

(3) مروجہ زکوٰۃ کا کوئی ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ یہ مذہبی زکوٰۃ ہے۔ دینی زکوٰۃ سے مفہوم اسلامی حکومت کی جملہ آمدنی ہے جو وہ نوع انسانی کی نشوونما کے لئے خرچ کرتی ہے قرآن کریم نے اس کی بھی وضاحت فرمادی کہ جب جماعت مؤمنین کی حکومت قائم ہوگی تو وہ ایتائے زکوٰۃ کریں گے (22/41) اسلامی مملکت اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے خود انتظامات کرلے گی۔

(4) توبہ کی دینی صورت یہ ہے کہ آپ نے اسلامی حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی شہری کا مال غصب کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو اس غلطی کا احساس ہوا۔ آپ کی توبہ یہ ہے کہ آپ اس شخص کا مال واپس کردیں اور آئندہ کے لئے عہد کرلیں کہ آپ اسلامی حکومت کے کسی شہری کا حق نہیں ماریں گے۔ یہ آپ کی دینی توبہ ہوگی۔ اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے بغیر ٹکٹ کے سفر کیا، کچھ عرصے بعد آپ کو غلطی کا احساس ہوا، اس میں توبہ کی شکل یہ ہے کہ آپ اپنے اس جرم پر نادم ہوں اور آئندہ بغیر ٹکٹ کے سفر نہ کریں۔

(5) اسلامی حکومت کی دل وجان سے اطاعت کرنے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ تقویٰ صرف اسلامی حکومت میں ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

(6) اسلامی حکومت کے قوانین کو ہر وقت پیش نظر رکھنا، ذکر الٰہی ہے۔

(7) جو لوگ اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کرتے ہیں، اور اس طرح قوانین الٰہی کو عملاً جاری کرنے کی جہدوجہد کرتے ہیں وہ ہی اولیاء اللہ ہیں۔ اولیاء اللہ کا کوئی گروہ الگ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر مسلمان جو اسلامی حکومت قائم کرنے میں مدد کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ولی اور اس کا دوست ہوتا ہے۔ ہم جن حضرات کو حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت معین الدین اجمیری، حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، کو بزرگان دین کہتے ہیں، وہ اصل

میں بزرگان مذہب ہیں دین سے ان کا تعلق نہیں۔اور جو موجودہ علمائے دین کہے جاتے ہیں وہ بھی علماء مذہب ہیں، ان کا دین سے کیا تعلق؟

(8) امر بالمعروف ونہی عن المنکر مذہب میں وعظ کرنے کو کہا جاتا ہے، دین میں اسلامی حکومت کے احکامات اس کے اوامر ہیں۔اور جن امور سے اسلامی حکومت منع کرتی ہے وہ اس کے نواہی ہیں۔

(9) مذہب میں شرع یا شریعت، سابقہ بند ہے ٹکے احکامات ہوتے ہیں جو ہمارے عہد ملوکیت کی یادگار رہیں۔دین میں شریعت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر اسلامی حکومت کے احکام اس کی شریعت ہوتے ہیں۔اور اس اسلامی حکومت کے باشندے ان کی اطاعت کرنے کے مُکلّف ہوتے ہیں۔ان کی اطاعت، عبادت الٰہی ہوتی ہے۔

(10) مذہب میں نذر یا نیاز، بائیس (22) رجب کے کونڈے ہوتے ہیں۔نیاز فارسی لفظ ہے اس کا قرآن کریم سے کوئی علاقہ نہیں۔نذر عربی لفظ ہے اور قرآن کریم نے اس کو استعمال فرمایا ہے۔ یعنی وہ امور جو اپنے آپ پر واجب قرار دے دیئے جائیں۔اسلامی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کی پیشکش نذر ہوتی ہے۔اگر آپ کے قصبہ میں بچوں کا کوئی اسکول نہیں ہے تو آپ پیش کش کرتے ہیں کہ اگر حکومت آپ کے قصبہ میں ایک اسکول کھول دے، تو آپ 40 فیصدی اخراجات برداشت کریں گے اور باقی 60 فیصد اخراجات خود حکومت برداشت کرے، قصبہ کے لوگوں کی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کی یہ پیشکش نذر کہلاتی ہے۔ان دس مثالوں کے علاوہ بے شمار مثالیں اس طرح کے دینی مفاہیم کی پیش کی جاسکتی ہیں۔وقت کی کمی کی وجہ سے ان پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

آپ یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ آج ایک ارب کی مسلم آبادی میں صرف طلوع اسلام سے وابستہ حضرات ہی دین کے داعی ہیں ورنہ ساری دنیا میں مذہب کا احیاء ہو رہا ہے۔یہ جس قدر کام اسلام کے نام پر ہو رہا ہے، یہ سب مذہب کو فروغ دے رہا ہے۔جو سخت نقصان وہ بات ہے

۔اس اعتبار سے ہماری ذمہ داری بہت زیادہ ہوجاتی ہے کہ ہم دین کے نظریات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔

صدر اول کے کچھ عرصہ بعد سے ملوکیت نے ایسا غلبہ حاصل کیا کہ ہم مسلمانوں میں دین کا تصور بالکل ہی جاتا رہا۔اور آج تک سب مسلمان مذہب پر عمل کر رہے ہیں ۔ان حالات پر غور کرنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ تحریک طلوع اسلام کے داعی جو اس دور کے صحیح معنوں میں **منادیاً یُنادی للایمان** تھے۔انہوں نے دین کے تصور کو کس طرح قرآن کریم سے اخذ کیا۔اور مزید حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے جب دین کے تصور کو پیش کیا، اور اسے عام کرنا شروع کیا، اس وقت تک نہ پاکستان ریزولوشن پاس ہوا تھا اور نہ ہی کسی جگہ سے الگ ملک بنانے کی کوئی تحریک شروع ہوئی تھی ۔اس دور کے اس قدر gloomy تاریک ،اور انگریز کی غلامی کے دور میں دین کی آواز بلند کرنا، اسی مردمومن کا کام تھا۔"تحریک پاکستان کے گمشدہ اوراق" نام کی کتاب، جو طلوع اسلام ٹرسٹ سے طبع ہوئی ہے، اس کے وہ مضامین جو 1940 سے پیشتر کے تحریر کردہ ہیں، ان میں انہوں نے دین کا تصور پیش کیا ہے۔اسی طرح حضرت علامہ محمد اسلم جیراجپوری، ہزاروں ہزار تحسین و تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بھی 1940ء سے پیشتر ہی اسلامی نظام کے عنوان سے ایک مضمون طبع کرایا، جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

طلوع اسلام دہلی میں جید برقی پریس، واقع بلّی ماراں سے طبع ہوتا تھا۔اس پریس کے مالک دہلی کے مشہور طبیب حکیم زکی احمد تھے۔ پرویز صاحب مرحوم اس زمانہ میں نور جہاں روڈ، بیرون ترکمان گیٹ پر رہتے تھے۔علامہ محمد اسلم جیراجپوری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر تھے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی اس زمانہ میں قرول باغ میں تھا اور حضرت کی رہائش بھی قرول باغ میں چھپر والے کنوئیں کے بالکل قریب تھی۔ یہ رسالہ چار سال طبع ہونے کے بعد نامساعد حالات کی بناء پر بند ہوگیا تھا اور پھر اس کا اجراء جنوری 1948ء شروع ہوا۔ میں نے یہ رسالہ

1948ء سے ہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اُس وقت میں اپنے والدین کے ساتھ کرشن نگر لاہور میں رہتا تھا، اور گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور کی مشہور لائبریری ہے، جو ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری شمار ہوتی تھی، وہ کالج کے قریب تھی اور میں کالج سے واپسی پر اس لائبریری میں جاتا تھا۔ طلوع اسلام اِس لائبریری میں باقاعدگی سے آتا تھا۔ میں نے یہ رسالہ وہاں پڑھنا شروع کیا میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ یہ رسالہ مجھے بہت پسند آیا اور میں اس کا مستقل قاری بن گیا۔ اس وقت تک تحریک کی چند ہی کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ صرف رسالہ پر ہی گذارہ تھا۔ میں چونکہ رسالہ سے بہت متاثر ہوا، اس لئے میری طبیعت سخت بے چین تھی کہ میں پرویز کو دیکھوں اور ان سے ملوں۔ چنانچہ 1952ء میں میں چندروز کے لئے لاہور سے کراچی آیا اور پرویز صاحب سے ملا۔ اس وقت ان کی رہائش فالور لائز، نیپیر بیرکس، پر تھی۔ میں دن کے وقت حاضر ہوا تھا۔ اگر چہ وہ اس وقت سروس میں تھے۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ اس دن اُن کو معمولی سی حرارت تھی اور وہ دفتر تشریف نہیں لے گئے تھے۔ میں جب ان کی رہائش گاہ میں داخل ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مولوی عبدالرب صاحب سامنے کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں اُنہیں نہیں جانتا تھا میں نے ان کو سلام کیا اور بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں اور پرویز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ پرویز صاحب ملحقہ کمرے میں بیٹھے ہیں اور میں ان سے مل لوں۔ کیونکہ میری عمر اس وقت کم تھی، میں ان سے ملتے ہوئے گھبرا سا رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مولوی الرب صاحب خود میرے ساتھ چلیں۔ انہوں نے مجھے ہمت دلائی اور میں کمرے کے دروازہ سے بالکل لگ کے کھڑا ہوا اور میں نے بلند آواز سے کہا کہ ازہر عباس حاضر ہو سکتا ہے؟ اندر سے آواز آئی تشریف لے آیئے۔ میں اندر چلا گیا۔ میرے ملے جلے جذبات تھے۔ کچھ ان کی شخصیت کا رعب اور کچھ ملنے کی خوشی ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں اپنے متعلق اس سے زیادہ نہیں لکھنا چاہتا ورنہ سارا وقت اسی میں گذر جائے گا، کیونکہ یہ واقعات تو ایک طویل عرصہ پر محیط ہیں۔

1958ء میں پرویز صاحب مرحوم لاہور تشریف لے گئے، اس وقت سے ان کی وفات

تک میں نے ان کے اپنے اور تحریک کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ۔1962ء میں ان کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا، جس کے بڑے بڑے پوسٹر لاہور کے بازاروں، اور سیکرٹیریٹ کی دیواروں پر چسپاں کئے گئے تھے ۔ یہ ان کا بہت پریشانی کا وقت تھا، لیکن انہوں نے ایک لفظ کسی سے نہیں کہا۔ درس قرآن، ان کی کوٹھی میں ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ ان کی تقاریر مختلف کالجوں، یونیورسٹی ہال، MCA ہال، وغیرہ میں ہوتی رہیں ۔ میں سب میں حاضر ہوتا تھا۔ یہ واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ اس ایک تقریر میں بیان نہیں ہوسکتے اس کے لئے کئی مضمون درکار ہیں ۔ اگر قارئین نے خواہش کی تو وہ تحریر کردیے جائیں گے۔

ماہ ستمبر 2007ء

رویت ہلال کا مسئلہ

ہم مسلمانوں میں جب سے علوم کی باقاعدہ درس وتدریس کی ابتداء ہوئی، اور مختلف علوم مدوّن ہونے شروع ہوئے۔ اس وقت سے لیکر آج تک صدہا علماء پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے مختلف علوم پر بے شمار کتب تصنیف کیں، ان میں کچھ تو عقلی وسوشل تھے اور کچھ کو اسلامی لٹریچر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فلسفہ، منطق، ریاضی، ہیئت، الجبرا، فلکیات وغیرہ عقلی علوم ہیں جن میں ہمارے علماء نے زیادہ غور وفکر سے کام لیا۔ جبکہ ہمارے اسلامی لٹریچر میں عموماً نقل وتقلید پرستی کی روش جاری رہی، اور غور وفکر سے کم اور نقل وتقلید سے زیادہ کام لیا۔ اس کے برخلاف جب مغرب میں احیاء علوم RENAISSANCE ہوا ہے، وہاں کے مفکرین نے غور وفکر سے زیادہ کام لیا۔ اسی لئے انگریزی میں سکالر SCHOLOR اور THINKER تھنکر کے الفاظ الگ الگ مفہوم کو زیادہ واضح کردیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ان کے علماء مفکرین کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تعداد علماء کرام کی گذری ہے۔ جنہوں نے صدہا کتب کا مطالعہ کیا ہوا تھا، اور ہر مسئلہ کے متعلق بتاسکتے تھے، کہ کس امام نے اس کے متعلق کیا کہا، اور دوسرے امام نے اس سے اختلاف کر کے، اس کے متعلق فلاں کتاب میں اس طرح تحریر کیا ہے۔ وہ ایک طرح کے (CATALOGUER) کیٹ لوگر اور بقول شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے، وراق ہوتے تھے لیکن مفکر کا یہ کام نہیں ہوتا، خواہ اس کی نگاہ کثیر کتب پر نہ ہو، اس کے باوجود وہ اپنی فراست وبلوغت سے خود مسئلہ کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور خواہ اس کا استنباط سابقہ تمام حضرات سے منفرد ہو، لیکن وہ اپنا منفرد نظریہ ہی پیش کرے گا۔ اگرچہ مغرب میں سکالر اور تھنکر میں فرق کیا گیا ہے، لیکن قرآن کریم

نے اس فرق کو ایک آیۂ کریمہ میں خوب واضح کر دیا ہے جب ارشاد ہوتا ہے ٥ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ٥(17/36)٥ اور جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو (خواہ مخواہ) اس کے پیچھے نہ پڑا کرو (کیونکہ) کان، آنکھ، اور دماغ ان سب کی بازپرس ہو گی ٥ ۔ یہاں قرآن کریم نے، سماعت، بصارت، اور دماغ تین FACVLTIES کا ذکر فرمایا ہے، جب تک کوئی شخص حصول علم میں صرف سماعت و بصارت کو استعمال کرتا رہے گا وہ عالم ہے، اور جب وہ دماغ کو بھی استعمال میں لاتا ہے، وہ مفکر بن جاتا ہے، سماعت و بصارت میں کتابوں کا مطالعہ، مساجد کی تقاریر و خطبات کا سننا، طلباء کا آپس میں مذاکرہ ''وتکرار'' کرنا، یہ سب آ جاتا ہے، ان ذرائع سے بھی انسان بڑے سے بڑا عالم بنتا ہے، لیکن جب انسان خالص دماغ (افـئـدة) سے کام لیتا ہے، تو وہ مفکر کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر علماء کرام ہی ہوئے ہیں ۔ مفکرین کی تعداد بہت کم ہے ۔ ماضی قریب برصغیر پاک و ہند میں سر سید احمد خان کے ساتھیوں میں پانچ حضرات وہ تھے جن کو اس وقت کی انگریزی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا تھا کیونکہ یہ سب حضرات عالم ہی تھے، لیکن سر سید احمد خان خود مفکر تھے اور ایک نئی فکر کے حامل ۔ مولانا ابوالکلام آزاد زبردست سکالر تھے، لیکن ان کی اپنی کوئی تھیوری THEOREY نہیں تھی ۔ اس کے برخلاف علامہ اقبال تھنکر (مفکر) تھے، کہ انہوں نے ،صدر اسلام کے بعد سے پہلی مرتبہ اسلام کو بحیثیت دین کے پیش کیا ۔ اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنا خودی کا تصور پیش کیا ۔ اُس دور میں مذہبی علماء بہت کثیر تعداد میں تھے، لیکن قرآنی مفکر، علامہ محمد اسلم جیراجپوری، خواجہ احمد الدین امرتسری، مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی، اور ان کے شاگرد رشید مولوی حشمت علی دہلوی، ایڈیٹر رسالہ اشاعت القرآن، اور ان سب سے بڑھ کر علامہ پرویز مرحوم و مغفور کہ ان حضرات نے قرآن فہمی کا سابقہ طریقہ بدل کر، قرآنِ خالص پیش کیا ۔ اور قرآن کریم کی تعلیم سے مُستنیر ہو کر انہوں نے وہ وہ جواہر پارے پیش کئے کہ جنہوں نے اندھوں کو بینا بنا دیا، اور مُردوں کو زندہ کر دیا ۔

رویت ہلال کا مسئلہ ہمارے ان حضرات کے ہاتھ میں ہے جو علماء کرام کہے جاتے ہیں اور جو کسی بھی تازہ فکر اور نئی روشنی کو اپنی سوچ میں داخل کرنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں بار بار حکم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے فیصلے مَا أَنزَلَ اللّٰہُ کے مطابق کریں اور جب ان میں کوئی باہمی اختلاف ہو تو اس اختلاف کو اللہ ورسول کی طرف پلٹا دیا کریں۔ ہمارے علمائے کرام **ردّہ الی اللہ والرسول** سے مراد لیتے ہیں کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا قرآن وحدیث کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ فیصلہ کرنے والے یہی حضرات ہوں گے، آپ اس ایک مسئلہ سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت کس طرح جوتیوں میں دال بٹے گی۔ یہ مسئلہ تو اس درجہ اہم نہیں ہے۔ سٹیٹ کے جملہ امور سرانجام دینے میں بعض تنازعات ایسے اہم ہوتے ہیں کہ جن پر قوم کی موت وزندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اس وقت یہ حضرات کتاب وسنت سے کیسے فیصلہ کریں گے۔ یہ بات واضح رہے کہ رویت ہلال کے سلسلہ میں درست فیصلہ کرنے میں وہ حدیث مانع آرہی ہے جس میں ہلال کو ننگی آنکھ سے دیکھنے کا حکم بتایا جاتا ہے اور ہمارے علماء کرام اس کے مفہوم کے بجائے اس کے الفاظ پر ہی STICK کر رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم اور روایات میں جو احکامات آئے ہیں ہمیشہ ان کے معانی ومفہوم اور ان کی مُراد کو پیش نظر رکھنا چاہئے، ان کے الفاظ پر STICK نہیں کرنا چاہئے۔
قرآن کریم میں اس کی بہت سی امثلہ موجود ہیں، ان میں سے چند پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

(1) وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ o(22/27)

o اور لوگوں کو حج کی خبر کر دو کہ لوگ تمہارے پاس (جوق در جوق) پیادہ ہر طرح کی دبلی (سواریوں) پر جو دور دراز کی راہ طے کر کے آئی ہوں گی (چڑھ چڑھ کر) آ جائیں گےo۔ حج کے اجتماع میں آنے کے لئے اگرچہ یہاں بہت واضح الفاظ آئے ہیں کہ وہ دبلی دبلی سواریوں پر یا پیدل چل کر، حج کے لئے آئیں، لیکن اس دور میں اس سے یہ مراد نہیں ہوگی۔ بلکہ اب حجاج کرام موٹروں، جہازوں کے ذریعے حج کے لئے جاتے ہیں، آج اگر کوئی شخص ان الفاظ کے ساتھ STICK کر

کے اس کے LITERAL معنی لے گا، تو وہ درست نہیں ہوں گے۔ اور اپنے لئے خود مشکلات پیدا کرے گا، اور ہر شخص کے لئے اضحوکہ بنے گا۔

(2) وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (8/60)

اور اُن سے لڑائی کے واسطے تیار کرو جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ ڈراؤ اس سے اپنے دشمنوں کو

اور اللہ کے دشمنوں کو۔ یہاں پلے ہوئے گھوڑوں کا حوالہ واضح الفاظ میں دیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آج ہم دشمن سے لڑنے کے لئے پلے ہوئے گھوڑوں کو جنگ میں استعمال نہیں کر سکتے بلکہ جدید سے جدید ترین اسلحہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ جب تک ہم جدید ترین اسلحہ سے لیس نہیں ہوں گے، دشمنوں پر غالب نہیں آسکیں گے بے شمار مثالوں میں سے صرف ایک مثال آپ کے پیش نظر کی جاتی ہے کہ جب جنرل گارڈن اور مہدی سوڈانی کا مقابلہ ہوا تھا تو مہدی سوڈانی کے متبعین بڑی بے جگری اور دلیری سے لڑے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آخر کار مہدی سوڈانی کی ہی فتح ہوگی، اور وہ اسے مامور من اللہ بھی خیال کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود مہدی ہار گیا، زیادہ غم ورنج کی بات یہ ہے کہ اس مقابلہ میں مہدی کے دس ہزار آدمی کام آئے جبکہ جنرل گورڈن (GORDON) کے صرف 40 آدمی قتل ہوئے کیونکہ مہدی کی فوج کے پاس صرف تلواریں اور نیزے تھے جبکہ جنرل گورڈن کی فوج کے پاس بندوقیں اور توپیں تھیں۔ قرآن کریم کے الفاظ سے STICK کرتے رہنے کہ یہ بدترین مثال ہے۔

(3) وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (8/16)

جو شخص بھی اس دن ان کفار سے اپنی پیٹھ پھیرے گا وہ یقیناً اللہ کے غضب میں آ گیا۔ جنگ کے موقع پر فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ο(8/15) ان سے پشت نہ پھیرنا کے الفاظ واضح آئے ہیں۔ یہ

حکم دست بدست لڑائی کے لئے تو درست ہوسکتا ہے لیکن آج کی جنگ میں یہ نہیں چل سکتا۔ بعض مرتبہ بطور STRATEGY فوج کو پیچھے ہٹانا ہوتا ہے، اور اپنے مورچے چھوڑنے ہوتے ہیں، اور بعض اوقات بارود بھرنے کے لئے بھی پیٹھ پھیرنی ہوتی ہے، یہاں مراد آیت کریمہ کی یہ ہے کہ بے جگری سے لڑائی کرو اور بزدلی نہ دکھاؤ اس موقع پر LITERAL معنی نہیں لئے جا سکتے۔

(4) اعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (5/8)

عدل کرو کہ یہ تقوی کے قریب ہے صدر اسلام میں عدل کرنے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ مسجد میں بیٹھ کر شہادتوں پر انحصار کر کے عدل کر دیا جاتا تھا۔ آج عدل کا طریقہ بالکل مختلف ہے، آج بڑے بڑے ادارے، ہائی کورٹس، سپریم کورٹس یہ کام سرانجام دے رہی ہیں۔ عدل کرنے کے طریقوں میں بھی شہادتوں کے علاوہ، جدید ترین سائنسی طریقے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ تاکہ اس سے صحیح عدل حاصل کیا جا سکے۔ جرائم کی نوعیت بھی صدر اسلام کے دور کی نہیں رہی، نئی نئی نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ اس لئے ''اعۡدِلُوۡا'' کے الفاظ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ عدل کے طریقوں کی نوعیت بدلتی گئی۔ جس طرح قرآنِ کریم میں اعۡدِلُوۡا کا حکم آیا ہے، بالکل اسی طرح وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ آئے ہیں۔ جس طرح عدل کے طریقے بدلتے چلے گئے، ظاہر ہے کہ اسی طرح صلوٰۃ کے طریقے بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے جائیں گے۔ قرآن کریم کے نزدیک دنیا میں کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ ہر دنیاوی کام جس کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے کر دیا جائے وہ دینی بن جاتا ہے، اسی طرح قرآن کریم کی رو سے عدل وصلوٰۃ میں دین ودنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ روزوں کے بارے میں حکم ہوتا ہے کہ وَکُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ (2/187) اور کھاؤ پیو حتی کہ تمہارے لئے فجر کی سفید دھاری (شب کی) سیاہ دھاری سے واضح ہو جائے۔ اس آیہ کریمہ میں طلوع سحر تک کھانا پینا حلال کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے **کلوا واشربوا الی طلوع الفجر** نہیں فرمایا حالانکہ اس طرح کہنا مختصر ہوتا بلکہ اس نے حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ

اَلْفَجْرِ کا طویل عنوان اختیار فرمایا ہے جس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کھانا پینا اس وقت تک جائز ہے جب تک عام مسلمانوں پر یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ سحر کی سفید دھاری شب کی سیاہ دھاری سے متمیز و واضح ہوگئی ہے۔ مدار سحر کے طلوع پر نہیں بلکہ عام لوگوں پر واضح ہونے پر ہے۔ حضوؐر کے زمانہ میں نہ سحر و افطار کے نقشے۔ نہ ان کے پاس گھڑیاں ہوتی تھیں کہ وہ ایک ایک منٹ کا شمار کریں۔ نہ ہی وہ سفید دھاریوں کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے بلکہ اس معاملہ میں بہت، نرمی اور وسعت تھی۔ آج کل جو ہمارے مولوی صاحبان افطار کے وقت کے تعین پر شدید اصرار کرتے ہیں کہ روزہ وقت پر نہ کھولنے سے مکروہ ہو جاتا ہے، یہ بات اس دور میں دُور دُور بھی نہیں تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا کہ بلال رات کو اذان دیں، تم کھاتے پیتے رہا کرو حتی کہ عبداللہ ابن اُم مکتوم اذان دے دیں۔ اور یہ عبداللہ نابینا تھے۔ وہ اس وقت تک اذان نہیں دیا کرتے تھے، جب تک ان سے کہا نہ جاتا تھا کہ صبح ہوگئی ہے۔ قرآن کریم نے شمس وقمر کو انسان کے تابع فرمان بنایا ہے o وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (14/33) o اور سورج اور چاند کو تمہارا تابعدار بنا دیا کہ ہمیشہ پھیری کرتا ہے۔ یہ سب انسان کے خدمت گذار اسی لئے سعدی نے کہا ہے کہ ؎

ابر و باد و مہ و خورشید در کار اند   تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے خلاف ہم نے چاند کو مذہبی تقدس دے رکھا ہے۔ ہم چاند دیکھتے ہیں تو ہاتھ بلند کر کے دعائیں مانگتے ہیں، جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔ خوف و کسوف کے وقت باقاعدہ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے تو چاند اور سورج دونوں کو ماہ وسال کے شمار کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (6/96) سورج اور چاند دونوں سے حساب کا کام لیا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے o الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ o (55/5) o سورج اور چاند ایک مقرر حساب سے (چل رہے) ہیں o۔ اس لئے ان دونوں سے گنتی شمار کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح رہنی

چاہئے کہ قرآن کریم نے خود شمسی کیلنڈر تجویز کیا ہے لیکن ہم مسلمانوں نے خود اس کو قمری قرار دے دیا ہے قرآن کریم نے ایک سال کے پورے بارہ مہینے خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ وہ گیارہ یا تیرہ نہیں ہو سکتے۔ بارہ ماہ میں سے کچھ بھی کمی و بیشی کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ٥ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ (9/36)٥ قانون الٰہی کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہوں گے۔ اس آیہ کریمہ نے واضح کر دیا کہ قانون قدرت کے مطابق سال کے بارہ مہینے ہیں اور قانون قدرت یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد ایک سال میں پورا چکر لگاتی ہے۔ اس مدت کو بارہ پر تقسیم کر دینے سے کیلنڈر فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ مہینوں اور سال کو فطرت کے مطابق کرنے کے لئے لازماً شمسی کیلنڈر اختیار کرنا ہوگا، کیونکہ قمری مہینہ تو قدرتی ہو سکتا ہے، لیکن قمری سال قدرتی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قمری سال 11 دن چھوٹا ہوتا ہے، اس لئے قمری حساب سے 12 مہینوں میں زمین کا چکر سورج کے گرد پورا نہیں ہوتا۔ قمری حساب سے وہ چکر گیارہ دن بعد جا کر پورا ہوتا ہے، اس لئے سال کے کے بارہ ماہ نہیں بنتے بلکہ اس میں گیارہ دن کا اضافہ ہو جاتا ہے اور ایک سال 12 ماہ گیارہ دن کا بن جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم کی رو سے سال، اور چکر کو آپس میں SYNCHRONIZE یعنی توافق کرنا ضروری ہے۔ یعنی زمین کے چکر کو پورے سال کو COVER کرنا ضروری ہے۔ یہ شرط صرف شمسی کیلنڈر سے پوری ہوتی ہے، قمری سے پوری نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کی رو سے وہ کیلنڈر اختیار کرنا ہوگا، جس کی مدت اور زمین کا چکر بالکل ایک دوسرے سے COINCIDE، منطبق کر جائیں لیکن ہم مسلمانوں نے یہ بڑی فاش غلطی کی کہ ہم نے مہینے تو بارہ ہی رکھے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہیں لیکن کیلنڈر قمری کر لیا، اس کی وجہ سے ایک سال میں گیارہ دن زیادہ ہو جاتے ہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کی خالص تعلیم اختیار کریں اور اس کے حکم کے مطابق مہینوں کی تعداد بارہ رکھیں، اور شمسی کیلنڈر اختیار کریں تا کہ اُن بارہ مہینوں میں زمین کی گردش بھی پوری ہو جائے۔

شمسی کیلنڈر اختیار کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہمارا کیلنڈر قرآن کریم کے مطابق

ہو جائے گا اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ رمضان اور عید کا چاند دیکھنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔حکومت کو چاہئے کہ METEOROLOGICAL ڈیپارٹمنٹ سے معلوم کر کے، رمضان اور عید کے دنوں کا تعین کر لے اور لوگوں کو بہت پیشتر سے اس سے آگاہ کر دے۔ پھر ہر شخص پر یہ پابندی ہوگی کہ وہ حکومت کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق رمضان شروع کریں اور اسی کے مطابق عید کریں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ محکمہ اور مذہبی، رویت ہلال کمیٹی، کونسل آف اسلامی آئیڈیالوجی (CII) اسلامی شریعت کورٹ وغیرہ قسم کے ادارے غیر اسلامی، سیکولر حکومتوں میں ہوتے ہیں، اسلامی حکومت میں ان کا کیا کام۔ وہ حکومت تو خود ساری قرآنی حکومت ہوتی ہے، اور قرآنی احکامات نافذ کرتی ہے، جن کا تسلیم کرنا ہر شہری کا فرض ہوتا ہے اور جس کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہوتی ہے۔وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ o(28/28)

ماہ اکتوبر 2007ء

"مائدۃ من السماء" کا دینی مفہوم

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزّ السمہٗ ہوتا ہے o قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (5/114) o حضرت عیسٰیؑ نے عرض کیا اے اللہ ہمارے رب ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادے، اس آیہ کریمہ کے بارے میں بڑی تفصیل سے مفسرین کرام نے لکھا ہے جس کا مُلخّص یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے یہ دعا کی تو ایک سرخ رنگ کا خوان لوگوں کی نظروں کے سامنے اُوپر سے اترنے لگا۔ ابر کا ایک ٹکڑا خوان سے اوپر تھا اور ایک نیچے۔ خوان آکر لوگوں کے سامنے گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عیسٰیؑ رونے لگے اور عرض کیا اے اللہ مجھے شکر گذاروں میں سے کر دیا ور اس کو رحمت بنادے۔ عذاب نہ بنانا (تفسیر مظہری) اسی قسم کی بفوات و تفاصیل تمام تفاسیر میں مذکور ہیں۔ یہاں صرف ایک مختصر سا اقتباس نقل کیا گیا ہے تا کہ قارئین کرام کو ان تفاسیر کے علمی و ذہنی معیار کا اندازہ ہو سکے۔ یہ تمام تفاسیر مذہبی نقطہ نظر سے تحریر کی گئیں تھیں۔ اور یہ حصہ بھی اس ذیل میں آتا ہے۔ جبکہ دینی حیثیت یہ ہے کہ لوگوں کے آپس کے معاملات، و تنازعات کو وحی کی رُو سے طے کرنا دین ہے۔ اس لئے انسانی زندگی کا معاشی شعبہ بھی اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے o اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (24/51) o ایمان داروں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب انہیں اللہ اور رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سنا اور (دل سے) مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں o۔ دوسری جگہ طاغوتی نظام کی قائم کردہ عدالتوں سے رجوع کرنے کو سختی سے منع کیا گیا ہے اور ان کی طرف

رجوع کرنے کو کُھلی گمراہی قرار دیا ہے (4/60) اور اگر کوئی مومن مجبوراً یا غلطی سے، اس عدالت کی طرف رجوع کرے اور وہ عدالت اس کے حق میں فیصلہ کر کے، اس کا مال وسامان اُس کا واپس دلا دے تو اس مومن کا فرض ہے کہ وہ عدالت کا دیا ہوا مال واپس نہ لے، کیونکہ اگر اس نے وہ مال وسامان واپس لے لیا تو اس نے اس طاغوتی عدالت کو RECOGNIZE کر لیا، جبکہ طاغوتی عدالتوں کی اطاعت، اللہ ورسول سے سرکشی اور اُن کی معصیت ہے۔

طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنے والے کو قرآن کریم نے مجرم قرار دیا ہے (6/123) اور اس کو حکم دیا ہے کہ وہ فوراً وہاں سے ہجرت کر لے۔ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَـٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا o (4/97) تو فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی (ایسی لمبی چوڑی) زمین میں بھی اتنی گنجائش نہ تھی کہ تم کہیں ہجرت کر کے چلے جاتے بس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے o۔ ہمارے اس موجودہ دور میں جبکہ کہیں بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہے۔ ہجرت کا CHOICE بھی باقی نہیں رہتی۔ آج کل کے دور میں مومن کے لئے صرف ایک اختیار باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کے قائم کرنے میں پوری پوری کوشش کرے۔ اور اس کوشش میں ذرہ برابر کمی نہ آنے دے۔ رات دن اسی دُھن میں لگا رہے۔ اس کوشش کرنے سے اس کے نفس پر اس قدر اچھے اثرات مرتب ہوں گے کہ وہ اس طاغوتی نظام میں رہنے کی مجبوری کو COVER کر جائیں گے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (11/114) نیکیاں بیشک گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔

یہ بات کہ ہم اپنی پوری زندگی کو قوانین خداوندی کے تحت رکھیں، اس میں ہماری معاش ازخود قوانین خداوندی کے ماتحت آجاتی ہے قرآن کریم کے معاشی نظام کو چھوڑ کر، کسی بھی معاشی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے سے جو رزق حاصل ہوتا ہے وہ حرام ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے وہ کبھی حلال نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کے مطابق ربوٰ حرام ہے اور اللہ ورسول کے خلاف جنگ ہے (2/279)، سرمایہ داری (CAPITALISM) کھلم کھلا ربوٰ ہے، فلہذا حرام ہے۔ قرآن کریم

کی وہ تمام تفاسیر جو دورِ ملوکیت میں مذہب کی نمائندگی کرتے ہوئے تحریر کی گئیں وہ سب سرمایہ داری (CAPITALISM) کو جائز قرار دیتی ہیں طاغوتی نظام میں کوئی شخص کتنے ہی جائز طریقوں سے آمدنی حاصل کرے، وہ سب حرام ہے، جب طریقہ ہی ناجائز ہے، تو اس سے حاصل کردہ آمدنی کیسے جائز قرار پا سکتی ہے۔ ہمارے علمائے کرام مذہب کے حامی و مؤید ہیں اور دین کے قیام سے ان کی روزی خطرے میں پڑ جاتی ہے اسی لئے وہ دین کے قیام کی کوشش نہیں کرتے۔ o وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ o (56/82) o اور اپنا حصہ تم یہی لیتے ہو کہ اس قرآن کو جھٹلا رہے ہو o (ترجمہ شیخ الہند) جبکہ مولانا فرمان علی نے یہ ترجمہ دیا ہے o اور تم نے اپنی روزی یہ قرار دے لی ہے کہ (اس کو) جھٹلاتے ہو o۔ یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے زیادہ واضح ہے۔ حضرت شیخ الہند نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "اور اپنا حصہ اتنا ہی سمجھ کہ اس (قرآن) کو اور اس کے بتلائے ہوئے حقائق کو جھٹلاتے ہو"۔ حضرت شیخ الہند کا یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہمارے علماء کرام عربی ادب سے ناواقفیت کی بناء پر غلط ترجمہ کرتے ہیں۔ وہ عربی ادب پر خوب مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآنی آیت کا درست ترجمہ اس لئے پیش نہیں کرتے کہ اس سے ان پر تعریض ہوتی ہے۔ آیہ کریمہ کا درست ترجمہ (اور مفہوم) یہ ہے کہ o تم قرآن جیسی کتاب کو اس لئے جھٹلاتے ہو، کہ اس سے تمہاری روٹی چلتی رہے o۔

اب عنوان بالا کی آیہ کریمہ کی دینی تشریح کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں ہمارے مفسرین کرام نے مائدہ کا ترجمہ خوان کیا ہے حالانکہ مائدہ صرف کھانے اور خوراک کو کہتے ہیں۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ دوسرے ہماری تفاسیر نے انزل کا ترجمہ اتار دے یا نازل کر دے کیا ہے لیکن قرآن کریم نے انزال کے معنی عطا کرنے کے بھی کئے ہیں۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (57/25) ہم نے لوہا عطا کیا۔ انزل کے معنی ان اسباب کا مہیا کرنا ہے جس سے انسان اُن چیزوں کو حاصل کر سکے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر قانون خداوندی کے مطابق معاشی نظام قائم کرو گے تو رزق کی فراوانی

ہوگی ارشاد ہوتا ہے o وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم (5/66) o اگر یہ لوگ توریت وانجیل اور جو صحیفے ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کئے گئے تھے۔ ان کو قائم رکھتے (یعنی ان کے مطابق نظام قائم کرتے۔ از راقم) تو ضرور ان کے اوپر بھی (رزق برستا) اور پاؤں کے نیچے سے بھی۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے o وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (7/96) o اور اگر ان بستیوں میں رہنے والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

آیت کریمہ سے واضح ہے کہ وَاتَّقَوْا، جب انہوں نے قانون خداوندی کا اتباع کیا تو آسمان و زمین میں برکات کا دروازہ کھل گیا حضرت عیسیٰ کے بارے میں فرمایا کہ جب ان کے ساتھی حواریوں نے اپنی زندگیاں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے فروغ دینے کے لئے وقف کردیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی معاش کا ایسا بندوبست کردیا کہ وہ حصول رزق کی طرف سے مطمئن ہوگئے (5/114) اس آیہ کریمۃ میں مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ کے معنی ہی وہ رزق ہے جو قانون خداوندی کے مطابق حاصل ہو۔ دوسری جگہ جہاں مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ آیا ہے وہاں بھی یہی معنی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے o قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ (5/114) o اس پر تم نے اے عیسیٰ دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہماری نشوونما کا سامان نظام خداوندی کی رُو سے عطا ہوجائے۔ حضرت عیسیٰ کی دعا کے مطابق یہ رزق ان کی قوم کو حاصل ہوا۔ اس کی وضاحت سورۃ آل عمران میں فرمائی گئی کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہو وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (3/49) میں تمہارے طاغوتی معاشی نظام کے بجائے وہ خداوندی نظام قائم کروں گا کہ جو اس بات پر کنٹرول رکھے گا تم کھانے کی چیزوں میں سے کس قدر استعمال میں لاتے ہو اور کس قدر انسانیت کو نفع پہنچانے کے بجائے HOARDING (تدخرون) کرتے ہو۔ اور اس سے ناجائز نفع کماتے ہو۔

مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ وہ رزق ہوتا ہے جس کی تقسیم وحی خداوندی کی رو سے ہوتی ہے اور جس کو دوسری جگہ قرآن کریم نے ؐبَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (11/86)، سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں بَقِیَّتُ اللّٰہ اس دولت وسامان کو کہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کی رو سے حاصل کیا جائے۔ قرآن کریم کی رو سے صرف وہ رزق حلال ہے جو وحی خداوندی کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اور اس تقسیم کے لئے اسلامی حکومت کا قیام لازمی ولابدی ہے۔ ورنہ اس نظام اور اس تقسیم کو نظر انداز کرکے، جو بھی رزق حاصل کیا جائے گا وہ مطلقاً حرام ہوگا۔ اور مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ کے زمرہ سے باہر۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ o

ماہ جنوری 2008ء

51

نفاذ شریعت کے بارے میں چند غلط فہمیاں

آج کل مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک بلین سے تجاوز کر گئی ہے، اور 56 کی تعداد مسلمان ممالک کی ہے۔ مگر مسلمانوں کی اس بدقسمتی اور بدنصیبی پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ ان کے عقائد قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ بظاہر جو ممالک اپنے اسلامی ہونے کا ادعا کرتے ہیں اور اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ وہ بھی لکیر کے فقیر اور تقلید پرستی اور اسلاف پرستی میں مبتلاء ہیں۔ سارے عالم اسلام میں کسی جگہ بھی روشنی کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی۔ بلکہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ تاریکی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے ہماری پیشوائیت جو کبھی بھی قابل اعتناء نہیں تھی، آج اس کے TENTACLES ساری اُمت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بظاہر جو طبقہ جدید تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے، وہ بھی موجودہ ذرائع ابلاغ مثلاً T.V وغیرہ کی وجہ سے پیشوائیت سے متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ساری دنیا میں صرف، موقر رسالہ صوت الحق کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ قرآن کریم کے نور کو پھیلانے کی حد درجہ کوشش کر رہا ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں کہ جب تک ہم مسلمانوں میں انفرادی پرستش کا تصور باقی رہے گا، نہ تو مسلمان اپنا نظام قائم کر سکتے ہیں، اور نہ ہی اس دنیا میں کوئی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ترقی وعروج تو وابستہ ہی خالص قرآن کریم کے نظام کے ساتھ ہے۔ یہ بات کہ مسلمانوں کے عقائد قرآن کریم کے خلاف ہیں اس کی دو مثالیں پیش خدمت کی جاتی ہیں۔ آپ خود ان سے اندازہ فرمالیں کہ موجودہ دور میں خواہ وہ عرب ہوں یا عجم ان کے نظریات قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ مورخہ 9، نومبر 2007ء کو ایک چھوٹا سا اداریہ، ڈیلی ٹائمز میں شائع ہوا تھا۔ اس کا آزاد ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''فتاویٰ کی بُری حالت''

''قاہرہ کی ازہر یونیورسٹی جو ایک زمانہ میں روشن خیال تھی۔اب وہاں سے ایسے فتاویٰ جاری ہورہے ہیں ، جو سخت گیر اسلام کی ترجمانی کررہے ہیں ۔جن میں سے اکثر و بیشتر آزاد خیال مفکرین کو سزا دینے کے لئے ہوتے ہیں ۔آج کل یہ جامعہ ہر روز ایک ہزار فتاویٰ جاری کرتا ہے۔ پورے عالم اسلام میں ہزاروں کی تعداد میں فتاویٰ جاری ہوتے ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو پورا کردیں کہ وہ اسلام کے احکامات کے مُطابق عمل کررہے ہیں یا نہیں ۔ان حضرات کی نگاہ میں حکومت اوراس کے قوانین کوئی اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ یہ حضرات اس طرح بالواسطہ ان کو رد کردیتے ہیں مثال کے طور پر ہندوستان کا دارالعلوم (دیوبند) جس کے متبعین صرف جامعہ ازہر سے دوسرے درجہ پر ہیں، اس نے T.V دیکھنے کو خلاف شرع قرار دیا ہے۔بدقسمتی سے خود ٹی وی چینلز ہی لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے علماء کرام کو مدعو کرتے ہیں ،اوران علماء کرام کی وجہ سے ہی فتاویٰ کی حالت مزید خراب ہورہی ہے۔

پاکستان اور بنگلہ دیش میں جن لوگوں کے خلاف موت یا ارتداد کے فتاویٰ جاری ہوئے تھے ۔وہ سب قتل کردئیے گئے ہیں ۔ بنگلہ دیش نے فتاویٰ پر پابندی لگادی ہے، لیکن پاکستان اس معاملہ میں اس وجہ سے ٹال مٹول کررہا ہے کہ بدقسمتی سے ارتداد کی سزا اس کے قانون کا ایک حصہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں (اوراسی طرح ہر جگہ) فتاویٰ کے اجراء سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ، کہ قومی حکومت عوام کی نگاہ میں کس حدتک اپنی اہمیت اور اپنا جواز کھوچکی ہے ''۔ترجمہ ختم

مندرجہ بالا اداریہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری پیشوائیت کا کس درجہ اثر ہمارے عوام پر ہے۔مذکور بالا اخبار کے ایڈیٹر نے جو نتیجہ نکالا وہ ان کی بالغ نظری کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کہ علماء کرام سے وہ لوگ فتاویٰ حاصل کرتے ہیں ، جن کی نظر میں موجودہ ریاست اور ریاست کا قانونی ڈھانچہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا ، جس درجہ فتاویٰ حاصل کرنے کی

روش میں اضافہ ہوگا اسی قدر مسلمانوں میں پیشوائیت کو فروغ حاصل ہوگا اور اسی تناسب سے مسلمان پستی کی طرف رواں ہوں گے۔ باقی رہا خود اسلامی فقہ وشریعت اور اس کی حقیقت تو اس پر تبصرہ آگے آتا ہے۔ البتہ اتنی بات یہاں ہی عرض کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگر مسلمان موجودہ قعرِ مذلت سے نکلنا چاہتے ہیں تو انہیں دو امور لازماً سرانجام دینے ہوں گے خواہ وہ ان کو کتنے ہی کڑوے کیوں نہ معلوم ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ اولاً تو اس سابقہ فقہ کو فوراً ترک کرنا ہوگا جو ملوکیت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مدّون کیا گیا تھا۔ اور دوسرے ہمارے ہاں جو تفاسیر تفسیر القرآن بالرّوایات کے طریقہ پر تحریر کی گئی ہیں۔ جن کے نظریات و مشمولات زیادہ تر قرآن کریم کے خلاف ہیں، ان سب کو بلا کسی استثناء خواہ وہ سابقہ دور کی ہوں یا موجودہ دور کی یا خواہ عربی میں تحریر کردہ ہوں یا اردو اور فارسی میں، سب کو فوری طور پر ترک کر کے نئی تفاسیر القرآن بالقرآن کے اصول پر اور موجودہ دور کی علمی سطح کے مطابق تحریر کی جائیں، اور آئندہ ان ہی شہ پاروں سے استفادہ کیا جائے۔ چونکہ اس مضمون کا موضوع تفسیر القرآن نہیں ہے، اس لئے صرف ان ہی معروضات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے عقائد کے خلافِ قرآن ہونے کی دوسری مثال ہمارے ملک عزیز پاکستان میں قاضی کورٹس کا قیام ہے۔ قاضی کورٹس کے قیام کے بارے میں ہمارے انگریزی اخبارات میں مسلسل تبصرے شائع ہو رہے ہیں اور وہ اخبارات ان کورٹس کے قیام میں جو جو قباحتیں درپیش ہوں گی، ان سب کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان اخبارات میں سے کوئی بھی شریعت کے نفسِ مضمون پر تبصرہ نہیں کرتا۔ ہماری پیشوائیت کا غلبہ اس قدر ہے کسی اخبار کے کسی مدیر کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ سابقہ شریعت کے اجراء سے اس وقت کی کوئی حکومت اسلامی نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف اس کے خامیوں کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ موقر رسالہ صوت الحق کو چونکہ عملی سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ وقتی وہنگامی حالات پر تبصرہ نہیں کرتا، البتہ جو کام بھی قرآن کریم کے خلاف ہوتا ہے، اس کی نشاندہی کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے صرف اس لئے چند

گذارشات و معروضات پیشِ خدمتِ عالی ہیں۔

جہاں تک لفظ شریعت کا تعلق ہے۔ یہ لفظ ہمارے ہاں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنی میں تو اس کو خود قرآن کریم نے استعمال کیا ہے، جبکہ ارشادِ عالی ہوتا ہے o شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّینِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِیٓ اَوحَینَآ اِلَیکَ وَمَا وَصَّینَا بِهٖٓ اِبرٰهِیمَ وَمُوسٰی وَعِیسٰٓی اَن اَقِیمُوا الدِّینَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِیهِ کَبُرَ عَلَی المُشرِکِینَ مَا تَدعُوهُم اِلَیهِ (42/13) o اس نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس (پر چلنے) کا نوح کو حکم دیا گیا تھا اور اسی کی ہم نے تمہارے پاس وحی کی اور اسی کا ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا یہ کہ دین قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ جس دین کی طرف تم مشرکین کو بُلاتے ہو، وہ اُن پر بہت شاق گذرتا ہے۔

تمام انبیاء کرام کی وحی میں ان کو دین ہی عنایت کیا گیا تھا۔ چونکہ انسانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرے بھی ترقی کررہے تھے اس لئے دینی احکام میں بھی معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ابتدا انسانی معاشرے بھی ترقی کررہے تھے اس لئے دینی احکام میں بھی معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ابتدأ انسانی معاشرے بہت سادہ تھے اس لئے اُنہیں دین میں ہدایت بھی بہت کم دی گئی تھیں لیکن جب آہستہ آہستہ معاشرے زیادہ ترقی پذیر ہوتے گئے، اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے گئے، تو دین کی ہدایات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، جو ہدایات، مستقل اقدار، اور تعلیم سب انبیاء کرام کو تواتر کے ساتھ ملتی رہیں وہ دین تھا، اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا، البتہ وقت کے تقاضوں کے مطابق جن جزئیات کا اضافہ ہوتا گیا اور وقت کے پیشِ نظر جو تبدیلیاں کی گئیں، وہ شریعت کے لفظ سے موسوم ہوئیں۔ چنانچہ اس دور کی معروف تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس سلسلہ میں تحریر ہے ''جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہے اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے ہیں۔ (جلد دوم۔ صفحہ 535)

لیکن ہمارے علماء کرام شریعت کا لفظ اس فقہ و قوانین کے لئے استعمال کرتے ہیں جو

بنو عباس کے دور میں مدّون ہوئے ہیں۔ اور اُس دور سے آج تک وہ ہمارے سروں پر مسلط رہے ہیں۔ اور ان ہی قوانین کو ہمارے علماء کرام اب پھر جاری کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوانین خود ہی قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان قوانین کے خلافِ قرآن ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ان قوانین کے مقاصد و اہداف ہی قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے ملوکیت و پیشوائیت قطعاً حرام ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود جابر و فاسق اور بدچلن بادشاہ محض اپنی قوت کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے۔ اس لئے اُس دور میں جس قدر قوانین وضع کئے گئے، اُن سب کا مفاد ملوکیت و پیشوائیت کا استمرار و استبقاء اور بادشاہوں کی بدچلنی و بد کرداری کا جواز مُہیا کرنا تھا۔ ان بادشاہوں کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں اس لئے ایسے قوانین وضع کئے گئے جن سے بردہ فروشی اور غلامی کے جواز مہیا کئے گئے اور قرآن کریم کی واضح تعلیم فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (47/4) پھر اس کے بعد (غلاموں) کو احسان رکھ کر یا معاوضہ لے کر چھوڑ دو جیسے واضح حکم کو پس پشت ڈال دیا گیا یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں اور ہماری فقہ میں آج تک بردہ فروشی چلی آ رہی تھی۔

فقہ کے مطابق مطامع نظر کے خلافِ قرآن ہونے کی دوسری عجیب و دلچسپ مثال امام غزالی کی ایک تحریر ہے۔ اس تحریر کی اہمیت میں اضافہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ تحریر کسی معمولی شخصیت کی تحریر نہیں ہے بلکہ اس شخصیت کی تحریر ہے جو ہمارے علماء کرام کے سرخیل و سرتاج تھے اور حُجۃ الاسلام کے الفاظ سے مُلقب تھے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں "سلطان زمین پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ سلطانی سلطانوں کو اللہ تعالیٰ نے مرحمت کی ہے۔ لہٰذا ان کی اطاعت کرنی چاہئے۔ اُن سے محبت کرنی چاہئے اور ان کا حکم ماننا چاہئے۔ سلطان سے جھگڑا کرنا درست نہیں ہے اور اُن سے نفرت کرنا غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (نصیحت الملوک، صفحہ 44، مطبوعہ لندن 1964ء)" امام صاحب موصوف کی تحریر سے فقہ کا ہدف اس درجہ واضح ہو جاتا ہے کہ فقہ کے مفاد کے بارے میں مزید کچھ تحریر کرنا تحصیل

حاصل ہے یہاں تک تو فقہ یا شریعت کے اہداف ومطامع کا خلافِ قرآن ہونے کے متعلق گفتگو ہوئی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نام نہاد شریعت جو ہمارے علماء کرام جاری کرنا چاہتے ہیں وہ خود اپنی بناوٹ، ساخت اور تعمیر کے اعتبار سے خلافِ قرآن ہے اور اس سے وہ نتائج کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتے جو اسلامی نظام عدل سے حاصل ہو سکتے ہیں۔قرآن کریم کا ارشاد عالی ہے وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ o(5/44)وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ o(5/47)وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ o(5/45)جو شخص بھی منزل من اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر فاسق، وظالم ہے o۔دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ(5/48)اور جو کچھ اللہ نے تم پر نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو۔نیز ارشاد ہوتا ہے oوَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)o جس بات میں بھی تمہارا اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ان پانچ آیات کریمات سے، اور اسی قسم کی مزید بے شمار آیات کریمات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کا شدید اصرار ہے کہ عدل وانصاف کا انحصار و مدار صرف قرآن کریم پر ہے۔اور قانون سازی کا ماخذ و منبع صرف اور صرف قرآن کریم ہے۔لیکن ہماری موجودہ شریعت میں صرف قرآن کریم قانون کا ماخذ نہیں ہے بلکہ حدیث (سنت) اجماع وقیاس بھی موجودہ شریعت کے ماخذ ہیں جو اصطلاح فقہاء میں **ادلہ اربع** کہلاتے ہیں۔لیکن قرآن کریم کی رو سے منزل من اللہ میں کسی چیز کا اضافہ کرنے کے بعد، فیصلہ کرنے والا اپنے آپ کو ظالم، فاسق اور کافر کی لسٹ میں شامل کر دیتا ہے ۔کیونکہ قرآن کریم نے تو واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ جو بھی قرآن کریم فیصلہ نہیں کرے گا وہ مسلمان نہیں رہے گا۔حضورؐ کے دورِ مبارک میں قرآن کریم کے احکامات واصولوں کو اسلامی حکومت کی طرف سے جاری کرنے میں جو مختلف صورتیں اختیار کی گئیں وہ سنت وحدیث تھیں۔جب ہر طرح کے احکام نظام حکومت کی طرف سے جاری ہوتے تھے، تو ان پر سب کا اجماع ہوتا تھا اسی طرح حالات کے تقاضوں کے مطابق بعض احکام کو قیاس کرنے کے بعد جاری کیا جاتا تھا۔اصل یہ ہے کہ

قرآن کریم کی واضح ہدایت کے مطابق شریعت کا ماخذ تو صرف قرآن کریم ہے۔ یہ باقی تینوں ذرائع قانون کی تدوین یا ان کے اجراء کے طریقے ہیں۔ قرآن کریم کے مطابق کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو اسی طرح جاری کرنا، اتباع سنت ہوگا نئے معاملات پر غور کرنا قیاس ہے اور پوری قوم کے مشورے سے ان فیصلوں تک پہنچنا اور انہیں جاری کرنا، اجماع ہے اس طرح قانون کا ماخذ صرف قرآن کریم ٹھہرے گا۔ واضح رہے کہ شریعت کوئی جامد یا FINISHED PRODUCT نہیں ہوتی۔ یہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہر دور کے مسائل کو حل کرتی ہے۔ ہماری موجودہ شریعت جو بنو عباس کے دور کی بنائی ہوئی ہے وہ آج کے مسائل کو حل نہیں کرسکتی کیونکہ اس دور کے معاشرتی حالات بنو عباس کے دور کے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم مسلمانوں کے حالات میں بے شمار تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہمارے معاشرتی رشتے بدلے، پیداوار کے طریقے بدلے، سماجی اقدار بدلے رسم ورواج بدلے، رہن سہن کے طریقے بدلے، سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کے انداز بدلے، قانون وضابطے بدلے، علوم وفنون بدلے، نئی ٹیکنالوجی کی بے شمار ایجادات آئیں۔ ٹیلیفون، ٹیلیویژن، فرج، ایئرکنڈیشنز، کاریں، ریل، ہوائی جہاز، بجلی، ان سب چیزوں نے ہیئت بدل METAMORPHOSIS کر کے رکھ دی ان تمام تبدیلیوں کو بھلا کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ان موجودہ معاشروں کو پیچھے دھکیل کے، ان کی تنظیم ان خطوط پر نہیں کی جاسکتی جو بنو عباس کے دور میں تھے۔ اس زمانہ کے وضع کردہ قوانین میں اتنی وسعت وگنجائش ہی نہیں ہے کہ اجتہاد کیا جاسکے۔ اور اگر ان جامد، بنجر، بے جان، قوانین کو اختیار بھی کیا جائے، تب بھی وہ اس دور کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہاں تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ ایک ایسی بات ہے کہ ہر وہ شخص جو پہلے سے BIASED نہ ہو، اور اس پر تقلید واسلاف پرستی کا گہرا اثر نہ ہو، وہ اس بات کو قبول کرے گا کہ شریعت کے نفاذ سے نہ تو یہ مسائل ہی حل ہوسکتے ہیں، اور نہ ہی قرآن کریم کا یہ مقصود ہے۔ یہ دو مثالیں جو تحریر کی گئی ہیں وہ کوئی نئی یا انوکھی نہیں ہیں۔ جبکہ ہماری ساری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی کوئی مفکر اٹھا، اس نے مسلمانوں میں انقلاب پیدا کرنے اور ان کو بیدار کرنے کے لئے

مذہب کے احیاء کو ہی اپنا مقصود بنایا ہے۔ ہماری تاریخ میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ جن کے سامنے تعظیم سے ہمارے سر جھک جاتے ہیں۔ حجت الاسلام امام غزالی، امام ابن تیمیہ، ابن قیم، نجدی سنوسی تحریکوں کے بانی، ہمارے برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کا خانوادہ یہ سب حضرات علم کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ہمدرد و غمگسار بھی تھے، لیکن افسوس، صد افسوس، صد ہزار افسوس کہ ان حضرات میں سے سب مذہب کی حدود میں ہی گھرے رہے۔ دین تک ان کی نظر پہنچ ہی نہیں سکی۔ اس بارے میں یہ دور اس درجہ خوش قسمت ہے کہ ہماری تاریخ میں یہ پہلا دور ہے جس میں دین کا تصور نکھر کے سامنے آیا اس کا باعث کچھ تو حالات کے تقاضے اور فطرت کے اشارے ہیں نیز یہ کہ مسلمانوں کو سخت ذلت و خواری کا سامنا ہوا کہ ان کے پاس قرآن کریم کا نظام قائم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہا۔ دوسری وجہ یہ کہ دین کے دُعاۃ کے سامنے خالص قرآن تھا۔ وہ حضرات قرآن کریم کے علاوہ کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوئے۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم اور نتائج تک پہنچ گئے۔ ہم جو لوگ اس تحریک سے وابستہ ہیں، اس تمسک بالقرآن، احیاء دین پر جس قدر فخر و ناز کریں کم ہے ایک ہزار سال کے بعد ہم مذہب کو ترک کر کے، دین قائم کرنے کے لئے اُٹھے ہیں۔ دین کے قیام میں انفرادی پرستش کا عقیدہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ دین میں تو احکامات خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے اور وہ بھی اجتماعی طور پر اس لئے دین میں انفرادی پرستش کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ اس بارے میں ہمارے ہاں نماز کا مسئلہ بڑا غور طلب ہے اور چونکہ ہمارے ہاں صدر اول کو چھوڑ کر، کبھی بھی صلوٰۃ کا صحیح تصور نہیں رہا۔ اس لئے ہمارے سارے لٹریچر میں اس بارے میں کوئی راہ نمائی بھی نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے صلوٰۃ کو اسلامی نظام (صلوٰۃ تمکنہ) اور صلوٰۃ موقت دونوں معانی میں استعمال کیا ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ قرآن کریم میں ایک سو دو بار (102) آیا ہے اور غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ کس مقام پر کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ صلوٰۃ موقت سے مراد وہ تمام اجتماعات ہیں جو نظام دین کا ایک حصہ ہیں۔ دین کو قیام کرنے سے پیشتر وہ تمام اجتماعات جن میں

دین کے قیام کی کوشش کی جائے صلوٰۃ موقت ہے۔ ہماری بزموں کے اجتماعات ان میں شامل ہیں دین کے قیام ہو جانے کے بعد وہ ادارے اور وہ تمام اجتماعات جو نظام حکومت کی نگرانی میں قائم ہوں اور جن سے اسلامی نظام کو چلانے میں مدد ملے وہ سب صلوٰۃ موقت ہیں اگر ہم اپنی مرجہ نمازوں میں دین کے قیام کی کوششوں کو بھی ساتھ ساتھ شامل کرلیں تو یہ بھی صلوۃ موقت میں تبدیل ہوسکتی ہیں، اور اس طرح یہ ایک رُکاوٹ کے بجائے دین کے قیام میں مُمد ومعاون ہوسکتی ہے۔ نماز کے فوری بعد تمام نمازی اس اجتماع میں دین کے قیام کی تجاویز کو زیر بحث لائیں۔ اور نماز کا مقصد ذاتی پرستش کے بجائے دین کا قیام قرار دیں تو یہ صلوٰۃ موقت میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ تاہم صلوۃ کے بارے میں جو کچھ رقم کیا گیا ہے وہ صرف ذاتی سوچ کا نتیجہ ہے، نہ تو اس کے درست ہونے پر اصرار ہے اور نہ ہی اس کو دوسروں پر IMPOSE کرنے کی نیت ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قیام پاکستان کی جہد وجہد کے دوران ہمارے علماء کرام اسلامی نظام کے خلاف ہی رہے۔ حالانکہ اس دوران رسالہ طلوع اسلام میں اسلامی نظام کی حمایت اور سیکولر نظام کی تردید میں جامع مقالات شائع کئے گئے بعض مضامین تو براہ راست علماء کرام کو مخاطب کر کے رقم کئے گئے تھے جواب بھی ''تاریخ کے گم شدہ اوراق'' نامی کتاب میں محفوظ ہیں۔ مگر یہ ہمارے علما کرام ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ تاہم اب بالآخر وہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے طلوع اسلام سے متفق الرائے ہوگئے۔ طلوع اسلام جو بات قیام پاکستان سے پیشتر کہتا تھا، اُنہوں نے اب آ کر یہ بات کہنی شروع کی۔ یہ بات تو خوش آئند ہے کہ وہ سیکولر نظام کے خلاف ہوئے اور اسلامی نظام کے قیام کی موافقت میں ہوئے۔ لیکن اب بھی ان کی APPROACH درست نہیں ہے۔ اب جب کہ انہوں نے طلوع اسلام کی اتنی بات مان لی، اگر وہ اسلامی نظام کے بارے میں مذہب کا تصور چھوڑ کر دین کا تصور اختیار کرلیں تو مسلمان موجودہ تباہی و بربادی سے نکل سکتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام کے لئے یہ سمجھنے کی بات ہے کہ کسی بھی حکومت میں شریعت باہر سے IMPOSE نہیں ہوتی بلکہ شریعت اسلامی حکومت کے اندر خود بخود بنتی اور چلتی ہے اور یہ ایک

EVER-EVOLVING اور EVER-DEVELOPING سسٹم ہوتا ہے۔اس میں سوچ کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔فکری رجحانات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔نئے نئے مسائل کو FACE کرنا ہوتا ہے۔اس ریاست کی پارلیمنٹ اور عدلیہ نئے نئے قوانین قرآن کریم کی روشنی میں اور اس کے حدود کے اندر بناتی چلتی ہیں اور وہی اس کی شریعت ہوتی ہے۔وہ اپنے MOMENTUM پر بڑھتی چلی جاتی ہے۔اور جس قدر مشکل مسائل سے یہ دوچار ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے شریعت نشو ونما حاصل کرتی ہے۔اس شریعت کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔اور اس کے جاری کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے وہ تمام وعدے پورے ہوتے ہیں۔جو اس نے قرآن کریم میں مسلمانوں سے کئے ہیں۔ہمارے علماء کرام اس قرآنی شریعت کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ اس کے اجراء کی وجہ سے ان کا HOLD مسلمانوں پر نہیں رہتا۔سابقہ مدون شدہ شریعت کے نفاذ سے ان کی اہمیت قائم رہتی ہے کیونکہ وہ ان کی EXCLUSIVE ملکیت ہوتی ہے۔اسی لئے ہمارے علماء کرام قرآنی شریعت کی مخالفت کرتے ہیں اور مسلمانوں کے عروج و خوش حالی میں حارج ہوتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ o

ماہ اپریل 2008ء

(مکاتب)

لندن سے جناب ناظر علی صاحب کے سوالات

اگرچہ ہمارا موجودہ دور مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش وزبوں حالی کا دور ہے۔ لیکن بڑی ہی خوش آئند بات یہ ہے کہ صدر اول کے بعد پہلی مرتبہ قرآنِ خالص کی آواز بلند ہونی شروع ہوئی ہے۔ چونکہ یہ آواز مذہبی مسلمانوں کے نظریات کے خلاف ہے اوران کے مخالفِ قرآن نظریات کی تردید کرتی ہے، اس لئے ان کی مخالفت ہونا بھی ضروری بات تھی۔ گزشتہ صدی میں مولوی عبداللہ صاحب کی نگرانی میں ایک رسالہ اشاعت القرآن، مسجد سریانوالہ، بازار، لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ جس کی ادارت مولوی حشمت علی صاحب دہلوی کرتے تھے۔ اور مالی تعاون شیخ محمد چٹو صاحب فرماتے تھے۔ یہ رسالہ اپنے وقت میں اہل قرآن حضرات میں بہت مقبول تھا۔ اس اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ رسالہ علامہ اقبال کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ اوران کے مطبوعہ خطوط میں اس رسالہ کا ذکر موجود ہے۔ میں نے پنجاب پبلک لائبریری، لاہور سے اس رسالہ کی 1902ء 1903ء کی نقول بہت مشکل سے حاصل کیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور اہل قرآن پر بڑی پریشانی کا دور تھا۔ اب الحمدللہ کہ وہ صورت نہیں رہی۔ اب پاکستان میں بڑی تعداد قرآنی حضرات کی ہے۔ اور رسالہ، صوت الحق، بلاغ القرآن، طلوع اسلام قرآنی قندیل کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ پاکستان کے علاوہ بھی قرآنی نظریات دیگر ممالک میں خوب پھیل رہے ہیں۔ جس ملک میں بھی قرآنی احباب موجود ہیں وہ اس نور کو پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں۔ خصوصاً لندن میں بہت سے حضرات، اس نور کو پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ لندن میں بزم طلوع اسلام کے درس کا سلسلہ کیانی صاحب مرحوم کے گھر میں

1970ء میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد عرصہ دراز سے برادر محترم جناب فرحت مقبول صاحب لندن بزم کے نمائندے ہیں۔ لندن کے نارتھ میں محترم المقام جناب سید شاہد علی صاحب میرٹھی کے ہاں، ہر بدھ کے روز یہ شمع نورانی فروزاں ہوتی ہے۔

سید شاہد علی صاحب، مشہور شاعر اسماعیل میرٹھی کے عزیز ہیں، اور خود عالم دین ہیں۔ ان کے مضامین موقر رسالہ بلاغ القرآن میں طبع ہوتے رہتے ہیں جو بہت پسند کئے جاتے ہیں اور ان سے شاہد علی صاحب کی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے یہ وہ گھر ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ oفِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ o(24/36) اس آیت کریمہ کا مفاد مفہوم القرآن میں اس طرح درج ہے ''وحی خداوندی کا یہ چراغ (جماعت مومنین کے ان) گھروں میں روشن رہتا ہے جن میں اللہ کی گونا گوں صفات (واحکام) کا چرچا رہتا ہے۔ اور جو اس طرح (قوانین خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنے سے) دنیا میں بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ ان گھروں کے رہنے والے صبح وشام (ہروقت) نظام الٰہی کے قیام وبقاء کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ ان گھروں اور ان گھروں کے مکینوں کی خوش قسمتی پر جس قدر بھی فخر ورشک کے جائے کم ہے۔ انہی گھروں میں ایک گھر سید ناظر علی صاحب کا ہے، جنہوں نے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے کہ ''ہم نے قرآن کریم کے مطالعہ کے لئے اعلیٰ پڑھے لکھے افراد کا ایک حلقہ بنایا ہے۔'' قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہی جناب ممدوح نے مندرجہ چار سوالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سوالات سورۃ بقرہ کی ان آیات سے متعلق ہیں۔ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o(2/184) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے لئے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو o۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہند) عزیز مکرم جناب سید ناظر علی صاحب نے یہ سوالات تحریر فرمائے ہیں۔

(1) کیا مسافر اور عارضی مریض کو یہ سہولت ہے کہ وہ قضا روزوں کے بدلے فدیہ ایک مسکین کو کھانا دے دیا روزے بھی بعد میں مکمل کرے۔

(2) یُطِيقُونَهٗ کن افراد کے لئے آیا ہے وہ جو طاقت رکھتے ہیں مگر روزے نہیں رکھتے یا مریض کو شفایاب ہونے کے بعد اور مسافر کو سفر سے فرصت پانے کے بعد جو طاقت آتی ہے۔

(3) کئی مفسرین نے آیت کے اس حصے عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيقُونَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کو منسوخ قرار دیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ وہ کونسی آیت ہے جس سے آیت کا حصہ منسوخ ہوا ہے۔

(4) آخری سوال یہ ہے کہ ایک تندرست لیکن سخت محنت کا کام کرنے والا جس آمدنی سے اپنے گھر والوں کی روٹی بھی پوری نہیں کرسکتا وہ رمضان کے فرض روزے کس طرح پورے کرے گا؟

جوابات پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں

(1) عزیز محترم کا پہلا سوال واضح ہے۔ آیت کے الفاظ اس درجہ واضح ہیں کہ کسی تفسیر یا تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر کوئی شخص بیمار یا حالت سفر میں ہے تو وہ صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آنے کے بعد، یہ مدت پوری کرے۔ ان دونوں صورتوں میں فدیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) دوسرے سوال کے متعلق ہمارے مفسرین کرام نے بہت طویل وعریض بحث لکھی ہے۔ میرے پاس اس وقت بیضاوی شریف نہیں ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قاضی صاحب نے بیضاوی شریف یُطِيقُونَهٗ سے پیشتر لامحذوف مانا ہے اور مفہوم یہ کیا ہے کہ جو طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں۔ لیکن یہ دور از کار تاویل ہے کیونکہ یہاں کوئی

قرینہ لامحذوف ماننے کا نہیں ہے اور اس طرح لامحذوف ماننے سے قرآن کریم کی عبارت میں اضافہ ہوتا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں ہے کچھ مفسرین کرام نے یُطِیْقُوْنَہٗ کی ضمیر مفعول کا مرجع صوم کے بجائے طعام کو قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی یہی تاویل کی ہے اور اس ضمیر کو ضمیر شان قرار دیا ہے جس سے اصل عبارت یوں بنتی ہے عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ اور جو لوگ مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہوں تو ان کے لئے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔ لیکن یہ بھی مفسرین کی ایک تاویل ہے اور اس سے اضمار قبل الذکر ماننا پڑتا ہے جو کلام کا ایک ایسا عیب ہے جو قرآن کریم میں نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ آیت کا یہ حصہ جملہ متانفہ ہے۔ اس حصہ کا آیت کے سابقہ حصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں ایک نئی صورتِ حال کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی مسافر ہے۔ لیکن وہ یا تو جسمانی طور پر بہت کمزور ہے یا اس کی ڈیوٹی اس درجہ محنت طلب ہے کہ وہ بھوکا پیاسا اپنی ڈیوٹی ادا نہیں کر سکتا۔ یا کوئی حاملہ عورت ہے۔ یا وہ شخص بہت بوڑھا ہے اور روزہ کی صعوبت برداشت نہیں کر سکتا تو ایسے حضرات کے لئے ایک رخصت ہے کہ وہ روزوں کا فدیہ ادا کر دیں۔ اُنہیں پھر روزے نہیں رکھنے ہوں گے۔ کیونکہ اُنہیں روزوں کی قوت نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ حالت ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہے اور انسان خود ہی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ اگر ان مذکورہ بالا کمزوریوں کے باوجود وہ ہمت کر کے روزہ رکھ لیں تو ان کے لئے ارشاد ہوا کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ اگر وہ خیر کریں تو یہ خیر ان کے لئے ہے اور بہر حال فدیہ روزہ کا بدل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(3) نسخ کا عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ مندرجہ بالا آیات کریمات کا جو مفہوم عرض کیا گیا ہے اس میں نسخ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہمارے مفسرین نے روایات کے زیر اثر آیات کا غلط مفہوم اخذ کیا، اس لئے اُنہیں مجبوراً نسخ کا سہارا لینا پڑا۔ جو بحث انہوں نے یہاں نسخ کی ہے وہ طویل بھی ہے اور ژولیدہ بھی، اس لئے اس کو یہاں نقل نہیں کیا جاتا۔

(4) اگر کوئی شخص کمزوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا، اس کا مسئلہ تو تحریر کر دیا گیا ہے اور

افلاس کی وجہ سے فدیہ نہیں دے سکتا تو ظاہر ہے بوجہ عدم استطاعت تو دونوں کاموں سے محروم ہے۔ اس لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ سرخیل علماء اہل قرآن، سرتاج مفسرین، محترم جناب خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری مرحوم نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر ''بیان للناس'' میں روزہ کے سلسلہ میں دو فارسی اشعار نقل فرمائے ہیں۔ ہمارے سابقہ علماء جب بھی عربی و فارسی کے اشعار درج کرتے تھے تو وہ ان کا ترجمہ نہیں لکھتے تھے، اس دور میں عموماً لوگ تھوڑی بہت فارسی جانتے تھے، اس لئے وہ علماء یہ PRESUME کرتے تھے کہ ان کا ہر قاری یہ اشعار سمجھ لے گا۔ آپ ''غبار خاطر'' مطالعہ فرمائیں۔ اس میں بڑی کثرت سے عربی و فارسی کے اعلیٰ اشعار دئے گئے ہیں۔ لیکن ترجمہ ایک کا بھی نہیں ہے، اسی روش کے مطابق خواجہ صاحب نے بھی ترجمہ نہیں لکھا ہے۔ چونکہ لندن والے سب ہی فارسی نہیں جانتے ہوں گے اس لئے ان کا ترجمہ پیش خدمت عالی ہے۔

چوں کم خوردن طبیعت شد کسے را — چو سختی پیشش آید سہل گیرد
وگر تن پرور است اندر فراخی — چوں تنگی بیند از سختی بمیرد

(ترجمہ) اگر کسی شخص کو کم کھانے کی عادت ہو جائے تو وہ سختی کو بآسانی برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص آسان زندگی میں بھی تن پرور ہے تو وہ جب مصیبت سے دوچار ہوتا ہے اس سختی کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ روزہ، روزہ دار کی طبیعت میں صلابت، اور برداشت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں نے روزے کے جو نتائج بیان فرمائے ہیں وہ الگ موضوع ہے اور وہ نتائج اس وقت برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔ وہ نتائج تو اسلامی حکومت میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔

ماہ مئی 2008ء

میرے عزیز بھائی اور بہن کے چند مغالطے

میری ایک خواہر عزیزہ نے جو اگرچہ روایتی مسلمان تو ہیں، لیکن مذہب سے کچھ مطمئن نہیں ہیں۔ انہوں نے چند روز پیشتر مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ آپ نے ساری عمر پرویز صاحب کی تحریک کے ساتھ گذار دی، اور پاکستان میں ہر شخص مذہب میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود عملی صورت یہ ہے کہ معاشرہ روز بروز بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے ان کا اعتراض یہ تھا کہ کیونکہ مذہب پر عمل کرنے سے معاشرہ پر اس کا کوئی مُثبت اثر نہیں ہو رہا ہے، اس لئے مذہب اختیار کرنا بے سود ہے۔ اس واقعہ سے چند روز پیشتر، میرے ایک عزیز بھائی نے جو بالکل ہی سیکولر مزاج کے ہیں، بہت تعلیم یافتہ ہیں، اور پیشے کے اعتبار سے بہت کامیاب PAEDIATRICIAN ہیں، انہوں نے یہ اعتراض فرمایا کہ اسلام نے دنیا میں کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کئے۔ نہ تو اس نے اپنے ابتدائی دور میں عربوں کی حالت بدلی اور نہ ہی انسانیت کی فلاح وفوز میں کوئی اہم کردار ادا کیا۔ یہ دونوں اعتراض آپس میں لازم وملزوم ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ واضح ربط رکھتے ہیں۔ جس وقت یہ اعتراض کئے گئے وہ مواقع جواب کے لئے مناسب نہیں تھے۔ اس لئے میں نے اس وقت خاموشی اختیار کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اعتراضات اکثر وبیشتر حضرات کرتے رہتے ہیں اور بظاہر یہ سوالات وقیع بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے مناسب خیال کیا گیا کہ ان کا جواب رسالہ ھذا میں تحریر کر دیا جائے تا کہ اور حضرات کی نظر سے بھی یہ گزر جائے۔

خواہر عزیزہ کے اعتراض کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس میں اصل ابہام (CONFUSION) وغلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات مذہب سے ان نتائج کی توقع کرتے ہیں جو

دین کے قیام سے حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے سامنے دین کا کوئی دھندلا سا بھی تصور نہیں ہے۔ اس لئے یہ حضرات دین اور مذہب کے تصورات میں CONFUSED ہیں اور ان دونوں میں تفریق نہیں کر سکتے، مذہب سے برگشتہ ہونے کی وجہ سے دین سے بھی متنفر ہو جاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کا مذہب سے یہ توقع کرنا ہی غلط ہے۔ معاشرہ کو درست کرنے کے بارے میں مذہب کا کوئی ROLE ہی نہیں ہے۔ مذہب کا معاشرہ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ تو چند رسومات ہوتی ہیں، جو ہر شخص کسی بھی جگہ، کسی وقت، اپنے اپنے طور پر ادا کر لیتا ہے۔ بھلا مذہب کا معاشرہ سے کیا علاقہ؟ اس سے اس کار خیر کی توقع ہی غلط ہے اور اس کا عملی ثبوت ہمارے سامنے ہے۔ مذہب میں سب سے اہم نماز ہوتی ہے۔ آپ نماز ادا کرتے ہیں تو فقہ میں جو اس ادائیگی کی شرائط آتی ہیں۔ آپ ان سب شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اگر کسی شخص کے کپڑے ناپاک ہیں، اور ان پر پیشاب کے قطرے پڑتے تھے، تو ان ناپاک کپڑوں سے نماز ادا نہیں ہو سکتی۔ فقہ کی کتابوں میں عموماً مبطلات نماز کی تعداد گیارہ بیان کی گئی ہے، کہ اگر یہ گیارہ چیزیں واقع ہو جائیں تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ان میں حدث (WINDS) ہوا کا صادر ہونا، قبلہ سے منحرف ہونا، سورۃ الحمد کے بعد عمداً آمین بالجبر کہنا، خوف خدا کے علاوہ دینوی امور کے لئے رونا، استفراغ ہونا، وغیرہ شامل ہیں فقہاء کرام کے قول کے مطابق اگر ان گیارہ مبطلات میں سے کوئی ایک مُبطل بھی واقع نہ ہو، تو نماز درست ہوگئی۔ آپ غور فرمائیں کہ ان گیارہ امور میں سے کسی ایک امر کا بھی کوئی علاقہ معاشرہ کی درستگی و اصلاح سے نہیں ہے۔ اس کے برخلاف اگر ایک شخص نے اپنے دفتر میں بارہ بجے رشوت لی، اور ایک بجے ظہر کی نماز نہایت خضوع و خشوع سے ادا کر لی، تو ان فقہاء کرام کے مطابق، اس کی نماز بالکل درست ادا ہوگئی اور ''انشاء اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگی کیونکہ رشوت لینا مُبطل نماز نہیں ہے۔ اسلئے ہماری نماز کا کوئی ROLE معاشرہ کے سنوارنے میں نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب حج بیت اللہ شریف پر تشریف لے جا رہے ہیں اور ان کا بالکل ساتھ کا جوان پڑوسی سخت بیمار ہے اور اس کے پاس علاج کے لئے رقم نہیں ہے، اور حاجی صاحب کے حج کرنے کے دوران وہ

فوت ہو جائے تو حاجی صاحب کا حج اللہ ورسول کے ہاں مقبول ہے۔ پڑوسی کے علاج کرانے یا اس کو موت سے بچانے کا کوئی تعلق حاجی صاحب کے حج سے نہیں ہے۔

لاہور میں، ریلوے اسٹیشن کے قریب شاہ محمد غوث صاحب کا ایک مشہور مزار شریف ہے۔ وہاں ایک متمول تاجر نے لاکھوں روپے لگا کر، اس مزار کی مرمتیں کرائیں۔ اب بھی ہر شخص خود جا کر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ اسی مزار پر بڑی کثرت سے گداگر ہجوم کئے ہوتے ہیں۔ میں نے اُن صاحب سے عرض کیا کہ شیخ صاحب آپ اس قدر خطیر رقم مزار کی تزئین پر خرچ کر رہے ہیں، اس میں سے کچھ رقم ان مساکین وفقراء کو بھی عنایت کر دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان بھکاریوں کو تو مانگنے کی عادت ہو گئی ہے اور شیخ صاحب محترم مزار شریف کی آرائش وتزئین سے بالکل مطمئن تھے۔ قبر پرستی، مُردہ پرستی، کا معاشرہ کی اصلاح سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جس قوم کے زندہ افراد مردوں سے امداد کے طالب ہوں، اس قوم کا اللہ ہی مالک ہے اور اس کی پستی کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں، اور اس زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لئے کسی کمیشن کو بٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے مفسرین کرام نے آیات کریمات کے شان نزول بیان کئے ہیں۔ اور ان آیات کو نزول قرآن کے وقت کے مومنین ومنافقین سے مختص کر دیا ہے۔ ہر آیت کریمہ کے بارے میں تحریر کر دیا کہ یہ آیت فلاں صحابی یا فلاں منافق کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ مفسرین کرام کے اس طریقہ کا اثر ہم مسلمانوں پر یہ ہوا کہ جب ہم اُن آیات کو پڑھتے ہیں۔ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ آیات اُس دور کے مومنین ومنافقین کے متعلق ہیں۔ ہمارا ان سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہم میں کوئی منافق نہیں ہے، یہ اُسی دور کے منافق تھے۔ لیکن جب ہم قرآن کریم کی وہ آیات پڑھتے ہیں جن میں مسلمانوں سے غالب آنے کے وعدے کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ وعدے اس وقت پورے نہیں ہو رہے ہیں، تو ہم قرآن کریم کے وعدوں پر شک کرنے لگ جاتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا وَلَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ٥ (4/141) اللہ نے کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں دی ہے ٥ نیز فرمایا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥ اگر تم سچے مومن ہو تو

تم ہی غالب رہو گے o اور ہم اپنے کو مومن شمار کر کے، یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم نے وعدے پورے نہیں کئے۔ حالانکہ قرآن کریم کے معیار کے مطابق تو ہم مومن ہی نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے مطابق تو مومن صرف وہ ہے جو قرآنی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کر رہا ہو، (5/44-5/45-5/47) اگر کوئی اس حکومت کے ماتحت زندگی بسر نہیں کر رہا ہے تو وہ مسلمان تو یقیناً ہے، لیکن صرف مردم شماری کے رجسٹر کا مسلمان ہے۔

اصل یہ ہے کہ جو توقعات لوگ مذہب سے کرتے ہیں۔ وہ ساری توقعات دین پوری کرتا ہے۔ آپ مذہب کی نماز کے بجائے دین کی الصلوٰۃ کو پیش نظر رکھیں پھر دیکھیں کہ الصلوٰۃ معاشرہ کی اصلاح کے لئے کیا رول PLAY کرتی ہے۔ الصلوٰۃ کے لئے اقتدار شرط ہے (22/41) یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ اقتدار ہوتا ہے۔ مغلوب قوم صلوٰۃ قائم ہی نہیں کر سکتی۔ صلوٰۃ معاشیات پر محیط ہے (11/87) اس لئے معاشرہ کی اصلاح خود بخود کرتی ہے۔ کوئی شخص قیام صلوٰۃ کے بعد، غریب، محتاج، اور بغیر رزق کے نہیں رہ سکتا (11/6-6/151) قرآن کریم کی رُو سے اقامت صلوٰۃ قوانین خداوندی کا اتباع کرنا، اور تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی سرفرازیاں اور آخرت کی سرخرویاں ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے یہ **صلوٰۃ تمکنہ** ہے یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت قائم ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ اس کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ اس میں وقت و جگہ کی کوئی قید نہیں ہے اس کے قیام میں اوقات کے تعین کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس میں تو تمام افراد ہر وقت قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں اور یوں قرآن کریم کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں (7/170) قرآن کریم نے صلوٰۃ موقت کا بھی ذکر کیا ہے (4/103) یہ وہ اجتماعات، ادارے، NGOS ہیں جو قرآنی حکومت کے قیام کی کوشش کرتے ہیں۔ فی الحال بزم طلوع اسلام کے اجتماعات اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ البتہ صلوٰۃ تمکنہ، یعنی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو اس وقت وہ تمام ادارے جو حکومت کی نگرانی میں، حکومت کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ اُن

کے اجتماعات صلوٰۃ موقت ہیں۔ ہماری موجودہ نمازیں اگر حکومت کی زیرنگرانی، موجودہ دور میں، قرآنی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرنے لگیں اور معاشرہ میں قرآن کریم کے احکامات کو جاری کرکے، معاشرہ کو قرآنی خطوط پر قائم کرنے لگیں تو یہ صلوٰۃ موقت کے زمرہ میں آسکتی ہیں۔ پھر جب اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو اس حکومت کی نگرانی میں اس کے قائم رکھنے میں اس کی امداد کریں۔ اس کی ADMINISTRATION میں اس کی مدد کریں، اس صلوٰۃ موقت کی ساری کوششیں اجتماعی ہوں گی۔ موجودہ نماز تو انفرادی پرستش ہے۔ قرآن کریم نے انفرادی پرستش کی اجازت ہی نہیں دی ہے۔ انفرادی پرستش سے انفرادی نجات کا تصور اُبھرتا ہے۔ اور انفرادی نجات سے خود غرضی اور صرف اپنے مفادات کو پیش نظر رکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب تک انفرادی پرستش اور انفرادی نجات کا تصور ہم مسلمانوں میں باقی رہے گا کبھی بھی اجتماعی، مفادات سامنے نہیں آئیں گے اور نہ ہی انفرادی پرستش معاشرہ کو درست کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ دوسری عبادت زکوٰۃ کو شمار کیا جاتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اپنی آمدنی میں سے صرف اڑھائی فیصد مال اللہ کی راہ میں دے دیں اس کے بعد جس قدر بھی مال بچے وہ شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ لیکن دین کی رو سے اسلامی حکومت کا اساسی و بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد انسانیہ کی نشوونما کرے۔ قرآن کریم میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ جب دین قائم ہوگا تو اس دین میں تمام افراد انسانیہ کو سامان نشوونما ملے گا (22/4) قرآن کریم نے فرمایا o اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی o (92/18) جو اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے اس کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے o۔ اس طرح دوسروں کو مال دینے سے اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی ذات کی نشوونما کا رشتہ نوع انسانی کی نشوونما کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت میں اپنی ذات کی ربوبیت کو مضمر و پنہاں سمجھتا ہے اور اس طرح انسانیت خود بخود ترقی کرتی ہے اور معاشرہ بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہی حال روزے کا ہے۔ روزے میں احتیاط اس درجہ کی جاتی ہے کہ انجکشن تک لگانا بھی منع کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزے کے دوران جھوٹی گواہی دیدے، جوا کھیلے، انکم ٹیکس

بچائے، اور اسی طرح کے دوسرے وہ اعمال کرے جس سے معاشرہ خراب ہوتا ہے تو اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا، دین کی رُو سے روزے کا مقصد ضبطِ نفس پیدا کرنا ہے تاکہ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (2/185) تاکہ تم اللہ کے قانون کو دوسرے قوانین پر غالب کر دو اس بات کے عوض کہ اللہ نے تمہاری راہ نمائی فرمائی ہے۔ اسلامی حکومت میں قانون کا سرچشمہ تو قرآن کریم ہے اور نظام حکومت کا مرکز کعبہ ہے، جب بھی اسلامی حکومتوں کو آپس میں مشورے کی ضرورت پیش آئے تو وہ کعبہ میں جمع ہو کر جو مشورے کرتے ہیں۔ وہ سالانہ اجتماع حج کہلاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں تمام صوبوں کے والیان حج کے دوران حاضر ہوتے تھے اور حضرت عمرؓ ان کے مسائل حل کرنے کے علاوہ ان کو معاشرہ درست کرنے کے لئے احکامات بھی عنایت فرماتے تھے۔ اب لطف یہ ہے کہ اس نظام کو تو متروک ہوئے عرصہ گزر گیا لیکن حج کے اجتماعات اسی طرح مُنعقد ہوتے ہیں جس کا مقصد صرف انفرادی پرستش رہ گیا ہے۔ اس کا عملی طور پر اصلاحات سے کوئی علاقہ نہیں رہا۔ اسی وجہ سے اب حج کی صحیح پوزیشن صرف ''مذہبی رسم'' سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اب برادر محترم کا اعتراض سامنے آتا ہے کہ اسلام نے دنیا میں کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کئے اور نہ ہی اپنے ابتدائی دور میں عربوں کی حالت بدل کر کوئی عمدہ معاشرہ قائم کیا۔ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس اعتراض کے دو حصے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں عربوں کے معاشرہ میں کیا تبدیلیاں کیں اور دوسرے یہ کہ اسلام نے عام انسانیت کو کیا دیا کہ جس کے مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو دو رائے ہونی بڑی مشکل ہے۔ اسلام سے پیشتر عربوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ سارے عرب میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو خواندہ کہلا سکتے تھے۔ ان کے ہاں حکومت یا معاشیات کا کوئی باضابطہ سسٹم ہی نہیں۔ بالکل افراتفری کی کیفیت تھی۔ قبائلی طریقہ ان میں رائج تھا۔ اور وہ بھی نہایت غیر منظم طور پر، صرف طاقت کا بول بالا تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت، بدچلنی، بدعہدی، شراب نوشی ان کا عام چلن تھا۔ ان کے حالات تو بہت تفصیل سے درج ہیں جن کے تحریر کرنے سے مضمون کی طوالت کا اندیشہ ہے،

اختصار کی خاطر مسدس سے صرف تین بند تحریر کیے جاتے ہیں۔ جو ملاحظہ ہوں۔

(1)

چلن ان کے تھے سب وحشیانہ
ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

(2)

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے
سُلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے
تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اُٹھتا تھا ملک سارا

(3)

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی
تھی ایک آگ ہر سُو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ ایک ان کی جہالت کا تھا وہ

احساس برتری اور جذبہ انتقام جوئی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسی لڑائیاں ہو جاتی تھیں جن کا سلسلہ سو سال تک جاری رہتا تھا۔ اور ہر مرنے والا اپنی اولاد کو وصیت کر جاتا تھا کہ جب تک تم فریق مخالف سے انتقام نہ لے لو، اس آگ کو بجھنے نہ دینا۔ سُود خواری کی لعنت عام تھی اور اس کی حدود اتنی وسیع تھیں کہ اپنی عورتوں اور بچوں تک کو رہن رکھ دیتے تھے۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کا طبقہ سود خواروں کے پنجہ میں محبوس تھا یہ تھی وہ قوم جس میں

حضورؐ کی بعثت ہوئی اور اس کی کیفیت ہوئی کہ ۔

(1)

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی   عرب کی زمین جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی   اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غُل یہ پیامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت وجبل نامِ حق سے

(2)

مِس خام کو جس نے کندن بنایا   کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا   پلٹ دی بس ایک آن میں اسکی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

حضورؐ نے اس قوم کی حالت بدل کر کے اس کا METAMORPHOSIS کر کے رکھ دیا وہی عرب جو ایک دوسرے کے دشمن تھے آپس میں بھائی بھائی بن گئے (3/103) ان کے ہاں حکومت کا کوئی نظام نہیں تھا۔ حضورؐ نے ایک ایسا انسانیت پرور نظام جاری فرمایا جس کے سبب ان کا معاشرہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہوگیا۔ ان کے ہاں سیاسی تنظیم، مُستقل اقدار، اور پاکیزہ اخلاق کا قطعی فقدان تھا۔ حضورؐ نے ان کو یہ تینوں چیزیں دے کر، ان کی سیاسی حالت، مذہبی عقائد، اور ضابطہ اخلاق، سب کی اصلاح فرمادی۔ انہوں نے مختلف قبائل کو ایک قوم بنادیا۔ مختلف دیوتاؤں اور بتوں کی جگہ توحید کا درس دیا جس سے بڑی سے بڑی معیوب اور قبیح رسومات کو بیخ وبُن سے اکھیڑ دیا۔ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوتا ہے۔ چنانچہ عربوں کو قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے سے ایسا اقتدار حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنے دور کی دونوں سپر پاورز سے نہ صرف ٹکر لی بلکہ ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ایران اور روم جہاں انسانیت کچلی جارہی تھی، جہاں کے

نچلے طبقہ پر سخت مظالم ہو رہے تھے ان دونوں خطوں میں اسلام کا نظام جاری کیا۔ خود حضورؐ کے دور میں دس لاکھ مربع میل زمین اور حضرت عمرؓ کے دور میں سارا مشرق وسطیٰ اس نظام کے ماتحت تھا۔ اگرچہ یہ نظام ملوکیت کے غالب آ جانے کی وجہ سے آگے نہ چل سکا۔ لیکن اس نے انسانیت کو ایسی ترقی کی راہ پر ڈال دیا کہ کم سے کم پانچ سو سال تک یہ اپنے MOMENTUM پر آگے آگے چلتی چلی گئی۔ اور مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں بہترین معاشرہ قائم کیا۔ اور صدیوں تک دنیائے علم و فن میں اقوام عالم کی امامت کرتے رہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف مغرب کے بڑے بڑے مفکرین نے بھی کیا ہے۔

جہاں تک برادر، عزیز کے اعتراض کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآن کریم نے انسانیت کو جو نظریات دیئے، انسانیت اس سے پیشتر ان نظریات سے واقف ہی نہیں تھی۔ لیکن زمانہ خود قرآن کریم کے حقائق اور اس کی مستقل اقدار کو اپناتا اور رفتہ رفتہ ''مسلمان'' ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے ان نظریات پر عمل نہیں کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انقلابی دعوت اپنے زمانے کی عام ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے زمانہ کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو تو وہ انقلابی نہیں ہو سکتی۔ اسلامی نظریات چونکہ اس وقت کی عام ذہنی وسطح سے بہت بلند تھے، اس لئے انسانیت نے ان کی قدر نہیں کی۔ لیکن زمانہ اب مجبور ہو کر ان نظریات کو اپنا رہا ہے اور یہی قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ ذہن انسانی اُس دور میں ان اقدار کا ادراک کر ہی نہیں سکتا تھا۔

(1) نزول قرآن کریم کے وقت انسانی ذہن ملوکیت کو فطرت انسانی کے عین مطابق سمجھتا تھا اس کے علاوہ ذہن میں کوئی اور طریقہ حکومت کا آتا ہی نہیں تھا۔ قرآن کریم نے اس کی واضح طور پر تردید کی اور شخصیات کے بجائے نظام، قانون اور INSTITUTION کی حکومت کا تصور پیش کیا۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دین (نظام) جس کو رسول اللہ نے نافذ فرمایا اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اس نظریہ میں لطیف فرق یہ ہے کہ اس نظام میں حضورؐ کی ذاتی

اطاعت نہیں کی جاتی تھی بلکہ اطاعت نظام کی کی جاتی تھی۔ اور اس نظام کا سنگ میل ہی یہ تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ ایک ایسا انقلابی نعرہ تھا کہ اس وقت ذہن انسانی اس تصور سے قطعاً نا آشنا اور غیر مانوس تھا۔ لیکن زمانہ رفتہ رفتہ اس نظریہ کو قبول کرتا چلا گیا اور آہستہ آہستہ ''مسلمان ہوتا چلا گیا''۔ نیز یہ کہ اس نظام کو چلانے کا عملی طریقہ قرآن کریم نے مشاورت قرار دیا۔ جس کے عملی طریقہ کو آج عقل انسانی کی معراج کبریٰ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں نظریات انسانیت کو قرآن کریم کے عطا کردہ ہیں۔

(2) نزول قرآن کریم کے وقت غلاموں کا وجود معاشرہ کا جز ولاینفک بنا ہوا تھا۔ ارسطو نے غلامی کے جواز میں 72 دلائل دیئے تھے اور یہ مستحکم خیال تھا کہ اس INSTITUTION کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن کریم نے o وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70) کہہ کر تمام افرادِ انسانیہ کو اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم قرار دیا۔ اس لئے کسی شخص کا دوسروں کا غلام بنالینا قطعاً خلافِ انسانیت ہے۔ مزید یہ کہ قرآن کریم نے واضح حکم دیا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (47/4) یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔ اُس وقت ذہن انسانی نے قرآن کریم کے عطا کردہ اس انقلابی نظریہ کو قبول نہیں کیا لیکن زمانہ نے رفتہ رفتہ اس کو قبول کر لیا۔

(3) ذہن انسانی کے مطابق ایک نسل کو دوسری نسل پر برتری و فوقیت حاصل ہے اور یہ ذات پات کی تمیز ہے ہمارے ہمسایہ ملک میں یہ ذات پات کی تمیز ان کے لئے سخت عذاب کا باعث بنی ہوئی ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے اور جو شخص نسل پرستی کا قائل ہوگا حقیقت یہ ہے کہ اس نے قرآن کریم کا پیغام سمجھا ہی نہیں۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی INTRINSIC VALUE پر ہے نہ کہ نسبی انتساب پر ارشاد ہوتا ہے (49/4) اے لوگو ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر لیں اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ بے شک اللہ واقف کار اور خبردار۔ نیز ارشاد ہوتا ہے o فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ

أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ o(23/101)o پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا تو اس دن کوئی نسب نہیں ہوگا اور نہ ایک دوسرے سے بات پوچھ سکیں گے o۔

(4) نزول قرآن کریم کے وقت جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی مطابق فطرت شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ ہر فرد انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہے۔ نوع انسانی کی ربوبیت سے ذات کی پرورش ہوتی ہے جو مقصد حیات ہے یہ ایک ایسا نادر UNIQUE نظریہ ہے کہ اس کے پیش نظر ہر شخص مجبور ہوگا کہ وہ دوسروں کی نشوونما کرے تاکہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوجائے۔

(5) قرآن کریم نے ذاتی ملکیت کے تصور کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ قرآن کریم کے نزدیک ملکیت زمین بالکل ناجائز ہے اور اسی وجہ سے زمین کی خرید وفروخت قطعاً حرام ہے۔ زمین نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ ہے اور اس سے ہر شخص اسی طرح مستفید ہوسکتا ہے جس طرح وہ ہوا، پانی، دھوپ وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس طرح پانی، ہوا، دھوپ، بلا مزد و معاوضہ انسان کو ملتی ہیں۔ اسی طرح زمین بھی ہر انسان کے لئے بلا مزد و معاوضہ مہیا کی گئی ہے۔ جو شخص بھی اس کو TILL کرے گا وہ اس سے فائدہ حاصل کرے گا۔

(6) نوع انسانی کو قوموں میں تقسیم کرنا بھی ایک بڑی لعنت ہے۔ زمین پر خود اپنے ہاتھ سے لکیریں کھینچ کر، نوع انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا، بنی نوع انسانی کے لئے تباہی کا باعث بنا ہے یورپ کی دو عظیم جنگیں اسی نظریہ کا شاخسانہ ہیں قرآن کریم نے عالمگیر انسانیت کا تصور عطا کیا ہے۔ o كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (2/213)o ساری انسانیت ایک ہی امت ہے۔ وحدتِ خالق کا لازمی و منطقی نتیجہ وحدتِ مخلوق ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ساری انسانیت کا رب ہے۔ قرآن کریم کا تخاطب ساری نوع انسانی سے ہے۔ کسی خاص قوم یا کسی خاص نسل سے ہرگز نہیں ہے۔ قرآن کریم کا یہ تصور زمانہ آہستہ آہستہ اختیار کررہا ہے۔

(7) انسانی فکر پر روحانیت کا تصور کابوس کی طرح چھایا ہوا تھا۔ روحانیت کا تصور ایک ایسا

کابوس PARASITE تھا کہ اس کی وجہ سے، جسم انسانی سوکھتا چلا جاتا تھا نہ تو دنیا کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی اور نہ ہی انسانی معاشرے ترقی کر رہے تھے۔ یہ کابوس انسانیت کے خون پر پرورش پا رہا تھا۔ اور انسانیت کا خون نچوڑ رہا تھا۔ قرآن کریم نے روحانی ترقی کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حضورؐ کے متعلق ارشاد ہوا ہے o وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ o (64/4) o اے رسول آپ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں o۔ اخلاقی بلندیوں کے بعد وہ کون سی روحانی بلندی رہ جاتی ہے جس کا ذکر حضورؐ کے بارے میں بھی نہیں کیا گیا۔

(8) حقوق اللہ و حقوق العباد کی تفریق عیسائیت میں تھی۔ خدا کا حصہ خدا کو اور قیصر کا حصہ قیصر کو دو۔ قرآن کریم نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق مٹا دی۔ اسلام میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام نے صرف حقوق العباد کو ہی سند کیا ہے۔ حقوق العباد سے الگ حقوق اللہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ عبادت کو حقوق اللہ شمار کر لیتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ عبادت کا مقصد بھی انسانوں کی ایسی اصلاح ہوتی ہے جس سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو۔ انسانوں کے باہمی تعلقات و تنازعات کو وحی کے مطابق طے کرنا ہی دین ہے اور اسی سے فرد کی اصلاح ہوتی ہے۔ انسانوں کے مفادات کے باہمی ٹکراؤ سے ہی انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ خاص حقوق العباد کے دائرے تک ہی محدود ہوتے ہیں۔

(9) جس زمانہ میں ساری دنیا توہم پرستی میں مبتلا تھی۔ ملائکہ یعنی فرشتوں کے متعلق بھی یہی تصور تھا کہ فرشتے جسم رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان وسائط ہوتے ہیں۔ عیسائیت میں تو اب تک ANGELS کا یہی تصور چلا آرہا ہے۔ عرب خود اس زمانہ میں فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ملائکہ کو فطرت کی قوتیں قرار دیا ہے۔ یہ اس وقت کا کیسا عظیم نعرہ تھا؟ ان کے لئے شرط لگائی کہ وہ غیر مرئی ہوتے ہیں۔ سوئی گیس کی وہ حرارت جو پانی کو گرم کرتی ہے، ملک ہے، پانی کی وہ خاصیت جو پیاس بجھاتی ہے ایک ملک ہے۔ جن اشیاء میں کئی کئی قوتیں ہوتی ہیں قرآن کریم نے ان کو أُولِي أَجْنِحَةٍ (35/1) قرار دیا ہے یعنی

جن کے دو دو تین تین چار چار پَر WINGS ہوتے ہیں۔ سورج کی تمازت روشنی فراہم کرتی ہے جس سے لوگوں میں چیزوں کے دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے یہی تمازت فصل پکاتی ہے، اسی تمازت سے سمندروں سے بخارات اُٹھتے ہیں۔ جو بارش کا سبب بنتے ہیں۔ سورک کی یہ تمازت اُولیٖ اَجنِحَۃٍ ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ PHYSICAL FORCES ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے کسی ایک چیز میں چار قوتوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید پانچ قوتیں (پانچ ملائکہ) ایک چیز میں نہیں ہوسکتے اس کی تحقیق تو PHYSICISTS ہی کر سکتے ہیں۔ ہم LAYMEN، اس کی تحقیق نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ہے (2/285) جس سے مراد یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے وہ تصور رکھا جائے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ اور انہیں وہی مقام دیا جائے جو مقام قرآن کریم نے ان کو دیا ہے۔ ملائکہ کا مقام قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا (2/43) یعنی یہ کہ وہ آدمؑ کے سامنے جھک گئے۔ ملائکہ کا آدمؑ کے سامنے جھکنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کرسکتا ہے۔ انہیں انسان کے سامنے جھکا دینا چاہئے۔ انسان کا مقام ہی یہ ہے کہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنے میں رات دن لگا رہے اور اس کے ماحصل کو انسانیت کے مفاد میں صرف کرے، ملائکہ کے متعلق قرآن کریم کا یہ تصور اس کے وحی الٰہی ہونے پر دال ہے۔ یہ وہ دس اصول ونظریات ہیں جو اسلام نے انسانیت کو عطا فرمائے اور جن کی وجہ سے انسانیت نے ترقی کی۔ ہم مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا۔ ہمارے علماء کرام قرآن کریم کو چھوڑنے کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ مسلمانوں نے نماز، روزہ، وغیرہ کو چھوڑ دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو چھوڑنے کے عملی معنی یہ ہیں کہ ہم نے قرآنی نظام کو چھوڑ کر، انسانی ذہن کے وضع کردہ نظامہائے حیات کو اختیار کرلیا۔ اور اسی سبب سے ان کا زوال ہوا۔ کیونکہ مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے نظام سے وابستہ ہے۔ مسلمانوں کے زوال کو اسلام کے زوال سے CONFUSE کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ بے شک مسلمانوں کو زوال آیا۔ لیکن اسلام کے اصول اور اس کی اقدار برابر بڑھتی چلی گئیں۔ اور ان کے سبب سے انسانیت

برابر ترقی کرتی چلی گئی اور ان اقدار میں سے دس اقدار اس مضمون میں جناب کی خدمت میں پیش کی گئیں ۔کوئی شخص بھی ان کے آگے بڑھنے سے انکار نہیں کر سکتا ۔ جب فرانس میں1789 ء کے انقلاب میں ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی گئی تو وہاں اسلام کی قدر ہی ترقی کر رہی تھی ۔ جب امریکہ میں انسداد غلامی کے لئے CIVIL WAR لڑی گئی تو وہاں بھی اسلامی قدر آگے بڑھ رہی تھی ۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں اچھوتوں کو برابری کے حقوق دینے کی جو تحریک چلی ہے، وہ بھی اسلام کی ایک قدر آگے بڑھ رہی ہے ۔ ماضی قریب میں امریکہ میں سیاہ و سفید فام افراد میں نسل و رنگ کی تمیز مٹانے کی جو کوشش ہوئی وہ بھی اسلام کی ایک کڑی تھی ۔ اس نے اس دور میں اس درجہ فروغ پایا کہ اب امریکہ کی صدارت کے لئے ایک سیاہ فام مسٹر OBAMA امیدوار ہو رہے ہیں ۔ جب اقوام متحدہ اور لیگ آف نیشنز نے یہ فیصلہ کیا کہ قوموں کے تنازعات باہمی مشاورت سے طے کئے جائیں تو یہ بھی اسلام کی ہی ایک کڑی تھی ۔ آپ غور فرمائیں کہ اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک کے طویل عرصہ میں جہاں جہاں کوئی تحریک اُٹھی ، وہ قرآن کریم کے نظریات کے مطابق ہی اُٹھی ہے ۔ آپ مزید اس بات پر غور کریں اور نہایت سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ کسی ایک جگہ بھی کوئی ایسی تحریک برپا نہیں ہوئی جو قرآن کریم کے اصولوں اور نظریات کے خلاف ہو۔اس سے آپ محسوس کریں گے کہ کس طرح قرآن کریم زمانے اپنے پیچھے پیچھے لے کر چل رہا ہے اور کس طرح عقل انسانی کی راہ نمائی کی ہے، تو یہ آئندہ بھی کر سکتا ہے ۔

یہ وہ زریں اصول ہیں جو برابر چلے آرہے ہیں اور ان اصولوں کے عملی اثرات وہ ہیں جو اسلام نے انسانیت کو دیئے ۔ اس کے بعد یہ خیال فرمانا کہ اسلام نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا، عدل و انصاف کے مطابق نہیں ہے ۔

رسالہ ھذا کے قارئین کو تو معلوم ہے لیکن برادر عزیز کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس مضمون میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، اس کے لئے آیات کی سند FRACTIONS میں اس طرح دی گئی ہیں کہ اس میں اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر ہے ۔ اگر کسی آیہ کریمہ یا اس کا ترجمہ

ملاحظہ فرمانا ہو، تو قرآن کریم کے کسی نسخے سے اس کے حوالہ کے مطابق آپ آیہ کریمہ اور اس کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمالیں۔ o إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ (50/37) o جو شخص آگاہ دل رکھتا ہے اس کے لئے اس میں کافی نصیحت ہے۔

ماہ جون 2008ء

(مکاتیب)

وحی والہام کی وضاحت

محترم المقام جناب نعیم صادق صاحب نے یو کے سے وحی والہام کی وضاحت طلب فرمائی ہے۔ان کی خواہش کے مطابق ان دونوں چیزوں کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

قرآن فہی کے سلسلہ میں یہ بات بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے عربی مُبین استعمال کی ہے(26/195)اور عربی مُبین بھی وہ جو اُس دور کے عوام کی زبان تھی اور جس زبان میں وہ روزمرہ گفتگو کرتے تھے(51/23)لیکن قرآن کریم نے اس روزمرہ کی زبان میں کچھ اپنی مخصوص اصطلاحات بھی وضع کر لی تھیں۔یوں تو قرآن کریم کا مفہوم لغوی معانی سے ہی سمجھا جاتا ہے۔لیکن جب وہ چند الفاظ کو بطور اپنی اصطلاح کے استعمال کرتا ہے،تو ان کے معنی اسی مفہوم ومنطوق میں مخصوص ومتعین ہوجاتے ہیں۔جیسے قرآن کریم نے صوم وصلوٰۃ،زکوٰۃ،تقویٰ، تسبیح،رسول،نبی،طاغوت،دین،معروف،منکر،ذکر جہاد اور اسی قبیل کے بہت سے الفاظ کو اپنے متعین کردہ مفہوم میں استعمال کیا ہے۔لفظ وحی کی بھی یہی صورت حال ہے۔الہام کا تو لفظ ہی قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا؟۔وحی کی طویل وعریض لغوی بحث سے قطع نظر قرآن کریم نے وحی کو جو اپنے اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے،اور جو اس مضمون کا موضوع ہے،اس کے حوالہ سے وحی کے معنی ہیں"انسانیت کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ملنے والا علم"۔قرآن کریم کی رُو سے اس علم(وحی)کی یہ خصوصیات لازمی ہیں۔

(1) یہ علم صرف انبیاء کرام کو ہی ملتا تھا۔اور وہ اس علم کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔

(2) یہ علم ساری انسانیت کی ملکیت ہوتا تھا(اور اب بھی ہے)اور پوری انسانیت اس کی

مخاطب تھی۔ رسول پر فرض ہوتا تھا کہ اگر وحی چلتی ہوئی تلواروں کے دوران بھی نازل ہو، تو رسول اس کو فوری طور پر دوسرے انسانوں تک پہنچا دے۔ o یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5/67) o اے رسول جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف آیا ہے، اس کو دوسروں تک پہنچا دے۔

(3) یہ وحی الفاظ کی شکل میں نازل ہوتی تھی۔ o نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ o عَلَىٰ قَلْبِكَ (26/193.194) o اسے روح الامین نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ o بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ o (26/195) o یہ وحی واضح عربی زبان میں ہے o اور اسی وجہ سے حضورؐ کو حکم ہوا o اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (29/45) o جو کتاب تیری طرف وحی کی گئی اس کی تلاوت کر، یعنی جو کچھ کیا گیا تھا وہ تلاوت کیا جا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے وحی کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے o فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ o (75/18) o جب ہم پڑھیں تو اس کے پیچھے پڑھا کر o اس سے واضح ہے کہ وحی صرف خیالات کا دل میں ڈالنا نہیں تھا، بلکہ اس طرح کے الفاظ تھے جن کو معلم ایک متعلم کو پڑھاتا ہے۔

وحی کی حفاظت کے سلسلہ میں سورہ جن میں ارشاد ہوتا ہے۔ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا o لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا o (72/27.28) تو اللہ تعالیٰ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں (رسولوں) نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور جو کچھ ان رسولوں کے پاس ہے وہ سب پر حاوی ہے اور اس نے تو (وحی) کی ایک ایک چیز گن رکھی ہے o۔

اس آیہ کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت العلام مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔ ''یعنی یہ زبردست انتظامات اس غرض سے کیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ لے کہ فرشتوں نے پیغمبروں کو یا پیغمبروں نے دوسرے بندوں کو اس کے پیغامات ٹھیک ٹھیک بلا کم و کاست پہنچا دیئے ہیں''۔ وحی کے

سلسلہ میں ہی ارشاد ہوتا ہے کہ اور کسی بشر کا تو ذکر ہی کیا ہے خود رسول کی بھی کسی خواہش یا اس کے غور وفکر کا دخل وحی میں نہیں ہوسکتا۔ oوَمَا یَنطِقُ عَنِ الْہَوَیٰ oإِنْ ہُوَ إِلَّا وَحْیٌ یُوحَیٰ o(53/3.4)oاور وہ اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھی کی جاتی ہے o۔سرخیل علماء حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اس آیت کے ترجمہ میں فرمایا۔ وسخن نمیگو یدازخواہش نفس ،نیست قرآن وحی کہ بسوی فرستادہ میشود۔مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم وحی کے ذریعے انسانیت کو ملتا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ وہ،

(1) الفاظ کی متعین شکل میں ملتا تھا جس کی تلاوت کی جاسکتی تھی(26/195)

(2) فرشتے اس کی حفاظت کے لئے مامور تھے(73/27)

(3) رسول کی خواہش اور اس کے فکر کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا تھا(53/3)

(4) یہ ساری انسانیت کی ملکیت ہوتا تھا(2/231-6/114)اور رسول پر فرض ہوتا تھا کہ فوری طور پر اس کو ساری انسانیت کو پہنچادے۔

ہمارے علماء کرام اور صوفیاء عظام اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو وحی کے علاوہ ایک اور علم بھی ملتا تھا۔ جس کو وہ الہام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سارے قرآن کریم میں الہام کا لفظ ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوا البتہ اس کے مادے (ل۔ہ۔م) سے ایک جگہ أَلْہَمَہَا کا لفظ آیا ہے۔سورہ شمس میں ارشاد ہوتا ہے oفَأَلْہَمَہَا فُجُورَہَا وَتَقْوَاہَا o(91/8)oپھر اس کی برائی اور پرہیز گاری کو اسے سمجھا دیاo۔اس آیہ کریمہ میں قرآن کریم نے أَلْہَمَ کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔اس کے لغوی معنی نگلنا کے ہیں۔ یہاں سابقہ آیات میں نفس انسانی کا تذکرہ ہوتا چلا آرہا ہے۔اسی سلسلہ میں اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں نیکی (فجور) بدی اور (تقویٰ) نیکی کرنے کی دونوں صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں۔اب جس کا جی چاہے فجور کے کام سرانجام دے اور جس کا دل چاہے وہ تقویٰ اختیار کرسکتا ہے۔ فُجُورَہَا اور تَقْوَاہَا میں دونوں جگہ ضمیر ''ہَا'' کا استعمال کیا گیا

ہے جس کے واضح طور پر یہ معنی ہیں کہ یہ دونوں نفس کی کیفیات ہیں۔ نفس انسانی میں یہ دونوں ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں۔ نفس کا یہ بیان کچھ چند لوگوں یا اولیاء اللہ سے مختص نہیں ہے۔ اس میں مسلم وغیر مسلم کی بھی کوئی تفریق وتمیز نہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں مسلم وغیر مسلم، گنہ گار و پرہیز گار، سب ہی شریک ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے علماء کرام الہام کو ایک خاص اصطلاح کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مراد ایک ایسا علم ہوتا ہے جو بزرگوں اور اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے۔ بلکہ وہ جب چاہتے ہیں اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اصطلاحی علم (الہام) کا کوئی تعلق اس آیہ کریمہ سے نہیں بنتا۔ ہمارے علماء کرام الہام کے بارے میں صرف اسی آیت کا حوالہ دیتے ہیں اور اسی سے سند حاصل کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کی اس مصطلحہ الہام کا اس آیت سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم وحی کے ذریعے انسانیت کو ملا آپ نے اس کے لئے ملاحظہ فرمالیا کہ اس کی کس درجہ اہمیت ہے اور اس کی کس درجہ حفاظت کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف آپ اس علم الٰہی کو پیش نظر رکھیں جس علم کے ہمارے علماء کرام قائل وحامی ہیں۔ اس علم الٰہی کی یہ کیفیت ہے کہ یہ الفاظ کے ذریعے نہیں ملتا۔ اس میں ملہم (صاحب الہام) کو صرف کوئی تصور بغیر الفاظ کے ملتا ہے اور ملہم (صاحب الہام) اس تصور کو خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ علماء کرام کا یہ نظریہ سابقہ ادوار میں تو چل سکتا تھا۔ لیکن اب یہ نظریہ قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اب علم النفس (PSYCHOLOGY) اور علم الالسنہ (PHILOLOGY) نے اس درجہ ترقی کر لی ہے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور (CONCEPT) بلا لفظ (WORD) کے آسکے۔ تصور اور لفظ کا تو دامن چولی کا ساتھ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اس لئے الہام کا وہ تصور جو ہمارے علماء کرام کے ذہن میں ہے ایک ناممکن چیز (PSYCHOLOGICAL IMPOSSIBILITY) ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی علم بغیر الفاظ کے مل سکے۔ ہمارے علماء کرام کے لئے بھی الہام صرف ملہم

یعنی صاحب الہام کے لئے حجت ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک موضوع کے بارے میں مختلف حضرات کو مختلف الہام ہوئے ہیں۔ کسی کو یہ الہام ہوا ہے کہ امام مہدی حنفی المذہب ہوں گے اور کسی کو یہ الہام ہوا کہ وہ شافعی المذہب ہوں گے۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب ''انفاس العارفین'' اس قسم کے الہامات سے بھری پڑی ہے۔ مختلف حضرات کو متضاد الہام ہونے کی بہت سی مثالیں اس کتاب سے مل سکتی ہیں۔ لیکن ان کا یہاں درج کرنا محض تضیع اوقات ہی ہوگا۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ مختلف لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے متضاد علم دیا جائے۔

یہاں تک گفتگو علمائے کرام سے تخاطب کی وجہ سے مذہب کی سطح پر رہی ہے دین کی سطح پر تو اس موضوع پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جو علماء کرام الہام کے موید و حامی ہیں ان کے الہام کے بارے میں سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ امت مسلمہ امت مرحومہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس امت کو بغیر رابطہ و تعلق کے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اس امت کے صلحاء اور عرفاء سے تعلق جوڑے رکھتا ہے۔ اور ان کی معرفت اللہ تعالیٰ کا امت مسلمہ سے رابطہ رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ درست نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا اور انسان کا تعلق صرف قرآن کریم اور قرآنی نظام کی معرفت ہوسکتا ہے۔ یہی وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جو لَا انْفِصَامَ لَهَا ہے، جو سہارا ٹوٹ نہیں سکتا (2/256) اس کے علاوہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے اور کوئی تعلق استوار ہی نہیں ہوسکتا اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے الہام کے ذریعے پورے نہیں ہوسکتے۔ اگر آپ الہام کا تصور درست بھی مان لیں تو الہام کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف چند بندوں سے ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن نظام کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تعلق پوری انسانیت سے وابستہ ہوجاتا ہے۔ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (3/97) جو بھی اس نظام میں داخل ہوگیا وہ امن میں آ گیا۔ جو بھی اس نظام کے ماتحت آ گیا اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں ہر دنیاوی کام جو وحی کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے، وہ دینی

بن جاتا ہے اور اس کا سرانجام دینا عبادت الٰہی ہوتا ہے۔ الہام کا تصور اور وقوع انفرادی پرستش سے وابستہ ہے۔ مذہب کی سطح تک تو اس کا عقیدہ رکھا جاسکتا ہے کیونکہ مذہب میں انفرادی پرستش جائز ہوتی ہے۔ لیکن دین میں کیونکہ انفرادی پرستش کی اجازت ہی نہیں ہے اس لئے وہاں الہام کا امکان ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ سب مذہب کے شاخسانے ہیں۔ دین کا ان سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ رسالہ صوت الحق کے نزدیک ختم نبوت کے بعد، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو بھی، کوئی علم حاصل ہونا، قرآن کریم کی توہین اور اس کی کفالت کی نکیر ہے اور امام مہدی یا کسی بھی مجدد کے آنے کا عقیدہ رکھنا توہین رسالت ہے۔ مذہب میں یہ سب روا اور جائز ہیں۔ دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ ختم نبوت کا تو منطقی و لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حضورؑ کے بعد پوری انسانیت میں کسی شخص کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی علم نہیں مل سکتا۔ اور جو کوئی براہ راست علم حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے خواہ وہ الہام ہو یا کشف و استخارہ، وہ شعوری یا لاشعور طور پر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ دین میں صرف زندہ مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہوتی ہے اگر کوئی شخص الہام کا دعویٰ کر کے یہ کہے کہ میں حکومت کے اس قانون کی اطاعت نہیں کرتا، جس میں مثلاً کوئی ٹیکس لگایا گیا ہو، میں اس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ مجھے الہام ہوا ہے کہ میں حکومت کا یہ ٹیکس اس شرح سے ادا کروں گا، تو حکومت اس کے الہام کو سند نہیں مانے گی۔ اس طرح تو ملک میں انارکی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے دین میں تو الہام کا تصور پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے خلاف قرآن تصورات صرف مولوی صاحبان میں ہی محض مذہب کی سطح تک رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ مذہب میں ہر عقیدہ اور تصور صرف نظری طور پر ہی رہتا ہے اس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جبکہ دین میں ہر عقیدہ پر عمل کیا جاتا ہے دین میں زندہ اتھارٹی کے احکامات پر عمل ہوگا۔ کسی کے الہام پر عمل نہیں ہوسکتا۔

ماہ جون 2008ء

55

جمہوری نظام اور قرآنی نظام کے فاصلے

انسانوں نے اپنے رہن سہن کے لئے جو معاشرے بنائے اور جو نظامہائے حیات تشکیل دیا وہ بھی عقل انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے گئے اور بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتے چلے گئے مدت مدید اور عرصہ طویل کے تجربات کے بعد سیکولر نظامہائے حیات سامنے آئے۔ اس سیکولر نظام نے ڈیموکریسی، کمیونزم، سوشلزم، فاشزم UTILITARIANISAM وغیرہ کی صورتیں اختیار کیں ان سب نظاموں میں قدر مشترک یہ ہے کہ انسان قانون سازی کے لئے بالکل آزاد ہے جس قسم کا قانون اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے، وہ بنالے، اس پر خارج سے کوئی قدغن یا پابندی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں HOMOSEXUALITY جیسا شنیع فعل بھی جائز قرار پا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کمیونزم، فاشزم، سوشلزم، کے نظام تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ ان پر تبصرہ کرنا بے سود ہے ان کا انقراض ہی ان پر بہترین تبصرہ ہے۔ آج کل سارے مہذب ممالک میں جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ اور ہر طرف سے اس کی تعریف وتحسین ہے۔ یورپ کو ہی اس کے وضع کرنے کا CREDIT دیا جاتا ہے۔ لیکن جو بات عموماً ہمارے سنجیدہ ترین دانشوروں سے مخفی ہے وہ یہ ہے کہ یورپ کا نظام جمہوری نہیں ہے فقط ان کے نظام کو چلانے کی مشینری جمہوری ہے۔ کیونکہ یورپ میں یہ نظام تو جمہوریت سے پہلے بھی تھا۔ جمہوریت کے نفاذ کے بعد بھی یورپ کا وہی نظام برقرار ہے۔ یورپ کا نظام سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ہے۔ البتہ حکومت کی مشینری جمہوری ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان کیونکہ ہمارے زیادہ قریب ہے اور ہر وقت ہمارے مشاہدے میں ہے، اس لئے اس کی مثال ہمارے لئے زیادہ آسان

ہے۔ ہندوستان میں تقریباً 60 سال سے جمہوریت نافذ ہے۔لیکن ہندستان کا نظام جمہوری نہیں ہے۔ وہاں کے نظام کا سارا دارومدار ذات پات کی تفریق، اور انسان کی انسان سے مغائرت و حقارت پر قائم ہے۔ اگر وہاں مزید سو سال بھی جمہوریت رہے گی تب بھی وہاں CASTE SYSTEM ختم نہیں ہوسکتا۔ ذات پات کی تقسیم اور جمہوریت ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اور اگر جمہوریت ان کے نظام میں داخل ہو جائے تو ہندوازم بالکل ختم ہو جائے گا۔ یہ نہ یورپی نظام میں داخل ہے نہ ہندوستان کے، ان دونوں جگہ جمہوریت صرف حکومت کی مشینری تک محدود ہے۔ اگر کسی صاحب کو مزید وضاحت درکار ہو تو وہ جب خواہش کرے گا، پیش خدمت کر دی جائے گی۔ لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ جمہوریت کے سامنے حقائق ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں ہوتا۔ نہ تو حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے نہ باطل اپنی ذات میں باطل ہوتا ہے۔ جمہوریت میں حق و باطل لوگوں کے خیالات اور ان کی تعداد یا گنتی کے تابع ہوتا ہے۔ اس میں افراد کی اہمیت ہوتی ہے۔ آج اگر 52 افراد کسی بات کو غلط قرار دے دیں، اور کچھ عرصہ کے بعد ان میں سے چار افراد اس گروہ سے ٹوٹ کر مخالف گروہ میں شامل ہو کر، ان کو 48 کے بجائے 52 کر دیں، تو پہلی بات غلط ہو جائے گی اور دوسری بات جو آج 52 آدمی کہہ رہے ہیں وہ درست قرار پائے گی۔ حق و باطل کا مدار ان 4 افراد کی رائے کا تابع ہوگا۔ عملاً بھی اگر کسی ملک میں دو پارٹیوں نے 30% ووٹ حاصل کئے اور ایک پارٹی نے 40% ووٹ حاصل کر لئے تو 40% ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی حکومت بنائے گی اور 60% فیصد ووٹرز کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

شروع سے ہی سیکولر حکومت کے برعکس تھیوکریسی کی حکومت رہی ہے۔ اس حکومت میں بظاہر قانون الٰہی کو نافذ کیا جاتا ہے لیکن عملاً اس میں اختیار علماء کرام کو ہوتا ہے کیونکہ وہ اس قانون کو نافذ کرتے ہیں۔ یہ علماء کرام حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون نہیں بناتے بلکہ سابقہ وضع شدہ قوانین کو ہی نافذ کرتے ہیں۔ اس لئے حکومت میں ساری اجارہ داری علماء کی ہوتی ہے غیر علماء حضرات LAYMEN چونکہ ان قوانین کو نہ تو جانتے ہیں اور نہ ہی ان میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اس

لئے اس میں سارا HOLD مذہب کے نمائندوں کا ہوتا ہے۔ یہ مذہبی حکومت ہوتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ سیکولر حکومتوں میں بھی مذہب برقرار رہتا ہے۔ سیکولر حکومت میں بھی مذہبی حضرات پرسنل لاء پر عمل کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت چند رسومات کے ذریعے کر لیتے ہیں۔ اب بھی یورپین ممالک امریکہ، کینیڈا، ہندوستان وغیرہ میں جہاں نظام سیکولر ہے مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرتے ہیں، ان میں مذہب ختم نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے ان دونوں نظاموں سے بالکل مختلف نظام پیش فرمایا ہے اس نظام میں حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے اس میں ملت اور مملکت الگ الگ چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ ملت ایک انتظامی مشینری متعین کرتی ہے جو خود ملت کا ایک جزو ہوتی ہے۔ ملت اپنے اختیارات اس انتظامی مشینری کو تفویض نہیں کرتی اختیارات ملت کے ہی ہوتے ہیں، فقط ان کا استعمال اس مشینری کی وساطت سے ہوتا ہے۔ اسلام میں اصلاً اطاعت نظام کی ہے۔ کسی فرد واحد کی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس میں رسول کی اطاعت بھی نہیں ہوتی (3/79) حضوؐر نے اپنے دور میں اس نظام کو جاری فرمایا۔ اپنے دور کے حالات کے مطابق حضوؐر نے اس نظام کو چلانے کے لئے ایک مشینری تجویز فرمائی ہے۔ اس میں مقامی حکام اولی الامر کہے جاتے تھے۔ اگر کسی تنازعہ میں یا کسی انتظامی امر میں مقامی لوگوں نے اولی الامر کی اطاعت کر لی تو سمجھئے کہ اس سے نظام کی اطاعت ہوگئی، اور اللہ و رسول کی اطاعت ہوگئی۔ حضوؐر نے انتظامی طور پر اپنے دور میں جزئیات مقرر فرمائیں ان جزئیات کی اطاعت صرف حضوؐر کے دور تک ضروری تھی۔ البتہ نظام کی اطاعت ابدی و سرمدی ہے۔

جب تک اسلامی نظام جاری رہے گا۔ حضوؐر کی اطاعت قائم رہے گی۔ البتہ جو وقتی انتظامی امور آپؐ نے اختیار فرمائے ان کی اطاعت وقتی ہی تھی۔ ان امور کی اطاعت ہمیشہ کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ انتظامی امور حضوؐر کے جانشین کے طرف منتقل ہوگئے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشین جو آئیں گے وہ جو انتظامی امور سرانجام دیں گے۔ پھر ان کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت

ہو جائے گی۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے تمام انتظامی امور کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ اس نظام میں چونکہ انتظامی امور کے احکام نئے نئے جاری ہوتے رہتے ہیں اس لئے اس میں سابقہ فقہ یا گذشتہ ادوار میں وضع کردہ قوانین کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے اس میں علماء کا طبقہ بھی نہیں رہتا۔ دینی حکومت میں پھر مذہب کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ مذہبی حکومتوں میں شریعت باہر سے IMPOSE ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں شریعت اندر سے ہی خود بخود دبتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے یہ اسلام کا دینی نظام ہے جو مذہب کے تصور سے بالکل مختلف ہے چونکہ دیگر اقوام میں صرف مذہب کا تصور ہے۔ دین کا تصور ان کے سامنے نہیں ہے۔ اس لئے ان کے ہاں دین کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ دین کا ترجمہ بھی RELIGION کر دیتے ہیں دین کا تصور خالص قرآنی تصور ہے۔ اس نظام خالص میں اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور صرف وحی الٰہی کے قوانین جاری ہوتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہوتی ہے۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور اس کی نافرمانی نہیں ہو سکتی، اس وجہ سے اس نظام میں بہت کٹھن اور تنگی محسوس ہوگی۔ لیکن اصل صورت حال ایسی نہیں ہے۔ اولاً تو اس نظام میں حکومت کی اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے اس کے علاوہ زندگی میں جو دیگر امور ہوتے ہیں ان میں نہ صرف یہ کہ حکومت کی اطاعت ضروری نہیں ہوتی (60/12) بلکہ حکومت کو ان امور سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ عام زندگی میں ہر شخص اپنی مرضی و خواہش کے مطابق گذر بسر کرتا ہے اور اسے ہر طرح کی آزادی میسر ہوتی ہے۔ جو جس قدر قانون کی اطاعت کرے گا اسی قدر اس کی عزت ہوگی۔ اس بارے میں ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی اور سیرت ایسی ہی آتی ہے جیسے آج کل کے حکمرانوں کی ہے اور عوام بھی اسی طرح کے سامنے آتے ہیں جیسے آج ہم ہیں لیکن اس نظام میں دونوں کی صورت مختلف ہوگی اس نظام میں سربراہ مملکت سب سے زیادہ قانون کا متبع ہوگا۔ (7/163-7/203) اس نظام کے حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی قسم کا اجر

طلب نہیں کر سکتے۔ جو حاکم وقت ہوں گے یہ سوچ سمجھ کر آئیں گے کہ انہیں کوئی اجر نہیں ملے گا۔ البتہ جو ڈیوٹی وہ سرانجام دیں گے ان کا معاوضہ ومشاہرہ ان کو دیگر حضرات کی طرح مل جائے گا۔ انہیں کسی قسم کی PRIVILEGE نہیں ہوگی۔ اسلامی حکومت کے حکام کی جوابدہی بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح عام لوگوں سے ہوگی۔ قرآن کریم کی رو سے تو انبیاء کرام بھی باز پرس سے مستثنیٰ نہیں (7/6-24/57) کوئی شخص احتساب ACCOUNTBILITY سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ مغربی دنیا میں عام طور پر اور ہمارے ہاں بھی یہ تصور عام ہے کہ حکمرانوں کے لئے پبلک لائف میں قانون کا تابع ہونا ضروری ہے۔ البتہ پرائیویٹ لائف میں ان کا جو جی چاہے کریں اُن کا مواخذہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے پبلک اور پرائیویٹ لائف کی تقسیم غلط ہے۔ حکمرانوں کے لئے بھی اور ہر شخص کے لئے بھی۔ پرائیویٹ لائف میں بھی قانون کی اطاعت اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ پبلک لائف میں ہے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قانون کی پابندی اور اس کی اطاعت میں گذرے گا۔

جمہوری نظام میں چونکہ مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اس لئے جمہوریت کی طرف بلانے والے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ انسانی معاشرہ کو کن بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ ان کے نظام کی چار بنیادیں یا ہمارے نقطہ نگاہ سے ان کے نظام کی چار خامیاں یہ ہیں۔ پہلی خامی یہ ہے کہ ان کے نزدیک حیات مادی عناصر کی ترکیب سے کسی نہ کسی طرح از خود پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔ اس نظام کی دوسری خامی یہ ہے کہ ان کے سامنے مستقل اقدار نہیں ہیں۔ ہر وہ کام جس سے کسی شخص کو فائدہ ملتا ہو، وہ اس کو سرانجام دے سکتا ہے۔ مستقل اقدار کے تصور کے فقدان کی وجہ سے یہ مفکرین GOOD اور EVIL ، خیر و شر کو DEFINE نہیں کر سکتے۔ اس کا لازمی نتیجہ اس کی تیسری خامی ہے کہ ہر شخص اپنی یا اپنی قوم کی منفعت کو ہی پیش نظر رکھتا ہے۔ اس سے ساری دنیا میں ذاتی انفرادی، یا زیادہ سے زیادہ قومی مفادات حاصل کرنے کی ایک ریس RACE لگی ہوئی ہے۔

بس یہ ایک دوڑ ہے اس دور میں انسانوں کی تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

اس نظام کی چوتھی خامی قانونِ مکافاتِ عمل کا انکار ہے۔ جب ہر شخص کو معلوم ہے کہ نہ اس کے بُرے کام کا انجام اس کے لئے بُرا ہوگا نہ کسی نیک کام سے اسے کوئی فائدہ ہوگا تو نیک اعمال کرنے کا مُحرکہ INCENTIVE جاتا رہتا ہے۔

اس کے برخلاف قرآن کریم بڑی مضبوط بنیادوں پر اپنے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ زندگی کا سرچشمہ اور ہدایت کا ابدی سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیتا ہے اور یہی ذات بزرگ و برتر اُن مستقل اقدار کا سرچشمہ ہے جن پر معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ جمہوری معاشرے کے برخلاف اسلامی معاشرے کی بنیاد مندرجہ ذیل محکم اصولوں پر ہوتی ہے۔

اِس معاشرے کا اصل الاصول انسانی ذات پر ایمان اور اس کا ارتقاء مقصد حیات ہے۔ مغربی جمہوری معاشرے طبعی و حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتے اُن کے ہاں انسانی ذات یا انسانیت کا تصور ہی نہیں ہے۔ انسانیت کے تصور کے نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقیات یا خیر وشر کو جانچنے کا معیار ہی مقرر نہیں ہوسکتا۔ زندگی جب حیوانی و طبعی معیار سے بلند ہوکر، انسانی معیار پر آتی ہے، تب قرآن کریم اس زندگی کو مخاطب کرنے کے قابل گردانتا ہے، اور زندگی کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ حیوانی و طبعی زندگی کے متعلق قرآن کریم کوئی ہدایت نہیں دیتا۔ قرآن کریم یہ نہیں بتاتا کہ سردی کے موسم میں گرم کپڑے استعمال کرنے چاہئیں۔ اور گرمی کے موسم میں ٹھنڈے کپڑے پہنیں۔ سردی میں اپنے مکان کو گرم رکھو، اور گرمی کے موسم میں درجہ حرارت اس سے زیادہ نہ ہو، جو خوراک ہم جسم کی ضرورت کے لئے کھاتے ہیں وہ ان کے لئے کوئی ہدایت نہیں دیتا کہ کس موسم میں کتنا کھانا ضروری ہے، البتہ جب کھانا کھانے میں ''ذات'' INVOLVE ہوتی ہے تو وہ ہدایت دیتا ہے کہ حرام مال کھانا بالکل منع ہے اور صرف حلال کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں حرام اور حلال کھانے کی وجہ سے ذات انسانی پر اثرات مرتب ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور یہاں سے ہی فلسفہ اخلاق کی بنیاد مہیا ہوتی ہے اور اسی بنیاد و اساس پر سارا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

معاشرے کی تشکیل میں دوسرا محکم اصول توحید باری تعالیٰ کا ہے وحدت خالق کا لازمی نتیجہ وحدتِ مخلوق ہے جس سے ساری دنیا میں عالمگیر برادری وجود میں آتی ہے۔ اس طرح نسل پرستی، وطن پرستی کے جذبات ختم ہوجاتے ہیں آج جو دنیا ایک DEN بنی ہوئی ہے اور یورپ میں جو دو عظیم جنگیں ہوئیں ان کا واحد سبب وطن پرستی اور نسل پرستی کا تھا۔ قرآن کریم نسل پرستی اور وطن پرستی کے بالکل خلاف ہے۔ جو شخص بھی نسل پرستی کا قائل ہے، اس نے قرآن کریم کا پیغام اور اس کی تعلیم کو سمجھا ہی نہیں۔ تاہم بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں میں بھی یہ نظریات در آئے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

کسے کو پنجہ زد ملک ونسب را ۔۔۔ نہ داند نکتۂ دین عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ ۔۔۔ نہ دادے دعوت دین بولہب را

قرآن کریم کا تیسرا محکم اصول مکافاتِ عمل ہے۔ اس کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ ہر عمل کا اثر اس کے کرنے والے کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ ذات کی نشوونما اور اس کا ارتقاء ہی مقصود حیات ہے یہ ذات اچھے اعمال سے پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ جسمانی طور پر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ تقریباً آٹھ پاؤنڈ سے زیادہ اس کا وزن نہیں ہوتا یہی بچہ اپنی جوانی میں ڈیڑھ سو پاؤنڈ سے بھی تجاوز کرجاتا ہے۔ اسی طرح انسانی ذات نشوونما پاتی ہے۔ جسم کی قوت غذا و خوراک سے حاصل ہوتی ہے، جبکہ ذات کی نمو داعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ بچہ کی یہی ذات جوانی میں پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ذات اس درجہ پختہ ہوجاتی ہے کہ موت سے بھی نہیں مرتی۔

موت کے صدمہ سے کم ہوتی نہیں تابندگی ۔۔۔ اس طرف بھی زندگی ہے، اس طرف بھی زندگی

علامہ اقبال نے بھی فرمایا کہ۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے ۔۔۔ کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

قرآن کریم کا چوتھا اصول اتباع وحی الٰہی ہے۔ جس معاشرہ میں اتباع وحی ہوگا وہ

معاشرہ صفاتِ الٰہی کو اپنی بنیاد بنائے گا۔ یہی صفاتِ الٰہی مستقل اقدار میں اور POLITICAL PARLANCE میں یہی انسانی حقوق قرار پاتے ہیں۔ اس معاشرہ میں افراد معاشرہ صفاتِ الٰہی کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جاتے ہیں۔ صفاتِ الٰہی کو منعکس کرنے کے عملاً یہ معنی ہیں کہ ہر واقعہ و حادثہ پر وہ ردّعمل REACTION ہونا چاہئے جو اس موقع پر صفت الٰہی کا ہو۔ اگر کوئی واقعہ کسی قدر بھی جذبات بھڑکانے والا ہو، لیکن وہاں عفو کی ضرورت ہو، تو اس معاملہ عفو کی صفتِ الٰہی پر عمل کرنا ضروری ہے اور جہاں ظالم کو اپنی گرفت میں لینا اور اسے مزید ظلم سے رُوکنا درکار ہو، تو وہاں صفتِ الٰہی جبر، وقہر کو اختیار کیا جائے۔ ہر وقت قرآن کریم کی تعلیم کو سامنے رکھنے اور خصوصاً صفات الٰہی پر مشق کرنے سے یہ مسئلہ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے معمولات میں خود بھی دیکھا ہوگا کہ کسی بھی حادثہ پر شریف اور غیر شریف کا ردِّعمل ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔ مومنین جب کسی لغویات کے پاس سے گذرتے ہیں تو نہایت شرافت سے گذر جاتے ہیں۔ (25/72) لیکن اگر کوئی برا اس لغویات کے پاس سے گذرے گا تو وہ شرافت سے نہیں گذرے گا۔ جب مومنین کو جہلاء خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامت روی اختیار کرتے ہیں لیکن سُفلاء سلامت روی سے نہیں گذر سکتے وہ ضرور اس موقع پر ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک تو افراد کی اپنی طبیعت کا خاصہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر قرآنی معاشرہ ہے اور قرآن کریم کی تعلیم سامنے ہے تو پھر لازمی طور پر وہی ردِّعمل ہوگا جو قرآن کریم کا مطلوب و مقصود ہے۔ اس میں صرف مُزادلت درکار ہوتی ہے، یہاں تک جو کچھ تحریر کیا گیا اس سے مضمون تقریباً پورا ہو گیا ہے تاہم اس موضوع سے متعلق چند مزید باتیں بھی RELEVANCE رکھتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ وہ بھی تحریر کر دیئے جائیں۔

انسانی ذات یا انسانی زندگی کا یہ تصور کہ ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا منفرد UNIQUE نظریہ ہے اور وہ اسی بنیاد پر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ مغربی سیکولر ممالک میں چونکہ اس نظریہ کا کوئی تصور نہیں ہے، اس لئے ان کا معاشرہ نہ تو پائیدار ہو سکتا ہے،

اور نہ ہی اس میں جرائم کی روک تھام ہوسکتی ہے۔ایک شخص سخت گرمی میں روزہ رکھتا ہے۔اپنے مکان میں تنہا ہونے کے باوجود روزہ نہیں توڑتا۔اس کو علم ہے کہ اس سے اس کو گناہ ہوگا جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس کے نفس پر برا اثر مرتب ہوگا۔وہی شخص جب باہر جاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی پرواکئے بغیر گذر جاتا ہے۔کیونکہ اس کو خیال ہے کہ اس جُرم CRIME سے اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔لیکن اگر وہ اسلامی حکومت ہے،تو اس کو خوب معلوم ہوگا کہ اس سگنل کو پار کرنے سے بھی اس کے نفس پر اتنا ہی بُرا اثر پڑے گا جس قدر بُرا اثر روزہ توڑنے سے پڑتا ہے،اس لئے وہ سگنل پار کرنے کا جرم نہیں کرے گا۔آپ اس کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جُرم کی دو نوعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جُرم تو معاشرہ یا حکومت کے خلاف ہے اور دوسرا جُرم ذات کے خلاف ہے۔معاشرہ کے خلاف جرائم کا انسداد حکومت کرتی ہے اگر کوئی شخص حکومت کی سزا سے بچ سکتا ہے تو وہ جُرم کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔اگر حکومت کی مشینری مضبوط نہیں ہے تو جرائم کا انسداد نہیں ہوسکتا۔ذات کے خلاف جُرم کرنے کی روک تھام خود انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔اگر حکومت اسلامی ہے اور اس کے قوانین کے انحراف سے اللہ ورسول کی معصیت ہوتی ہے،اور نفس پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ،تو وہ شخص جو ذات پر ایمان رکھتا ہے،اور اس پر اثرات مرتب ہونے کا قائل ہے وہ کوئی جُرم نہیں کرے گا۔اس طرح اسلامی حکومت میں جرائم کا انسداد از خود پیدا ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس حکومت میں SIN ،گناہ اور CRIME ،جُرم ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ہر وہ شخص جو گناہ نہیں کرتا وہ جُرم بھی نہیں کرے گا۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ کر دینا چاہئے اور جب تک چرچ اور سٹیٹ الگ الگ نہیں ہوں گے،قوم ترقی نہیں کر سکتی جو حضرات مذہب کے لئے SOFT-CORNER رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ نہ بھی کیا جائے تو کم سے کم یورپ میں جس طرح RENAISSANCE اور REFORMATION ہوئے،اسلام کو بھی REFORM،

اور حالات کے مطابق بنالینا چاہئے۔ یہ دونوں نظریات وہ حضرات رکھتے ہیں جن کا مغربی ممالک کا مطالعہ ہے اور جن کے سامنے اسلام بطور مذہب کے ہے۔ دین میں چرچ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چرچ اور سٹیٹ کو تو آپ اس وقت الگ کر سکتے ہیں کہ جب چرچ کا وجود ہو۔ جب دین میں چرچ کا وجود ہی نہیں ہے تو آپ سٹیٹ سے الگ کس چیز کو کریں گے۔ قرآن کریم میں تو تصور ہی صرف سٹیٹ کا ہے۔ قرآن کریم کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام میں چرچ ہوتا ہی نہیں۔ اس میں انفرادی، ذاتی پرستش کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس قسم کے خیالات وہ حضرات رکھتے ہیں جن کا تصور اسلام کا بطور مذہب کے ہے۔ اگر اُن کے سامنے دین کا تصور ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتے۔ یورپ میں چرچ اور سٹیٹ اس لئے الگ الگ کئے گئے کہ ان کے ہاں صرف چرچ تھی۔ اُن کے ہاں NATION STATES کا تصور ہی نہیں تھا۔ اور چرچ کے نظریات نہایت فرسودہ اور عقل انسانی کے خلاف ہے۔ موجودہ بائبل میں طلاق کے علاوہ اور کوئی LAW ہے ہی نہیں۔ پوری بائبل صرف مذہب پر مبنی ہے، جس پر آج کل عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے یورپ میں مجبوراً ان کو سِول لاء بنانے پڑے۔ موجودہ عیسائیت میں سٹیٹ نہیں تھی صرف چرچ تھی۔ جبکہ اسلام میں صرف سٹیٹ ہے چرچ کا تصور ہی نہیں ہے چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ کرنے کا نظریہ کا اسلام سے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔

تشکیل پاکستان کے وقت، گیارہ اگست 1947ء کو جو تقریر قائداعظم نے اسمبلی میں فرمائی تھی اس تقریر کو ہمارے دانشور حضرات بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس تقریر کے پس منظر میں بھی مذہب کارفرما ہے۔ قیام پاکستان تک اسلام کا دین کا تصور واضح نہیں ہوا تھا۔ یہ تو تحریک طلوع اسلام کا شرف اور اس کا اعلیٰ مقام ہے کہ اس نے دین کا تصور پیش کیا۔ جن مغربی تعلیم یافتہ دانشور حضرات کے سامنے اب بھی اسلام بطور مذہب کے سامنے آتا ہے وہ اس تقریر پر جب دلخواہ تبصرہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جن حضرات کے سامنے تحریک طلوع اسلام اور موقر رسالہ صوت الحق کی وساطت سے دین کا تصور واضح ہو گیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس تقریر کی اتنی اہمیت نہیں رہتی۔ ہمارے دلوں

میں قائداعظم کے لئے بہت عزت واحترام ہے۔ہم جس درجہ بھی ان کا احترام کریں، بجا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا کوئی قول حُجت نہیں ہوسکتا رسالہ صوت الحق کے نزدیک تو حضورؐ کا قول حُجت نہیں ہے۔اس زمین کے اوپر صرف اور صرف قول الٰہی حجت ہے، باقی بتانِ آزادی۔

یہ بات نہایت توجہ کی متقاضی ہے کہ مسلمانوں کے دینی تقاضوں کے پورا ہونے سے انہیں سیاسی مفادات بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔مثلاً دینی تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان ایمان لائیں اور اعمال صالحہ کریں۔اس سے اُنہیں اقتدار حاصل ہوجائے گا اور اسی طرح اُنہیں سیاسی مفاد حاصل ہوجائے گا۔بالکل اسی طرح سیاسی مفادات اتباعِ دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوسکتی۔یہ نکتہ بہت ہی غور وفکر، اور شرح اور تفصیل کا متقاضی ہے۔ اور یہ نکتہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت بھی ہے۔اگر قارئین کرام نے پسند فرمایا تو اس کی شرح وتفصیل پیش خدمت کردی جائے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o

ماہ جولائی 2008ء

درسی کتاب ''علوم القرآن'' پر تبصرہ

ہمارے ملک عزیز پاکستان میں تعلیم عام کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، کا اس سلسلہ میں ایک اہم کردار ہے۔ اس قسم کی اُوپن یونیورسٹیز دنیا کے بیشتر ممالک میں کام کر رہی ہیں۔ ان یونیورسٹیز میں طلباء کا حاضر ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ پورے ملک کے طلباء، خواہ وہ کسی شہر میں ہوں، اس سے استفادہ کر کے ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ اصطلاح میں DISTANCE TEACHING کہلاتی ہے۔ اس یونیورسٹی کی ڈگری کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو دیگر یونیورسٹی کی ڈگری کی ہوتی ہے۔ اس یونیورسٹی سے، ایم اے، ایم فل، اور غالباً ڈاکٹریٹ تک کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ یونیورسٹی جو کام کر رہی ہے وہ نہایت قابل تبریک و تحسین ہے۔ اس یونیورسٹی میں قرآن و تفسیر کا بھی ایک شعبہ ہے جسے ''**کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ**'' کہا جاتا ہے۔ اس یونیورسٹی نے اس شعبہ کے لئے ایک کتاب طبع کی ہے جس کا نام ''علوم القرآن'' ہے اور جو ''**التخصص فی القرآن والتفسیر**'' کے طلباء کے لئے طبع کی گئی ہے۔ اس کلاس کے طلباء کے امتحان میں اس کتاب سے سوالات آتے ہیں۔ یہ کتاب 861 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے میں تقریباً 5 اسکالرز نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر حضرات، پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ اور اپنے اپنے خاص مضمون میں ماہر اور تخصص کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجھے اپنی بے بضاعتی، اور ہیچمدانی کے پیش نظر اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی، لیکن محترم المقام جناب پرویز صاحب کے دو واقعات چونکہ میرے سامنے تھے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن خالص کس طرح دستگیری کرتا ہے، اس لئے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی

جرات پیدا ہوگئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے، کانگریس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے، اپنی تفسیر کے پہلے حصہ میں یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اور ہر مذہب نیک عملی اور خدا پرستی کی تعلیم سکھاتا ہے۔اس وقت پورے ہندوستان میں مولانا آزاد کی بہت شہرت اور عزت تھی ۔اوران پر ہاتھ ڈالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پرویز صاحب کی عمر اس وقت تقریباً صرف 35 سال ہوگی لیکن چونکہ ان کا موقف قرآن کریم کے مطابق تھا اس لئے محترم پرویز صاحب نے مولانا آزاد کا تعاقب کیا۔اور قرآن کریم سے ثابت کیا کہ مولانا آزاد کا نظریہ غلط تھا اور یہ کہ اسلام مذہب کے زُمرہ میں آتا ہی نہیں اور اس کو بحیثیت دین کے تمام باطل مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔مذاہب سب باطل ہوتے ہیں۔اور صرف دین ہی حق پر استوار ہوتا ہے۔اُس وقت بھی قرآنی مُفکرین اور دانشوروں نے پرویز صاحب کے موقف کی تائید کی اور اب HIND SIGHT میں تو بات اور بھی واضح ہوگئی کہ پرویز صاحب کا موقف درست تھا اور انہوں نے مولانا آزاد کے خلاف مضمون لکھ کر بڑی ہمت وجرات کا مظاہرہ کیا تھا۔پرویز صاحب کی ہی دوسری مثال ختم نبوت کے مسئلہ میں ہے۔مقدمہ بہاولپور میں بڑے بڑے علماء کرام نے حصہ لیا، مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مفتی محمد شفیع مرحوم، اور سب سے بڑھ کر، حضرت العلام، مولانا انور کشمیری عدالت میں پیش ہوئے۔سیشن جج محمد اکبر صاحب کو نبی اور نبوت کی جامع تعریف کسی سے بھی حاصل نہیں ہوسکی۔لیکن پرویز صاحب کے صرف ایک مضمون سے اُن کو نبی اور نبوت کی جامع تعریف معلوم ہوگئی۔اوران سیشن جج صاحب نے، پرویز صاحب کے اس مضمون کو بنیاد بنا کر مقدمہ کا فیصلہ کردیا۔اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان علماء کرام کے سامنے خالص قرآن کریم نہیں تھا جبکہ پرویز صاحب کے سامنے صرف قرآن کریم تھا۔اگر صرف قرآن کریم سامنے ہو تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے قرآن کریم نے فرمایا o يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا (8/29)o اے ایمان والو! اگر تم قوانین خداوندی کی پیروی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے

اندر ایک ایسی صلاحیت پیدا کر دے گا کہ تم فوراً حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے۔ اسی مضمون کو سورۃ حدید میں اس طرح فرمایا کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ایک ایسا نور پیدا کر دے گا نُوراً تَمْشُونَ بِهِ (57/28) کہ جس کی روشنی میں تم چلو گے۔ ایک حدیث میں بھی حضورؐ نے ارشاد فرمایا اتقو الفراسة المومنين انه ينظر بنورالله، اوكما قال عليه السلام مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نور یہ قرآن کریم ہی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے محتویات CONTENTS پر تبصرہ کرنے سے پیشتر ایک گذارش پیش خدمت عالی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی واحد وجہ قرآن کریم کو دین کی بلند سطح سے مذہب کی پست سطح پر لانا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم پر بحیثیت دین کے عمل کرتے تو قرآن کریم کے تمام وعدے پورے ہوتے۔ قرآن کریم نے وعدہ فرمایا تھا کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے (3/139) ایک ایسی اُمتِ وسطیٰ رہیں گے کہ تمام دنیا کے نگران رہیں گے اور ان کا سربراہِ مملکت ان کا نگران رہے گا (2/143) پوری انسانیت کی منفعت ان کے پیش نظر رہے گی (3/110) یہ ساری دنیا میں عدل و انصاف قائم کر سکیں گے (57/25-4/135) ان کے معاشرے میں کوئی خوف و ہراس نہیں رہے گا (2/38) ان کی مملکت میں ہر متنفس کو رزق مہیا ہوگا (11/6) قرآن کریم کے یہ وعدے اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے۔ لیکن جب ہم نے اس نظام کو ہی لپیٹ کے رکھ دیا، تو ہم ذلت و خواری میں بھی مبتلا ہو گئے اور دوسری قوموں کے دست نگر ہو گئے اور رزق کے حصول میں دوسری اقوام کے محتاج ہو گئے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنے زوال کے اس سبب کا صحیح ادراک نہیں ہے اور مسلمانوں میں ایک ہزار سال کے اندر قوم کی اصلاح کی جو بھی کوششیں ہوئیں ان کے پیش نظر یہ نکتہ آیا ہی نہیں کہ ہمارے زوال کا سبب اس نظام کو چھوڑنا ہے۔ اس کے برخلاف ہماری ساری تفاسیر، احادیث و روایات اور تاریخ صرف مذہب کے نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئیں۔ اس تمام لٹریچر میں دین کا کہیں کوئی تصور دکھائی نہیں دیتا۔ یہ سارا لٹریچر مسلمانوں کے زوال

کا باعث ہے۔ اور جب تک ہم اس ایک ہزار سال کے سارے لٹریچر کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لٹریچر میں جو عقائد و نظریات پیش کئے گئے ہیں، ان کو جو قوم بھی اختیار کرے گی، وہ تباہ و برباد ہو جائے گی۔

اب تک یہ لٹریچر مسجدوں، مدارس جامعہ عربیہ تک محدود تھا۔ اب جبکہ ساری دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ''احیاء اسلام'' کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہ تباہ کن، خلاف قرآن لٹریچر کالجوں، یونیورسٹیوں، یہاں تک کہ انگلش میڈیم اسکولوں تک پہنچ رہا ہے۔ اور اس طرح یہ لٹریچر اپنے TENTACLES، دانشوروں اور INTELLECTUALS میں بھی پھیل رہا ہے۔ اس لٹریچر سے جو ذہن مساجد کے طلباء میں بنتا تھا اور وہاں سے ''ابلۂ مسجد'' پیدا ہوتے تھے۔ اب اسی لٹریچر سے ہمارے ذہین و فطین بچے پوری پوری طرح متاثر ہو کر ''ابلۂ کالج'' بن کر نکل رہے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی روشنی و فراست نہ مدارس و مساجد میں ہوتی تھی، اور نہ اب کالجوں میں پیدا ہو گی۔

اس کتاب کا نام ''علوم القرآن'' تجویز کیا گیا ہے۔ اس میں صرف ان ہی موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جو ہمارے مذہبی حلقوں کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ دین کے موضوعات میں تو سب سے زیادہ اہمیت نظام اور نظام کو چلانے کی ہو گی۔ دینی نقطۂ نگاہ سے تو علوم القرآن میں سب سے زیادہ اہمیت ان علوم کی ہو گی جو اس نظام کو چلانے میں کام آئیں۔ ان میں قرآن کریم کا سیاسی، معاشی، سماجی، تمدنی، عمرانی، سب ہی پہلو آ جائیں گے۔ جب قرآن کریم نے حکم دیا کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے۔ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے، اور اس کے نظام کی اطاعت ہی اس کی عبادت ہے اور یہ نظام اولی الامر کی معرفت رواں دواں رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنی مختلف آیات میں اس نظام کا نقشہ بھی دے دیا ہے، اس پر تحقیق و تفتیش، اس کو نظام کی حیثیت سے پیش کرنا، اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر، اس میں تبدیلیاں کرنا، علوم القرآن کی فہرست میں اول نمبر پر آتا ہے۔ یہاں قرآن کریم کی POLITICAL SCIENCE، مغرب کی پولیٹیکل

کی سائنس سے بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ جس کا علم حاصل کرنا اول نمبر پر آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ
لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ o(9/122) چاہئے یہ کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ مرکزِ خداوندی میں آ کر،
اس نظام کے متعلق پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل کریں اور پھر اپنی جماعت کی طرف واپس جا کر انہیں
اس سے آگاہ کریں، اس طرح پوری کی پوری قوم اپنے آپ کو غلط باتوں سے محفوظ رکھ سکے گی (اور
صحیح نظام کے مطابق چلنے کے قابل ہو جائے گی)o (مفہوم القرآن 454 صفحہ) اسی طرح جب
قرآن کریم نے فرمایا کہ oوَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6)oاور زمین
پر کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس کے رزق کی ذمہ داری ہم پر نہ ہو۔ پھر مزید ارشاد فرمایا نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ
وَإِيَّاهُمْ (6/151) ہم تمہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) رزق دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ
ربٰو کو حرام قرار دے دیا۔ زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کا حکم دیا۔ ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ قرآن
کریم اپنا ایک معاشی نظام عنایت فرما رہا ہے۔ قرآن کریم کا یہ معاشی نظام علوم القرآن میں اہم
ترین علم ہے۔ بغیر سود کے معاشی نظام تشکیل دینا اور اس کو عملاً چلانا، علوم القرآن میں سب سے زیادہ
اہم علم ہے۔ جو علوم بھی قرآن کریم کے نظام کو جاری کرنے میں ضروری ہوں وہ سب علوم، علوم
القرآن میں شامل ہیں۔ ان علوم کے علاوہ نظری طور پر بھی سارے سائنسی علوم حاصل کرنے کا حکم
دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (10/101) دیکھو تو سہی کہ
آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔ نیز ملائکہ (فطرت کی قوتوں) کو مسخر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ
سارے علوم قرآنی علوم ہیں۔ ان کو علوم القرآن سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ آج عقلِ انسانی جہاں
تک پہنچ چکی ہے اور قرآن کریم عقلِ انسانی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے، اس تک پہنچنے کے لئے
جو علوم بھی کام آئیں وہ سارے علوم القرآن میں شامل ہیں۔ اس زمانے کی مشکلات اور وہ مسائل
جس سے انسانیت دوچار ہے ان کو قرآن کریم حل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان کو حل کرنے کے لئے
جو بھی علوم کام میں آئیں وہ سب علوم القرآن میں داخل ہیں۔ اصل کام کرنے کا ہی یہ ہے کہ اس قسم

کی کتب میں پہلے اس زمانہ کی مشکلات و مسائل کی نشاندہی کی جائے، پھر ان تمام مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کیا جائے، اوران کی تائید میں قرآنی آیات لازمی دینی چاہئیں، تو ایسی کتب علوم القرآن کہلانے کی مستحق ہوں گی۔

اب کتاب کے مندرجات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔اس کتاب میں 18 یونٹ ہیں اور ہر یونٹ خود مکتفی ہے اور الگ الگ عنوان کا حامل ہے۔اس کے دوسرے یونٹ کا عنوان ''تعارف وحی'' ہے۔اس کو محترم جناب ڈاکٹر ازکیا ہاشمی صاحب نے تحریر کیا ہے اور ایسوسی ایٹ پروفیسر جناب محی الدین ہاشمی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔اس یونٹ میں وحی کے لغوی اصطلاحی مفہوم، اقسام وحی، الہام، حضوؐر پر نزول وحی کی مختلف صورتیں بیان کرنے کے بعد صفحہ 78 پر یہ عنوان تحریر ہے۔''وحی صرف قرآن کریم میں نہیں'' اور اس کے ذیل میں عبارت تحریر ہے'' منکرین سنت وحی کو صرف قرآن کریم تک محدود رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک سنت پر وحی کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے آنحضرتؐ کی ذاتی رائے اور تدبیر و استنباط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔جب کہ قرآن وسنت سے اس نقطہ نظر کی تردید ہوتی ہے، درحقیقت آنحضرتؐ پر نازل ہونے والی وحی دو اقسام پر مشتمل ہے''۔اس عنوان کے بعد دوسرا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے۔

وحی متلو و غیر متلو یا وحی جلی و خفی:

اس عنوان کے ذیل میں یہ عبارت تحریر کی گئی ہے۔''وحی کی وہ قسم جسے آنحضرتؐ پر خاص الفاظ اور معانی دونوں کے ساتھ اُتارا گیا ہے جو اصول وکلیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کی صورت میں اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں معمولی لفظی تغیر بھی ممکن نہیں اسے وحی متلو یا وحی جلی بھی کہا جاتا ہے۔اس کی تلاوت وقرأت کا تاکیداً حکم ہے اور اس پر اجر وثواب کا وعدہ ہے۔دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن حکیم کے اصول وکلیات کی تشریح وتوضیح اور شرعی احکامات کی جزوی تفصیل پر مشتمل ہے اس میں مضامین تو من اللہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ کا انتخاب رسول اکرمؐ کا ہوتا ہے۔ جس وحی غیر متلو یا وحی خفی بھی کہا جاتا ہے۔یعنی جس کی تلاوت کا باقاعدہ حکم نہیں دیا گیا اور یہ وحی بھی

چاہے الہام والقاء کے ذریعے حاصل ہو یا نبی کی فہم وفراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو، بہر حال شیطانی تحریکات واثرات سے مُنزّہ اور غلطی اور خطاء سے یکسر پاک ہوتی ہے اور جس کے وحی ہونے کی سند خود قرآن کریم نے دی ہے"(یہاں اقتباس ختم ہوا)

ہمارے علماء کرام (اور اب ماشاء اللہ پروفیسر صاحبان) کا یہی وہ نظریہ ہے جس کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ کیونکہ صرف اس نظریہ کی وجہ سے دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے۔ اس بات کے دلائل کہ وحی صرف قرآن کریم میں ہے اور حدیث وحی نہیں ہے، آگے آتے ہیں، پہلے آپ یہ غور فرمائیں کہ حدیث کو وحی بنانے کا عقیدہ کیوں پیدا ہوا، اور علماء کرام کی وہ کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے حدیث کو وحی قرار دے دیا، اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اس خلاف قرآن عقیدے کے کیا کیا مضر اثرات ہم پر مرتب ہوئے ہیں۔

حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے دین کو عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ یہ دین اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا اور حضورؐ نے اس کو عملاً جاری کیا تھا، اس لئے اس کی اطاعت اللہ ورسول دونوں کی اطاعت تھی۔ اللہ ورسول کی طاعت کا مفہوم ہی یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اس نظام کے ذریعے ہوتی تھی جسے حضورؐ نے قائم فرمایا تھا اللہ تعالیٰ کے احکام قرآن کریم میں جمع تھے اور حضورؐ بہ حیثیت مرکز حکومت الہیہ، ان احکامات کی اطاعت کراتے تھے اور قرآن کریم کے اصولوں کی جزئیات بھی حالات کے مطابق مقرر فرماتے جاتے تھے۔ یہ نظام صرف حضورؐ کے دور تک کے لئے محدود نہیں تھا اس آگے چلنا اور بڑھنا بھی تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے بعد، خلافت راشدہ کے دور میں حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت، اللہ ورسول کی اطاعت قرار دی گئی۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، جب تک بھی وہ نظام جاری رہا ان حضرات کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ بدقسمتی سے وہ نظام منقرض ہو گیا اور خلافت کی جگہ ملوکیت غالب آ گئی۔ اس وقت یہ نہایت ہی تکلیف دہ سوال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو قرآن کریم سے ہو جاتی ہے لیکن رسول اللہ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو اس سوال کا

جواب نہایت تھا کہ دوبارہ خلافت قائم کر لی جاتی اور اس کے ذریعے پھر اللہ ورسول کی اطاعت کا سلسلہ جاری کر دیا جاتا۔ لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ اور علماء کرام کے خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ اس صورت میں حضورؐ کی اطاعت ان کے ارشادات عالیہ اور اقوال مبارکہ کے ذریعے کی جائے اور ان اقوال کو وحی الٰہی کا درجہ دے دیا جائے۔ یہ وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے حدیث کو وحی کا درجہ دیا گیا۔ اس کے بُرے اثرات اور بُرے نتائج تو بہت ہوئے لیکن ان میں سے دو بُرے اثرات و نتائج ایسے تھے جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ کر دیا۔

پہلا اثر تو یہ ہوا کہ جب احادیث کو وحی الٰہی قرار دے کر، اس کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دے دیا گیا، تو پھر اسلامی نظام کے قیام اور ایک زندہ اتھارٹی سے احکام جاری کرنے کا تصور ہی جاتا رہا۔ اگر رسول اللہ کی اطاعت کا یہ غلط تصور رائج نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی آئندہ دور میں ملوکیت کے خاتمہ پر مسلمان پھر سے زندہ اتھارٹی قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب اطاعت رسول کا تصور ہی بدل گیا، تو نظام کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اطاعت رسول کے اس غلط نظریہ کا اثر کس قدر گہرا تھا کہ آپ غور فرمائیں کہ بارہ سو سال بعد، ہمارے دور میں ایران میں اسلامی نظام قائم کیا گیا، لیکن نظام قائم ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار نہیں دیا۔ ان کے ہاں انفرادی پرستش کا تصور بجنسہ اسی طرح قائم ہے جس طرح غیر اسلامی نظام میں قائم ہوتا ہے۔ اسی لئے ایران کا وہ نظام ناکام ہوا۔ دوسری مثال خود ہمارے پاکستان میں ہے۔ ہمارے ہاں بھی جو چند تحریکات اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لئے اُٹھی ہیں اور برابر سالہا سال سے اس کام میں مصروف ہیں اور نہایت نیک نیتی سے اپنی ساری عمریں اس میں کھپادی ہیں وہ سب اطاعت رسول احادیث کے ذریعے ہی کرتی ہیں، احادیث کو وحی بھی مانتی ہیں۔ اور اطاعت رسول کے لئے زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی ہیں۔ احادیث کو وحی الٰہی قرار دینے کا دوسرا مُہلک اثر قرآن فہمی پر ہوا۔ ہمارے سابقہ مفسرین کرام نے نہایت نیک نیتی سے تفاسیر تحریر فرمائیں۔ لیکن چونکہ سابقہ دور علمی لحاظ سے کم تر تھا اس لئے وہ تفاسیر اپنے دور کی

علمی سطح تک ہی پہنچ پائی تھیں۔اس موجودہ دور کے تعلیم یافتہ طبقہ کو وہ مطمئن نہیں کر سکتیں۔لیکن اس میں کوئی اس درجہ نقصان کی بات نہیں تھی۔ہم سمجھ سکتے تھے کہ سابقہ دور میں مفسرین کی علمی سطح اُسی دور کے مطابق تھی۔لیکن جس چیز نے قرآن فہمی کے لئے راستہ بند کر دیا وہ یہ عقیدہ تھا کہ حضورؐ کے وہ ارشادِ گرامی و احادیث جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر کی ہے وہ وحی تھے، اس لئے ان ارشادِ گرامی سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے اور آیات قرآنی کی اور کوئی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔اس میں ایک صورت یہ بھی پیدا ہوئی کہ لوگوں نے چند فقرے بنا کر، ان کو حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا اور اُن موضوعہ فقروں سے قرآن کریم کی تفسیر کی گئی۔اس عقیدہ سے نہ صرف قرآن فہمی کی راہ مسدود ہوئی بلکہ بیشتر غلط اور خلافِ قرآن عقائد نے بھی حضورؐ کی طرف مُنتسب ہو کر مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

موقر رسالہ 'صوت الحق' کا موقف جمہور مسلمانوں کے بالکل خلاف، لیکن قرآن کریم کے مطابق ہے کہ ''وحی صرف قرآن کریم میں ہے'' اور ''خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے'' یہ رسالہ اپنے اس قرآنی موقف پر جم کر کھڑا ہے اور مسلسل اس نظریہ کی اشاعت و ترویج کر رہا ہے۔ پہلے اس موقف کے چند عقلی دلائل پیش خدمت ہیں۔اس کے بعد قرآنی دلائل پیش خدمت کئے جائیں گے۔

(1) پہلی بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام جن کتب احادیث، مثلاً موطا، صحیحین، صحاح ستہ، کتب اربعہ، کو احادیث کی کتب شمار کر کے، ان کو وحی خفی قرار دیتے ہیں۔ یہ کتابیں احادیث کی کتابیں ہیں ہی نہیں۔ یہ تو ساری کتب روایات ہیں۔ یہ اقوال رسول ہیں ہی نہیں، ان کو نطق رسول سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو محض اقوال منسوب الی الرسول ہیں۔اور یہ سارے اقوال و الفاظ راویوں کے اپنے الفاظ میں بیان کردہ ہیں۔ ہمارے علماء کرام خود اس کے قائل ہیں کہ یہ احادیث روایت بالمعنی ہیں۔یعنی NARRATION ہیں۔ یہ حضورؐ کے اپنے الفاظ نہیں ہیں یعنی یہ VERBATIM نہیں ہیں۔اسی وجہ سے احادیث کے شروع میں **قال رسول اللّٰہ** اور آخر میں **اَوکما قال علیہِ السّلام** لکھا جاتا ہے۔یعنی حضورؐ نے یوں فرمایا جس طرح بھی حضورؐ

نے فرمایا ہو۔اس کی عملی مثال یہ ہے کہ حدیث میں ہے **خیر کم من تعلم القرآن و علمته** تم میں وہ سب سے بہتر شخص ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور اور سکھاتا ہے۔حدیث مبارکہ کا یہ مفہوم ممکن ہے کہ حضورؐ نے **خیرکم** کی جگہ **افضلکم** فرمایا ہو۔کیونکہ راویوں نے محض مفہوم اخذ کر کے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔اب آپ غور فرمائیں کہ راویوں کے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں حدیث کے بعد **اوکما قال رسول اللہ** ، کہہ کر علماء کرام خود حدیث کو مشکوک بنا کر ظنی قرار دیتے ہیں۔وحی ظنی کبھی نہیں ہو سکتی۔وحی میں ظن وشک کا کیا کام۔قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ جب ہم کسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں تو شروع میں کہتے ہیں **قَال اللّٰہ تعالیٰ** اور آخر میں کہتے ہیں۔**صدق اللّٰہ العظیم** ، یہ ہے وحی کی شان کیونکہ قرآن کریم کی تلاوت کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ **اوکما قال اللّٰہ تعالیٰ** ۔اس لئے وحی میں شک وشبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

(2) دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن کریم تو یقیناً سب کے لئے وحی ہے۔لیکن اگر احادیث بھی وحی ہیں تو رسول اللہ کے ذاتی اقوال کون سے ہیں۔قرآن کریم نے حضورؐ کی فہم وفراست کی تعریف فرمائی ہے۔حضورؐ اللہ تعالیٰ کی طرف دلائل کے ساتھ بلاتے تھے۔ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (12/108) میں اور ہر وہ شخص جو میرا اتباع کرتا ہے، اللہ کی طرف دلائل کے ساتھ بلاتے ہیں یہاں دلائل دینے کے PROCESS میں حضورؐ اور عام مومنین ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔جس طرح مومنین دلائل دیتے تھے، اسی طرح حضورؐ بھی عقلی دلائل دیتے تھے۔کیا حضورؐ کے وہ عقلی دلائل وحی ہوتے تھے۔

(3) عام مومنین کو حکم تھا کہ اپنے امور مشاورت سے طے کرو (12/38) اس عام حکم کے باوجود حضورؐ کو الگ حکم ہوا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (3/159) کاموں میں لوگوں سے مشورہ کرلیا کرو۔اگر حضورؐ کے اقوال وحی خفی تھے تو کیا وحی مشورہ سے نازل ہوتی تھی۔کیا وحی میں مشورہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

(4) وحی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔چنانچہ قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت

ہوتی ہے۔ اگر احادیث وحی خفی ہیں تو ان کی اطاعت سے بھی تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوگی۔ ان کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ یہ بات قرین عقل وقیاس نہیں ہے کہ وحی کے ایک حصہ سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو اور وحی کے دوسرے حصہ سے رسول اللہ کی اطاعت ہو۔

(5) اگر رسول اللہ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث ہے، تو یہ ضروری تھا کہ اُنہیں بھی قرآن کریم کی طرح محفوظ رکھنے کی ذمہ داری اللہ ورسول پر ہوتی۔ کیونکہ اطاعت کے لئے متعین اور یقینی احکام کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح حضورؐ نے قرآن کو جمع کرا کے امت کے لئے چھوڑا، ضروری تھا کہ وہ احادیث کی حفاظت کا بھی اہتمام کر جاتے۔ وحی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا، اور دوسرے حصے کو راویوں کی صوابدید پر چھوڑ جانا مناسب نہیں تھا۔ اس طرح تو یہ راوی حضرات شریک کار رسالت قرار پاتے ہیں۔

(6) جس طرح ہم وحی الٰہی کے پابند ہیں، آپ بھی اس کے متبع تھے۔ جس طرح ہم اپنے عقلی واختیاری کاموں کے لئے جوابدہ ہیں آپ بھی تھے۔ ○وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ○(43/44) آیت میں لَّكَ کا لفظ خاص طور پر آپؐ کے لئے اضافہ فرما کر، واضح کر دیا کہ آپ بھی مسئولیت سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ارشاد ہوتا ہے ○فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ○(7/6)○ پھر ضرور ہم باز پرس کریں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، اور خود رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے○۔ انبیاء کرام کے اعمال زیر محاسبہ ہوتے تھے۔ جن کے اعمال واقوال زیر محاسبہ ہوں بھلا وہ وحی کیسے ہوسکتے ہیں۔

(7) آپ کو حکم تھا کہ کسی کام کے کل کرنے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہنے کے نہ کریں (18/23.24) آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کل کو کیا ہوگا (46/9) آپ کو شیطانی نزاع کے وقت اعوذ باللہ کہنے کا حکم تھا (7/200) آپ شیطانی اکساہٹوں سے پناہ مانگا کرتے تھے (23/97) آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنے گناہ کی بخشش مانگ (48/55) آپ غور فرمائیں کہ کیا یہ باتیں وحی ہوسکتی ہیں۔ یقیناً آپ کی ایسی سب باتیں وحی کے بغیر تھیں یہاں تک حدیث کے وحی نہ

ہونے کے عقلی دلائل پیش خدمت عالی کیے گئے۔ اب چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(1) ہمارے علمائے کرام حدیث کو خفی کہتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے یہ نام ہی غلط ہے کیونکہ وحی خفی ہو ہی نہیں سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے o يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5/67) o اے رسول جو کچھ تم پر پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچا دو۔ وحی تو پوری انسانیت کی ملکیت ہوتی ہے۔ وحی کا نزول اگر چلتی تلواروں میں بھی ہو، تو رسول کا فرض تھا کہ وہ اسے فوراً انسانیت کو پہنچا دے وحی تو BY DEFINITION خفی ہو ہی نہیں سکتی۔

(2) یہی صورت وحی غیر متلو کے نام کی ہے۔ ہمارے علمائے کرام حدیث کو غیر متلو کہتے ہیں۔ حالانکہ وحی غیر متلو نہیں ہو سکتی۔ وحی ساری کی ساری متلو ہے۔ ارشاد ہوتا ہے o كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهَا أُمَمٌ لِّتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (13/30) o اے رسول ہم نے تمہیں اسی طرح ایک امت میں بھیجا ہے جیسے پہلے اور بہت سی اُمتیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو تم پر وحی کی گئی ہے۔ اس آیہ کریمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ مُطلق **مایوحیٰ** وحی ہے جس کی تلاوت حضورؐ فرمایا کرتے تھے۔

(3) مایوحیٰ اور قرآن کریم ایک ہی چیز ہے۔ o وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (18/27) o جو کتاب تمہارے پروردگار کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اس کو پڑھا کرو اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے o إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ o وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ (27/91.92) o مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے مالک کی عبادت کروں، جس نے اسے عزت وحرمت دی اور چیز اسی کی ہے اور مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں اس کا فرمانبردار رہوں o اور یہ کہ میں قرآن پڑھا کروں۔

پہلی آیت میں مَا أُوحِيَ کی تلاوت کا حکم ہوا اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مَا أُوحِيَ اور قرآن کریم ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک

دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں۔''وحی صرف قرآن میں ہے'' کے موضوع پر متعدد مضامین رسالہ صوت الحق میں شائع ہو چکے ہیں۔جن صاحب کو مزید قرآنی دلائل درکار ہوں وہ اسی رسالہ کی طرف رجوع فرمائیں یا کتاب موسومہ ''قرآن فہمی کے قرآنی دلائل'' ملاحظہ فرمائیں۔
''علوم القرآن'' سے تحریر کردہ اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔اس میں آپ ان دونوں کے مابین فرق کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔تحریر کیا گیا ہے۔

(1) ''دوسری قسم کی وحی وہ ہے کہ.........اس میں مضامین تو من جانب اللہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ کا انتخاب رسول اکرمؐ کا ہوتا ہے جسے وحی غیر متلو یا وحی خفی بھی کیا گیا ہے''۔

(2) ''یہ وحی بھی چاہے الہام والقاء کے ذریعے ہو یا نبی کی فہم وفراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو'' (صفحہ 78)

پہلے فقرہ میں وحی خفی اور وحی غیر متلو کے متعلق تبصرہ پیش کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے یہ اصطلاحیں ہی بالکل غلط ہیں۔اس فقرہ میں دوسری بات اس وحی کے متعلق یہ تحریر ہے کہ اس وحی میں مضمون تو حضورؐ کے دل اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا تھا۔حضورؐ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔علماء کرام کا یہ نظریہ سابقہ دور میں تو رائج ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نظریہ علمی حلقوں میں بالکل مسترد کیا جا چکا ہے اب سائکلوجی اور فلولوجی PHILOLOGY نے اس درجہ ترقی کر لی ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور CONCEPT بغیر لفظ کے آسکے۔تصور اور لفظ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔اس لئے وحی بلا الفاظ،کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

دوسرا فقرہ جو تحریر ہے کہ یہ وحی چاہے الہام والقاء کے ذریعے حاصل ہو یا نبی کی فراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو''،اس سلسلے میں عرض ہے کہ الہام کے متعلق ایک مضمون رسالہ 'صوت الحق' میں گذشتہ ماہ طبع ہو چکا ہے۔اس موضوع پر دوبارہ تحریر کرنا تضیع اوقات ہے البتہ وحی میں نبی کی فہم وفراست کے دخل کے متعلق جو تحریر کے گیا ہے اس پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور یہ بات ہماری سمجھ سے

بھی بالاتر ہے۔اس طرح کا فقرہ کس طرح طبع ہو گیا ہے۔وحی میں تو نبی کی فراست وجذبات کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ تو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور اس درجہ خلاف قرآن ہے، کہ اس پر کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی معلوم نہیں ہوتی صفحات 153، 154 میں جو حفاظ کے والدین اور رشتہ داروں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ان کو بہت اعزاز ملے گا یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

صفحہ 160 پر مرقوم ہے کہ جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اُن کی تعداد صرف 4 ہے۔ یہ نظریہ بھی قرآن کریم کے خلاف ہے۔قرآن کریم کی رُو سے تمام انبیاء اور رسولوں کو کتابیں ملی ہیں۔ (2/213-57/25) ''نوح علیہ السلام کے زمانے سے قبل حضرت ادریس اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم ہدایت کے علاوہ بطور معجزہ علم نجوم اور رمل بھی دیا گیا تھا'' (P232) یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ انبیاء کرام کو صرف کتاب دی جاتی تھی جو ان کی جانب وحی ہوتی تھی۔صفحہ 246 پر رقم ہے ''کفار ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے اور فاسق وفجار انبیاء کی شفاعت سے نجات پاسکیں گے''۔ یہ عقیدہ بالکل خلاف قرآن ہے۔ جو ہمارے معاشرے میں جس درجہ مذہب کا غلبہ ہو رہا ہے، اسی نسبت سے جرائم بڑھ رہے ہیں، اس کی وجہ یہی شفاعت کا عقیدہ ہے۔ مذہب کے غلبہ کی وجہ سے شفاعت کے عقیدہ کو مزید استحکام ملتا ہے اور وہ بے دریغ جرائم کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو بھروسہ ہوتا ہے کہ اس کی شفاعت کرادی جائے گی۔قرآن کریم سے شفاعت کے عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ ہر شخص کے اپنے اعمال ہی کام آئیں گے اس موضوع پر مزید مواد رسالہ صوت الحق سے حاصل کریں

کتاب کے صفحہ 246 سے ایک مختصر سا باب شروع ہوتا ہے اس کا عنوان '' آغاز نزول قرآن (غار حرا کا واقعہ)'' ہے۔اس پانچ صفحے کے باب میں وہ تمام روایات مندرج ہیں جو ہماری تاریخ اور عام کتب میں درج ہے کہ حضورؐ اپنا بیشتر وقت غار حرا میں عبادت الٰہی میں گذار دیتے تھے۔ پھر جبرئیل نے آکر اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ والی آیت پڑھنے پر اصرار کیا۔حضورؐ نے اس کے پڑھنے سے معذوری ظاہر کی ۔ اس واقعہ سے حضورؐ پر خوف طاری ہوا۔ اور حضرت خدیجہ اُنہیں اپنے COUSIN ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ واقعات بہت مشہور ہیں اور بغیر چھان بین کے

اس کتاب میں درج کردیئے گئے ہیں۔قرآن کریم سے عناد رکھنے والے مستشرقین اور ہمارے لبرل حضرات اس واقعہ سے دو نتائج اخذ کرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ معاذ اللہ حضورؐ کو وحی نہیں آئی تھی بلکہ آپ کو HALL UCINATIONS ہوتے تھے اور ورقہ بن نوفل نے حضورؐ کو اس لائن پر پر ڈال دیا۔دوسرے جو کیفیت نزول وحی کی بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ پر کپکپی طاری ہوتی تھی اور دہن مبارک سے جھاگ برآمد ہوتے ہیں تو یہ مرگی EP کی علامات ہیں۔اس سے مخالفین اسلام یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو مرگی کا مرض تھا اور اس وجہ سے ان کی یہ حالت ہوتی تھی۔غار حرا کا وقعہ بالکل ایجاد بندہ ہے اور یہ سب ہفوات صرف تصوف کی تائید کی وجہ سے وضع کی گئی ہیں۔ایک اس کے بعد دو باب نزول قرآن اور اسباب نزول قرآن سے متعلق ہیں ان ابواب پر تبصرہ پورے ایک مضمون کا متقاضی ہے۔اس لئے ان ابواب پر تبصرہ اگلے مضمون میں آئندہ کے شمارے میں پیش کیا جائے گا۔

وبیده التوفیق وعلیه التکلان۔

مضمون کے آخر میں یہ رسالہ نہایت عاجزی و فروتنی سے عرض گذار ہے کہ اس تبصرہ سے خدانخواستہ کسی کی تنقیص وتخفیف ہرگز ہرگز مقصود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ رسالہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے کہ جہاں کہیں بھی خلاف قرآن نظریات کی اشاعت ہو رہی ہو، یہ رسالہ اپنا محاکمہ اور قرآن کریم کا موقف پیش کرے۔ جہاں تک اس موجودہ تبصرہ کا تعلق ہے تو یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے اور اس سے خلاف قرآن نظریات کی اشاعت وترویج کا زیادہ امکان نظر آتا ہے۔اس لئے اس کتاب پر بلا لومۃ لائم تبصرہ کرنا اور بھی زیادہ ضروری تھا۔

نکل جاتی ہے سچی جس کے منہ سے مستی میں　　　فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ○

ماہ ستمبر 2008ء

عالم ارواح کا عقیدہ قرآن کریم کے خلاف ہے

آج ہم مسلمان جس بربادی کے دور سے گزر رہے ہیں اس صرف ایک وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے کئی وجوہ ہیں ۔ اور اس وجوہات کا اجتماعی نتیجہ ACCUMMULATED EFFECT اس تباہی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اس وقت ضرورت تو اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے کو موجودہ مسائل و مصائب کے بارے میں قرآن کریم کی رو سے ان کے حل کے متعلق ہی تحریر کیا جائے ۔ ان میں بھی قانونی امور زیادہ اہمیت دی جائے ۔ لیکن ہم مسلمانوں میں بعض خلافِ قرآن عقائد ایسے بھی ہیں جن کا ہم پر مسلسل اثر چلا آ رہا ہے ۔ جیسے کہ تقدیر کا عقیدہ کہ اس نے مسلمانوں کو محنت اور کوشش سے بے نیاز کر دیا ہے ۔ تصوف کے نظریات اور ان نظریات پر عمل کرنے سے مسلمان بالکل ہی مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں ۔ آج کل ماہ مبارک رمضان ہے ۔ روزہ یقیناً فرض ہے ۔ ہم سب مسلمان اس کے پابند ہیں اور مسمانوں کی بیشتر تعداد روزہ رکھتی بھی ہے ۔ یہ ہم میں نظم وضبط اور صلابت پیدا کرتا ہے ۔ لیکن تراویح ، اعتکاف عمرے ، شبینے کی وجہ سے مسلمانوں کی PRODUCTIVITY- تقریباً نصف رہ جاتی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے لیلۃ القدر نہایت بابرکت رات تھی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل اقدار نازل ہوئیں ۔ لیکن یہ فضیلت صرف اسی رات سے مخصوص ہے جس میں یہ قدریں نازل ہوئیں ۔ ہر سال کے رمضان میں یہ رات نہیں آتی ۔ نہ دوبارہ مستقل اقدار نازل ہوں گی ۔ نہ وہ برکت والی رات واقع ہو گی ۔ ہر سال لیلۃ القدر منانے سے اس رات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے ۔ اس قسم کے خلاف قرآنی عقائد ہم مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور ہمارے عقائد کا بیشتر حصہ ان ہی خلافِ عقائد پر مشتمل ہے

۔ہمارے صرف چند عقائد ہی قرآن کریم کے مطابق ہیں۔ان خلاف قرآن عقائد میں جنہوں نے ہمیں متاثر کیا ہے ایک عقیدہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے ایک عالم ارواح بنایا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اسی روز آفرینش میں قیامت تک کے لئے ارواح کو پیدا کر دیا تھا۔ان کو ایک مرتبہ ہی ذخیرہ کرلیا تھا اور ہر نئے پیدا ہونے والے بچے کے جسم میں اس جمع شدہ ذخیرے میں سے ایک روح کو لے کر اس جسم میں داخل کر دیتا ہے۔اس عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے جب آدم اور دوسرے انبیاء کرام کو پیدا کیا تو ان سے عہد لیا کہ جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں (تفسیر کبیر بحوالہ تفسیر نمونہ جلد دوئم ص184)

اس عالم کو عالم میثاق اور عالم ذر بھی کہتے ہیں۔تفسیر انوار القرآن میں تحریر ہے۔''عالم ذر کے بارے میں بعض حضرات کا خیال خیال ہے کہ آدمؑ کی پشت یا آدمؑ کی مٹی سے ذرّاتِ اولاد آدمؑ کو الگ کر کے انہیں شعور دے کر ان سے سوال جواب کیا گیا اور اس کے ذریعے اتمام حجت کیا گیا۔علماء عظام کا یہ بھی نظریہ ہے کہ اس عالم ارواح میں سب سے پہلے حضورؐ کا نور تخلیق کیا گیا۔**اول ماخلق اللّٰہ نوری** ۔مشہور حدیث ہے اور ان کے خیال میں آیت کریمہ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (42/52) تم تو نہ ہی کتاب کو مانتے تھے کہ کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو) کا تعلق بھی اسی عالم ارواح سے ہے۔مختصر یہ کہ ایک فرضی دنیا قائم کی گئی اور اس کے متعلق جملہ تفاسیر میں تفصیل در تفصیل اور بہت سی لایعنی باتیں لکھی گئیں۔اس کو یوم الست بھی کہا گیا تھا فارسی شعراء نے اس مزعومہ قصہ کو مزید شہرت دی اور بہت عمدہ اور دلکش اشعار اس بارے میں لکھے ان سارے نظریات کی ایک ہی آیت کریمہ اساس ہے۔اس لئے پہلے اس آیہ کریمہ کی متوجہ تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے وہ آپ ملاحظہ فرمائیں۔ان کے مطالعہ سے قارئین کو یہ تو اندازہ ہوگا کہ ہماری ان سابقہ تفاسیر میں کس قسم کا مواد ہے اور اس مردہ جنازہ کو ہم اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہیں۔یہ تو غنیمت ہے کہ یہ ساری تفاسیر عربی اور فارسی میں ہیں۔ہماری موجودہ نسل کے جوان ان سے بے خبر ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ یہ تفاسیر موجودہ ذہن کو صرف مطمئن نہیں کرتی بلکہ مزید قرآن کریم سے

برگشتہ کر دیتی ہیں۔ارشاد جناب باری تعالیٰ اعزاسمہ ہوتا ہے۔o وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ o(7/172) شاہ عبدالقادر صاحب کا تحت اللفظ ترجمہ ہے:o اور جس وقت نکالی تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پیٹھ سے ان کی اولاد اور اقرار کروایا ان سے ان کی جان پر کیا میں نہیں ہوں رب تمہارا بولے البتہ ہم قائل ہیں کبھی کہو قیامت کے دن ہم کو اس کی خبر نہیں تھیo۔شاہ صاحب کا ترجمہ چونکہ مستند ترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ پیش خدمت ہے کیا گیا۔چونکہ یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے اور اس کی اردو بھی پرانی ہے اس لئے مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ اس کا بامحاورہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔''اور جب تمہارے پروردگار نے آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنا کر سوال کیا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں۔تو سب نے کہا بے شک ہم اس کے گواہ ہیں یہ عہد اس لئے لیا کہ روز قیامت یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس سے غافل تھے''۔ترجمے کے بعد اب آپ اس کی تفسیر مختلف کتب تفاسیر سے ملاحظہ فرمائیں۔

(1) موضح القرآن میں ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے پشت سے ان کی اولاد نکالی سب سے پہلے اقرار کروایا اپنی خدائی کا پھر پشت میں داخل کر دیا اس سے مدعا یہ تھا کہ خدا کے ماننے میں میں ہر کوئی آپ کفالت کرتا ہے باپ کی تقلید نہیں۔

(2) تفسیر ابن کثیر میں ہے۔اولاد بنی آدم سے عہد الست اولاد آدم سے اللہ تعالیٰ نے ان کی نسلیں ان کے پیٹھوں سے نکالیں۔پھر ان سب سے اس بات کا اقرار لیا کہ رب خالق مالک معبود ہی ہے،اسی فطرت پر پھر دنیا میں ان سب کو ان کے وقت پر اس نے پیدا کیا یہی فطرت ہے جس کی تبدیلی ناممکن ہے(جلد دوم ص207)

(3) رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح گوری نسل نکل پڑی۔اور بائیں شانے پر ہاتھ مارا تو کوئلے کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی دائیں طرف والوں کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جنت کی طرف جانے

والے ہیں اور مجھے ان کی اطاعت کی پروانہیں۔اور بائیں شانے والوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی نافرمانی کی پرواہ نہیں۔سابقہ تمام مفسرین نے اس آیت کی تفسیر معمولی سی رد بدل سے اسی طرح کی ہے۔اس پر موجودہ کی دو تفاسیر نے یہ تبصرہ کیا ہے۔

(1) آیت کریمہ کی یہ تفسیر زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے کہ اس میں ذریت آدمؑ کا ذکر ہے۔آدم کا نہیں ۔پھر اس سلسلے کی روایات بھی بے حد اختلاف رکھتی ہیں مجموعی طور پر فطری استعداد کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔(تفسیر انوار القرآن)

(2) اس کے علاوہ کچھ حدیثوں میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ موجود ہے **یوم الذر یوم اخذ المیثاق** یعنی عہد الست کا ذکر موجود ہے۔اس لئے ان محققین کی اتنی مستحکم بحث کے بعد بھی میں اس مرحلہ میں کسی قابل اطمینان نتیجہ پر نہیں پہنچا ہوں۔(جلد سوئم ص366) اس آیت کریمہ کی تفسیر میں پہلی لغزش ہمارے علماء کرام سے یہ ہوئی کہ انہوں نے ان چار الفاظ، **اشھد، قالوا، اخذ،** اور **شھدنا** ماضی کا صیغہ قرار دیا ہے اور اسی لغزش کی وجہ سے ان کا رخ غلط سمت کی طرف ہو گیا ہے۔حالانکہ قرآن کریم نے ہمیشہ سنت جاریہ کے لئے ماضی کے صیغے استعمال کئے ہیں۔لیکن اس سے مراد مضارع ہی ہوتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (2/22) اور اللہ آسمانوں سے بارش نازل کرتا ہے۔اسی طرح ارشاد ہوتا ہےoوَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا (16/78)oاور اللہ ہی تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالتا ہے تم کوئی چیز نہیں جانتے تھے۔ان دونوں آیات کریمات میں سنت جاریہ کا بیان ہے، صیغے ماضی کے ہیں۔لیکن یہاں ان کا ترجمہ صرف مضارع میں ہو سکتا ہے، ماضی میں ہو نہیں سکتا۔چونکہ نوع آدم کی پشت سے اولاد کا ہونا ماضی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔بلکہ سنت جاریہ ہے اس لئے ان چاروں الفاظ کے معنی میں لئے جانے ضروری اور لازمی ہیں۔صرف اس درست ترجمہ کی وجہ سے ہی مفسرین کرام کے دیئے ہوئے الست یا یوم میثاق کی از خود تردید ہو جاتی ہے۔

آیت کریمہ میں اس بات پر اصرار ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانیت کی کفالت کرتا ہے اور ہر شخص کی ذات اپنے روزانہ مشاہدے سے اس بات کی خود گواہ ہے۔ کہ اس کو رزق مہیا ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو دودھ مہیا ہوتا ہے۔ رضاعت کا دور ختم ہونے سے پیشتر ہی اس کے دودھ کے ننھے ننھے دانت نکل آتے ہیں۔ کہ بچہ ان سے نرم غذا چبا سکے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ اگر چھوٹے چھوٹے بچوں کے بڑے بڑے ہڈی کے دانت نکل آتے تو وہ کس درجہ بدصورت نظر آتے کائنات کا سارا سلسلہ انسان کو رزق مہیا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست — چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست
چناں پہن خوان کرم گستر — کہ سیمرغ دو قاف قسمت خورد

بوستان کے یہ اشعار آسان ہیں ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ آیۃ کریمہ کا مفہوم ہے کہ اے رسول یہ بات قابل غور ہے کہ آپ کا رب نوع انسانی کی پشتوں سے ان کی اولاد پیدا کرتا ہے اور ساری انسانیت کی اولاد پیدا کرتا ہے اور ساری انسانیت کو رزق مہیا کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خود اپنے پر گواہ ٹھہرایا ہوا ہے۔ کہ اس کو رزق مل رہا ہے۔ ہر شخص اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس کو رزق مل رہا ہے اور اس رزق کا دینے والا اس کا رب ہے۔ ہر شخص اپنے روزانہ تجربے سے یہ بات کہتا ہے کہ اے پروردگار بے شک تو ہمارا رب ہے۔ اور قیامت کے دن بھی ہم اس بات کے گواہ ہوں گے کہ ہم تیری رزاقیت، ربوبیت سے بے خبر نہ تھے۔

یہ واضح رہے کہ ہمارے مفسرین کرام عربی قواعد کے ماہر تھے چونکہ وہ آیات کی تفسیر احادیث مبارکہ کی روشنی میں کرتے تھے بلکہ احادیث کے حدود کے اندر اندر کرتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی سوچ میں آزاد نہیں تھے۔ اگر احادیث کے FRAME WORK سے باہر نکل آتے اور خالص عقل کی روشنی میں آیات کی تفسیر کرتے تو ہماری ان سابقہ تفاسیر کی صورت ہی کچھ اور ہوتی۔ تفسیر تو ایک طرف رہی حدیث نے تو عربی لغت اور قرآنی تراجم کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہاں تک کہ راغب اصفہانی کی مفردات جو صرف قرآنی لغت ہے وہ بھی احادیث سے متاثر ہوئی ہے۔ اسلامی

فقہ کا بیشتر حصہ بھی قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ وہ بھی حدیث سے متاثر ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے جس کا اس مضمون سے کوئی علاقہ نہیں۔

اس مضمون میں اس بات پر شدید اصرار ہے کہ اس آیات کی سابقہ تحریر کردہ تفسیر بالکل غلط اور خلاف قرآن ہے۔ لیکن اس بات پر اصرار نہیں کہ آیت کی موجودہ وضاحت لازماً درست ہے، یہ ایک سوچ ہے جو قارئین کے غور کرنے کے لئے ان کی خدمت عالی میں پیش کردی گئی ہے۔

(یہاں ہمارا کلام ختم ہوتا ہے اور ہمارے مصطفیٰ علیہ السلام پر ہزاروں سلام)

ماہ نومبر 2008ء

اسلام میں چار شادیاں؟

جیسا کہ قارئین کرام کو بخوبی علم ہے رسالہ صوت الحق خالص قرآنی رسالہ ہے۔ اس کو نہ تو عملی سیاست سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی کسی شخصیت سے کوئی سروکار۔ وقتی ہنگاموں اور حکومتی سازشوں سے یہ کلی طور پر صرف نظر کرتا ہے۔ اس کا پیغام تو ابدی حقائق کو پیش کرنا ہے۔ اور یہ سب امور وقتی ہوتے ہیں۔ البتہ اگر کسی گوشہ سے بھی قرآن کریم کے نظریات کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو یہ رسالہ اس کی گرفت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے خواہ وہ شخصیت کتنی ہی قد آور ہو، اور وہ کسی پارٹی سے بھی علاقہ رکھتا ہو۔

مورخہ 8 مئی 2008ء کو P.T.V چینل پر رات کے وقت محترم جناب عمران خان صاحب کا ایک انٹرویو ہوا جس کی COMPERE ثمینہ وقار صاحبہ تھیں۔ اس انٹرویو کی CONTENTS (مشمولات) سے اس رسالہ کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ البتہ جو بات وہاں قرآن کریم کے خلاف ہوئی اس مضمون میں اس کی وضاحت کر دینی صوت الحق کے نزدیک ضروری اور لازمی ہے۔ ساری دنیا کے لیڈر BY DEFINITION، اقتدار پرست ہوتے ہیں۔ یہ تو لیڈر شپ (قیادت) کی DEFINITION ہوتی ہے۔ اس میں اقتدار پسندی INBUILT اور INHERENT ہوتی ہے۔ البتہ جب لیڈر کے ذاتی مفاد اور ملک کے مفاد میں TIE آپڑتی ہے تو جو لیڈر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے وہ ملک کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں تقریباً 60 سال سے ایسے ہی لیڈر آئے ہیں جنہوں نے ایک مرتبہ اقتدار میں آنے کے بعد ہی مفادات کا تحفظ کیا اور کبھی بھی بخوشی اقتدار سے دست بردار نہیں ہوئے ہر لیڈر

نے اقتدار اسی وقت چھوڑا جب اسے سخت مجبور کیا گیا، یا موت نے ہی اس کو اقتدار سے ہٹا دیا۔

ہمارے محترم عمران خان جو ان لیڈر ہیں ۔ ان کے لئے مشہور ہے کہ وہ RE-BORN یا NEW-BORN مسلم ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی ایسی معلومات ہیں۔ اس لئے ان سے توقعات بھی وابستہ ہیں اور اسی وجہ سے ان سے یہ گذارشات بھی ہیں۔ قرآن کریم نے بھی RE-BORN مسلمانوں کی تعریف و مدح کی ہے اور انہیں ان لوگوں سے مُمیز کیا ہے جو ہنوز تاریکیوں میں ہیں کیونکہ یہ (نوزائیدہ مسلم) RE-BORN قرآن کریم کے نور کو لے کر، لوگوں کے درمیان پھرتا ہے (6/122)

ثمینہ وقار صاحبہ نے اپنے انٹرویو میں جو اور گفتگو کی، اس سے صوت الحق کا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ انہوں نے عمران خان صاحب سے یہ سوال کیا کہ جب اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے تو وہ اور شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ وہ شادی اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اسلام میں بیویوں کے درمیان عدل قائم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ شاید یہ عدل قائم نہ کر سکیں اس مضمون میں ان کے اور ثمینہ وقار صاحبہ کے الفاظ بعینہ نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ اس وقت اس انٹرویو کے NOTES نہیں لئے گئے تھے۔ البتہ یہ بات طے شدہ ہے کہ ثمینہ وقار صاحبہ اور عمران خان صاحب دونوں اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام میں ایک شخص کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اور یہی وہ بات ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہے اور جو اس مضمون کا موضوع ہے۔ اگر قارئین کرام اس مضمون کے پس منظر کو نظر انداز کر کے، مضمون کا مطالعہ اسی مقام سے کر دیں تب بھی یہ مضمون اس موضوع پر مکمل ہے اور یہ ظاہر کرے گا کہ نہ صرف ہمارے علماء ہی شریعت کے قائل ہیں بلکہ ہمارے INTELLCCTUALS بھی کس طرح شریعت سے متاثر ہیں۔ کیونکہ ان کی قرآن کریم تک براہ راست رسائی نہیں ہے۔

''شریعتِ مُطہرہ''، جس پر ہم عمل کرتے ہیں اور جس کے نفاذ کے لئے ہمارے علماء کرام سخت بے چین و مضطرب ہیں، اور جس کا اطلاق اب سوات کے اضلاع میں شروع ہو گیا ہے، یہ

ہماری شریعت بنو عباس کے دور میں بنائی گئی تھی۔ اس شریعت کا واحد مقصد حکمرانوں اور اس کے دور کے لیڈروں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ وہ دور گذر گیا۔ بنو عباس کی حکومت ختم ہو گئی۔ وہ نام نہاد خلفاء یا قتل ہو گئے یا خود اپنی طبعی موت مر گئے۔ مگر ان کے دور کی بنائی ہوئی شریعت اب بھی ہمارے سروں پر مسلط ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ بنو عباس کے دور کے وہ انتظامی (Scale) احکامات و قوانین جو حکومت اپنی رعایا کو GOVERN کرنے کے لئے جاری کرتی تھی، ان قوانین و احکامات کے متعلق کوئی کاغذات نہیں ملتے جن سے پتہ چلتا کہ وہ احکامات کیا تھے اور اس دور کی حکومت کس طرح چلائی جاتی تھی۔ لیکن پیشوائیت کے یہ قوانین تقدس (SANCITY) کا درجہ حاصل کر کے، باقی رہ گئے اور آپ ان پر کوئی انتقاد نہیں کر سکتے۔ ہمارے ملک عزیز پاکستان میں بھی یہی صورت ہے کہ شریعت وفاقی شرعی عدالت کے ماتحت مدون ہو رہی ہے۔ اس شریعت کے احکامات سپریم کورٹ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ حکومت جو بھی حکم یا آرڈیننس جاری کرتی ہے۔ ملک کی پبلک کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس پر انتقاد کر سکتی ہے۔ لیکن شرعی وفاقی عدالت کے احکامات پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ وفاقی شرعی عدالت کے یہی احکامات مستقبل میں شریعت یا ''شرع شریف'' کے نام سے موسوم ہوں گے۔ اور اسی شریعت کے ہمارے علماء قائل ہیں اور اسی سے ہمارے پڑھے لکھے حضرات متاثر ہیں۔ قرآن کریم نہ اُن کے سامنے ہے اور نہ ان کے سامنے اور اسی کے تاثر سے عمران خان صاحب نے یہ بیان دیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ o وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ o (51/49) o اور ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا o ۔ o وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ o (53/45) o اور یقیناً وہ نر اور مادہ کے جوڑے پیدا کرتا ہے o ۔ حضرت نوحؑ کو حکم ہوا۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (11/40) اور ہم نے حکم دیا کہ ہر قسم کے جانداروں میں سے دو دو جوڑے لے لو۔ آپ

ملاحظہ فرمائیں کہ جوڑے سے مراد ایک نر اور ایک مادہ ہوتے ہیں۔ ایک نر اور کئی مادہ جوڑے نہیں ہوتے۔ حضرت نوحؑ نے جب اپنی کشتی میں جاندار سوار کرائے تو یقیناً ان میں ایک نر اور ایک مادہ ہوگا۔ ایک نر اور کئی مادہ نہیں ہوں گے۔ عربی میں زوج کے معنی رفیق یا ایک دوسرے کے ساتھی کے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کے متعلق بھی ارشاد ہوتا ہے o وَ خَلَقْنَا کُمْ اَزْوَاجًا o(78//8)o اور ہم نے تم لوگوں کو جوڑا جوڑا پیدا کیا o۔ ظاہر ہے کہ جوڑے میں ایک شوہر اور ایک بیوی ہوگی ایک شوہر اور چار بیویاں جوڑا نہیں ہوسکتیں۔ قرآن کریم کا اصول تو ایک شوہر اور ایک بیوی کا ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے o وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ (4/20)o اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو۔ نیز فرمایا اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4/3)۔ اگر (شرائط کے ساتھ ساتھ) عدل نہ کرسکو تو ایک (بیوی)

سارے قرآن کریم میں اصولی طور پر اجازت صرف ایک بیوی کی ہے۔ لیکن صرف ایک مقام پر خلافِ معمول خاص حالات ہیں، چند شرائط کے ساتھ، قرآن کریم نے تعدد ازواج کی اجازت دی ہے۔ لیکن اگر خاص حالات نہ ہوں، اور وہ چند شرائط بھی پورے نہ کئے جائیں، تو پھر قرآن کریم کی رُو سے دوسری شادی کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ جس آیہ کریمہ سے متعدد شادیوں کی اجازت اخذ کی جاتی ہے، اس کی وضاحت ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے o وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا o(4/3)o اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کرسکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کرلو جو عورتیں تم کو خوش آویں دو دو، تین تین، چار چار، پھر اگر ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا لونڈی جو اپنا مال ہے۔ اس میں امید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو گے o ترجمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ۔

تفسیر ابن کثیر معروف و مستند تفسیر ہے۔ اس میں اس کا ترجمہ اس طرح مرقوم ہے۔ ''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں سے بھی جو تمہیں

اچھی لگیں تم اُن سے نکاح کرلو دو دو، تین تین، چار چار، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کرسکنے کا خوف ہو تو ایک ہی بس ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی ہی، ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور ایک طرف جھک جانے سے بچ جاؤ''۔ان دو ہی تراجم پر اکتفاء کیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ یہ دونوں تراجم غلط ہیں۔جن کی نشاندہی آگے آتی ہے۔

اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک لڑکی یتیم تھی جس کے پاس مال بھی تھا اور باغ بھی۔جس (شخص) کی پرورش میں وہ تھی اس نے صرف اس مال کے لالچ میں بغیر اس کا پورا مہر وغیرہ مقرر کرنے کے اس سے نکاح کرلیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔اس آیت کریمہ میں ہمارے مفسرین نے یتیمی کا ترجمہ یتیم لڑکیاں کیا ہے اور اسی وجہ سے یہ ترجمہ غلط ہے ۔لفظ یتیم میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے ہیں یتیم کا لفظ صرف لڑکیوں کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں ہے۔عربی زبان میں یتیم کا مطلق معنی بے سہارا ہو جانا ہے۔اس لئے جن بچوں کے باپ مرجاتے ہیں اور وہ بے سہارا ہو جاتے ہیں، تو اُنہیں یتیم کہا جاتا ہے۔اسی طرح جن عورتوں کے خاوند مرجائیں اور وہ بے سہارا ہو جائیں، اُنہیں بھی یتیم کہا جاتا ہے۔خود قرآن کریم نے یتامی النساء کا لفظ بیوہ عورتوں کے لئے استعمال کیا ہے (4/127)۔لغات القرآن میں بحوالہ لسان العرب مرقوم ہے کہ ''یتیم اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو''۔قرآن کریم نے بھی یتیم کو بے سہارا ہی DEFINE کیا ہے جب حضورؐ کے متعلق ارشاد ہوا۔o أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ o(93/6)o کیا ہم نے تمہیں بے سہارا نہیں پایا کہ پناہ دی o قرآن کریم کی اس آیہ کریمہ کی رُد سے ہر وہ شخص جو بے سہارا ہے وہ یتیم ہے۔اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ لفظ صرف لڑکیوں کے لئے نہیں آتا چونکہ اس کا اطلاق حضورؐ پر ہوا تو یہ مردوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔یہ لفظ قرآن کریم میں کم سے کم پندرہ مختلف مقامات پر جمع کی صورت میں استعمال ہوا ہے اور کسی جگہ بھی صرف لڑکیوں کے لئے استعمال نہیں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ اس آیت میں خطاب عام نہیں ہے، یہ خطاب صرف یتیموں کے اولیاء و

سرپرستوں سے ہے۔ النّسآء کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن آیت کے شروع میں لفظ یتیمیٰ نے اس کو QUALIFY کیا ہے، اوراس کے تحت آکر یَتَامَی النّسَاء کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ جس کے معانی خود قرآن کریم نے (4/127) میں بیوہ عورتوں کے کئے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں خوف ہو کہ بیوہ عورتوں میں انصاف قائم نہیں کرسکو گے۔ تو ان بیوہ عورتوں میں سے جو عورتیں تمہیں پسند کریں، دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلیا کرو۔ پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں میں عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی بیوی یا جس کے مالک ہوئے تمہارے دائیں ہاتھ۔ بہر حال اس آیت کے مطابق دوسرے نکاح کی شرائط یہ ہیں۔

(1) بیوہ عورتوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ان سے انصاف نہ ہو رہا ہو، اور یتیموں سے بھی انصاف نہ ہو رہا ہو۔

(2) دوسرا نکاح صرف ان یتیموں کی ماں، یعنی بیوہ عورتوں سے جائز ہے۔

(3) پسندیدگی یا انتخاب کا حق بیوہ عورتوں کو ہوگا۔ مردوں کو نہیں ہوگا۔

(4) یہ تحدید ازواج اس لئے ہے تاکہ اولاد میں کمی ہو۔ اور کثرتِ اولاد نہ ہو۔

ان بیان کردہ شرائط اور ثبوت کو آئندہ پیش کیے جائیں گے۔ اس بات کی تائید میں کہ دوسرا نکاح صرف بیوہ عورت سے ہو "تدبر قرآن" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ اقتباس اس بارے میں حُجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتا ہے، حضرت اقدس فرماتے ہیں۔

"آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم (مخاطب یتیموں کے اولیاء اور سرپرست ہی ہیں) بر بنائے احتیاط اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہارے لئے یتیموں کے مال اور ان کے واجبی حقوق کی کما حقہ نگہداشت ایک مشکل کام ہے۔ تم تنہا اپنی ذمہ داری پر اس سے بہ حسن وخوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ اگر یتیموں کی ماں بھی، اس ذمہ داری میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائے تو تم اس فرض سے عمدہ طریقے سے عہدہ برآ ہوسکتے ہو، اس لئے کہ یتیموں کے ساتھ جو قلبی لگاؤ اس کو ہوسکتا ہے، کسی دوسرے کو نہیں ہوسکتا۔ اور ان کے حقوق کی نگہداشت جس بیداری سے وہ کرسکتی ہے کسی اور کے لئے

ممکن نہیں تو ان سے جو تمہارے لئے جائز ہوں ان سے تم نکاح کرلو"۔ جلد دوم، صفحہ 252۔ پہلی شرط کہ دوسرا نکاح صرف بیوہ سے ہو، اس کا ثبوت آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب دوسری شرط کہ انتخاب کا حق عورتوں کو ہے مردوں کو نہیں اس کا ثبوت ملاحظہ فرمائیں۔

جہاں تک عورتوں کو حق انتخاب دینے کا مسئلہ ہے تو ہمارے مفسرین نے مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ میں شوہر کو طَابَ کا فاعل قرار دیا ہے۔ لیکن اصل میں یہاں النِّسَاءِ فاعل ہے۔ کیونکہ یہاں **هن** ضمیر مستتر ہے یہ **هن** ضمیر مستتر **مُبین** ہے اور مِّنَ النِّسَاءِ بصیغہ جمع مونث اس کا بیان ہے۔ **مُبین** اور بیان مل کر طَابَ کا فاعل ہے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرتا ہے کہ جمع مونث کے لئے **فعل** مذکر نہیں آسکتا تو خود قرآن کریم نے جمع مونث کے لئے **فعل** مذکر استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ٥ وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ (12/30) یہاں نِسْوَةٌ جمع مونث ہے، لیکن یہاں **فعل** مذکر قَالَ آیا ہے، اسی طرح آیت میں بھی **فعل** مذکر طَابَ آیا ہے۔ اس لئے اس کا درست ترجمہ ہوگا "جو پسند کریں تمہیں عورتوں میں سے"۔

تیسری بات کہ اولاد کم ہو۔ اس بارے میں عرض ہے کہ ہمارے مفسرین نے (أَلَّا تَعُولُوا) کا ترجمہ "ایک طرف نہ جھک پڑو" کیا ہے۔ ہم نے اس کا ترجمہ "تم زیادہ عیالدار نہ بنو" کیا ہے۔ مدارس عربیہ میں متداول و مستند لغت، مصباح اللغات میں **عال یعول عولاً و عیالة** کے معنی کثیر العیال ہونا لکھے ہیں۔ امام راغب نے اپنی مفردات میں **اعال الرجل** کے معنی "وہ آدمی کثیر العیال ہوگیا" کئے ہیں۔ لغات القرآن میں بھی تاج کے حوالہ سے لَّا تَعُولُوا کے معنی "تم کثیر العیال ہوکر بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ" تحریر کئے ہیں تفسیر مظہری میں تحریر ہے کہ "امام شافعی نے ترجمہ کیا ہے کہ تمہارے بچے زیادہ نہ ہوجائیں جلد اول صفحہ 321، ان تمام معتبر ترین اور مستند اسناد کو پیش نظر رکھ کر، ہم نے اس کا ترجمہ یہی کیا ہے کہ "کہ تمہارے زیادہ بچے نہ ہوں" بہرحال قرآن کریم کے نزدیک دوسری شادی کے لئے مندرجہ ذیل 4 شرائط ضروری ہیں۔

(1) ایسے ہنگامی حالات ہوں کہ بیوہ عورتوں کو پناہ کی ضرورت ہو اور اسلامی حکومت دوسری

شادی کی اجازت کا اعلان کردے۔

(2) دوسری شادی صرف اور صرف، یَتَامٰی کی ماں، یعنی صرف بیوہ عورت سے ہوسکتی ہے۔

(3) بیویوں کے درمیان عدل قائم رہ سکے۔

(4) انتخاب کا حق عورتوں کو ہے۔ مرد اس بارے میں زبردستی نہیں کر سکتے۔

ازواج پر تحدید کی غرض وغایت یہ ہے کہ اولاد کی کثرت سے اجتناب کیا جائے۔

یہ مضمون یہاں ختم ہوگیا ہے۔ لیکن بعض حضرات اس بارے میں حضورؐ کی ازواج مطہرات، اور لونڈیوں کا حوالہ دے کر مسئلہ کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ازواج مطہرات، اور لونڈیوں کا مسئلہ، یہ الگ موضوعات ہیں، اور الگ مضامین کے متقاضی۔ یہ مختصر سا مضمون ان موضوعات کا متحمل نہیں ہوسکتا تاہم یہ بات عرض کرنا ضروری ہے کہ حضورؐ کی ازواج کے متعلق مروجہ تصور بالکل غلط ہے اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ حضورؐ قرآن کریم کے متبع تھے۔ قرآن کریم کے ہر حکم کا اطلاق حضورؐ پر ہوتا تھا۔ جن چند امور میں حضورؐ کو مستثنٰی قرار دیا گیا تھا اس کا ذکر خود قرآن کریم نے کردیا تھا۔ مثلاً حضورؐ کی ازواج سے، حضورؐ کے انتقال کے بعد، کوئی شخص نکاح نہیں کرسکتا تھا۔ تہجد صرف حضورؐ کے لئے فرض تھا اسی طرح کے چند دیگر امور۔ لیکن تعداد نکاح کی تحدید میں حضورؐ کا استثنا نہیں تھا۔ اس لئے حضورؐ نے بھی ہنگامی حالات کی وجہ سے، چار شادیاں تک کی ہوں گی۔ بیک وقت بارہ یا تیرہ شادیاں نہیں کی ہوں گی اور وہ بھی صرف ہنگامی حالات کی وجہ سے اور مندرجہ بالا درج شدہ چار شرائط کو پیش نظر رکھ کر۔ قرآنی شرائط کو نظر انداز کرکے، حضورؐ نے کسی حال میں بھی چار سے زیادہ شادیاں نہیں کی ہوں گی۔ اگر قارئین کرام کی خواہش ہوئی تو اس موضوع کے لئے گذارشات پیش خدمت کردی جائیں گی۔ اس مضمون میں ان سے اس لئے صرف نظر کیا گیا ہے کہ اس موضوع میں جو آیات INVOLVE ہوتی ہیں ان کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کے قواعد کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ وہ آیات سمجھ میں نہیں آتیں۔ صرف یہی ایک رکاوٹ اس موضوع پر لکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ البتہ جو حضرات عربی قواعد سے واقف ہیں، ان کے لئے، اس موضوع پر مضمون پیش کردیا

جائے گا۔ ورنہ وہ حضرات خود تفسیر القرآن بآیات القرآن سے رجوع فرمائیں۔ ادارہ بلاغ القرآن

،لاہور نے بھی ایک مبسوط پمفلٹ ''ازواج مطہرات'' کے نام سے طبع کیا ہے وہ اس بارے میں

بہت مفید اور کارآمد ہے۔ ادارہ صوت الحق کی درخواست ہے کہ آپ وہ مضمون ضرور مطالعہ فرمائیں

ماہ دسمبر 2008ء

اقامتِ صلوٰۃ اور اقامتِ دین ایک ہی چیز ہے

میرا ایک مضمون ''میرے عزیز بھائی اور بہن کے چند مغالطے'' عنوان کا، رسالہ صوت الحق بابت جون 2008ء میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون کو بہت پسند کیا گیا اور اس مضمون میں درج شدہ چند امور کی وضاحت طلب کرنے کے بہت سے خطوط اور ای میل مجھے موصول ہوئے۔ اس مضمون میں تحریر کیا گیا تھا کہ نماز معاشرے کی اصلاح نہیں کر سکتی اور نماز پڑھنے سے اس قسم کے نتائج برآمد ہونے کی توقع ہی غلط ہے۔ اصلاحِ معاشرہ نماز کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ البتہ جب قرآن کریم کی صلوٰۃ نہ صرف اصلاحِ معاشرہ کرتی ہے بلکہ اس معاشرہ کو درست کر کے، قوم کو عروج واقتدار بھی عطا کرتی ہے۔ قارئین کرام میں سے چند اصحاب نے اس بات کی وضاحت طلب فرمائی ہے قرآنی صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور یہ کس طرح اصلاحِ معاشرہ کرتی ہے۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ایک اہم نکتہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن کریم عربوں کی روزمرہ کی زبان میں نازل ہوا (51/23) اور اس کے سمجھنے کے لئے عربی الفاظ کے وہ معانی لینے ضروری ہیں جو معانی ان الفاظ کے نزولِ قرآن کے وقت مروج تھے اس کے علاوہ دوسرا اہم نکتہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان ہی مروجہ الفاظ میں سے کچھ الفاظ کو اپنی اصطلاحات کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ جن الفاظ کو قرآن کریم نے اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے ان کے معانی قرآن کریم کی تصریف آیات سے واضح ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن پر قرآن کریم نے ''ال'' داخل کر کے انہیں خاص معنی میں مخصوص کر لیا۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جنہیں بغیر ال داخل کئے بطور اپنی اصطلاح کے بھی استعمال کیا ہے۔ یہ قرآن کریم پر

غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے کس لفظ کو کس جگہ اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے اور کس جگہ اس کے اصطلاحی معنی لئے ہیں۔ الصلوٰۃ کا لفظ قرآن کریم میں اپنے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا مادہ اپنی مختلف تراکیب میں ایک سو دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ ان تمام مقامات کو سامنے رکھنے کے بعد اس کے اصطلاحی معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی اصطلاحات، اور خصوصاً الصلوٰۃ، اس قدر جامع ہیں، کہ جوں جوں علم انسانی ترقی پذیر ہو رہا ہے، ان اصطلاحات کے مفہوم میں بھی وسعت ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات کہ قرآن کریم کے بعض الفاظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(1) صَامَ، یَصُوم، صَوْماً کے معنی رک جانا ٹھہر جانا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو روزہ کے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی ''صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رہنے کا نام صوم ہے'' (2/182) یہ رمضان کے مہینے کے روزے ہیں جن میں قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا تھا (2/187)

(2) زکا، یزکو، زکاءً، کے معنی بڑھنا، نشوونما پانا ہیں (**مصباح اللغات**)۔ لیکن قرآنی اصطلاح میں اس کے معنی ''اسلامی حکومت کا اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسانی کی پرورش کے لئے سامان فراہم کرنا'' ہے۔

(3) حج، حجاً کے معنی دلیل سے غالب ہونا اور قصد کرنا ہیں (مصباح) اس کی جمع حجج ہے جس کے معنی سال کے ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو حضرت شعیبؑ کے قصہ میں اسی لغوی معنی میں استعمال کیا ہے ثَمَانِیَ حِجَجٍ (28/27) آٹھ سال۔ لیکن قرآنی اصطلاح میں اس کے معنی ''عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع جو امت کے مرکز محسوس، یعنی کعبہ میں اس غرض سے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل کے ساتھ تلاش کیا جا سکے اور اس طرح یہ امت اپنے فائدہ کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے''۔ (22/28)

(4) رکع کے معنی منہ کے بل گر جانا ہے۔ راغب نے اس کے معنی جھکنے کے لئے ہیں۔ لیکن

قرآن کریم میں جب یہ لفظ ال کے اضافہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے تو اس کے معنی "قوانین الٰہی کے سامنے سر جھکانے والا" ہوں گے۔ چنانچہ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ o(2/43) کے معنی "جو جماعت مومنین قوانین الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے۔ تم بھی ان میں شامل ہو کر، اسی طرح قوانین کی اطاعت کرو"۔

(5) ارسل کے معنی بھیجنا اور رسول کے معنی بھیجا ہوا (مصباح) لیکن قرآن کریم میں اپنی اصطلاح میں اس سے مراد "وہ حضرات ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے وحی ملتی تھی اور وہ اس وحی کو انسانوں تک پہنچاتے تھے"۔

(6) اسی طرح وحی کے معنی اشارہ کرنے کے ہیں اور قرآن کریم نے حضرت زکریاؑ کے متعلق اس کو اسی لغوی معنی میں استعمال کیا ہے فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ (19/11) اس (زکریا) نے لوگوں کو اشارہ سے کہا، لیکن قرآنی اصطلاح میں وحی کے معنی "اللہ کا قانون جو حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتا تھا" ہے۔

(7) وقیٰ یقی وقایة کے معنی کسی چیز کی حفاظت کرنا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے تقویٰ کو اپنی اصطلاح بنا کر استعمال کیا ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت تقویٰ ہے۔

(8) دانہ من دیناً کے معنی مالک ہونا۔ حکم دینا اور دین کے معنی قدرت، حکم، حکومت، غلبہ، اقتدار اور قانون کے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو ضابطہ حیات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ (9/29) وہ نظام الٰہی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے۔ سورۂ یوسف میں دِينِ الْمَلِكِ (12/76) کے معنی بادشاہ کا قانون یا بادشاہ کا جاری کردہ ضابطہ حیات ہے۔ لہٰذا دین سے مراد اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ضابطہ حیات و نظام زندگی ہے جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو اور عملی طور پر کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ اس ضابطہ حیات و نظام زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ ہوتے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت عبادت الٰہی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے الدین کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے اور اقامتِ دین سے اسلامی نظام کا قیام مراد لیا ہے اس مفہوم کو پیش نظر رکھئے، تاکہ

اس سے اقامتِ صلوٰۃ کا موازنہ ہو سکے۔اس طرح کی اصطلاحات کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔لیکن اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے یہی کافی ہے ہیں۔الصلوٰۃ اور الدین قرآن کریم کی اصطلاحات ہیں۔صوت الحق کے نزدیک یہ دونوں اصطلاحیں قرآن کریم نے ایک ہی معنی میں استعمال کی ہیں۔اور اقامت دین اور اقامت صلوٰۃ ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں۔یعنی ایسی حکومت کا قیام جس کی اطاعت عبادت الٰہی ہے اور جس سے نہ صرف معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے بلکہ اس دنیا اور آخرت میں سرفرازی حاصل ہو جاتی ہے۔

(1) قرآن کریم نے الصلوٰۃ اور الدین دونوں کے لئے اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ان دونوں پر عمل ان کی اقامت سے ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کو قائم ESTABLISH کرنا ہے

۔

(2) سابقہ انبیاء کرام کو اقامتِ دین اور اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا۔تمام انبیاء کرام نے دین اور صلوٰۃ قائم کی تھی۔شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ (42/13) تمہارے لئے دین کا راستہ مقرر کیا گیا۔اسی طرح صلوٰۃ کے متعلق حکم تھا o يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ (19/55-31/17)

(3) دین میں فرقہ بندی نہیں ہوسکتی کیونکہ دین نام ہی اسلامی حکومت کا ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ پر قانون الٰہی کا اطلاق یکساں ہوتا ہے۔ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (42/13) اور دین قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بناؤ۔اسی طرح صلوٰۃ کے بارے میں ارشاد ہوا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (30/31.32) اور نماز پڑھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے بنا لئے۔

(4) اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے بعد خوف وحزن باقی نہیں رہتا (2/277) اسی طرح جس معاشرہ میں اتباعِ وحی ہوگا (یعنی دین کا قیام ہوگا) اس میں خوف وحزن نہیں رہے گا (2/38)

(5) ایک آیہ کریمہ تو اس باب میں اس قدر واضح ہے کہ پھر اقامتِ صلوٰۃ اور اقامتِ دین کو ایک ہی چیز ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا ارشاد ہوتا ہے وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ o(98/5) رواں ترجمہ، اور پابندی سے نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، اور یہی سچا دین ہے o اس آیہ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا نظام قائم کرو جس میں ہر فرد معاشرہ قوانین الٰہی کے پیچھے پیچھے چلے، اور ساری انسانیت کو سامان نشو ونما فراہم کرے۔ بس یہی وہ دین محکم ہے اور یہی وہ نظام ہے جو انسانیت کو اس کے پاؤں پر کھڑا کردے۔ اس سے پوری وضاحت ہوجاتی ہے کہ اقامتِ دین اور اقامتِ صلوٰۃ ایک ہی چیز ہے۔

اقامت دین اور اقامت صلوٰۃ دونوں کے لئے اقتدار شرط ہے(22/41-24/55) بغیر اقتدار کے نہ اقامتِ دین ممکن ہے نہ اقامتِ صلوٰۃ، اور ہم مسلمانوں کے لئے دونوں کا قائم کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ ہمارے ہاں غلطی ہورہی ہے کہ ہم اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم نماز پڑھنا قرار دیتے ہیں اور نماز پڑھنے پر شدید اصرار کرتے ہیں لیکن اقامت صلوٰۃ کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ نماز پڑھنے کے لئے ہی مساجد، مدارس علماء، آئمہ، خطباء ،حضرات رات دن مصروف رہتے ہیں لیکن نتائج کچھ بھی برآمد نہیں ہوتے۔ اور صلوٰۃ اور دین کو نہ صرف قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اُن کا تصور بھی ہمارے ذہن سے محو ہوگیا ہے۔ بلکہ جو شخص اقامتِ دین کی کوشش کرتا ہے، اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ ایک اصولی بات ہمیشہ پیش نگاہ رکھئے کہ قرآن کریم نہ تو پرستش کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی انفرادی رسومات کی۔ قرآن کریم کے نزدیک اس کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے، اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اور یہ صرف اجتماعی طور پر اسلامی نظام کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اقامتِ دین یعنی اسلامی حکومت کا قیام، خارج میں وجود رکھتا ہے جو VISIBLE ہوتا ہے، جس کے نتائج آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ۔ اسی طرح اقامتِ صلوٰۃ کے نتائج لازماً اور یقیناً آنکھوں کے سامنے آنے چاہئیں۔ اور اُن نتائج سے ہی اصلاح معاشرہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ اصلاح معاشرہ ہی اس کے نتائج ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَo

ماہ دسمبر 2008ء